افلا یتدبرون القرآن

تدبرِ قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ

الطور ۵۲ — الجن ۷۲

تدبرِ قرآن

— جلد ہشتم —

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ

تدبرِ قرآن

جلد ہشتم

تفاسیر

سورۂ طور (۵۲) — تا — سورۂ جن (۷۲)

امین احسن اصلاحی

فاران فاؤنڈیشن

لاہور — پاکستان

جملہ حقوق عکس وطباعت محفوظ

اہتمام ـــــ حسن خاور

مطبع ـــــ فلک شیر پرنٹرز، ابراہیم روڈ، لاہور

تاریخ اشاعت ـــــ نومبر 2009ء ـــ ذیقعد 1430ھ

ادارہ ـــــ فاران فاؤنڈیشن

سیکنڈ فلور، علق پریس بلڈنگ، 19-اے،
ایبٹ روڈ، لاہور، پاکستان۔ فون: 042-6303244
ای میل: faran@wol.net.pk

فہرس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

(طبع اوّل)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ تدبر قرآن کی ساتویں جلد[1] بھی پریس کے حوالہ کی جا چکی ہے۔ توقع ہے کہ اختتام سال سے پہلے پہلے ان شاء اللہ اس کی اشاعت کی خوش خبری قدر دانوں تک پہنچ جائے گی۔ کتاب کے ناشر ــــ عزیزم ماجد خاور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ ــــ میرے شکریہ اور کتاب کے قدر دانوں کی تحسین کے سزاوار ہیں کہ گوناگوں مشکلات کے باوجود، نہایت قلیل مدت میں، کتاب کی تین جلدیں ــــ پنجم ششم اور ہفتم ــــ نہایت اعلیٰ معیار پر شائع کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے اور یہ حوصلہ بھی رکھتے ہیں کہ سالِ آئندہ کے اندر اندر اس کی آٹھویں یعنی آخری جلد بھی ان شاء اللہ وہ شائع کر دیں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس ارادے میں کامیابی بخشے اور وہ اس سے بھی بڑے بڑے کاموں کو انجام دینے کی توفیق پائیں۔ اگرچہ میں اپنے رب کے ہر فیصلہ پر راضی ہوں لیکن دل میں یہ ارمان ضرور ہے کہ مرنے سے پہلے اس کتاب کو مطبوعہ صورت میں دیکھنے کی خوشی مجھے بھی حاصل ہو جائے۔

آٹھویں جلد کا معتد بہ حصہ بھی خدا کے فضل سے تیار ہے۔ اگرچہ گھر میں مسلسل علالت کے سبب سے اِدھر عرصہ سے دل جمعی کے ساتھ کام کرنا نصیب نہیں ہوا تاہم وقفہ وقفہ کے ساتھ کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہوں اور یہ کوشش بھی کی ہے کہ جو کچھ قلم سے نکلے وہ کتاب کے معیار کے مطابق ہو اور کسی اہم بحث میں قارئین کسی پریشانی، خاطر یا بے توجہی کا کوئی اثر محسوس نہ کریں۔ آخری گروپ کی سورتوں میں، جیسا کہ جلد ششم کے دیباچہ میں عرض کر چکا ہوں، کمالِ ایجاز کے باعث مشکلیں بہت ہیں تاہم سورۂ غاشیہ (۸۸) تک کام ہو چکا ہے۔ جو کام رہتا ہے، زندگی اور صحت باقی ہے تو چند مہینوں میں پورا ہو جائے گا۔

یہاں ایک فتنہ کی طرف بھی توجہ دلانا ضروری ہے جو مستشرقین نے قرآن کے نظام اور اس کی خدائی ترتیب کو درہم برہم کرنے کے لیے اٹھایا ہے۔ انھوں نے اپنے زیرِ اہتمام قرآن کے ایسے نسخے چھاپے ہیں جن میں سورتوں کی وہ ترتیب، جو اللہ اور رسول کی قائم کی ہوئی ہے، بدل کر ایک نئی ترتیب اس دعوے کے ساتھ قائم کی ہے کہ اس طرح قرآن ایک منظم اور مرتب کتاب بن جاتا ہے اور ان کے نزدیک اس کے

---

[1] ترتیبِ نو ــــ جلد ہشتم

اندر بے ترتیبی کا جو عیب ہے وہ ایک حد تک دور ہو جاتا ہے۔

اس نوعیت کا ایک اور فتنہ بعض مسلمان ملکوں میں اٹھ رہا ہے کہ وہاں ایسے قرآن مجید چھاپے جا رہے ہیں جن میں مصحفِ عثمانی کی معروف و متواتر قراءت (قراءت حفص) کو نظر انداز کر کے دوسری غیر معروف اور شاذ قراءتیں اختیار کر لی گئی ہیں۔

تدبر قرآن میں اس طرح کے فتنوں کا سر میں نے اچھی طرح کچل دیا ہے۔ جو لوگ غور سے اس کا مطالعہ کریں گے وہ ان شاء اللہ مستشرقین، یہود اور روافض کی اس طرح کی فتنہ انگیزیوں سے محفوظ رہیں گے۔ جس ترتیب کے ساتھ مصحف ہمارے ہاتھوں میں ہے یہ ترتیب اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ ہے۔ اس کی بنیاد تورات اور انجیل کی طرح تاریخ پر نہیں بلکہ فلسفۂ دین اور حکمت شریعت پر ہے۔ اس کے تمام گروپ باہم دگر بالکل وابستہ و پیوستہ ہیں۔ اس کی ہر سورہ اپنی سابق و لاحق سورہ سے اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ اس کے اندر معمولی تقدیم و تاخیر سے معنوی خلا پیدا ہو جائے گا۔ ہر سورہ کی آیات میں ایک خاص عمود کے تحت ایسا ربط و اتصال ہے کہ ایک آیت بھی اگر کہیں اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اندیشہ ہے کہ پوری سورہ کا نظام مختل ہو جائے۔

قراءتوں کا اختلاف بھی اس تفسیر میں دور کر دیا گیا ہے۔ معروف اور متواتر قراءت وہی ہے جس پر یہ مصحف ضبط ہوا ہے جو ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ اس قراءت پر قرآن کی ہر آیت اور ہر لفظ کی تاویل لغتِ عرب، نظم کلام اور شواہدِ قرآن کی روشنی میں اس طرح ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی شک کا احتمال نہیں رہ جاتا۔ چنانچہ میں نے ہر آیت کی تاویل اسی قراءت کو بنیاد بنا کر کی ہے اور میں پورے اعتماد کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ اس کے سوا کسی دوسری قراءت پر قرآن کی تفسیر کرنا اس کی بلاغت، معنویت اور حکمت کو مجروح کیے بغیر ممکن نہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی کتاب کا صحیح فہم عطا فرمائے اور شیاطین کے فتنوں سے محفوظ رکھے۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

لاہور

۱۴- نومبر سنہ ۱۹۷۹ء

۲۳- ذوالحجہ سنہ ۱۳۹۹ھ

تدبرِ قرآن

۵۲

الطُّور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلق

یہ سورہ اس گروپ کی تیسری سورہ ہے۔ پچھلی دونوں سورتوں ـــــ قٓ اور الذّٰریٰت ـــــ میں زندگی بعد موت، حشر و نشر اور جزاء و سزا کے عقلی و انفسی اور آفاقی و تاریخی دلائل بیان ہوئے ہیں اور انداز بیان عمومیت یعنی جزا اور سزا دونوں کے پہلو لیے ہوئے ہے چنانچہ الذّٰریٰت میں عمود کی حیثیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا ہے، اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (بے شک جس چیز کی تم کو دھمکی دی جا رہی ہے وہ سچی ہے اور جزاء و سزا واقع ہو کے رہے گی) کو حاصل ہے اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ جزاء و سزا کے دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے، خواہ اس کا تعلق رحمت سے ہو یا عذاب سے۔ اس سورہ میں عذاب کے پہلو کو زیادہ نمایاں فرمایا ہے چنانچہ چند تاریخی اور آفاقی شواہد کا حوالہ دینے کے بعد قریش کو نہایت واضح الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ لا مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ (۷-۸) (بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہو کے رہے گا اور کوئی بھی اس کو دفع کرنے والا نہ بن سکے گا) یہی دھمکی اس سورہ میں مقسم علیہ کی حیثیت بھی رکھتی ہے اور یہی اس سورہ کا عمود بھی ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ اپنے مطالب کے اعتبار سے تین حصوں میں تقسیم ہے۔

(۱-۱۶) یہ حصہ تمہیدی ہے۔ پہلے بعض اہم تاریخی و آفاقی حقائق کو شہادت میں پیش کر کے قریش کے متمردین کو دھمکی دی گئی ہے کہ جس عذاب سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے اس کے لیے جلدی نہ مچاؤ، اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ پیش آکے رہے گا اور کوئی بھی اس کو ٹالنے والا نہ بن سکے گا۔ اس کے بعد چند آیتوں میں اس عذاب کے دن کی تصویر کھینچی گئی ہے اور تکذیب کرنے والوں کا اس دن جو حشر ہو گا بالاجمال اس کا بیان ہے۔

(۱۷-۲۸) مکذبین کے بالمقابل متقین پر اللہ تعالیٰ اس دن جو فضل و انعام فرمائے گا اس کا بیان۔ اس انعام کا خاص پہلو جو یہاں نمایاں فرمایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے جو بندے آل و اولاد کی دنیا بنانے سے زیادہ ان کی عاقبت سنوارنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی با ایمان اولاد کو جنت میں ان کے ساتھ جمع کر دے گا، اگرچہ اولاد اپنے اعمال کے اعتبار سے ان کے درجہ کی مستحق نہ ہو۔ اس یکجائی کے لیے اونچے درجے کے مستحقین کے درجہ کو

نیچا نہیں کیا جائے گا بلکہ نیچے درجے والوں کا مرتبہ اونچا کر دیا جائے گا۔ اصل نتائج کا انحصار تو آدمی کے اعمال ہی پر ہوگا۔ اس وجہ سے نہ کسی کے عمل میں کوئی کمی ہوگی اور نہ کوئی ایمان سے محروم شخص جنت میں جا سکے گا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل کا دروازہ اس کے باایمان بندوں کے لیے کھلا رہے گا۔

(۲۹ - ۴۹) خاتمۂ سورہ جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تمھاری تکذیب کے لیے کفار جو بہانے بنا رہے ہیں ان کی پروا کیے بغیر اپنا فرضِ تذکیر ادا کیے جاؤ تاکہ جن کو راہِ راست پر آنا ہو وہ راہ راست پر آجائیں اور جو اپنی گمراہی پر اڑے رہنا چاہیں ان پر حجت تمام ہو جائے۔

اوپر آیت ۴۲ میں مخالفین کی جن سخن سازیوں اور تہمت تراشیوں کی طرف اشارہ ہے ان کی تفصیل اور ان کے مسکت جواب۔

متمردین کو تنبیہ کہ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ان کی ساری چالیں بے کار ہو جائیں گی اور آخرت کے عذاب سے پہلے وہ اس دنیا میں بھی عذاب سے دوچار ہوں گے۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و استقامت کی تلقین کہ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اطمینان رکھو کہ تم ہر وقت ہماری حفاظت میں ہو۔

صبر و استقامت کے حصول کے لیے نماز بالخصوص شب اور سحر کی نمازوں کے اہتمام کی تاکید۔

سُورَةُ الطُّورِ (۵۲)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰیات : ۴۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالطُّوْرِ ۙ﴿۱﴾ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ﴿۲﴾ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ﴿۳﴾ وَّالْبَيْتِ (آیات ۱ - ۲۸)
الْمَعْمُوْرِ ۙ﴿۴﴾ وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ۙ﴿۵﴾ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ۙ﴿۶﴾ اِنَّ
عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ﴿۷﴾ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ ۙ﴿۸﴾ يَّوْمَ تَمُوْرُ
السَّمَآءُ مَوْرًا ۙ﴿۹﴾ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ؕ﴿۱۰﴾ فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ
لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ۘ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ (وقف لازم)
اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ﴿۱۳﴾ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا
تُكَذِّبُوْنَ ﴿۱۴﴾ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ۚ﴿۱۵﴾ اِصْلَوْهَا
فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا
كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ۙ﴿۱۷﴾ فٰكِهِيْنَ
بِمَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۱۸﴾
كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ
عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۲۰﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ

اَلَتۡنٰهُمۡ مِّنۡ عَمَلِهِمۡ مِّنۡ شَیۡءٍ ؕ کُلُّ امۡرِیًٔ بِمَا کَسَبَ رَهِیۡنٌ ﴿۲۱﴾ وَ
اَمۡدَدۡنٰهُمۡ بِفَاکِهَةٍ وَّ لَحۡمٍ مِّمَّا یَشۡتَهُوۡنَ ﴿۲۲﴾ یَتَنَازَعُوۡنَ فِیۡهَا
کَاۡسًا لَّا لَغۡوٌ فِیۡهَا وَ لَا تَاۡثِیۡمٌ ﴿۲۳﴾ وَ یَطُوۡفُ عَلَیۡهِمۡ غِلۡمَانٌ لَّهُمۡ
کَاَنَّهُمۡ لُؤۡلُؤٌ مَّکۡنُوۡنٌ ﴿۲۴﴾ وَ اَقۡبَلَ بَعۡضُهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ یَّتَسَآءَلُوۡنَ ﴿۲۵﴾
قَالُوۡۤا اِنَّا کُنَّا قَبۡلُ فِیۡۤ اَهۡلِنَا مُشۡفِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾ فَمَنَّ اللّٰهُ
عَلَیۡنَا وَ وَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوۡمِ ﴿۲۷﴾ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلُ نَدۡعُوۡهُ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ الۡبَرُّ الرَّحِیۡمُ ﴿۲۸﴾ ع ۲۸ ۳

ترجمۂ آیات ۱-۲۸

شاہد ہے طور اور کتاب لکھی ہوئی، جھلّی کے کھلے ہوئے اوراق میں۔ اور شاہد ہے آباد گھر اور بلند چھت اور لبریز سمندر کہ تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا، کوئی اس کو ٹالنے والا نہیں بن سکے گا۔ ۱-۸

اس دن کو یاد رکھو جس دن آسمان ڈانواں ڈول ہو جائے گا اور پہاڑ چلنے لگ جائیں گے، پس بدبختی ہے اس دن جھٹلانے والوں کی! اُن کی جو سخن گستری میں لگے ہوئے کھیل رہے ہیں۔ جس دن کہ وہ آتشِ دوزخ کی طرف دھکے دے دے کر لے جائے جائیں گے کہ یہ ہے وہ دوزخ جس کو تم جھٹلاتے رہے تھے۔ کیا یہ جادو ہے یا تمھیں سجھائی نہیں دے رہا ہے! اس میں داخل ہو جاؤ، اب صبر کرو یا نہ کرو۔ تمھارے لیے یکساں ہے۔ تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو کرتے رہے تھے۔ ۹-۱۶

بے شک متّقی بندے باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔ وہ محظوظ ہو رہے ہوں گے ان نعمتوں سے جو ان کے رب نے ان کو دے رکھی ہوں گی اور اس بات سے کہ

ان کے رب نے ان کو دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ کھاؤ اور پیو بے غلّ وغش اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم کرتے رہے تھے۔ ٹیک لگائے ہوئے ہوں گے صف بہ صف، تختوں کے اوپر اور ہم ان کو بیاہ دیں گے غزال چشم حوریں۔ ۱۷-۲۰

اور جو لوگ ایمان لائے، اور ان کی اولاد نے بھی ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ان کے ساتھ ہم ان کی اولاد کو بھی جمع کر دیں گے اور ان کے عمل میں سے ذرا بھی کمی نہیں کریں گے۔ ہر ایک اس کمائی کے بدلے میں گرو ہوگا جو اس نے کی ہوگی۔ اور ہم ان کی پسند کے میوے اور گوشت ان کو برابر دیتے رہیں گے۔ ان کے درمیان ایسی شراب کے پیالوں کے تبادلے ہو رہے ہوں گے جو لغویت اور گناہ سے پاک ہوگی اور محفوظ موتیوں کے مانند چھوکرے ان کی خدمت میں سرگرم ہوں گے۔ ۲۱-۲۴

وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، دریافتِ حال کرتے ہوئے۔ کہیں گے: ہم اس سے پہلے اپنے اہل وعیال کے باب میں بڑے ہی چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر اپنا فضل فرمایا اور ہمیں عذاب دوزخ سے محفوظ رکھا۔ ہم اس سے پہلے اسی کو پکارتے رہے تھے، بے شک وہ بڑا ہی باوفا اور مہربان ہے۔ ۲۵-۲۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالطُّوْرِ (۱)

قسم اور مقسم علیہ — 'وَ' یہاں قسم کے لیے ہے اور یہ وضاحت اس کے محل میں تفصیل سے ہو چکی ہے[1] کہ قرآن میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں بیشتر اس دعوے کی شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں جو اس قسم کے بعد بطور مقسم علیہ مذکور ہوا ہے۔ یہاں مقسم علیہ، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ (بے شک تیرے رب کا عذاب

---

[1] ملاحظہ ہو اقسام القرآن مؤلفہ امام حمید الدین فراہیؒ

واقع ہو کے رہے گا) ہے۔ اس وجہ سے طُور کی قسم لازماً اس دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہے۔ چنانچہ قسم کے اسی مفہوم کو پیشِ نظر رکھ کر ہم نے اس کا ترجمہ 'شاہد ہے طُور' کیا ہے اور یہ ترجمہ ہمارے نزدیک زیادہ معنی خیز ہے۔

'طُور' سے مراد وہی جبلِ طُور ہے جس کا ذکر مختلف پہلوؤں سے قرآن مجید میں بار بار ہوا ہے۔ اسی طُور کی ایک مقدس وادی 'طویٰ' میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مدین سے واپس ہوتے ہوئے، پہلی بار خدا کی تجلی کا مشاہدہ ہوا۔ یہیں وہ شرف رسالت سے مشرف ہوئے اور حکم ہوا کہ وہ فرعون اور اس کی قوم کے پاس منذر بن کر جائیں اور اس کو آگاہ کر دیں کہ اگر وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آیا تو اپنی قوم سمیت اللہ کے عذاب کی زد میں آ جائے گا۔ پھر فرعون کی ہلاکت کے بعد اسی طُور پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات دینے کے لیے بلایا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی غیبت کے دوران میں جب بنی اسرائیل گوسالہ پرستی کے فتنہ میں مبتلا ہوئے تو اسی طُور کے دامن میں اپنی قوم کے سرداروں کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام اجتماعی توبہ کے لیے حاضر ہوئے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے سارے طُور کو ہلا دیا اور بنی اسرائیل کو متنبہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کتاب ——— تورات ——— دے کر تم سے جو عہد لے رہا ہے، اگر اس عہد پر تم استوار نہ رہے تو یاد رکھو کہ اس کی قدرت یہ بھی ہے کہ اسی پہاڑ سے تمھیں کچل کے رکھ دے گا۔

اپنی ان گوناگوں خصوصیات کے سبب سے جبلِ طُور اس دعوے کی صداقت و شہادت کا ایک عظیم تاریخی نشان ہے جو اس قسم کے بعد مذکور ہوا ہے۔ چنانچہ اسی خصوص کی بنا پر اس کی قسم سورۂ تین میں بھی کھائی گئی ہے اور وہاں بھی، جیسا کہ سورۂ تین کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم واضح کریں گے، اسی جزاء و سزا ہی کے پہلو سے اس کی قسم کھائی گئی ہے۔

ایک غلط فہمی

بعض لوگوں نے لفظ 'طُور' کو یہاں عام پہاڑ کے معنی میں لیا ہے۔ لیکن یہ قول مختلف وجوہ سے کمزور ہے۔ اول تو قرآن کی تاویل معروف معنی کے لحاظ سے کرنی چاہیے۔ لفظ 'طُور' عبرانی یا سریانی میں پہاڑ کے معنی میں ممکن ہے آتا ہو لیکن عربی میں یہ اس معنی میں معروف نہیں۔ قرآن میں یہ لفظ بار بار آیا ہے اور ہر جگہ عَلَم ہی کی حیثیت سے آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ پہاڑ کے معنی لینے کی صورت میں مقسم علیہ کے ساتھ اس کی مطابقت باقی نہیں رہتی در آنحالیکہ یہ چیز ضروری ہے ورنہ قسم بے محل ہو جائے گی۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ (۲)

کتاب مسطور سے مراد تورات ہے

'وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ' سے مراد یہاں تورات ہے۔ اس کا ایک واضح قرینہ تو یہ ہے کہ اس کا عطف 'طُور' پر ہے اور یہ کتاب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طُور ہی پر عطا فرمائی۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ اس کی صفت 'فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ' آتی ہے۔ 'رَقّ' باریک کھال کو کہتے ہیں جو زمانۂ قدیم میں لکھنے کے مصرف میں آتی تھی اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تورات شروع شروع میں صاف کی ہوئی باریک کھال

ہی پر لکھی جاتی ہو طومار کی شکل میں لپیٹ کر رکھی جائیں اور تلاوت کے وقت ان کو پھیلا لیا جاتا۔ ان قرائن کی موجودگی میں تورات کے سوا کسی اور کتاب کو مراد لینے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے دفترِ عمال کو مراد لیا ہے، لیکن یہ اس کا محل نہیں ہے۔ اس کی شہادت اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں مؤثر ہو سکتی ہے۔

مُقسم علیہ کے ساتھ بھی اس کا تعلق بالکل واضح ہے۔ جس طرح 'طُور' اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات کا ایک تاریخی نشان ہے اسی طرح تورات بھی ایک عظیم تحریری ریکارڈ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کا قانونِ مجازات بھی نوشتہ ہے اور اس قانون کے تحت اس نے دنیا میں قوموں کے ساتھ جو معاملات کیے ہیں ان کی تاریخ بھی محفوظ ہے۔ اس تاریخ کو پڑھیے تو معلوم ہو گا کہ مکافاتِ عمل کا قانون حضرت آدمؑ کے وقت سے برابر جاری ہے اور اس کا یہ تسلسل اس امر کی دلیل ہے کہ یہ برابر جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک ایسا دن بھی آئے گا جس میں اللہ تعالیٰ کے عدلِ کامل کا ظہور ہو گا۔ اس دن جس نے ذرہ برابر بھی برائی کی ہوگی وہ اس برائی کی سزا بھگتے گا اور جس نے رائی کے برابر بھی نیکی کی ہوگی وہ اس کا صلہ پائے گا۔

لفظ 'کِتَاب' کی تنکیر اس کی شان کے اظہار کے لیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے یہی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے خلق کی ہدایت اور آخرت کے عذاب سے ڈرانے کے لیے اتاری اور جس کے بنیادی احکام تحریری شکل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عنایت فرمائے۔ اس سے پہلے حضرات انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیم دی وہ تمام تر زبانی دی۔ ان کی تعلیمات کو تحریر کی شکل میں لانے کا آغاز اسی کتاب سے ہوا اس وجہ سے اس کا ذکر خاص اہمیت کے ساتھ ہوا۔ اس تعلیم بالقلم سے خلق پر اتمامِ حجت کے جو پہلو ظہور میں آئے ان پر ان شاء اللہ سورۂ رحمٰن اور سورۂ علق کی تفسیر میں ہم روشنی ڈالیں گے۔

فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (۳)

ایک کھلا صحیفہ

لفظ 'رَقّ' کی تحقیق اوپر بیان ہو چکی ہے۔ اس کتاب کے پھیلے ہوئے اوراق میں ہونے کا حوالہ یہاں خلق پر اتمامِ حجت کے پہلو سے ہے۔ یعنی یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ ایک آشکارا حقیقت ہے جو بالکل کھلے اور پھیلے ہوئے اوراق میں بیان ہوئی ہے۔ جو شخص چاہے، اس کو پڑھ سکتا ہے اور اگر پڑھ نہیں سکتا تو اس کو پڑھوا کر سن سکتا ہے۔ بلکہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس کتاب کے حاملین سے مطالبہ کرے کہ وہ اس کو بتائیں اور سنائیں کہ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے کیا بیان فرمایا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اہلِ عرب دینی معاملات میں اہلِ کتاب کی برتری تسلیم کرتے رہے ہیں، چنانچہ جگہ جگہ قرآن نے ان کو توجہ دلائی ہے کہ اگر وہ نہیں جانتے تو اہلِ کتاب سے پوچھ لیں۔ پھر یہ

بات بھی ہے کہ تورات میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کی تاریخ بھی بیان ہوئی ہے اور اہلِ عرب اس بات کے مدعی تھے کہ وہ جس دین پر ہیں وہ ان کو اپنے انہی اجداد سے وراثت میں ملا ہے۔ گویا ان کے لیے یہ ایک لطیف اشارہ ہے کہ وہ اس کتاب سے معلوم کر سکتے ہیں کہ اِن کے اجداد نے ان کو جزاؤ سزا سے ڈرایا ہے یا نہیں۔

وقت کے یہود پر ایک لطیف تعریض

لفظ 'منشور' میں وقت کے یہود پر نہایت لطیف تعریض بھی ہے۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان ہوئی ہے کہ یہود اپنے صحیفوں کی بہت سی باتیں چھپاتے ہیں۔ کتمانِ حق کی یہ بیماری یہود کے اندر ان کے دورِ زوال میں پیدا ہوئی اور اس کے پیدا ہونے کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہ بھی تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان پیشین گوئیوں سے واقف ہوں جو تورات کے صحیفوں میں نبی آخرالزمان (صلی اللہ علیہ وسلم) سے متعلق وارد ہیں اور جن میں ان کو یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ اگر انھوں نے اس نبی کی تکذیب کی تو وہ خدا کے مغضوب اور امامت سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لفظ سے یہود کو تورات کی اصل نوعیت کی یاددہانی فرمائی گئی کہ یہ پھیلے ہوئے، صاف و شفاف اوراق میں تھی کہ لوگ اس کو پڑھیں اور سمجھیں اور اس کے اوراق ہر وقت لوگوں کے سامنے کھلے رہیں، لیکن وہ اپنی بدبختی سے ان کو چھپاتے ہیں۔ یہی حقیقت حضرت مسیحؑ نے یہود کو خطاب کر کے یوں واضح فرمائی ہے کہ 'تم کو چراغ دیا گیا تھا کہ گھر میں اس کو بلند جگہ پر رکھو کہ سارے گھر میں روشنی پھیلے، لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانک کر رکھا ہے'۔

وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ (۴)

'بیتِ معمور' سے مراد

'بیتِ معمور' سے عام طور پر مفسرین نے جنت کے اندر ایک گھر کو مراد لیا ہے جو فرشتوں کے لیے آسمان میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو زمین میں انسانوں کے لیے بیت اللہ الحرام کی ہے۔ لیکن یہ قول، ہمارے نزدیک، یہاں غیر متعلق ہے۔ اس طرح کا کوئی گھر جنت میں ہے تو اس کی شہادت اس دعوے کے حق میں کیا وزن رکھتی ہے جو اس قسم کے بعد پیش کیا گیا ہے؟ ہمارے مفسرین کو چونکہ یہ غلط فہمی ہے کہ قسم جس چیز کی کھائی جائے وہ کوئی مقدس چیز ہونی چاہیے، اس وجہ سے وہ صرف مقسم بہ کے تقدس کو دیکھتے ہیں حالانکہ اصل دیکھنے کی چیز مقسم بہ کا تقدس نہیں بلکہ پیش کردہ دعوے پر اس کی شہادت کا پہلو ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو دعوے کے ساتھ اس کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

بعض لوگوں نے اس سے بیت اللہ کو مراد لیا ہے۔ یہ قول اس پہلو سے تو وزن دار ہے کہ 'بلدِ امین' کی قسم 'وَالتِّیْن' میں جزا اور سزا کے حق ہونے پر کھائی گئی ہے۔ بیت اللہ چونکہ اسی بلدِ امین میں واقع ہے اس وجہ سے اس کی شہادت بھی اپنے اندر ایک معنویت رکھتی ہے لیکن سیاق و سباق اس قول کے خلاف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد 'سقفِ مرفوع' کی قسم کھائی گئی ہے۔ اس 'سقفِ مرفوع' سے بیت اللہ کی چھت ظاہر ہے کہ مراد نہیں ہو سکتی۔ اس سے آسمان ہی مراد ہو سکتا ہے

اور مفسرین نے آسمان ہی کو مراد لیا بھی ہے۔ اگر اس سے آسمان ہی مراد ہے تو بیت اللہ کی قسم کے کے بعد آسمان کی قسم اور اس کے بعد دریا کی قسم یہ کچھ بے جوڑ سی قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ان کے اندر وہ ہم رنگی ہم آہنگی باقی نہیں رہتی جو طور اور کتابِ مسطور والی قسم میں پائی جاتی ہے۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ 'بیتِ معمور' سے مراد یہ زمین ہے جس پر آسمان کی چھت پھیلی ہوئی ہے۔ اس خیال کی تائید میں کئی باتیں پیش کی جا سکتی ہیں، مثلاً

ایک یہ کہ زمین کے لیے بیت کا استعارہ نہایت موزوں ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ اس کو 'مہاد' اور 'قرار' وغیرہ الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ نیز زمین کو فرش اور آسمان کو اس کی چھت سے تمثال دے کر اس کے گھر ہونے کو نہایت خوبصورت طریقہ پر ممثّل بھی کر دیا ہے۔

دوسری یہ کہ اس کے بعد آسمان کا ذکر اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ اس سے زمین ہی مراد لی جائے۔ قرآن میں جہاں جہاں اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے زمین اور آسمان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا ہے۔

تیسری یہ کہ قرآن میں جگہ جگہ اس حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ زمین میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی پرورش کے لیے جو گوناگوں اسباب و وسائل مہیا فرمائے ہیں وہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہیں کہ انسان اس دنیا میں شترِ بے مہار نہیں ہے بلکہ وہ اپنے رب کے آگے جواب دہ ہے۔ لفظ 'معمور' یہاں زمین کے انہی اسباب و وسائل اور اس کے لازمی نتیجہ یعنی مسئولیت اور جواب دہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

چوتھی یہ کہ سابق سورہ ـــــ الذّٰریٰت ـــــ میں فرمایا ہے کہ وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ (۲۰) (اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے) نیز فرمایا ہے کہ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (۲۲) (اور آسمان میں تمہارا رزق بھی ہے اور وہ چیز بھی جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے) ان آیتوں کی تفسیر کرتے ہوئے ہم زمین و آسمان کی ان نشانیوں کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات اور اس کے عذاب پر گواہ ہیں۔ بعینہٖ اسی چیز پر زمین و آسمان کی گواہی یہاں بھی پیش کی گئی ہے، صرف اسلوبِ بیان کا فرق ہے۔

ان مختلف وجوہ سے ہمارے نزدیک اس سے مراد زمین ہے اور لفظ 'معمور' سے اس کا موصوف ہونا خدا کی قدرت، حکمت اور ربوبیت کی ان نشانوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس سے قرآن نے جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور جزا و سزا پر استدلال فرمایا ہے اور جس کی وضاحت اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ (۵)

آسمان کی شہادت

زمین کے بعد یہ آسمان کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ قرآن نے اپنے دعاوی کی تائید میں بالعموم زمین کی نشانیوں کے ساتھ آسمان کی نشانیوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ سورۂ ذاریات کی آیت وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (۲۲) (اور آسمان میں تمھاری روزی بھی ہے اور وہ چیز بھی جس سے تم کو ڈرایا جا رہا ہے) نیز اس میں وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ (۷) (دھاریوں والے آسمان کی قسم بھی ہے۔ اس کے تحت ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے معلوم ہو جائے گا کہ معتوب قوموں کی تباہی میں آسمان اور ابر و ہوا کے تصرفات کو کتنا دخل رہا ہے۔

آسمان کا ذکر قرآن میں موقع و محل کی رعایت سے مختلف صفات کے ساتھ ہوا ہے۔ یہاں اس کو 'سقف مرفوع' سے تعبیر فرمایا ہے۔ لفظ 'سقف' اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، عنایت اور رحمت پر دلیل ہے کہ یہ محض اس کی کرم گستری کا کرشمہ ہے کہ اس نے یہ عظیم شامیانہ ہمارے سروں پر تان رکھا ہے اور لفظ 'مرفوع' اس کی قدرت، عظمت اور کبریائی کو ظاہر کر رہا ہے کہ جو ذات اس عظیم اور ناپیدا کنار چھت کے بلند کر دینے پر قادر رہے کون سا کام ہے جو اس کے دائرۂ قدرت سے باہر ہو سکتا ہے! اللہ تعالیٰ کی صفات کے یہ دونوں پہلو (یعنی اس کی عنایت اور قدرت) جن مختلف اعتبارات سے آخرت اور جزا و سزا پر دلیل ہیں ان کی تفصیل اس کتاب میں ہم برابر کرتے آ رہے ہیں۔

وَالْبَحْرِ الْمَسْجُورِ (۶)

'سجر' کے معنی بھرنے کے ہیں۔ 'سجر الرجل التنور' تنور کو ایندھن سے بھر دیا۔ 'سجر الماء النھر' پانی نے نہر کو لبریز کر دیا۔

سمندر کی شہادت

زمین اور آسمان کی شہادت کے بعد یہ زمین کی ایک سب سے بڑی نشانی سمندر کی قسم کھائی۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی زمین اور آسمان کی نشانیوں کا حوالہ دینے کے بعد سمندر کی نشانیوں کا ذکر آیا ہے، ملاحظہ ہوں سورۂ رحمٰن کی آیات ۱۰-۲۴۔ ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ زمین و آسمان کی نشانیوں میں سے سمندر اپنے اندر خدا کی توحید، اس کی قدرت، اس کی ربوبیت اور اس کی جزاء و سزا کے اتنے شواہد رکھتا ہے کہ انسان ان کو شمار نہیں کر سکتا۔ ان شواہد کی تفصیل اس کتاب میں جگہ جگہ ہم کرتے آ رہے ہیں۔ ان بحثوں کو ان کے محل میں دیکھیے۔ بعض اہم امور سورۂ رحمٰن کی تفسیر میں بھی ان شاء اللہ زیرِ بحث آئیں گے۔ یہاں سورہ کے عمود اور مقسم علیہ کے تعلق سے اتنی بات یاد رکھیے کہ ان قسموں کے بعد جس عذاب سے ڈرایا گیا ہے اس کی تاریخی شہادت قومِ نوح کے واقعہ میں بھی موجود ہے اور قومِ فرعون کے واقعہ میں بھی۔ یہ دونوں قومیں سمندر ہی کے عذاب میں گرفتار ہوئیں جس کی تفصیلات تورات میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّا لَهُ مِن دَافِعٍ (۷-۸)

اصل دعویٰ جو سورہ کا عمود ہے

یہ ہے وہ اصل دعویٰ جو اوپر کی قسموں کے بعد پیش کیا گیا ہے اور یہی اس سورہ کا عمود بھی ہے۔ یہی بات معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، سابق سورہ میں ہواؤں کی قسم کے بعد یوں ارشاد ہوئی ہے: اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ۝ وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ (الذّٰریٰت: ۵-۶) (بے شک جس چیز سے تمھیں ڈرایا جا رہا ہے وہ سچی ہے اور بے شک جزا اور سزا ہو کے رہے گی) بس اتنا فرق ہے کہ اس میں عذاب کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ ہم سابق سورہ میں اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ کی شرح کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے مراد درحقیقت وہ عذاب ہے جس سے اللہ کے رسولوں نے دنیا اور آخرت میں ڈرایا ہے۔ اس سورہ میں گویا وہی بات واضح فرما دی گئی ہے جو سابق سورہ میں مضمر تھی۔ اجمال کے بعد تفصیل اور اضمار کے بعد توضیح قرآن مجید کا معروف اسلوب ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اوپر قسموں کی وضاحت کرتے ہوئے ہم ان شواہد کی طرف اشارہ کر چکے ہیں جو اس دعوے پر دلیل ہیں۔ یہاں ان کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہی کا حوالہ دے کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم قریش کو جس عذاب سے ڈرا رہے ہو اور جس کا وہ مذاق اڑا رہے ہیں وہ واقع ہو کے رہے گا، کوئی اس کو دفع کرنے والا نہ بن سکے گا۔ یعنی نہ تو ان کی اپنی قوت و جمعیت اس کے مقابل میں کچھ کام آئے گی اور نہ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ان کو اس سے چھڑا سکیں گے۔ نہ دنیا میں اس سے کوئی بچا سکے گا اور نہ آخرت میں کوئی سہارا دے سکے گا۔ طُور پر موسیٰ (علیہ السلام) کو جو خبر دی گئی، تورات کے صحیفوں میں جو ریکارڈ میں موجود ہے، یہ زمین جن آثار و شواہد سے معمور ہے، یہ سقفِ نیلگوں جن عجائبِ تصرفاتِ قدرت کی گواہی دے رہی ہے اور یہ سمندر جن آیاتِ الٰہی کے امین ہیں ان کو دیکھو اور ان پر غور کرو، وہ اس وعید کی تصدیق کے لیے کافی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی اور نشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان نشانیوں سے جن لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلیں گی وہ اگر آسمان کا کوئی ٹکڑا اپنے اوپر گرتا ہوا بھی دیکھیں گے تو اس کو بھی عذاب کے بجائے ابرِ باراں سمجھ کر خوشی سے ناچیں گے، یہاں تک کہ وہ ان کو تباہ کر کے رکھ دے گا لیکن وہ ایمان نہیں لائیں گے۔

یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۝ وَّتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا ۝ فَوَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ۝ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ (۹-۱۲)

یومِ عذاب کی تصویر

یہ اس عذاب کی تصویر ہے کہ اس دنیا میں یہ آسمان جو نہایت ہی محکم اور اپنے مقام پر ٹکا ہوا نظر آتا ہے ڈانواں ڈول ہو جائے گا۔ 'مَوْر' کے معنی مضطرب اور متردد ہو کر ادھر ادھر حرکت کرنے کے ہیں۔ یعنی اس کا کوئی ٹکڑا کسی سمت کو جاتا ہوا نظر آئے گا، کوئی کسی جانب کو۔ اسی طرح یہ پہاڑ جو اپنی جگہ گڑے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اکھڑ کر بالکل بگٹٹ چلنے لگیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن جب آسمان اور پہاڑوں کا یہ حال ہو گا تو انسانوں پر کیا گزرے گی؟ اس دن کسی کی قوت و جمعیت

اور کسی کے قلعے اور مورچے کیا کام آنے والے بن سکیں گے! یہاں یہ بات یاد رکھیے کہ جب قریش کے سرکشوں کو قیامت کے دن کسی ہلچل کی خبر دی جاتی تو وہ باندازِ استہزاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرتے کہ اس دن ان پہاڑوں کا کیا بنے گا، کیا یہ بھی ٹوٹ پھوٹ جائیں گے! قرآن نے دوسرے مقام میں انہی لوگوں کے جواب میں فرمایا ہے کہ ان لوگوں کو بتا دو کہ میرا رب ان کو بھی ریزہ ریزہ کر دے گا۔

'فَوَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ'۔ فرمایا کہ اس دن ان لوگوں کے لیے ہلاکی ہی ہلاکی ہے جو اس کو آج جھٹلا رہے ہیں۔ 'الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ'۔ یہ انہی جھٹلانے والوں کی صفت ہے جس سے کلام بالکل مطابقِ حال ہو گیا ہے اور یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آگئی کہ اس سے مراد وہی متمرّدین قریش ہیں جو مختلف قسم کی سخن سازیوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے اور آپ کے انذار کو ہوا میں اڑا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سخن سازیوں کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آیات ۲۹-۴۶ میں آئے گی۔

مخالفین کی خاک بازی

'خوض' کے معنی کسی چیز کے اندر گھسنے کے ہیں۔ 'خَاضَ الماءَ' وہ پانی کے اندر گھس گیا۔ اسی سے 'خَاضَ القومُ فِی الحدیث' کا محاورہ نکلا جس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ بات سے بات پیدا کرتے ہوئے کہیں سے کہیں جا نکلے۔ عام طور پر یہ محاورہ کسی باطل کی حمایت اور حق کی مخالفت میں سخن سازی اور دلیل بازی کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں یہ اسی معنی میں جگہ جگہ آیا ہے۔ مثلاً 'وَخُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْا' (التوبۃ: ۶۹) (اور تم نے بھی اسی طرح کی دلیل بازیاں کیں جس طرح کی دلیل بازیاں انھوں نے کیں)۔ 'فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ' (الزخرف: ۸۳) (پس ان کو چھوڑو وہ دلیل بازیاں اور سخن سازیاں کرتے رہیں، یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے)۔

کسی بات کو حق سمجھتے ہوئے اس کی مخالفت میں دلیلیں گھڑنے کی کوشش کرنا اپنی اور اپنے پیروؤں کی عقل کے ساتھ ایک قسم کی دل لگی ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو 'لعب' سے تعبیر فرمایا ہے۔ خاک بازی کا یہ کھیل یوں تو ہر حال میں نہایت خطرناک ہے لیکن اس صورت میں آخری حد تک خطرناک ہو جاتا ہے جب اس کے نتیجے میں ایک ابدی خسران سے سابقہ پیش آنے والا ہو۔

اس 'خوض' کی پوری تفصیل آگے آ رہی ہے۔ اس سے اشارہ مخالفین کی اس طرح کی باتوں کی طرف ہے جو وہ اپنے ضمیر کے خلاف محض اس لیے کہتے کہ کسی طرح اس اثر کو مٹائیں جو قرآن کی دعوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے لوگوں کے دلوں پر پڑ رہا تھا۔ مثلاً یہ کہ کوئی آپ کو کاہن کہتا، کوئی شاعر، کوئی آپ کو مفتری قرار دیتا اور کوئی شیخی باز۔ اسی طرح بعض یہ دعویٰ بھی کرتے کہ جس طرح کا کلام یہ پیش کر رہے ہیں اس طرح کا کلام ہم بھی پیش کر سکتے ہیں۔ غرض آپ کو زچ کرنے کے لیے جس کو جو بات

بھی سوجھ پاتی وہ بے دھڑک کہہ گزرتا۔ حق کی مخالفت میں یہ نکتہ آفرینیاں ان کے لیے محض دل لگی تھی۔ یہ سوچنے کی توفیق کسی کو نہ ہوتی کہ اس دل لگی سے اپنے اور اپنی قوم کے لیے وہ ابدی جہنم کا سامان کر رہے ہیں۔

یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ؕ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ (۱۳-۱۴)

آخرت کا مذاق اڑانے والوں کا انجام

اس دن ان دل لگی بازوں پر جو آفتیں نازل ہوں گی، یہ ان کی تفصیل ہے۔ 'دَعٌّ' کے معنی پوری شدت و نفرت کے ساتھ دھکا دینے کے ہیں اور اس کے بعد 'دَعًّا' اس کی مزید تاکید کے لیے ہے۔ یعنی آج یہ دل لگی میں مصروف ہیں لیکن اس دن یہ جہنم کی طرف دھکے دے دے کر ہانکے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ ہے وہ دوزخ جس کا دنیا میں تم مذاق اڑاتے اور جس کو جھٹلاتے تھے۔

اَفَسِحْرٌ هٰذَاۤ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ (۱۵)

یعنی دنیا میں جب اللہ کا رسول تم کو اس سے ڈرا رہا تھا تو تم اپنے آپ کو اور اپنے عوام کو اس سے بےخوف رکھنے کے لیے قرآن کے انذار کو الفاظ کی جادوگری قرار دیتے تھے۔ اب بتاؤ، یہ الفاظ کی جادوگری ہے یا ایک حقیقت ہے لیکن جس طرح تم دنیا میں اس سے اندھے بنے رہے اسی طرح اب بھی تمھیں یہ دکھائی نہیں دے رہی ہے!

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْۤا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَیْكُمْ ؕ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۶)

حکم ہوگا کہ جاؤ اس میں پڑو، تمھارے لیے اب کوئی مفر نہیں۔ خواہ صبر کرو یا رؤو چلاؤ، دونوں تمھارے لیے یکساں ہے، نہ صبر کی داد ملنی ہے اور نہ آہ و فریاد کی شنوائی ہونی ہے۔ 'اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ'، یہ جو کچھ تمھارے سامنے آیا ہے تمھارے اپنے ہی اعمال ہیں۔ اگر تمھارے ساتھ کوئی ناانصافی ہوئی ہوتی اور تم فریاد کرتے تو شنوائی اور فریادرسی کی توقع کر سکتے تھے لیکن جب تمھاری اپنی ہی کمائی تمھارے سامنے آ رہی ہے تو فریاد کس کے خلاف کرو گے اور شنوائی کی توقع کس سے کرو گے!

'اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ' سے مراد یہ نہیں ہے کہ بعینہٖ وہ اعمال ان کے سامنے آئیں گے جو انھوں نے دنیا میں کیے ہوں گے بلکہ مراد ان اعمال کی حقیقتیں ہیں۔ دنیا میں انسان جو عمل بھی کرتا ہے، خواہ نیکی کا عمل ہو یا بدی کا، وہ اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک خاص شکل اختیار کرتا ہے اور اسی شکل میں وہ عمل کرنے والے کے سامنے آئے گا۔ اگرچہ اس کی شکل اس سے مختلف ہوگی جس شکل میں وہ اس دنیا میں انجام پایا لیکن چونکہ وہ اسی کی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہوگا اس وجہ سے فرمایا کہ تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو تم دنیا میں کر کے آئے ہو۔

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَعِیْمٍ (۱۷)

متقین کا صلہ

'مکذبین' کے انجام کی سنگینی کو واضح تر کرنے کے لیے ان کے مقابل میں 'متقین' کا صلہ و انعام بھی بیان فرما دیا۔ تقابل کا اصول دلیل ہے کہ 'متقین' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑانے کی جگہ اس کی باتیں گوشِ دل سے سنیں، ان پر غور کیا اور ان کو حرزِ جاں بنایا۔ فرمایا کہ یہ لوگ بے شک باغوں اور نعمتوں میں ہوں گے۔

فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ (۱۸)

یہ ان باغوں اور نعمتوں سے ان کو بہرہ مند اور محظوظ ہونے کی تفصیل آ رہی ہے۔ فرمایا کہ ان کے رب نے ان کو جو کچھ بخش رکھا ہوگا اس سے وہ پوری آزادی کے ساتھ محظوظ ہو رہے ہوں گے۔ 'بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ' میں جو ابہام ہے وہ تفخیمِ شان پر دلیل ہے کہ آج کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ان کا رب ان کو کیا کچھ بخش دے گا۔ ان کی حقیقت اس دن کھلے گی جس دن یہ عطا ہوں گی اور انھیں پر کھلیں گی جن کو عطا ہوں گی۔

'وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ' کا عطف میرے نزدیک 'بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ' پر ہے۔ یعنی وہ اپنے رب کی بخشی ہوئی بے پایاں نعمتوں سے محظوظ اور خاص طور پر اس کے اس فضل پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ اس نے ان کو اپنی توفیق بخشی سے دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھا۔ لفظ 'فٰكِهِيْنَ' میں مسرت و ممنونیت کا مضمون خود مضمر ہے اس وجہ سے اس مفہوم کے لیے کوئی الگ لفظ لانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جس دوزخ کو اس کے مکذبین آج اپنے مذاق کا موضوع بنائے ہوئے ہیں اہلِ جنت قیامت کے دن اس سے نجات پانے کو اپنے رب کا سب سے بڑا فضل و احسان سمجھیں گے اور اس پر ان کا رواں رواں شکرگزار ہو رہا ہوگا۔ یہ مضمون آگے اسی سورہ میں یوں آیا ہے: 'قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ٥ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ' (۲۶-۲۷) (وہ کہیں گے ہم پہلے اپنے اہل و عیال میں بڑے چوکنے رہے ہیں تو اللہ نے ہم پر احسان فرمایا اور ہم کو عذابِ سموم سے محفوظ رکھا)۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱۹)

یعنی ان لوگوں کو ربِّ کریم کی طرف سے بشارت دی جائے گی کہ اب اپنے اعمال کے صلے میں بے خل و غش کھاؤ پیو۔ نہ اس سے کوئی ضرر لاحق ہوگا، نہ اس میں کمی واقع ہوگی اور نہ اس کے لیے تمھیں دکھ جھیلنا پڑے گا۔

'هَنِيْٓـًٔا' فعیل کے وزن پر صفت ہے۔ اس کے معنی ہیں راس آنے والی چیز۔ یہاں یہ درحقیقت مصدرِ محذوف کی صفت واقع ہے۔ پورا جملہ یوں ہے: 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا اَكْلًا وَّشُرْبًا هَنِيْٓـًٔا'۔ بعض لوگوں نے اس کو حال کے مفہوم میں لیا ہے لیکن یہ رائے عربیت کے خلاف ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰي سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ (۲۰)

'مُتَّكِـِٕيْنَ' دراصل 'فٰكِهِيْنَ' کی وضاحت، اور بیچ کا جملہ 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا ... الآیۃ' بطور جملہ معترضہ آ گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہوں گے صف بہ صف تختوں پر بیٹھے ہوئے۔ صف بہ صف ہونا ان کی نشست گاہوں کے کمال درجہ آراستہ ہونے کی بھی تعبیر ہے اور اس میں یہ اشارہ بھی ہے کہ ان میں باہم کامل محبت اور بے تکلفی ہوگی اس وجہ سے رُو در رُو ہو کر بیٹھیں گے۔ بعض جگہ یہ مفہوم 'مُتَقٰبِلِيْنَ' کے لفظ سے بھی ادا کیا گیا ہے۔

'وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ'۔ انسان کا کوئی لطف و سرور بھی بیوی بچوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں یہ نعمت بھی اہلِ ایمان کے لیے مہیا فرمائے گا۔ اس کی تعبیر کے لیے الفاظ وہ استعمال فرمائے ہیں جن سے ہم اس کا فی الجملہ تصور کر سکیں۔ رہی اس کی اصل حقیقت تو اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ یہ آخرت ہی میں واضح ہوگی۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِیٍٔۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ (۲۱)

اہلِ ایمان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ایک بشارت

جنت میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی مسرت کی تکمیل کے لیے جو اہتمام فرمائے گا اسی سلسلہ میں یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ ان کی اولاد میں سے جس نے ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کی ہوگی اللہ تعالیٰ ان کو بھی ان کے ساتھ ملا دے گا اگرچہ وہ ایمان و عمل کے اعتبار سے ان کے درجے کے مستحق نہ ہوں۔ اس یکجائی کے لیے ضابطہ یہ بیان فرمایا کہ 'وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ' اولاد کے ایمان کے کسر کا جبر ان کے والدین کے عمل میں کمی کر کے نہیں کیا جائے گا۔ وہ اپنے اسی مرتبہ پر سرفراز رہیں گے جس کے وہ اپنے ایمان و عمل کے اعتبار سے مستحق قرار پائے ہوں گے بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضلِ خاص سے ان کی اولاد کے درجے کو اونچا کر دے گا۔

'وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ' میں لفظ ایمان کی قید سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ رعایت صرف اسی اولاد کے لیے خاص ہے جس نے ایمان کے ساتھ اپنے بزرگ کی اتباع کی ہو، اگر وہ ایمان سے محروم ہو تو اس رعایت کی مستحق نہیں ہوگی اگرچہ وہ ان کے اتباع کی کتنی ہی بلند آہنگی کے ساتھ مدعی ہو۔

لفظ 'ایمان' کی تنکیر سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اس کے مدارج ہیں۔ اگر اولاد کو ایمان کا وہ ادنیٰ درجہ بھی حاصل ہوا جو اس کو جنت کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کا بھی مستحق ٹھہراتا ہے تو وہ اس رعایت کی مستحق قرار پائے گی۔

نجات سے متعلق اصل ضابطہ

'كُلُّ امْرِیٍٔۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ'۔ یہ نجات سے متعلق اللہ تعالیٰ نے اصل ضابطہ بیان فرما دیا ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے عوض گرو ہے۔ عمل ہی چھڑائے گا، عمل ہی ہلاک کرے گا۔ یہ نہیں ہوگا کہ ایمان و عمل کے بغیر محض نیکوں سے ظاہری نسبت رکھنے کے سبب سے کوئی جنت میں ان کے پاس پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ اپنا فضل انہی پر فرمائے گا جو اپنے ایمان و عمل سے اس کا استحقاق پیدا کریں گے۔ اس میں یہود اور

مشرکین عرب، دونوں کو تنبیہ ہے کہ انھوں نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کے دین کو تو بالکل مسخ کر کے رکھ دیا لیکن محض ان سے نسبی رشتہ کے بل پر جنت کے اعلیٰ مقامات پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں ممکن ہے کسی کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ جب نجات کے باب میں اصل ضابطہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عمل کے عوض میں گرو ہے تو اولاد کا اپنے سے برتر درجے کے بزرگوں کی صف میں جا پہنچنا کس بنیاد پر ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے تعلق رکھنے والا ہے جو اس نے اپنے باایمان بندوں کے لیے خاص رکھا ہے۔ اس سے اس ضابطہ کی نفی نہیں ہوتی جو کُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا کَسَبَ رَہِیْنٌ کے الفاظ سے بیان ہوا ہے۔ نجات تو بے شک کسی کو ایمان و عمل کے بغیر حاصل ہونے والی نہیں ہے لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں کے مراتب و مدارج میں اپنے فضل سے اضافہ بھی نہیں فرمائے گا۔ ان دونوں چیزوں کے دائرے الگ الگ ہیں۔ ان میں باہمدگر کوئی تناقض نہیں ہے۔

ایک اور استنباط

اس آیت سے یہ بات بھی مستنبط ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس طرح والدین کی خوشی کی تکمیل کے لیے ان کی اولاد کو ان کے ساتھ جمع کر دے گا اگرچہ اولاد اپنے ایمان و عمل کے اعتبار سے ان کے مرتبہ کی سزاوار نہ ہو۔ اسی طرح بلند مرتبہ اولاد کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کے ساتھ ان کے باایمان والدین کو بھی جمع کر دے گا اگرچہ والدین اپنے ایمان و عمل کے لحاظ سے ان کے درجے کے حق دار نہ ہوں۔ اس استنباط کی دلیل یہ ہے کہ جو تعلقِ خاطر والدین اور ان کی اولاد کے درمیان پایا جاتا ہے وہی تعلقِ خاطر اس دوسری صورت میں بھی موجود ہے۔

اس بشارت کا موقع و محل

یہاں اس بشارت کا موقع و محل بھی قابلِ توجہ ہے۔ اگر کسی شخص کے اندر سچا ایمان ہے تو وہ اپنی اولاد سے متعلق سب سے زیادہ فکرمند اس بات کے لیے ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے ہول اور جہنم کے عذاب سے محفوظ رکھے۔ یہ ارمان کہ اولاد کو دنیوی کامیابیاں حاصل ہوں اگر ہوتا بھی ہے تو اس کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضراتِ انبیاء اور صالحین نے اپنی اولاد کے لیے جو دعائیں فرمائی ہیں ان میں آخرت کی کامیابی کو مقدم رکھا ہے بلکہ اسی چیز کو اصل کی حیثیت دی ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا تھا جو اس دور میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے قلوب جب نورِ ایمان سے منور ہوئے تو ان کو رب سے زیادہ تشویش اپنی اولاد کے دنیوی مستقبل سے متعلق نہیں بلکہ اس کے اخروی انجام سے متعلق ہوئی۔ ان کی اس تشویش کا اظہار آگے اسی سورہ کی آیت ۲۶ اِنَّا کُنَّا قَبْلُ فِیْٓ اَہْلِنَا مُشْفِقِیْنَ (بے شک ہم اس سے پہلے اپنے اہل و عیال کے اندر بہت ڈرتے اور خبردار رہے ہیں) سے ہوتا ہے۔ اس آیت کے تحت ہم ان شاء اللہ واضح کریں گے کہ اس میں جس ڈر یا تشویش کا حوالہ ہے اس سے مراد ان کا یہ اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس گلّے کا چرواہا بنایا ہے اس کی کوئی بھیڑ بھیڑیے کا لقمہ نہ بنے بلکہ

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو جاہلیت کی تاریکی سے نکال کر صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی ہے اسی طرح ان کی اولاد کو بھی ایمان کی توفیق نصیب ہو تاکہ ان کو جہنم کے ہول سے دوچار نہ ہونا پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے انہی باایمان بندوں کی تسلی کے لیے یہ بشارت دی کہ اگرچہ یہ ضابطہ تو بالکل اٹل ہے کہ کسی شخص کو نجات ایمان و عمل کے بدون حاصل نہیں ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ اپنے باایمان بندوں پر یہ فضل ضرور فرمائے گا کہ اگر ان کی اولاد نے ان کی پیروی کی تو، گو ایمان کے اعتبار سے اس کا درجہ فروتر ہو لیکن اللہ تعالیٰ اولاد کو ان کے ساتھ جمع کر دے گا اور اس یکجائی کے لیے ان کے درجے کو نیچا نہیں کرے گا بلکہ اولاد کے درجے کو اونچا کر دے گا۔

اولاد کی اصلاح کے لیے فکرمند رہنے کی تعلیم

یہ اس بات کی تعلیم ہے کہ ہر شخص اپنی اولاد اور اپنے متعلقین کو ایمان کی راہ دکھانے کی کوشش، جس حد تک اس کے امکان میں ہو، ضرور کرے۔ ایمان کے بغیر کسی شخص کو بھی نجات حاصل نہیں ہوگی اگرچہ وہ کسی نبی اور رسول کی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی کی اولاد نے اگر ایمان کی راہ اختیار کر لی تو گو اس کا ایمان ادنیٰ درجے کا ہی ہو لیکن اس کو اپنے رفیع المنزلت بزرگوں کی معیت جنت میں ضرور حاصل ہو جائے گی۔

وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ (۲۲)

یعنی جس طرح ہم ان کی اولاد کو یکجا کر دیں گے اسی طرح ان کے لیے مطلوب فواکہ اور ان کے مرغوب گوشت میں بھی اضافہ کر دیں گے۔ لفظ 'اَمْدَدْنَا' اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تعداد کے اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے رزق و فضل میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔

'فَاكِهَة' اور 'لَحْم' کے دونوں لفظوں کے اندر تمام غذائی نعمتیں جمع ہو گئی ہیں، خواہ وہ تفکہات کی نوعیت کی ہوں یا غذا کی۔

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ (۲۳)

جنت کا لطف و سرور

یہ اس لطف و سرور کا بیان ہے جس سے وہ جنت میں بہرہ مند ہوں گے۔ فرمایا کہ ان کے درمیان جامِ شراب کے تبادلے ہو رہے ہوں گے۔ 'تَنَازَعُوا الْكَاسَ' کے معنی ہیں 'تعاطوہا' یعنی وہ آپس میں ایک دوسرے کی طرف شراب کے جام بڑھائیں گے۔ چھین جھپٹ اس لفظ کے لوازم میں سے نہیں ہے۔ لفظ 'کَاْس' ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جامِ شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔

'لَا لَغْوٌ فِيْهَا وَلَا تَاْثِيْمٌ'۔ یعنی یہ شراب ان برے اثرات سے بالکل پاک ہوگی جو دنیا کی شراب کے لوازم میں سے ہے۔ اس شراب سے آدمی نہ تو کسی لغوگوئی میں مبتلا ہوگا اور نہ کسی پر گناہ کی تہمت لگائے گا۔ 'اَثَمَه تاثیما' کے معنی ہیں اس نے اس کو گناہ کی تہمت لگائی۔ اس دنیا کی شراب کے مفاسد میں سے یہ بھی ہے کہ اس بدمستی میں آدمی اپنے حریفوں اور ان کی بہوؤں بیٹیوں پر ہر قسم کی تہمتیں جڑ دیتا ہے جس سے زمانۂ جاہلیت

میں بڑے بڑے خاندانی فتنے اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ قرآن نے دوسرے مقام میں اسی فتنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اس کے ذریعہ سے شیطان تمہارے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکانا چاہتا ہے۔ اس کے برعکس جنت کی شراب اہلِ جنت کے درمیان الفت و محبت کی عطر بیزی کرے گی۔ چنانچہ سورۂ واقعہ میں فرمایا ہے: لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ۝ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا (۲۵-۲۶) (اس میں کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ صرف سلام اور جوابِ سلام کا چرچا ہو گا)

وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَأَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ (۲۴)

یعنی ان کی خدمت اور ان کی فرمائشوں کی تعمیل کے لیے ہر وقت ایسے چھوکرے ان کے سامنے حاضر رہیں گے جو اپنی پاکیزگی اور اپنے حسن و جمال کے اعتبار سے معلوم ہوگا کہ موتی ہیں جو صدف میں محفوظ رہے ہیں اور ان کی خدمت ہی کے لیے ان سے نکلے ہیں۔ اہلِ عرب کسی چیز کی غایت درجہ نفاست و نزاکت کی تعبیر کے لیے لُؤْلُؤٌ مَّكْنُونٌ کی تشبیہ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کے اندازِ بیان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان چھوکروں کو خاص اسی مقصد کے لیے پیدا کرے گا۔ بعض لوگوں کی رائے اس کے خلاف بھی ہے لیکن ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے اس وجہ سے اس پر تنقید کی ضرورت نہیں ہے۔

وَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ يَتَسَاءَلُونَ (۲۵)

اہلِ جنت کا ایک دوسرے سے دریافتِ حال

جنت میں مجتمع ہو جانے کے بعد، جس طرح ایک دراز اور کٹھن سفر کے مسافر منزل پر پہنچ کر ایک دوسرے سے دریافتِ حال کرتے ہیں اسی طرح اہلِ جنت تڑپ کر ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے اور پوچھیں گے کہ کہیے کیسے گزری، راہ میں کیسی گھاٹیوں سے گزرنا پڑا، منزل تک کس طرح پہنچنا ہوا اور یہ اہل و عیال کی یکجائی کیسے نصیب ہوئی۔

قَالُوا إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ (۲۶)

جواب دینے والے جواب دیں گے کہ ہم اس سے پہلے دنیا میں اپنے اہل و عیال کے اندر ڈرنے والے رہے ہیں۔ اپنی عاقبت کے ساتھ برابر ان کی عاقبت کی بھی ہمیں فکر رہی ہے۔ ہم اس غرور میں کبھی مبتلا نہیں ہوئے کہ ہمارا بڑا خاندان اور بڑا کنبہ و قبیلہ ہے اور اس دنیا میں ہمیں جو کچھ حاصل ہے یہ ہمارا پیدائشی اور خاندانی حق ہے، اس کو کوئی ہم سے چھین نہیں سکتا۔ ہم نے آخرت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا اور اپنے رب سے برابر یہ دعا کی کہ قیامت کے دن وہ ہمیں صالحین کے سربراہ کی حیثیت سے اٹھائے، فسّاق کے پیشوا کی حیثیت سے نہ اٹھائے۔ ہم نے اپنی اولاد کو ہمیشہ نماز، زکوٰۃ اور خدا سے ڈرتے رہنے کی تاکید اور دینِ حق پر جینے اور اسی پر مرنے کی وصیت کی۔

فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُومِ (۲۷)

ہمارے اس خوف و اندیشہ کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر احسان فرمایا کہ ہم کو اور ہماری اولاد کو اس

بہشت میں یکجا کر دیا اور آتشِ دوزخ کی ہوائے گرم سے اس نے ہمیں محفوظ رکھا۔ 'سموم' ہوائے گرم اور آگ کی آنچ کو کہتے ہیں۔ یہ اسلوبِ بیان اللہ تعالیٰ کے غایت درجہ لطف و احسان کی تعبیر کے لیے وہ اختیار فرمائیں گے۔ مطلب یہ کہ دوزخ اور آتشِ دوزخ تو درکنار اللہ تعالیٰ نے اس کی ہوائے گرم سے بھی ہمیں محفوظ رکھا۔

إِنَّا كُنَّا مِن قَبْلُ نَدْعُوهُ ۖ إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ (۲۸)

اس جملہ کا تعلق اوپر والے جملہ 'إِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِي أَهْلِنَا مُشْفِقِينَ' سے ہے۔ یعنی ایک تو یہ کہ ہم اپنے اہل و عیال کے اندر ڈرنے والے رہے ہیں، دوسرے یہ کہ ہم خوف اور طمع، امید اور بیم ہر حال میں خدا ہی کو پکارنے والے رہے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کی کبھی ہم نے نہ دہائی دی اور نہ کسی کو اس کا شریک و سہیم جانا۔ اس جملہ کو اصلاً آنا تو اوپر والے جملہ ہی کے ساتھ تھا لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و احسان کی مبادرت ظاہر کرنے کے لیے 'فَمَنَّ اللَّهُ عَلَيْنَا ...... الآية' کو اس پر مقدم کر دیا اور اس کو مؤخر کر دیا۔ اس تاخیر میں یہ بلاغت ہے کہ انسان کی نجات میں اصل عامل کی حیثیت عقیدۂ توحید کو حاصل ہے۔ جس نے اس کی حفاظت کی وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا مستحق ٹھہرا اور جس نے اس میں خرابی پیدا کی اس نے اپنی عاقبت برباد کی۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس عقیدے میں مستحکم رہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ احسان فرمایا۔

انسان کی نجات میں اصل عامل کی حیثیت عقیدۂ توحید کی ہے

'إِنَّهُ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيمُ'۔ یہ فقرہ غایت درجہ ممنونیت کے اظہار کے طور پر وہ فرمائیں گے کہ وہ بڑا ہی باوفا اور بڑا ہی مہربان ہے کہ اس نے نہ صرف وہ تمام وعدے پورے کیے جو اپنے بندوں سے کیے، بلکہ ان کو اپنے کرمِ مزید سے بھی نوازا۔ لفظ 'بَرّ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ جب یہ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر آتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بندوں سے جو وعدے کیے ہیں وہ سب کو پورا کرنے والا ہے، صدق اور وفا اس لفظ کی اصل روح ہے۔ اس کے ساتھ 'رحیم' کا اضافہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ وہ صرف وعدے ہی پورے کرنے والا نہیں، بلکہ بندوں کی کوتاہیوں سے درگزر کر کے ان کو اپنے مزید افضال سے نوازنے والا بھی ہے۔

۲۔ آگے آیات ۲۹-۴۹ کا مضمون

آگے کی آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے کہ تم ان لوگوں کی یاوہ گوئیوں کی پروا کیے بغیر اسی قرآن کے ذریعہ سے تذکیر کرتے رہو۔ جو لوگ تمہاری تکذیب پر اڑے رہیں گے وہ خود اپنی شامت بلائیں گے۔ اسی ذیل میں مخالفین کی ان باتوں کے مسکت جواب بھی دیے ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں وہ کہتے تھے اور جن کی طرف اوپر لفظ 'خوض' سے اشارہ فرمایا ہے۔ ان کی اس ساری سخن سازی کو قرآن نے محض ایک چال قرار دیا ہے اور یہ اطمینان دلایا ہے کہ اس چال سے وہ دعوتِ حق کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے بلکہ یہ انہی کے خلاف پڑے گی۔ آخر میں آپ کو تسلی دی ہے کہ ان کو کوئی بڑے سے بڑا معجزہ

بھی قائل کرنے والا نہیں بنے گا، یہ اسی دن قائل ہوں گے جس دن قیامت ان کے سر پر آ کھڑی ہوگی اور ہر پہلو سے ان کی بے بسی ان پر واضح ہو جائے گی تو تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس صبر کے حصول کے لیے زیادہ سے زیادہ اپنے رب کی تسبیح کا اہتمام کرو ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۹-۴۹

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ
شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ
مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾ اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ
قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ فَلْيَاْتُوْا
بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۳۴﴾ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ
شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ بَلْ
لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿۳۶﴾ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿۳۷﴾
اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۳۸﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۳۹﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا
فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۰﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۱﴾
اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا ۚ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿۴۲﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ
غَيْرُ اللّٰهِ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۴۳﴾ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ
سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿۴۴﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ
الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿۴۵﴾ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا
وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ
وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ﴿۴۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ﴿۴۹﴾ ع ۲

ترجمۂ آیات ۲۹ - ۴۹

پس تم یاد دہانی کرتے رہو، اپنے رب کے فضل سے نہ تم کوئی کاہن ہو اور نہ کوئی دیوانے۔ کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے جس کے لیے ہم گردشِ روزگار کے منتظر ہیں! ان سے کہہ دو کہ تم انتظار میں رہو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں کیا ان کی عقلیں یہی باتیں ان کو سجھاتی ہیں یا یہ ہیں ہی سرکش لوگ! کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے خود ہی گھڑا ہے! بلکہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے۔ پس یہ اس کے مانند کوئی کلام لائیں، اگر یہ سچے ہیں۔ ۲۹ - ۳۴

کیا یہ بغیر کسی خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا یہ خود ہی خالق ہیں! کیا انھی نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے، بلکہ وہ یقین نہیں رکھتے۔ ۳۵ - ۳۶

کیا انھی کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں یا وہ ان پر داروغہ مقرر ہیں! کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس پر چڑھ کر وہ آسمان کی باتیں سن لیتے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل پیش کرے۔ کیا اس کے لیے بیٹیاں ہیں اور تمھارے لیے بیٹے! ۳۷ - ۳۹

کیا تم ان سے کسی عوض کے طالب ہو کہ وہ اس تاوان کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں! کیا ان کے پاس علمِ غیب ہے، پس وہ خود ہی لکھ لیتے ہیں۔ کیا وہ کوئی چال چلنی چاہتے ہیں تو یاد رکھیں کہ جنھوں نے کفر کیا وہی اس چال میں گرفتار ہوں گے۔ کیا اللہ کے سوا اور کوئی معبود بھی ان کے لیے ہے؟ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک گردانتے ہیں۔ ۴۰ - ۴۳

اور اگر یہ آسمان سے کوئی ٹکڑا بھی گرتا ہوا دیکھیں گے تو کہیں گے یہ تو تہ بہ تہ بادل ہے! تو ان کو چھوڑو، یہاں تک کہ یہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس دن ان کے ہوش جاتے رہیں گے۔ جس دن نہ ان کی چال ان کے کچھ کام آئے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی ہو گی۔ ۴۴-۴۶

اور ان ظالموں کے لیے اس کے سوا بھی عذاب ہے لیکن ان کی اکثریت اس کو نہیں جانتی۔ اور تم صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ بے شک تم ہماری آنکھوں میں ہو۔ اور اپنے رب کی تسبیح کرو، اس کی حمد کے ساتھ، جس وقت تم اٹھتے ہو۔ اور شب میں بھی اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کے پیچھے ہٹنے کے وقت بھی۔ ۴۷-۴۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ (۲۹)

آنحضرتؐ کو تسلی

'ف' کے ذریعہ سے عطف دلیل ہے کہ یہ بات جو فرمائی جارہی ہے متفرع ہے انہی باتوں پر جو اوپر گزر چکی ہیں۔ اوپر آپ نے دیکھا کہ قرآن کے انذارِ عذاب کی صداقت ثابت فرمائی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو باندازِ تسلی خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ تم جو یاددہانی کر رہے ہو وہ کرتے رہو، مخالفین کے طعنوں اور کچوکوں کی پروانہ کرو۔ اگر یہ تمہیں کاہن یا خبطی کہتے ہیں تو انھیں بکواس کرنے دو۔ تم اپنے رب کے فضل سے نہ کوئی کاہن ہو نہ کوئی دیوانے۔

'بِنِعْمَتِ رَبِّكَ' کے الفاظ یہاں دلیل کے محل میں ہیں۔ یعنی تم پر تمھارے رب کا جو فضل و انعام ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے کہ آنکھیں اور عقل رکھنے والوں سے وہ مخفی رہ سکے۔ تمھاری زبانِ فیض ترجمان سے اللہ تعالیٰ نے جو چشمۂ حکمت و معرفت جاری کر رکھا ہے اس کو کاہنوں کی خرافات سے کیا تعلق! تم جس کردار کے حامل ہو، کس کاہن کے اندر اس کا کوئی ادنیٰ پر تو بھی پایا گیا ہے؟ تم راستبازی اور حق گوئی کے مظہر کامل ہو، اور کاہن دروغ گو اور لپاٹیے ہوتے ہیں۔ تم روح القدس سے فیض پاتے ہو اور کاہن شیاطین سے الہام حاصل کرنے کے لیے کان لگاتے ہیں اور اس میں بھی وہ بالکل جھوٹی نمائش کرتے ہیں۔

اس طرح تم کو جو دیوانہ کہتے ہیں وہ خود دیوانے ہیں۔ آخر تم سے بڑا فرزانہ، ذی ہوش، دانش مند اور حکیم انھوں نے کس کو پایا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر مخالفین کا یہ اتہام ان کے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف تھا اس وجہ سے اس کی تردید میں زیادہ دلیلیں دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی لغویت خود اتہام لگانے والوں پر واضح تھی۔ وہ محض عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے اس طرح کی باتیں کہتے تھے۔ سورۂ شعراء کی تفسیر میں ہم نے اس کے تمام ضروری پہلو واضح کر دیے ہیں۔ ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔

أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمَنُونِ ۝ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُتَرَبِّصِينَ (۳۰-۳۱)

مخالفین کے ایک الزام کا جواب

یہ ان کے دوسرے الزام کا حوالہ ہے۔ فرمایا کہ کیا یہ لوگ تمھیں شاعر کہتے ہیں اور یہ توقع رکھتے ہیں کہ جس طرح دوسرے بہت سے شاعر اپنی اپنی بولیاں بول کر اڑ گئے اسی طرح گردشِ روزگار ایک دن تمھیں بھی فنا کر دے گی۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس انتظار میں ہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم لوگ انتظار کرو، میں بھی انتظار میں ہوں کہ میں جو وعید تم کو سنا رہا ہوں وہ پوری ہوتی ہے یا تم جو خواب دیکھ رہے ہو وہ سچا ہوتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین آپ کو جو شاعر کہتے تھے تو اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں، یہ نہیں تھی کہ وہ فی الواقع آپ کو کوئی شاعر سمجھتے تھے، بلکہ اس الزام سے وہ اس اثر کو مٹانا چاہتے تھے جو قرآن کے زورِ بیان اور اس کی بلاغت و جزالت سے لوگوں کے دلوں پر پڑتا تھا اور جس کے سبب سے اس کے کلامِ الٰہی ہونے کی ہیبت لوگوں پر بیٹھتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے پیروؤں کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ قرآن میں جو زور ہے یہ اسی طرح کا ہے جس طرح کا زور ہمارے بعض بڑے شاعروں کے کلام میں ہے اس وجہ سے اس کو وحی والہام کا درجہ دے کر نہ تو کسی عذاب کے اندیشہ میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہے اور نہ اپنے دینِ آبائی سے مایوس ہونے کی۔ جس طرح ہمارے شاعروں کے کلام کی ان کے دور میں بڑی دھوم رہی ہے، لیکن پھر نہ وہ باقی رہے اور نہ ان کی شاعری، اسی طرح چند دن اس شخص کی فصاحت و بلاغت کا تماشا بھی دیکھ لو۔ بالآخر اس کو بھی گردشِ روزگار مٹا کے رکھ دے گی۔

'قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُتَرَبِّصِينَ'۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اس انتظار میں ہیں تو ان کو بتا دو کہ تم لوگ بھی انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں کہ تمھاری یہ طمعِ خام پوری ہوتی ہے یا میرے رب نے تم کو جس چیز سے ڈرایا ہے وہ ظاہر ہو کے رہتی ہے۔

'الْمَنُونُ' کے معنی الدھر یعنی زمانہ کے ہیں۔ محاورہ ہے: 'دار علیھم المنون' وہ گردشِ روزگار کی نذر ہو گئے۔ 'رَيْبَ الْمَنُونِ' کے معنی ہیں حوادثِ روزگار۔

مخالفین کے اس الزام کی مفصل تردید قرآن نے سورۂ شعراء میں کی ہے۔ وہاں چند نہایت واضح

کسوٹیاں بھی قرآن نے لوگوں کے سامنے رکھ دی ہیں جن پر ہر عاقل پرکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کو شعر اور شاعری سے دور یا قریب کا کوئی واسطہ ہے یا نہیں ۔ ہم نے بھی اس کے ہر پہلو پر وہاں تفصیل سے گفتگو کی ہے ۔

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۳۲)

تکذیب کی اصل سبب ان کی سرکشی ہے

یعنی معاملہ دو شکلوں سے خالی نہیں یا تو فی الواقع ان کی عقلیں یہی کچھ ان کو سجھا رہی ہیں کہ تم اللہ کے رسول نہیں بلکہ ایک کاہن، مجنون اور شاعر ہو یا یہ بات ہے کہ یہ لوگ اپنی سرکشی کے باعث تمھاری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں اس وجہ سے تکذیب کے بہانے ڈھونڈھ رہے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ پہلی بات کا امکان تو بہت بعید ہے ۔ آخر کوئی عاقل تمھارے جیسے صداقت شعار، راست باز، عاقل، فرزانہ، متین، رزین، مومن، مسلم، حنیف اور حکیم کو کاہن، مجنون اور شاعر کس طرح قرار دے سکتا ہے! اگر کوئی یہ جسارت کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ عقل سے بالکل عاری ہے ۔ اب صرف دوسرا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ یہ لوگ نہایت سرکش ہیں اور اس سرکشی ہی کے سبب سے یہ سخن سازیاں کر رہے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ سرکشی ہی ان سے یہ باتیں کہلوا رہی ہے ۔ عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے ۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ ۚ بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۚ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ (۳۳-۳۴)

ایک اور الزام کا جواب

یہ ان کے ایک اور الزام کا تذکرہ اور اس کا جواب ہے ۔ فرمایا کہ کیا یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو گھڑا تو انھوں نے خود ہے لیکن اپنی نبوت کی دھونس جمانے کے لیے دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے ذریعہ سے ان پر اتارا ہے ۔ 'تَقَوُّلٌ' کے معنی کسی پر جھوٹا بہتان لگانے کے ہیں ۔ یہی مضمون دوسرے مقامات میں 'بَلِ افْتَرٰىهُ' سے ادا کیا گیا ہے ۔ یعنی ان کے نزدیک یہ کتاب ہے تو ان کی اپنی طبع زاد لیکن عوام فریبی کے لیے جھوٹ موٹ یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ نے اتاری ہے ۔

'بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ' یہ اصل حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کا یہ الزام بھی ان کے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف ہے ۔ ان کو پورا یقین ہے کہ یہ کتاب تمھاری تصنیف نہیں ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ اس طرح کا کلام نہ تم پیش کر سکتے ہو، نہ کوئی دوسرا پیش کر سکتا ہے لیکن پرایمان نہیں لانا چاہتے اس وجہ سے یہ اپنے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے یہ سخن سازی کر رہے ہیں ۔ یہاں فعل ہمارے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہے ۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں جگہ جگہ گزر چکی ہیں ۔

'فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ ...... الاٰیۃ' یہ ان کے الزام کے جواب میں ان کو چیلنج ہے کہ اگر فی الواقع وہ اس کو پیغمبر کی اپنی تصنیف گمان کرتے ہیں تو وہ اپنے خطیبوں اور شاعروں کے کلام میں سے کوئی چیز اس کے مانند پیش کریں، خواہ وہ ان کے پرانے ذخائر میں سے ہو یا اب وہ خود سر جوڑ کر بیٹھیں اور کوئی چیز

اس کے جواب میں پیش کریں۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکیں (اور ہرگز نہیں کر سکتے) تو پھر راستبازی کا تقاضا یہ ہے کہ اس الزام کو واپس لیں اور پیغمبر کو صادق و امین مان کر اس پر ایمان لائیں۔

یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہ بات فرمائی تو ہے قریش کے جواب میں، اور انہی کے جواب میں یہ فرمائی گئی تھی لیکن یہ چیلنج آج بھی علیٰ حالہٖ قائم ہے۔ قرآن کے منکرین نہ تو اپنے قدیم ادبی و مذہبی ذخیرہ میں سے اس کے مانند کوئی چیز پیش کر سکے، نہ خود ہی کوئی چیز ایجاد کر سکے اور نہ بعد کی پوری تاریخ میں کوئی ایسی چیز سامنے آئی جس کو اس چیلنج کا جواب قرار دیا جا سکے۔ دنیا کی غیر عرب قوموں کے لیے یہ چیلنج براہِ راست نہیں ہے تاہم وہ بھی طبع آزمائی کر کے دیکھ سکتی ہیں کہ وہ کوئی چیز اس کے پائے کی لا سکتی ہیں یا نہیں۔ پھر یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن کی یہ تحدّی کسی ایک ہی پہلو سے نہیں بلکہ بحیثیتِ مجموعی ایک صحیفۂ ہدایت ہونے کے پہلو سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کوئی قوم یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ اس کے شاعر کے پایہ کا کوئی شاعر یا اس کے خطیب کے درجے کا کوئی خطیب دنیا میں نہیں ہے لیکن اوّل تو یہ دعویٰ ہی محلِ نظر ہے، دوسری قوم اس کے جواب میں اپنے خطیب یا شاعر کے حق میں یہی دعویٰ کر سکتی ہے لیکن کسی کا یہ دعویٰ تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ زیادہ سے زیادہ کسی ایک ہنر میں برتری کا دعویٰ ہو گا جس کو کوئی شخص نہ اپنے نبی ہونے کے ثبوت میں پیش کر سکتا اور نہ کوئی عاقل اس بنیاد پر اس کو نبی یا رسول مان سکتا۔

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿٣٥﴾ أَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ ۚ بَل لَّا يُوقِنُونَ (۳۵-۳۶)

معترضین سے چند سوالات

مکذبین کے اعتراضات و اتہامات کے جواب دینے کے بعد اب یہ ان سے چند سوالات کیے گئے ہیں کہ اگر وہ عذاب اور آخرت کے منکر ہیں تو یہ بتائیں کہ کیا وہ بغیر خالق ہی کے پیدا ہو گئے ہیں یا خود ہی اپنے خالق ہیں؟ نیز یہ بھی بتائیں کہ کیا آسمانوں اور زمین کو انھوں نے پیدا کیا ہے؟

یہ امر واضح رہے کہ مشرکین عرب اپنا اور تمام آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے تھے۔ وہ اپنے مزعومہ شرکاء میں سے کسی کو کسی چیز کا خالق نہیں مانتے تھے۔ یہ سوال قرآن نے ان کے سامنے رکھ کے گویا ان سے یہ پوچھا ہے کہ جب وہ اپنا اور آسمان و زمین کا خالق اللہ تعالیٰ ہی کو مانتے ہیں تو اس کے عذاب اور اس کے روزِ جزاء و سزا کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہیں؟ کیا ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک مرتبہ ان کو پیدا کر کے اب دوبارہ پیدا کرنے سے عاجز ہو گیا؟ اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ ایک کھلی ہوئی حماقت ہے۔ جو پہلی بار پیدا کرنے پر قادر ہوا وہ دوسری بار پیدا کرنے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہو گا۔

اسی طرح وہ یہ بھی سوچیں کہ جب وہ خود اپنے خالق نہیں ہیں بلکہ کسی اور نے ان کو پیدا کیا اور ان کی معاش و معیشت کا سامان کیا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ان کو یوں ہی چھوڑے رکھے اور کسی دن ان سے یہ نہ پوچھے کہ اس نے ان کو جس مقصد کے لیے پیدا کیا تھا اس کو انھوں نے پورا کیا یا نہیں؟

علیٰ ہٰذا القیاس وہ یہ بھی سوچیں کہ جس زمین پر اور جس آسمان کے نیچے وہ رہتے ہیں اور جن کی گوناگوں نعمتوں سے وہ متمتع ہوتے ہیں، درآنحالیکہ نہ زمین ان کی پیدا کی ہوئی ہے نہ آسمان اور نہ ان کے درمیان کی نعمتیں، تو کیا جس نے ان کو پیدا کیا ہے اس کا کوئی حق ان پر قائم نہیں ہوتا اور اس کے بنائے ہوئے اس گھر میں اپنے رویے سے متعلق وہ اس کے آگے جوابدہ نہیں ہوں گے؟

اسی طرح وہ یہ بھی سوچیں کہ جب نہ زمین ان کی پیدا کی ہوئی ہے نہ آسمان تو آخر کس برتے پر آسمان و زمین کے خالق سے اپنے کو وہ بے خوف و مامون سمجھتے ہیں۔ وہ جب چاہے زمین کو ذرا سا ہلا دے اور یہ بالکل بے نام و نشان ہو کے رہ جائیں، اسی طرح جب چاہے آسمان سے طوفان بھیج دے، اولے برسا دے، پتھراؤ کر دے اور چشم زدن میں ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے۔

اصل علتِ انکار

'بَل لَّا یُوقِنُوْنَ' یہ ان کے اعراض و انکار کی اصل علت سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ ان تمام اصولی باتوں کو تو مانتے ہیں جو آخرت اور جزا و سزا کو لازم ٹھہراتی ہیں، ان میں سے کسی بات کے انکار کی وہ جرأت نہیں کر سکتے لیکن اس بات پر وہ یقین نہیں رکھتے کہ فی الواقع وہ عذاب کے مستحق ہیں اور اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو ایک دن وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی گرفت میں آ جائیں گے۔ یہاں 'یُوقِنُوْنَ' کا مفعول 'بِالْاٰخِرَۃِ' یا 'بِالْعَذَاب' بربنائے قرینہ محذوف ہے۔

ہم یہ حقیقت جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ مشرکین قریش قیامت کے صریح منکر نہیں تھے اس کو وہ ایک نہایت مستبعد چیز سمجھتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ قیامت اور عذاب و ثواب کا قصہ اولاً تو محض ایک وہم ہے؛ ثانیاً اس کی کچھ حقیقت ہے بھی تو یہ اتنی دور کی چیز ہے کہ اس کے لیے ابھی سے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے؛ ثالثاً اس کا مرحلہ بالفرض آیا بھی تو ہمارا معاملہ ہمارے دیوتاؤں سے متعلق ہو گا، وہ اپنی سفارش سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچا ہی لیں گے۔ اسی طرح وہ اس عذاب پر بھی یقین نہیں رکھتے تھے جس سے قرآن ان کو بصورتِ تکذیب اس دنیا میں آگاہ کر رہا تھا۔ وہ اپنی موجودہ خوشحالی کو اپنے عقیدہ و عمل کی صحت کی دلیل بنائے بیٹھے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ اگر فی الواقع وہ خدا کے غضب کے سزاوار ہوتے، جیسا کہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھی کہتے ہیں، تو ان کا حال دنیوی رفاہیت کے اعتبار سے پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں سے بہتر کیوں ہوتا؟ پھر تو صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہونی تھی۔

ان کی اس ذہنی حالت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اصلاً یہ عدم یقین ہی کی صورت ہے۔ اصل حقیقت سے تو ان کے لیے فرار کی کوئی گنجائش تھی نہیں۔ اس کے تمام مقدمات ثابت اور معلوم تھے۔ انفس، آفاق، تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے تمام شواہد اس کے حق میں موجود تھے اور قرآن نے وہ سب ان کے سامنے رکھ بھی دیے تھے لیکن چونکہ اس کو تسلیم کرنا ان کی خواہش کے خلاف تھا اس وجہ سے وہ جان کر انجان بنتے تھے۔ یہ یقین نہیں رکھتے تھے کہ فی الواقع یہ چیز ایک دن پیش آ کے رہے گی۔

مزید غور کیجیے تو یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آئے گی کہ عدم یقین کی اس بیماری میں جس طرح قریش مبتلا تھے اسی طرح اس زمانے کے بہت سے مسلمان بھی مبتلا ہیں۔ ان کو قیامت اور جزاء و سزا سے انکار تو نہیں ہے لیکن ان کی زندگی شاہد ہے کہ ان کو اس کا یقین نہیں ہے اور ان کے اس عدم یقین کے اسباب کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بھی اسی طرح کی کسی نہ کسی غلط فہمی کے شکار ہیں جس طرح کی غلط فہمیوں میں مشرکین مبتلا تھے۔

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ (۳۷)

ایک اور سوال

جس طرح کے سوال اوپر کی دو آیتوں میں کیے ہیں اسی طرح کا سوال یہ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اپنے یا آسمان و زمین کے خالق نہیں تو کیا تیرے رب کے خزانوں کے مالک یا ان پر داروغہ ہیں کہ وہ خدا کی پکڑ سے بے فکر ہیں! یعنی جس طرح وہ آسمان و زمین کے خالق ہونے کے مدعی نہیں ہو سکتے اسی طرح اس بات کے بھی مدعی نہیں ہو سکتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رزق و فضل کے خزانے ان کے حوالے کر دیے ہیں یا ان کی تقسیم پر ان کو مامور کر دیا ہے کہ جس کو چاہیں دیں، جس کو چاہیں نہ دیں۔ پھر ان کو یہ غرہ کیوں ہے کہ وہ خدا کی پکڑ میں نہیں آسکتے یا جس عیش میں وہ ہیں اسی میں رہیں گے، نہ اس دنیا میں وہ اس سے محروم ہو سکتے اور نہ آخرت میں (اگر وہ ہوئی) اس سے ان کو کوئی محروم کر سکتا؛ قرآن نے جگہ جگہ قریش اور ان سے پہلے کی قوموں کے مترفین کے اس زعم کا حوالہ دیا ہے کہ انھوں نے اپنی رفاہیت کو اپنا پیدائشی حق سمجھا اس وجہ سے پیغمبر کے انذار کو خاطر میں نہ لائے۔ یہ ان کے اسی خنّاس پر ضرب لگائی ہے کہ جب نہ وہ خدا کے خزانوں کے مالک نہ ان کی تقسیم پر مامور تو اس خبط میں مبتلا ہونے کی کیا وجہ ہے؟ اللہ تعالیٰ جب چاہے چشم زدن میں ان کے سارے عیش کو خاک میں ملا دے سکتا ہے اور اپنی نعمتوں سے ان کو بہرہ مند کر سکتا ہے جن کو یہ کسی نعمت کا حق دار نہیں سمجھتے۔

قرآن نے یہی بات، معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، قریش کے ان مغروروں کو بھی خطاب کر کے فرمائی ہے جو کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی بشر ہی کو رسول بنا کر بھیجنے والا ہوتا تو مکہ یا طائف کے کسی رئیس کو رسول بناتا، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جیسے غریب و نادار کو کیوں رسول بناتا؟ اسی طرح اگر یہ دین، جس کی یہ دعوت دے رہے ہیں، کوئی خدائی دین ہوتا تو اس کے حامل بننے کے لیے اللہ تعالیٰ ہم کو چنتا نہ کہ اس کے حامل وہ نادار قلاش و غلام بنتے جن کو اس دنیا کی کوئی نعمت و عزت بھی حاصل نہیں ہوئی —— اس آیت میں ان مغروروں کے غرور پر بھی ایک کاری ضرب لگا دی گئی ہے۔

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ ۚ فَلْيَاْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ (۳۸)

کفار کے بے بنیاد اوہام

یعنی اگر ان کا زعم یہ ہے کہ وہ اسی طرح دنیا میں بھی عیش کریں گے اور آخرت ہوئی تو وہاں بھی سب پر بالا رہیں گے تو اس زعم کی بنیاد کیا ہے؟ کیا ان کے پاس کوئی ایسی سیڑھی ہے جس کو آسمان میں لگا کر اپنے حق میں اللہ کے فیصلے سن لیا کرتے ہیں؟ کیا ان پر کوئی کتاب نازل ہوئی ہے جس میں ان کی پسند کی سب باتیں

لکھی ہوئی ہیں ؟ کیا اللہ تعالیٰ نے ان کو کوئی براءت نامہ لکھ کر پکڑا دیا ہے کہ تم جو چاہے اودھم مچاتے پھرو، ہم نہ دنیا میں تم کو کچھ کہیں گے نہ آخرت میں تم سے کوئی باز پرس ہونی ہے ؟ اگر اس طرح کی کوئی خبر ان کے کسی آسمانی مخبر نے ان کو پہنچائی ہے تو وہ اس کے حق میں کوئی واضح دلیل پیش کریں۔

یہاں یہ بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔ سورۂ قلم میں یہ پوری وضاحت کے ساتھ آئی ہے۔ ہم نے آیت کی تفسیر سورۂ قلم کی روشنی ہی میں کی ہے اس وجہ سے متعلق آیات نقل کیے دیتے ہیں تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ہم نے تاویل میں تکلف سے کام لیا ہے۔ وہاں فرمایا ہے :

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۙ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۚ اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ ۚ سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ (القلم : ۳۷-۴۰)	کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں وہی باتیں مرقوم ہیں جو تم چاہتے ہو! کیا ہم نے تم سے قیامت تک کے لیے کچھ عہد کر رکھے ہیں کہ تم جو کہو گے وہی تمھیں ملے گا! ان سے پوچھو کہ کون ان چیزوں کا ضامن بنتا ہے!

زیر بحث آیت میں زبان کے معروف قاعدے کے مطابق کچھ محذوفات ہیں ان کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی : (ام لھم سلم منصوب الی السماء یسمعون صاعدین فیہ ...) جس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ انسان اپنی رہنمائی کے لیے آسمانی وحی کا محتاج ہے۔ اب یا تو ہر شخص اس بات کا ثبوت بہم پہنچائے کہ اس کے پاس آسمانی ہدایت معلوم کرنے کے ذرائع و وسائل موجود ہیں اور اگر ہر شخص اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور ظاہر ہے کہ نہیں کر سکتا تو اس پر واجب ہے کہ وہ ان لوگوں کی رہنمائی پر بھروسہ کرے جو ان وسائل سے بہرہ مند ہیں

اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ (۳۹)

مشرکانہ و مشفعانہ کا غرّہ بالکل باطل ہے

یعنی مذکورہ باتوں میں سے اگر کوئی بات نہیں ہے تو کیا تمھارا غرّہ اپنے شرکاء و شفعاء کے بل پر ہے کہ وہ دنیا میں بھی تمھارے محافظ ہیں اور آخرت میں بھی وہ شفیع و مددگار رہوں گے۔ اگر یہ بات ہے تو اس زعم کا بھونڈا پن واضح کر دینے کے لیے تنہا یہی بات کافی ہے کہ تم نے خدا کے لیے تو لڑکیاں فرض کر رکھی ہیں، درآنحالیکہ اپنے لیے لڑکوں کو پسند کرتے ہو، لڑکیوں سے نفرت کرتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس سوال پر غور کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ خدا کا کوئی شریک و کفو ہو سکتا ہے یا نہیں تو کم از کم یہ احساس تو انسانی فطرت کا بالکل بدیہی تقاضا تھا کہ خدا کے لیے اس چیز کو پسند نہ کرتے جسے اپنے لیے پسند نہیں کرتے۔ لیکن تم نے دہری حماقت کی۔ ایک تو بے دلیل خدا کے شریک ٹھہرائے، پھر شریک بھی بنایا تو ایسی چیزوں کو جن کو اپنا شریک بنانا انھیں گوارا نہیں ہے۔

مشرکین عرب کی تین دیویاں

یہ امر یہاں واضح رہے کہ مشرکین عرب کے ہاں سب سے اونچا درجہ تین دیویوں کا تھا جن کے متعلق ان کا

گمان تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں اور اپنے باپ سے جو چاہیں منوا سکتی ہیں۔ ان کا ذکر تفصیل سے آگے والی سورہ میں یوں آیا ہے۔

اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰی ۙ﴿۱۹﴾ وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی ﴿۲۰﴾ اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَ لَہُ الۡاُنۡثٰی ﴿۲۱﴾ تِلۡکَ اِذًا قِسۡمَۃٌ ضِیۡزٰی ﴿۲۲﴾ اِنۡ ہِیَ اِلَّاۤ اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ سُلۡطٰنٍ ؕ (النجم: ۱۹-۲۳)	ذرا غور تو کرو لات اور عزیٰ اور منات پر جو تین کی تیسری اور دو درجے میں دوسری ہے۔ کیا تمھارے لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں ہیں! پھر تو یہ بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔

اَمۡ تَسۡـَٔلُہُمۡ اَجۡرًا فَہُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ مُّثۡقَلُوۡنَ (۴۰)

مخالفین کی حق بیزاری پر تعجب

یہ ان لوگوں کی حق بیزاری پر اظہار تعجب ہے کہ آخر یہ تمھاری بات سنتے کیوں نہیں؟ اپنی بات سنانے پر تم ان سے کسی تنخواہ یا معاوضہ کے طالب تو ہو نہیں کہ اس کے بوجھ تلے یہ دبے جا رہے ہوں! تم تو اپنے رب کی نعمت مفت بانٹ رہے ہو تو ان کو کیا حرج ہوتا ہے کہ وہ اس کے سننے کے بھی روادار نہیں۔

یہ امر واضح رہے کہ جہل کے مقابل میں علم بہرحال ایک محبوب و مطلوب شے ہے۔ کوئی سلیم الفطرت نہ یہ گوارا کرتا اور نہ اسے گوارا کرنا چاہیے کہ اس کے سامنے اس چیز کا علم پیش کیا جائے جس سے وہ بے خبر ہے اور وہ اس کے سننے کا بھی روادار نہ ہو۔ ایسے شخص کی مثال اس اندھے کی ہے جو ٹھوکریں کھا رہا ہے لیکن کوئی اس کو رستہ پر لانا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ وہ جھٹک دیتا ہے۔ اہل عرب امی، یعنی دین و شریعت سے بے خبر تھے۔ ان کی اس بے خبری کا تقاضا یہ تھا کہ وہ اللہ کی ہدایت معلوم کرنے کے طالب بنتے بالخصوص جب کہ ان کے ہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانے سے یہ روایت بھی چلی آ رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ ان کے اندر سے ایک رسول اٹھائے گا جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گا اور جس سے دنیا کی تمام قومیں ہدایت پائیں گی۔ ان پر واجب تھا کہ جب انہی کے اندر کے ایک بہترین شخص نے ان کو اللہ کے راستہ کی دعوت دی تو وہ اس کی بات سنتے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرتے لیکن توقع کے خلاف انھوں نے اس کے بالکل خلاف روش اختیار کی۔ ان کی اسی حالت پر قرآن نے اس آیت میں تعجب کا اظہار فرمایا ہے۔

اَمۡ عِنۡدَہُمُ الۡغَیۡبُ فَہُمۡ یَکۡتُبُوۡنَ (۴۱)

یعنی تم سے اور تمھاری پیش کردہ ہدایت سے یہ اس قدر بیزار ہیں تو کیا ان کے پاس غیب کے خود جان لینے کا کوئی ذریعہ موجود ہے جس سے وہ تمام ضروری باتیں معلوم کر کے لکھ لیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس طرح کا کوئی ذریعہ ان کے پاس موجود نہیں ہے۔ ایسی حالت میں حق تو یہ تھا کہ وہ تمھاری پکار پر لپکتے کہ تم اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ان کو اس کے احکام اور اس کی مرضیات سے آگاہ کرنے کے لیے اٹھے ہو۔ لیکن وہ تم سے تو بیزار ہیں الّا

خود اپنے جی سے انھوں نے شریعت گھڑ رکھی ہے جو ہے تو ان کی من مانی خواہشات اور ان کے اوہام کا مجموعہ لیکن ان کو انھوں نے اللہ کا اتارا ہوا دین سمجھ رکھا ہے۔ ان کی اسی طرح کی خواہشات و بدعات کی طرف سورۂ نجم آیت ۳۵ میں یوں اشارہ فرمایا ہے: أَعِنْدَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ (کیا اس کے پاس علم غیب ہے، پس وہ دیکھ رہا ہے) اس آیت میں اشارہ ان لوگوں کی طرف ہے جو باعتبار ایمان و عمل تو بالکل صفر تھے لیکن ان کا زعم یہ تھا کہ وہ بزرگوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے بڑے درجے ملیں گے۔ اپنے اس پندار کے سبب سے وہ پیغمبر کے انذار کا مذاق اڑاتے اور کہتے کہ یہ ہمیں عذاب سے ڈراتے ہیں حالانکہ بہت جلد گردشِ روزگار خود انھیں ختم کر دینے والی ہے اور ہم اس کے منتظر ہی ہیں۔

أَمْ يُرِيدُونَ كَيْدًا ۖ فَالَّذِينَ كَفَرُوا هُمُ الْمَكِيدُونَ (۴۲)

اصل حقیقت کی پردہ کشائی

یہ سوال ہی کے پیرایہ میں اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے کہ یہ ساری دلیل بازیاں اور سخن سازیاں تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر کی دعوت کے فروغ میں ان کو اپنی سیادت کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ اس کو بچانے کے لیے یہ ساری باتیں وہ، اپنے ضمیر کے بالکل خلاف، گھڑتے اور پھیلاتے ہیں تاکہ ان کے عوام اس دعوت سے متاثر ہو کر ان کے ہاتھوں سے نکل نہ جائیں۔ فرمایا کہ کیا یہ کوئی چال چلنی چاہتے ہیں! اگر یہ بات ہے تو یاد رکھیں کہ جن لوگوں نے کفر کیا ہے وہ خود اپنے دام میں گرفتار ہیں۔

حق کے خلاف سازش کرنے والے خود اپنے دام میں گرفتار ہوتے ہیں

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حق سے برگشتہ رہتے اور لوگوں کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اپنے ضمیر کے بالکل خلاف اس طرح کی چالیں چلتے ہیں وہ حق کی دعوت دینے والوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنے ہی کو تباہی کے کھڈ میں گراتے ہیں۔ نجات و فلاح کا راستہ وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے بتایا ہے۔ کوئی شخص اس سے ہٹ کر دوسری راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی ضلالت کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے صحیح راہ بتانے والوں پر خواہ کتنی ہی تہمتیں تراشے اور کج روی کی حمایت میں کتنی ہی دلیلیں گھڑے لیکن جب انجام اس کے سامنے آئے گا تب اس پر واضح ہو جائے گا کہ وہ خود اپنے ہی دام میں اسیر ہو کر اس منزل تک پہنچا ہے۔

أَمْ لَهُمْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ (۴۳)

خدا کے ساتھ شرک کا کوئی جوڑ نہیں

یعنی بالآخر تو سب کو اللہ ہی کے آگے حاضر ہونا اور اسی کے حضور جواب دہی کرنی ہے تو جو چالیں اس کے خلاف چلیں گے ان کے انجام سے ان کو کون بچائے گا! کیا ان کا گمان یہ ہے کہ اللہ کے سوا ان کے کچھ اور معبود بھی ہیں جو ان کی مدد کریں گے تو یاد رکھیں کہ اللہ جل شانہٗ ان چیزوں سے پاک اور ارفع ہے جن کو وہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ، میں دلیل کا جو پہلو ہے اس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی ایسی صفت منسوب نہیں کی جا سکتی جو اس کی تمام صفات کے منافی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات خود بیان فرما دی ہیں جن کو مشرکین عرب بھی مانتے تھے لیکن ساتھ ہی انھوں نے اپنی خواہشوں اور بدعات کو دین بنانے کے لیے اس کے ساتھ شرک کا جوڑ بھی لگا رکھا تھا حالانکہ اس جوڑ سے خدا کی تمام بنیادی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ ان کی ان مشرکانہ نسبتوں سے بالکل پاک ہے۔

ان خرافات کا اس کی عظیم اور رفیع الشان ذات سے کوئی جوڑ نہیں ہے۔

وَإِن يَرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَاءِ سَاقِطًا يَقُولُوا سَحَابٌ مَّرْكُومٌ (۴۴)

چال چلنے والوں کو قائل کرنا کسی کے بس میں نہیں

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ جب ان کی ساری سخن سازیاں محض چال اور فریب کی نوعیت کی ہیں تو ان کو مطمئن کرنا تمھارے بس میں نہیں ہے۔ ان کو دلیلوں سے قائل کرنا تو درکنار اگر یہ اس عذاب کو بھی آسمان سے نازل ہوتا دیکھ لیں جس سے تم ان کو آگاہ کر رہے ہو تو اس کو بھی یہ تہ بہ تہ بادل کہیں گے اور اپنے کو مطمئن کر لیں گے کہ یہ ابر کرم بن کر ان کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کرنے والا ہے۔

اس فقرے میں ثمود کے تاریخی واقعہ کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے کہ ان کو جس عذاب سے ڈرایا گیا تھا جب وہ ان کے سروں پر آدھمکا تب بھی انھوں نے اس کا یقین نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا کہ 'هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا' (الاحقاف: ۲۴) (یہ تو ہمیں سیراب کرنے والا بادل ہے)۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح یہ لوگ عذاب کو دیکھ کر بھی ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ اسی وقت مانیں گے جب عذاب ان کو پامال کر دے گا، لیکن اس وقت ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہو گا۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی کو قائل کرنے کی توقع اسی حد تک کی جا سکتی ہے جب تک گمان ہو کہ اس کے ذہن میں فی الواقع کچھ شبہات و اعتراضات ہیں جو اس کے لیے قبولِ حق میں حجاب بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت تک ایک داعی کا فرض ہے کہ اس کے شبہات دور اور اس کے اعتراضات رفع کرنے کی کوشش کرے لیکن جب یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجائے کہ اس کی ساری دلیل بازی محض ایک چال (کید) اور مکر ہے جس کے پردے میں چھپ کر وہ حقیقت سے فرار اختیار کرنا چاہتا ہے تو پھر اس پر وقت ضائع کرنا بالکل بے سود ہے۔ پھر اس کا معاملہ اللہ ہی کے حوالے کرنا چاہیے۔

فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي فِيهِ يُصْعَقُونَ ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ (۴۵-۴۶)

مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ یہ لوگ چال چل رہے ہیں تو اب ان کے درپے ہونے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ اب ان کو اس دن کے حوالے کر جس دن صورِ اسرافیل سے ان پر غشی طاری ہو جائے گی۔ یہ اشارہ اس دن کی طرف ہے جس کے ہول کی تصویر سورۂ حج میں بدیں الفاظ کھینچی گئی ہے: 'وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُم بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيدٌ' (۲) (اور تم لوگوں کو مدہوش دیکھو گے اور یہ مدہوشی شراب کی نہیں ہو گی بلکہ اللہ کا عذاب ہی بڑا سخت ہو گا)۔

'يَوْمَ لَا يُغْنِي عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ ...... الاٰية' فرمایا کہ اس دن نہ ان کی یہ چالیں کچھ کام آئیں گی، نہ ان کے اعوان و انصار ان کی کچھ مدد کر سکیں گے اور نہ ان کے مزعومہ شرکاء و شفعاء ہی سے ان کو کچھ سہارا حاصل ہو سکے گا بلکہ ہر ایک کو سابقہ صرف اللہ رب العزت سے پیش آئے گا اور وہ سب کا کیا دھرا ان کے سامنے رکھ دے گا۔

وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۷)

اس عذاب کی طرف اشارہ جو مکذبین رسول پر دنیا میں آتا ہے

یعنی آخرت کا عذاب تو ہے ہی ان ظالموں کے لیے ایک عذاب اس سے پہلے بھی ہے لیکن ان کی اکثریت اس سے بے خبر ہے۔ یہ اشارہ اسی عذاب کی طرف ہے جو سنتِ الٰہی کے مطابق ان لوگوں پر ہمیشہ آیا ہے جنھوں نے اپنے رسول کی تکذیب کی اور اس پر اڑے رہ گئے۔ اس سنتِ الٰہی کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں۔ یہ عذاب قریش کے مکذبین پر بھی آیا اور وہ سب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ ہی میں ذلیل و پامال ہو گئے۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ (۴۸-۴۹)

نبی صلعم کو صبر اور انتظار کی ہدایت

یہ نہایت دلنواز پیرایہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی ہدایت اور ساتھ ہی اس صبر کے حصول کی تدبیر تلقین فرمائی گئی ہے۔

'وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ'۔ 'صبر' کے بعد 'لِ' کا صلہ اس بات کا قرینہ ہے کہ لفظ 'صبر' یہاں انتظار کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یعنی پوری استقامت کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ 'حکم' سے مراد ان باتوں کے ظہور کا حکم ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔

'فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا'۔ یہ نہایت ہی دل نواز فقرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ہر وقت ہماری آنکھوں یعنی ہماری حفاظت میں ہو۔ یہ کتنی ہی چالیں چلیں لیکن مجال ہے جو تمہیں کوئی گزند پہنچا سکیں۔

حصولِ صبر کی تدبیر

'وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ'۔ یہ اس صبر کے حصول کی تدبیر ارشاد ہوئی ہے کہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ نماز بالخصوص تہجد کی نماز کا اہتمام کرو۔ 'حِيْنَ تَقُوْمُ' کی تفسیر وضاحت سے ہم سورۂ شعراء کی آیات ۲۱۷-۲۱۸: وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيْزِ الرَّحِيْمِ ۙ الَّذِيْ يَرٰىكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ (اور خدائے عزیز و رحیم پر بھروسہ رکھو جو تمہیں دیکھتا ہے جب تم اٹھتے ہو) کے تحت کر چکے ہیں۔ اسی طرح 'تسبیح' کے ساتھ 'حمد' کی قید کی وضاحت بھی اس کے محل میں ہو چکی ہے۔

'وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ'۔ یہ ٹکڑا معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ سورۂ قٓ آیات ۳۹-۴۰ میں بھی گزر چکا ہے۔ اس کی تفسیر وہاں دیکھ لیجیے۔ یہاں ساری بحث دہرانے میں طوالت ہو گی۔ قٓ کی آیات ہم نقل کیے دیتے ہیں: فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝

بفضلِ ایزدی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۱۵- مئی ۱۹۷۷ء

۱۶- جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

۵۳

النَّجم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سے تعلّق

یہ سورہ سابق سورہ ـــــــ الطّور ـــــــ کی توام سورہ ہے۔ مرکزی مضمون دونوں کا ایک ہی ہے، یعنی جزا اور سزا کا اثبات۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں عذاب کے پہلو کو نمایاں فرمایا ہے اور اس میں اس شفاعتِ باطل کی تردید ہے جس میں مشرکین عرب مبتلا تھے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں ہم واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اس عقیدۂ باطل کے باقی رہتے ہوئے مشرکین کے لیے بڑے سے بڑے عذاب کی دھمکی بھی بالکل بے اثر تھی۔ قرآن نے اسی وجہ سے قیامت اور توحید دونوں کا ذکر ہمیشہ ساتھ ساتھ کیا ہے تاکہ مشرکین کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہ رہے۔ اس حقیقت کی طرف اشارہ پچھلی سورہ میں بھی ہے، اس سورہ میں اس اشارہ کی پوری وضاحت ہوگئی ہے۔ گویا ان دونوں سورتوں کا مشترک مضمون یہ ہے کہ منکرین و مکذّبین کے لیے اللہ کا عذاب لازمی ہے، اپنے جن معبودوں کی شفاعت پر یہ تکیہ کیے بیٹھے ہیں اول تو ان کی کوئی حقیقت نہیں، محض فرضی نام ہیں جو انھوں نے رکھ چھوڑے ہیں اور اگر کچھ حقیقت ہے تو اللہ تعالیٰ کا معاملہ لوگوں کے ساتھ کامل علم اور کامل عدل پر مبنی ہوگا۔ اس بات کا وہاں کوئی امکان نہیں ہے کہ کسی کی شفاعت اس کے علم میں کوئی اضافہ کر سکے، یا اس کے فیصلہ کو تبدیل کر سکے یا باطل کو حق بنا سکے۔

عمود اور مضمون کے علاوہ سابق سورہ کے خاتمہ اور اس سورہ کے آغاز پر بھی ایک نظر ڈالیے تو دونوں میں بڑی واضح مناسبت نظر آئے گی۔ سورۂ طور کی آخری آیت 'وَمِنَ الَّيۡلِ فَسَبِّحۡهُ وَاِدۡبَارَ النُّجُوۡمِ' ہے اور اس سورہ کی پہلی آیت 'وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰی' ہے۔ گویا سابق سورہ کی آخری اور اس سورہ کی پہلی آیت نے دونوں میں ایک نہایت خوب صورت حلقۂ اتصال کی شکل پیدا کر دی ہے۔ اس قسم کا اتصال اکثر مقامات میں موجود ہے۔ بعض جگہ لفظی، بعض جگہ معنوی، اور بعض مقامات میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کا۔ اس قسم کی بعض چیزوں کی طرف ہم نے پچھلی سورتوں میں اشارے کیے ہیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۸) اس امر کا بیان کہ یہ قرآن جو تم کو سنایا جا رہا ہے یہ تمھارے کاہنوں اور نجومیوں کے قسم کا کوئی کلام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرب ترین اور معتمد ترین فرشتہ کے ذریعہ سے اپنے پیغمبر پر یہ وحی فرمایا ہے۔

اس میں کسی ضلالت یا غوایت کا کوئی شائبہ نہیں ہے، بلکہ اس کی ہر بات مبنی بر حقیقت اور اٹل ہے۔ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ وحی اور جبریلؑ سے متعلق پیغمبرؐ اپنے جو مشاہدات و تجربات تمھارے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ کسی خیال آرائی یا فریبِ نظر پر مبنی ہیں۔ یہ سرتاسر حقیقت ہیں۔ پیغمبرؐ اپنے مشاہدات تمھارے آگے پیش کر رہے ہیں۔ ان مشاہدات کے باب میں ان سے لڑنے کے بجائے تمھاری سلامتی ان کی دعوت پر ایمان لانے میں ہے۔

(۱۹-۲۸) مشرکین کو یہ تنبیہ کہ تمھارے یہ خیالی اصنام، جن کے بل پر تم قرآن کے انذار سے بے پروا ہو، بالکل بے حقیقت ہیں۔ نہ اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل اتاری اور نہ تمھاری عقل و فطرت ہی کے اندر ان کے لیے کوئی جگہ ہے۔ یہ محض فرضی نام ہیں جو تم نے اپنے جی سے رکھ چھوڑے ہیں۔ حقیقت سے ان کو کوئی تعلق نہیں اور مفروضات حقیقت کے مقابل میں کچھ کام آنے والے نہیں بنیں گے، بالخصوص جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام کر دینے کے لیے تمھارے پاس اس کی نہایت واضح ہدایت بھی آچکی ہے۔ یاد رکھو کہ تم نے جھوٹی آرزوؤں کے جو خیالی محل تعمیر کر رکھے ہیں یہ بالکل بے بنیاد ہیں۔ انسان کو سابقہ اپنی تمناؤں سے نہیں بلکہ حقائق سے پیش آئے گا تو حقائق کے مواجہ کے لیے تیاری کرو۔ دنیا اور آخرت کے سارے معاملات صرف اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہیں۔ ان میں کسی اور کا کوئی دخل نہیں۔ آسمانوں میں بے شمار فرشتے ہیں لیکن ان کی سفارش ذرا بھی کسی کے لیے نافع نہیں ہوگی۔ اللہ ہی جس کو چاہے گا اور جس کے لیے چاہے گا سفارش کی اجازت دے گا۔ آخرت کی مسئولیت اور قانونِ مکافات سے گریز کے لیے تم نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بنا کر ان کی شفاعت کی جو آڑ لی ہے یہ محض تمھاری خیالی پناہ گاہ ہے۔ یہ چیز ذرا بھی کام آنے والی نہیں ہے۔

(۲۹-۳۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کہ ان سرگشتگانِ دنیا کو، جو اللہ کی یاد دہانی سے اعراض کر رہے ہیں، ان کے حال پر چھوڑ دو۔ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔ آخرت سے ان کی آنکھیں بند ہیں۔ اللہ نیکوں اور بدوں دونوں سے اچھی طرح باخبر ہے، وہ ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دے کے رہے گا۔ آسمانوں اور زمین کا بلا شرکتِ غیرے مالک اللہ ہی ہے، کسی کی مجال نہیں کہ وہ بروں کو اس کی پکڑ سے بچا سکے یا نیکوں کو ان کی نیکی کے صلہ سے محروم کر سکے۔ خدا کے ہاں اچھے صلہ کا حق دار ہر مدعی نہیں ہوگا بلکہ وہی ہوں گے جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے اجتناب کرتے رہے۔ یہ لوگ بے شک اس کی رحمت کے حق دار ہوں گے۔ اگر کبھی ان کے پاؤں کسی برائی پر پڑ گئے تو اللہ کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے گا۔ رہے وہ خود غلط جنھوں نے اپنے حسب و نسب اور اپنے خیالی معبودوں کی سفارش کے بل پر اپنے لیے خدا کے ہاں اونچے اونچے مراتب محفوظ کر رکھے ہیں، وہ اپنی پاک دامنی کی حکایت زیادہ نہ بڑھائیں۔ اللہ ان کی پیدائش کے تمام مراحل اور ان کے سارے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔

(۳۳-۵۵) ایک تحقیر آمیز اشارہ ان لوگوں کی طرف جو اللہ کی راہ میں کچھ دینے دلانے یا کسی قربانی کا حوصلہ تو ذرا بھی نہیں رکھتے لیکن اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ حضرت موسیٰؑ اور حضرت ابراہیمؑ جیسے جلیل القدر نبیوں

کے نام لیوا اور ان کی ذریت میں ہیں اس وجہ سے خدا کی جنت کے پیدائشی حق دار ہیں۔ ان کو ان جلیل القدر نبیوں کی تعلیمات اور ان کی عظیم قربانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ مرتبے ان کو گھر بیٹھے بٹھائے محض نسب و خاندان کی بنا پر نہیں مل گئے بلکہ ان کی ان بے مثال قربانیوں کی بنا پر ملے جو انھوں نے اللہ کی راہ میں پیش کیں۔ اللہ کے ہاں ہر ایک کا اپنا عمل تولا جائے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ عمل تو کسی نے کیا اور اس کا صلہ کسی اور کو ملے۔

اسی ضمن میں یہ حقیقت بھی نہایت زوردار الفاظ میں واضح فرما دی گئی ہے کہ رنج و راحت، موت و زندگی، بیٹا اور بیٹی، دولت و ثروت سب خدا ہی کے اختیار میں ہے، اس وجہ سے ہر حال میں خدا ہی سے وابستہ رہنا چاہیے۔ جو قومیں دنیا میں پھنس کر خدا سے بے پروا ہو جاتی ہیں وہ اپنی تمام دولت و شوکت کے باوجود اسی طرح کے انجام سے دوچار ہوتی ہیں جس طرح کے انجام سے عاد و ثمود اور ماضی کی دوسری قومیں دوچار ہوئیں۔ ان قوموں کے آثار تمھارے گرد و پیش میں موجود ہیں۔ ان کو دیکھو اور ان سے عبرت حاصل کرو۔

(۵۶-۶۲) خاتمۂ سورہ جس میں تمہید کے مضمون، یعنی قرآن کی عظمت کی یاددہانی ہے کہ یہ کاہنوں اور نجومیوں کے قسم کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اسی طرح کا ایک نذیر ہے جس طرح کے نذیر اس سے پہلے آ چکے ہیں۔ اب تمھارے فیصلہ کی گھڑی سر پر آ چکی ہے اور یہ تم کو اسی سے بروقت متنبہ کرنے کو نازل ہوا ہے۔ اگر تم متنبہ نہ ہوئے تو یاد رکھو کہ خدا کی پکڑ سے تم کو کوئی بھی بچانے والا نہیں بنے گا۔ یہ جس حقیقت سے آگاہ کر رہا ہے اس پر تعجب نہ کرو، بلکہ اپنی اصلاح کرو۔ تم اس پر ہنستے ہو حالانکہ یہ ہنسنے کی چیز نہیں بلکہ تمھارے لیے رونے کی چیز ہے۔ اپنے غفلت کے بستر لپیٹو اور اپنے رب کے آگے سجدہ اور اس کی بندگی کرو۔

سُورَةُ النَّجْمِ (۵۳)

مَکِّیَّۃٌ ——— آیات : ۶۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱ - ۱۸

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ؕ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ﴿۵﴾ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ﴿۶﴾ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ﴿۷﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ﴿۸﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ﴿۹﴾ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى ؕ﴿۱۰﴾ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ؕ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۸

شاہد ہیں ستارے جب کہ وہ گرتے ہیں کہ تمھارا ساتھی نہ بھٹکا ہے اور نہ گمراہ ہوا ہے، اور وہ اپنے جی سے نہیں بولتا۔ یہ تو بس وحی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔ اس کو ایک مضبوط قوتوں والے، عقل و کردار کے توانا نے تعلیم دی ہے۔ وہ نمودار ہوا، اور وہ افق اعلیٰ

میں تھا، پھر قریب ہو گیا اور جھک پڑا، پس دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ پس اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ جو کچھ اس نے دیکھا یہ دل کی خیال آرائی نہیں ہے تو کیا تم اس سے اس چیز پر جھگڑتے ہو جس کا وہ مشاہدہ کر رہا ہے! ۱۔ ۱۲

اور اس نے ایک بار اس کو اور بھی سدرۃ المنتہٰی کے پاس اترتے دیکھا، اسی کے پاس جنت الماویٰ بھی ہے۔ جب کہ چھائے ہوئے تھی سدرہ کو جو چیز چھائے ہوئے تھی۔ نہ نگاہ کج ہوئی اور نہ بے قابو۔ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے۔ ۱۳۔ ۱۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَالنَّجۡمِ اِذَا هَوٰی (۱)

'النجم' سے مراد

'النجم' سے عام طور پر مفسرین نے ثریا کو مراد لیا ہے، لیکن اس کا کوئی قرینہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ واضح قرینہ تو شعریٰ کا ہو سکتا ہے جس کا ذکر اسی سورہ میں آگے آیا ہے لیکن اس کو مراد لینے کا بھی، جیسا کہ وضاحت آئے گی، یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اسم جنس کے مفہوم میں ہے جس طرح وَبِالنَّجۡمِ هُمۡ یَهۡتَدُوۡنَ (النحل: ۱۶) (اور ستاروں سے وہ رہنمائی حاصل کرتے ہیں) یا وَالنَّجۡمُ وَالشَّجَرُ یَسۡجُدٰنِ (الرحمٰن: ۶) (اور ستارے اور درخت سجدہ کرتے ہیں) اور اس نوع کی دوسری آیات میں جگہ جگہ قرآن میں آیا ہے۔

هَوٰی یَهۡوِیۡ کا مفہوم

'هَوٰی یَهۡوِیۡ' کے اصل معنی کسی چیز کے اوپر سے گرنے کے ہیں۔ یہ لفظ ستاروں کے افق سے غائب ہونے اور ڈوبنے کی تعبیر کے لیے بھی موزوں ہے اور اس آتش باری کے لیے بھی موزوں ہے جو غیب کی ٹوہ لگانے والے شیاطین پر ستاروں سے ہوتی ہے اور جس کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

'وَالنَّجۡمِ' میں 'و' قسم کے لیے ہے اور قسم سے متعلق ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں کہ قرآن میں یہ بیشتر شہادت کے لیے آئی ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمۡ وَمَا غَوٰی ۚ وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰی ۚ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (۲-۴)

پیغمبر صلعم کی زندگی پر شہادت

یہ پوری بات مقسم علیہ کی حیثیت رکھتی ہے یعنی ستاروں کے غروب یا سقوط کی قسم کھا کر قریش کو مخاطب

کرکے فرمایا کہ تمھارے ساتھی (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو بھٹکے ہیں نہ گمراہ ہوئے ہیں۔ جو کلام وہ تمھیں سنا رہے ہیں اپنے جی سے گھڑ کے نہیں سنا رہے ہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر وحی کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو تمھیں سنائیں تاکہ تم ہدایت حاصل کرو۔

موقع کلام دلیل ہے کہ قریش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کہانت کا جو الزام لگاتے تھے یہ اس کی تردید ہے۔ قریش کے لیڈروں کو جب آپ قرآن سناتے اور وحی اور اس کے لانے والے فرشتہ سے متعلق اپنے تجربات و مشاہدات بیان فرماتے تو وہ اپنے عوام کو یہ باور کراتے کہ یہ بھی ہمارے کاہنوں اور منجموں کے قسم کے ایک کاہن و منجم ہیں۔ جس طرح ستاروں کے قرآن، نکھتروں کے مشاہدات اور جنات کے القاء کی مدد سے وہ مسجع و مقفّیٰ کلام پیش کرتے اور غیب کی باتیں بتاتے ہیں اسی طرح یہ بھی مسجع کلام سناتے اور مستقبل کی باتیں جاننے کے مدعی ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرشتہ وحی لے کر آتا ہے محض دھونس ہے۔ جس طرح ہمارے کاہنوں پر جنات القاء کرتے ہیں اسی طرح کوئی جن ان پر بھی القاء کرتا ہے جس کو یہ فرشتہ سمجھتے ہیں۔

قریش کے اس الزام کی تردید قرآن میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ خاص طور پر سورۂ شعراء کے آخر میں اس کے بعض نہایت اہم پہلو زیرِ بحث آئے ہیں۔ یہاں اسی الزام کی تردید ایک مختلف نہج سے کی جا رہی ہے جس کا آغاز ستاروں کے غروب اور سقوط کی قسم سے ہوا ہے۔

ستاروں کے غروب اور سقوط کی شہادت — ستاروں کے غروب یا ان کے سقوط سے قرآن نے دو پہلوؤں سے عربوں کے اس تصور پر ضرب لگائی ہے جو وہ کاہنوں اور منجموں سے متعلق رکھتے تھے۔

ایک تو اس پہلو سے کہ یہ سورج اور چاند اور یہ تمام نجوم و کواکب نہ خود اپنے اختیار سے کوئی تصرف کرتے ہیں نہ بذاتِ خود موثر یا نافع و ضار ہیں، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں مسخر اور اسی کے حکم کے تابع ہیں۔ ان کا پوری پابندی کے ساتھ، ایک مقررہ نظام الاوقات کے مطابق، طلوع و غروب خود اس بات کی شہادت ہے کہ یہ بذاتِ خود کسی اقتدار و اختیار کے مالک نہیں ہیں اس وجہ سے نہ تو یہ عبادت کے حق دار ہیں نہ اس بات کے کہ ان کو وحی و الہام کا مصدر سمجھ کر ان سے رجوع کیا جائے یا ان کو آفات کا منبع خیال کرکے ان کی دہائی دی جائے یا ان کو خیر و برکت کا مرکز مان کر ان سے دعا و التجا کی جائے، بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے اور اپنے عمل سے اللہ کے بندوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی انہی کی طرح اللہ ہی کی بندگی اور اسی کو سجدہ کریں۔ یہ مضمون قرآن میں یوں تو گوناگوں شکلوں میں بیان ہوا ہے لیکن خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کی وہ حجت جو انھوں نے اپنی قوم پر تمام کی اس باب میں حرفِ آخر ہے۔

یہ امر یہاں پیشِ نظر رہے کہ کہانت کی گرم بازاری جس طرح جنات و شیاطین کے تعلق سے تھی اسی طرح ستاروں کی گردش اور اس کے اثرات سے بھی اس کا نہایت گہرا ربط تھا۔ قرآن نے یہاں وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى کہہ کر اس کے اسی پہلو پر ضرب لگائی ہے کہ ستارے تو خود اپنے عمل سے شہادت دیتے ہیں کہ وہ

خالقِ کائنات کے حکم کے تابع ہیں۔ اسی کے حکم سے وہ طلوع ہوتے اور اسی کے حکم سے ڈوبتے ہیں، تو احمق ہیں وہ لوگ جو ان سے الہام حاصل کرنے یا لوگوں کی تقدیر معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ احمق ہیں وہ جو اللہ کے رسول کو نجومی یا کاہن بتانے ہیں درآنحالیکہ ان کی ساری تعلیم ان خرافات پر ایک ضربِ کاری ہے۔

دوسرے اس پہلو سے کہ کاہنوں کا یہ دعویٰ بالکل جھوٹ ہے کہ ان کا ربط ایسے جنّوں سے ہے جو آسمان کی خبریں معلوم کر کے ان کو بتاتے ہیں۔ غیب تک کسی کی بھی رسائی نہیں ہے۔ جو جنّات و شیاطین غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے آسمانوں میں گھات میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو کھدیڑنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ ان پر شہابِ ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ سورۂ صٰفّٰت میں اس کا ذکر یوں آیا ہے۔

اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ﴿الصّٰفّٰت: ۱۰﴾	مگر جو کوئی کچھ اچک لینے کی کوشش کرے تو اس کا تعاقب کرتا ہے ایک شہابِ ثاقب۔

اللہ تعالیٰ کے اس انتظام کا اعتراف خود جنّات نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ﴿الجن: ۹﴾	اور یہ کہ ہم آسمان کے ٹھکانوں میں غیب کی باتیں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو سننے کی کوشش کرے گا تو وہ اپنے لیے ایک شہاب کو گھات میں پائے گا۔

انہی ٹوٹنے والے ستاروں یا آسمانی راکٹوں کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ نے سورۂ واقعہ: ۷۵-۸۰، سورۂ حاقّہ: ۳۸-۴۳ اور سورۂ تکویر: ۱۵-۲۵ میں قرآن کریم کو شیطانی چھوت سے بالکل پاک اور بالاتر قرار دیا ہے اور یہ واضح فرمایا ہے کہ قرآن کی حریمِ قدس تک کسی جن و شیطان کو رسائی نہیں ہے۔ اگر کوئی وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو اس پر شہابِ ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ شیاطین نہ اس لوحِ محفوظ تک پہنچ سکتے ہیں جس میں قرآن محفوظ ہے، نہ اس جلیل القدر فرشتہ کو متاثر کر سکتے جو اس کو لے کر اترتا ہے اور نہ اس رسول ہی کو گمراہ کر سکتے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ شیاطین ان کاہنوں پر اترتے ہیں جو بالکل جھوٹے اور نابکار ہوتے ہیں اور محض لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے بھگل بناتے اور غیب دانی کے دعوے کرتے ہیں۔

بعض الفاظ کی وضاحت

قسم اور مُقسَم بہٖ کا تعلق سمجھ لینے کے بعد ان آیتوں کے الفاظ اور ان کے مفہوم کو بھی اچھی طرح سمجھ لیجیے تاکہ بات پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔

'مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى'۔ 'ضَلَّ' عام طور پر انسان کی اس گمراہی کے لیے آتا ہے جس کا تعلق بھول چوک یا فکر و اجتہاد کی غلطی سے ہو اور 'غَوٰى' کا تعلق اس گمراہی سے ہوتا ہے جس میں نفس کی اکساہٹ اور آدمی کے قصد و تعمّد کو بھی دخل ہو۔

لفظ 'صَاحِبُ' یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوا ہے اور ضمیر خطاب کے مخاطب قریش ہیں۔ ان کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ یہ پیغمبر جو تمہارے اپنے دن رات کے ساتھی ہیں تمہارے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔ تم ان کے ماضی و حاضر، ان کے اخلاق و کردار اور ان کے رجحان و ذوق سے اچھی طرح واقف ہو۔ تم نے کب ان کے اندر کوئی ایسی بات دیکھی ہے جس سے یہ شبہ بھی ہو سکے کہ ان میں کہانت یا نجوم کا کوئی میلان پایا جاتا ہے۔ اس طرح کا ذوق کسی کے اندر ہوتا ہے تو دن رات کے ساتھیوں سے وہ عمر بھر چھپا نہیں رہتا لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جو چیز اتنی مدت تک تم نے ان کے اندر کبھی محسوس نہیں کی اب جب انھوں نے نبوت کا دعویٰ کیا اور تم کو اللہ کا کلام سنایا تو تم نے ان کو کاہن اور نجومی کہنا شروع کر دیا حالانکہ ان کی زندگی اور ان کا کلام شاہد ہے کہ ان کے اندر کسی ضلالت یا غوایت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

'وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ'۔ 'عَنْ' یہاں منبع و منشا کا سراغ دینے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی جو کلام وہ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اس کا کوئی تعلق نفس اور اس کی خواہشوں سے نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر وحی ہے جو ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری ہدایت کے لیے اتاری جا رہی ہے۔ اس ٹکڑے میں کاہنوں اور نجومیوں پر تعریض ہے کہ ان کا کلام تو تمام تر ان کے نفس کی تحریک سے پیدا ہوتا ہے لیکن اس کلام کا منبع و مصدر اور ہے۔

جوہر جام جم از کان جہان دگر است

اس آیت میں اصلاً تو بیان قرآن کا ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی وحی کی حیثیت سے پیش کر رہے تھے چنانچہ آگے کی آیت 'اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى' سے اس کی وضاحت بھی ہو گئی ہے۔ لیکن نبی چونکہ معصوم اور اس کا ہر قول و فعل لوگوں کے لیے نمونہ ہوتا ہے اس وجہ سے عام زندگی میں بھی اس کی کوئی بات حق و عدل سے ہٹی ہوئی نہیں ہوتی اور اگر کبھی اس سے کوئی فروگزاشت صادر ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اصلاح فرما دیتا ہے۔

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَىٰ (۵)

حضرت جبریلؑ کی صفات

کلام اور صاحب کلام کی صفات بیان کرنے کے بعد یہ اس فرشتہ (حضرت جبریلؑ) کی صفت بیان ہو رہی ہے جس نے اس کلام کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دی۔ فرمایا کہ وہ 'شَدِيدُ الْقُوَىٰ' یعنی تمام اعلیٰ صفات اور صلاحیتوں سے بھرپور اور اس کی ہر صفت و صلاحیت نہایت محکم و مضبوط ہے۔ اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ کوئی دوسری روح اس کو متاثر یا مرعوب کر سکے، اس سے خیانت کا ارتکاب کرا سکے یا اس کی تعلیم میں کوئی خلط مبحث کر سکے یا اس سے کوئی فروگذاشت ہو سکے یا اس کو کوئی وسوسہ لاحق ہو سکے۔ اس طرح کی تمام کمزوریوں سے اللہ تعالیٰ نے اس کو محفوظ رکھا ہے تاکہ جو فرض اس کے سپرد فرمایا ہے اس کو وہ بغیر کسی خلل و فساد کے پوری دیانت و امانت کے ساتھ ادا کر سکے۔ سورۂ تکویر میں اس فرشتہ کی تعریف یوں آئی ہے: 'اِنَّهٗ

لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۔ (۱۹-۲۱)

(یہ ایک باعزت فرستادہ کی وحی ہے، وہ بڑی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک باررسوخ ہے۔ اس کی اطاعت کی جاتی ہے، مزید برآں وہ نہایت امین ہے)۔

'ذُوْ مِرَّةٍ'۔ یعنی وہ اپنی عقل اور اپنے کردار میں نہایت محکم ہے۔ اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ کوئی دھوکا کھا سکے یا کوئی اس کو دھوکا دے سکے یا وہ کسی کے ہاتھ بک سکے اور کوئی اس کو خرید سکے۔ یہ لفظ اخلاقی و عقلی برتری کے لیے آتا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ حضرت جبریلؑ کی یہ صفات کاہنوں اور نجومیوں کے مصدرِ الہام کی تحقیر ہی کے لیے نہیں بیان ہوئی ہیں بلکہ یہود اور ان کے ہم مشرب روافض نے، جیساکہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم اشارہ کر آئے ہیں، آپ پر نعوذ باللہ خیانت، جانب داری اور بے بصیرتی کا الزام لگایا ہے اور اسی بنا پر ان کو حضرت جبریل علیہ السلام سے ہمیشہ عداوت بھی رہی ہے جس کا حوالہ قرآن مجید میں موجود ہے۔

ذُوْ مِرَّةٍ ۭ فَاسْتَوٰى ۙ وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۭ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (۶-۱۰)

جبریلؑ کا طریقۂ تعلیم

'ذُوْ مِرَّةٍ' کا تعلق 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' سے ہے اس وجہ سے اس کی وضاحت ہم نے 'شَدِيْدُ الْقُوٰى' کے ساتھ ہی کر دی ہے۔ اب 'فَاسْتَوٰى' سے آگے اس تعلیم کے طریقہ کی وضاحت ہو رہی ہے جس کا ذکر اوپر 'عَلَّمَهٗ' کے لفظ سے ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس مقرب فرشتے نے نبی کو نہایت اہتمام، توجہ اور شفقت سے اس وحی کی تعلیم دی جو اللہ نے اس پر نازل کرنی چاہی۔ 'فَاسْتَوٰى' میں 'فَ' تفصیل کے لیے ہے، یعنی پہلے وہ اپنی اصل صورت میں، مستوی القامت ہو کر، نمودار ہوا۔ اس کے نمودار ہونے کی جگہ آسمان کی افقِ اعلیٰ میں تھی۔ 'اُفُقِ اَعْلٰى' سے مراد وہ افق ہے جو سمت راس میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی چیز سمت راس کے افق سے نمایاں ہوگی تو چودھویں کے چاند اور دوپہر کے سورج کی طرح وہ بالکل صاف، شفاف، جلی اور غیر مشتبہ صورت میں نظر آئے گی۔ اس کے برعکس مشرق یا مغرب یا شمال یا جنوب کے افق سے اگر کوئی چیز نمودار ہوگی تو وہ خفی صورت میں نمودار ہوگی جس طرح پہلی کا چاند نکلتا ہے۔ مقصود اس وضاحت سے یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ اپنی اصلی ہیئت میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے افقِ اعلیٰ کے اسٹیج پر نمودار ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھلی آنکھوں سے ان کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔

'ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى'۔ 'تَدَلّٰى' کے معنی جھک پڑنے یا لٹک آنے کے ہیں۔ یہ بیان ہے اس بات کا کہ اس کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینے کے قصد سے آپ کے قریب آئے اور جس طرح شفیق اور بزرگ استاد اپنے عزیز و محبوب شاگرد پر غایت شفقت سے جھک پڑتا ہے اسی طرح وہ آپ کے اوپر جھک پڑے۔ یعنی یہ نہیں ہوا کہ دور سے اپنی بات پھینک ماری ہو اور اس امر کی پروا نہ کی ہو کہ

آپ نے بات اچھی طرح سنی یا نہیں اور سنی تو سمجھی یا نہیں بلکہ پورے التفات و اہتمام سے اس طرح آپ کے کان میں بات ڈالی کہ آپ اچھی طرح سن اور سمجھ لیں۔ یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ کاہنوں کے شیاطین کا جو علم ہوتا ہے اس کو قرآن نے خَطِفَ الْخَطْفَةَ (الصّٰفّٰت: ۱۰) سے تعبیر کیا ہے یعنی اُچکی ہوئی بات، جس طرح چور اور اُچکے کوئی چیز اُچک لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب استاد اُچکے ہیں تو وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم بھی اُچکوں ہی کی طرح دیتے ہوں گے۔ قرآن نے یہاں حضرت جبریل علیہ السلام کے طریقۂ تعلیم کا اس لیے نمایاں فرمایا ہے کہ دونوں کا فرق اچھی طرح واضح ہو سکے۔

فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى۔ 'قاب'، کے معنی 'بقدر' کے ہیں یہ غایت قرب و اتصال کی تعبیر ہے۔ یعنی حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنے قریب ہو گئے کہ بس دو کمانوں کے بقدر یا اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔ اس تشبیہ میں اہلِ عرب کے ذوق کا بھی لحاظ ہے۔ اہلِ عرب تیر و کمان والے لوگ تھے اس وجہ سے غایت قرب کی تعبیر کے لیے ایک کمان یا دو کمانوں کے بقدر کی تشبیہ استعمال کرتے تھے، جس طرح ہم ایک گز یا دو گز کے الفاظ بولتے ہیں۔ 'اَوْ' یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ تشبیہ محض قرب کی تعبیر کے لیے ہے۔ یہ فاصلہ اس سے بھی کم ہو سکتا ہے۔

فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى۔ 'اَوْحٰی' کا فاعل اللہ تعالیٰ بھی ہو سکتا ہے اور حضرت جبریلؑ بھی۔ پہلی صورت میں مطلب بالکل واضح ہے کہ اس اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو وحی کرنی تھی وہ کی۔ دوسری صورت میں مضاف الیہ کی ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ ہو گا، یعنی اس توجہ اور اہتمام کے ساتھ جبریل علیہ السلام نے اللہ کے بندے کی طرف جو وحی کرنی تھی وہ کی یا وہ وحی کی جو اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ کو کرنے کے لیے ہدایت فرمائی۔ میرا رجحان پہلے قول کی طرف ہے، ویسے دوسرے قول میں بھی کوئی خاص قباحت نہیں ہے۔ بعض صوفیوں نے اس سے یہ بالکل غلط نتیجہ نکالا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ کا بندہ قرار دیا ہے۔ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ، مثالوں کی روشنی میں، واضح کرتے آ رہے ہیں کہ ضمیروں کے مرجع کا تعین قرینہ سے ہوتا ہے۔ انتشارِ ضمیر ہر صورت میں عیب نہیں ہے بلکہ بعض صورتوں میں اس سے ایجاز کا فائدہ ہوتا ہے جو کلامِ عرب میں داخلِ بلاغت ہے۔

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى (۱۱)

نبی صلعم کے مشاہدے کی تصدیق

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مشاہدے کی تصدیق و تصویب ہے کہ کوئی اس مشاہدے کو دل کی خیال آرائی اور نفس کے فریب پر محمول نہ کرے، یہ فریبِ نفس اور دھوکا نہیں بلکہ فی الحقیقت نبی کو یہ مشاہدہ ہوا ہے۔

ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے ان مشاہدات کا ذکر کیا تو مخالفین نے آپ کا مذاق اڑایا کہ جس قسم کے ارمان اس شخص کے دل میں لیے ہوئے ہیں اسی قسم کے خواب اس کو نظر آتے ہیں اور

یہ خواب کو حقیقت گمان کر کے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے ان کو سناتا پھرتا ہے، حالانکہ یہ تمام تر فریب نفس اور ذہن کی خیال آرائی ہے۔ قرآن نے اس الزام کی تردید مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ کی ہے، سورۂ تکویر کی تفسیر میں ان شاء اللہ اس پر مفصل بحث آئے گی۔

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى (۱۲)

یہ مخالفین کو مخاطب کر کے ان کو ملامت فرمائی ہے کہ کیا تم پیغمبرؐ سے اس کے مشاہدات پر جھگڑتے ہو؟ وہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھتا ہے اور کانوں سے سنتا ہے اس سے تم کو آگاہ کر رہا ہے۔ اگر یہ چیز تم کو نظر نہیں آتی تو اس سے نفسِ حقیقت باطل نہیں ہو جائے گی۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ یہ مخالفین اپنے کاہنوں کی تو ساری خرافات بے دریغ تسلیم کر لیتے تھے اس لیے کہ ان کی باتیں ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتی تھی لیکن پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ان کی خواہشوں کے خلاف تھی اس وجہ سے آپ کی مخالفت کے لیے طرح طرح کے شبہات پیدا کرتے تھے۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى (۱۳-۱۵)

دوسرا مشاہدہ

یعنی یہ بات نہیں ہے کہ پیغمبرؐ کو یہ مشاہدہ صرف ایک ہی بار ہوا ہو اس وجہ سے اس کو کوئی واہمہ یا مغالطہ قرار دیا جا سکے بلکہ اسی طرح انھوں نے دوبارہ بھی جبریلؑ کو سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا جس کے پاس ہی جنت الماویٰ بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنا جو مشاہدہ تمھارے سامنے وہ بیان کر رہے ہیں وہ مذاق اڑانے کی چیز نہیں بلکہ سنجیدگی سے غور کرنے کی چیز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں صرف دو ابتدائی مشاہدوں کا حوالہ ان لوگوں کے جواب میں دیا گیا ہے جنھوں نے شروع شروع میں آپ کے ان مشاہدات کا مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو دو ہی بار دیکھا۔ ان دو ابتدائی مشاہدات کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کا ظہور مختلف شکلوں اور مختلف اوقات میں تواتر کے ساتھ ہونے لگا، یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حضرت جبریلؑ کی آمد سے زیادہ کسی کی آمد معلوم و معروف تھی نہ محبوب و مطلوب۔

سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى

'سِدْرَةُ الْمُنْتَهٰى' وہ مقام ہے جہاں اس عالم ناسوت کی سرحدیں ختم ہوتی ہیں۔ 'سِدْرَة' بیری کے درخت کو کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ بیری کا درخت عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے درمیان ایک حدِ فاصل ہے۔ ہمارے لیے یہ سارا عالم نادیدہ ہے۔ نہ ہم عالم ناسوت اور عالم لاہوت کے حدود کو جانتے اور نہ ان دونوں کے درمیان کے اس نشانِ فاصل کی حقیقت سے واقف ہیں جس کو یہاں 'سدرۃ' سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ یہ چیزیں متشابہات میں داخل ہیں اس وجہ سے، قرآن کی ہدایت کے مطابق، ان پر ایمان لانا چاہیے، ان کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں ہے۔ ان کی حقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ جن کا علم راسخ ہوتا ہے ان کے علم میں ان چیزوں سے اضافہ ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جو ان کی حقیقت جاننے کے درپے ہوتے ہیں وہ ٹھوکر کھاتے اور گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

'عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی'۔ یہ 'سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی' کے مقام کی نشان دہی فرمادی کہ اس کے پاس 'جَنَّةُ الْمَاْوٰی' بھی ہے۔ 'جَنَّةُ الْمَاْوٰی' پر سورۂ سجدہ کی آیت ۱۹ کے تحت بحث گزر چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح 'سِدْرَۃُ الْمُنْتَھٰی' عالمِ ناسوت کی آخری حد پر ہے اسی طرح 'جَنَّةُ الْمَاْوٰی' عالمِ لاہوت کے نقطۂ آغاز پر ہے۔ اس نشان دہی سے یہ بات واضح ہوئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبریلؑ کا دوبارہ مشاہدہ دونوں عالموں کے نقطۂ اتصال پر ہوا۔

اِذْ یَغْشَی السِّدْرَۃَ مَا یَغْشٰی (۱۶)

مشاہدے کی کیفیت حیطۂ بیان سے باہر ہے

یہ اس مشاہدے کی کیفیت بیان ہوئی ہے کہ 'سدرۃ' کو چھائے ہوئے تھی جو چیز چھائے ہوئے تھی۔ یہ اسلوبِ بیان اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس وقت اس 'سدرۃ' پر انوار و تجلیات کا ایسا ہجوم تھا کہ ان کی تعبیر الفاظ کی گرفت میں نہیں آسکتی۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (۱۷)

تجلیات کے ہجوم میں پیغمبر کا قرار و سکون

جس طرح اوپر ارشاد ہوا ہے 'مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی' (۱۱) (جو کچھ اس نے دیکھا وہ دل کی خیال آرائی نہیں تھی) اسی طرح بیان فرمایا کہ اس مشاہدے کے موقع پر بھی نہ تو نگاہ بہکی اور نہ بے قابو ہوئی، بلکہ پیغمبر نے جو کچھ مشاہدہ کیا پورے قرار و سکون اور پوری دل جمعی کے ساتھ مشاہدہ کیا۔

'زیغ' کے معنی کج ہونے کے ہیں یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کسی جلوے کے مشاہدے میں اس کے صحیح زاویے سے کج نہیں ہوئی بلکہ آپ نے ہر چیز کا مشاہدہ اس کے بالکل صحیح زاویے سے کیا۔ 'طغٰی' کے معنی بے قابو ہونے کے ہیں۔ یعنی اگرچہ انوار و تجلیات کا ایسا ہجوم تھا کہ الفاظ اس کی تعبیر و تصویر سے قاصر ہیں لیکن آپ کی نگاہ ذرا بھی بے قابو نہیں ہوئی بلکہ آپ نے ہر چیز کا مشاہدہ اچھی طرح جم کر کیا۔

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی (۱۸)

اللہ تعالیٰ کی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ

یہ بیان ہے ان مشاہدات کا جو اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئے۔ فرمایا کہ اس نے اپنے رب کی بعض بڑی بڑی نشانیوں کا مشاہدہ کیا۔ ان نشانیوں کی کوئی تفصیل نہیں فرمائی کہ نہ الفاظ ان کے متحمل ہو سکتے اور نہ وہ ہماری عقل کی گرفت میں آسکتیں تاہم لفظ 'کُبْرٰی' دلیل ہے کہ یہ نشانیاں ان نشانیوں سے بالاتر تھیں جن کا مشاہدہ، آفاق و انفس میں، ہر قدم پر، ہر صاحبِ نظر کو ہوتا رہتا ہے۔ مفسرین نے ان سے وہ مشاہدات مراد لیے ہیں جو حضورؐ کو معراج کے موقع پر ہوئے۔ ان کی اس رائے کے حق میں یہ قرینہ موجود ہے کہ سورۂ اسراء میں ذکر ہے کہ اس موقع پر آپ نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیوں کے مشاہدے کیے۔ تاہم یہ امر ملحوظ رہے کہ آپ کو مشاہدہ صرف اپنے رب کی نشانیوں ہی کا ہوا، خود اللہ تعالیٰ کے مشاہدے کا کوئی اشارہ یہاں نہیں ہے۔

اب اس تمہیدی بحث کا خلاصہ بھی سامنے رکھ لیجیے تاکہ آگے کے مباحث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

جو لوگ قرآن کریم کو نجوم و کہانت کے قسم کی چیز قرار دے کر اس کی وقعت گھٹانی چاہتے تھے ان کو خطاب کر کے مندرجہ ذیل حقائق ان کے سامنے رکھے گئے ہیں۔

۱۔ یہ قرآن جس روزِ جزا و سزا سے تم کو آگاہ کر رہا ہے اس کو کوئی معمولی بات نہ سمجھو۔ یہ تمھارے کاہنوں اور نجومیوں کی ہفوات کی قسم کی کوئی چیز نہیں ہے جو اس کے پیش کرنے والے نے خود اپنے جی سے گھڑ لی ہو۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی وحی ہے جو اس نے سب سے زیادہ مقرب فرشتے کے ذریعہ سے اپنے اس خاص بندے پر اس لیے نازل کی ہے تاکہ وہ تھیں اس آنے والے دن سے، اس کے ظہور سے پہلے، اچھی طرح آگاہ کر دے۔

۲۔ جس فرشتہ کے ذریعہ سے یہ وحی آئی ہے وہ خدا کا نہایت مقرب فرشتہ ہے اس وجہ سے اس اہم ذمہ داری کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کا انتخاب فرمایا۔ وہ نہایت امین ہے، خدا کی امانت میں وہ کوئی خیانت نہیں کر سکتا۔ وہ نہایت قوی ہے، مجال نہیں ہے کہ کوئی دوسری طاقت اس کو مرعوب یا مغلوب کر سکے۔ وہ تمام اعلیٰ علمی و اخلاقی صفات سے متصف ہے، اس وجہ سے اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے کہ وہ کسی مغالطہ میں مبتلا ہو سکے یا کوئی اسے دھوکا دے سکے یا وہ کسی کی جانب داری یا کسی کی ناحق مخالفت کرے۔

۳۔ اس فرشتہ کو پیغمبرؐ نے دو بار نہایت وضاحت سے دیکھا ہے۔ پہلی بار اس کا مشاہدہ افقِ اعلیٰ میں ہوا اور دوسری بار سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ محض کوئی وہم تھا جو اس کو لاحق ہوا اور اس نے اس کو تمھارے سامنے بیان کر دیا۔

۴۔ فرشتہ نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو جو تعلیم دی وہ ایک شفیق استاد کی طرح نہایت قریب سے، اس کے دل پر جھک کر دی جس کو پیغمبرؐ نے اچھی طرح سنا اور سمجھا۔ یہ نہیں ہوا کہ دور سے اس کے کانوں میں کوئی آواز آ پڑی ہو جس کے سننے یا سمجھنے میں کوئی شبہ یا تردد لاحق ہوا ہو۔

۲۔ آگے آیات ۱۹-۳۰ کا مضمون

آگے مخالفین کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ تم کو اس اہتمام کے ساتھ روزِ جزا و سزا سے جو ڈرایا جا رہا ہے تو آخر کس بل بوتے پر اس سے بےخوف بیٹھے ہوا! کیا اپنی مزعومہ دیویوں ــــــ لات، عزّیٰ اور منات ــــــ کی سفارش کے بھروسہ پر! اگر اس وہم میں مبتلا ہو تو یاد رکھو کہ یہ تمھارے رکھے ہوئے محض فرضی نام ہیں جن کا کوئی مسمّیٰ موجود نہیں ہے۔ جزا و سزا ایک حقیقت ہے، حقیقت کا مقابلہ تم محض اٹکل پچو مفروضات سے نہیں کر سکتے۔ تم نے جو جھوٹی آرزوئیں اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں یہ محض تمھاری خواہشیں ہیں، ضروری نہیں کہ یہ پوری بھی ہو جائیں۔ دنیا اور آخرت کے سارے معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ کسی فرشتہ کا بھی یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور میں اس کے اذن کے بدون زبان ہلا سکے۔ جن لوگوں نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں اور ان کی سفارش کے بل پر قرآن کے انذار سے بالکل بے پروا ہیں انھوں نے

آخرت کی مسئولیت سے فرار کے لیے یہ ایک چور دروازہ نکالا ہے لیکن یہ چیز ذرا بھی ان کو نفع پہنچانے والی نہیں بنے گی۔ اللہ تعالیٰ نیک اور بد دونوں قسم کے لوگوں کو سب سے زیادہ خود جانتا ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۹-۳۰
اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَ الۡعُزّٰی ﴿۱۹﴾ وَ مَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی ﴿۲۰﴾ اَلَکُمُ
الذَّکَرُ وَ لَہُ الۡاُنۡثٰی ﴿۲۱﴾ تِلۡکَ اِذًا قِسۡمَۃٌ ضِیۡزٰی ﴿۲۲﴾ اِنۡ ہِیَ اِلَّاۤ
اَسۡمَآءٌ سَمَّیۡتُمُوۡہَاۤ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُکُمۡ مَّاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ بِہَا مِنۡ
سُلۡطٰنٍ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ مَا تَہۡوَی الۡاَنۡفُسُ ۚ وَ لَقَدۡ
جَآءَہُمۡ مِّنۡ رَّبِّہِمُ الۡہُدٰی ﴿ؕ۲۳﴾ اَمۡ لِلۡاِنۡسَانِ مَا تَمَنّٰی ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰہِ
الۡاٰخِرَۃُ وَ الۡاُوۡلٰی ﴿۲۵﴾ وَ کَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ ع ۵
شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ﴿۲۶﴾ اِنَّ
الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡاٰخِرَۃِ لَیُسَمُّوۡنَ الۡمَلٰٓئِکَۃَ تَسۡمِیَۃَ
الۡاُنۡثٰی ﴿۲۷﴾ وَ مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ ؕ اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَ اِنَّ
الظَّنَّ لَا یُغۡنِیۡ مِنَ الۡحَقِّ شَیۡئًا ﴿ۚ۲۸﴾ فَاَعۡرِضۡ عَنۡ مَّنۡ تَوَلّٰی ۬ۙ
عَنۡ ذِکۡرِنَا وَ لَمۡ یُرِدۡ اِلَّا الۡحَیٰوۃَ الدُّنۡیَا ﴿ؕ۲۹﴾ ذٰلِکَ مَبۡلَغُہُمۡ مِّنَ
الۡعِلۡمِ ؕ اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۙ وَ ہُوَ
اَعۡلَمُ بِمَنِ اہۡتَدٰی ﴿۳۰﴾

ترجمۂ آیات ۱۹-۳۰
بھلا، کبھی غور کیا ہے لات اور عزّٰی اور منات پر جو تیسری اور درجہ کے اعتبار سے دوسری ہے! تم اپنے لیے تو بیٹے پسند کرتے ہو اور اس کے لیے بیٹیاں! یہ تو بڑی ہی بھونڈی تقسیم ہوئی! یہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں،

اللہ نے ان کے حق میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ محض گمان اور نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس ان کے رب کی جانب سے نہایت واضح ہدایت آ چکی ہے۔ ۱۹-۲۳

کیا انسان وہ سب کچھ پالے گا جو وہ تمنا رکھتا ہے! سو یاد رکھو کہ آخرت اور دنیا سب خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ اور آسمانوں میں کتنے فرشتے ہیں جن کی سفارش ذرا بھی کام آنے والی نہیں مگر بعد اس کے کہ اللہ اجازت دے جس کو چاہے اور جس کے لیے پسند کرے۔ ۲۴-۲۶

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے انھی نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں۔ حالانکہ اس باب میں ان کو کوئی علم نہیں۔ وہ محض گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور گمان کسی درجے میں بھی حق کا بدل نہیں۔ تو تم ان لوگوں سے اعراض کرو جنھوں نے ہماری یاد دہانی سے اعراض کیا ہے اور جن کا مطلوب صرف دنیا کی زندگی ہی ہے۔ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔ تیرا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کے راستہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ یاب ہیں۔ ۲۷-۳۰

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ (۱۹-۲۰)

تذلیل و ملامت

سوال یہاں تعجب اور استخفاف و تحقیر کے لیے ہے۔ اوپر آپ نے حضرت جبریلؑ کی صفات ملاحظہ فرمائیں کہ وہ شَدِيدُ الْقُوَىٰ اور ذُو مِرَّةٍ ہیں۔ دوسرے مقام میں ان کی تعریف مُّطَاعٍ (التکویر: ۲۱) اور عِندَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ (التکویر: ۲۰) کے الفاظ سے بھی آئی ہے۔ ان صفات کے مضمرات کے بعض پہلوؤں کی طرف ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں۔ یہاں ان کا ایک اور خاص پہلو بھی قابل توجہ ہے جو اس آیت کے تحقیر آمیز اسلوبِ کلام سے سامنے آتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ حضرت جبریلؑ کی یہ صفات نہایت اعلیٰ مردانہ صفات

ہیں۔ گویا قریش کو اس جلیل القدر فرشتہ کی ان صفات کا حوالہ دے کر ملامت کی گئی ہے کہ نادانو! کہاں یہ اعلیٰ مردانہ صفات کے ملائکہ اور کہاں تمہاری یہ دیویاں ــــــ لات، عزّیٰ اور منات ــــــ جن کی نسبت تمہارا یہ گمان ہے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں اور جن کے نام تم نے عورتوں کے نام پر رکھ چھوڑے ہیں!

مشرکین کی تینوں عالی مرتبہ دیویاں

آگے کی آیات سے واضح ہو جائے گا کہ یہ تینوں فرشتوں کے بت تھے۔ فرشتوں کی نسبت، جیساکہ جگہ جگہ اس کتاب میں وضاحت ہو چکی ہے، مشرکین عرب کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی ہر بات مانتا ہے اس وجہ سے وہ اپنے پجاریوں کو اس دنیا میں بھی رزق و اولاد دلواتی ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی یہ ان کو بخشوا لیں گی۔ خاص طور پر ان تینوں دیویوں کا ان کے ہاں بڑا مرتبہ تھا۔ ان کی سفارش بے خطا سمجھی جاتی تھی۔ ان کی نسبت ان کا عقیدہ تھا کہ 'تلک الغرانیق العُلٰی وان شفاعتھن لتُرتجٰی' یہ بڑے مرتبے کی دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی قبولیت کی پوری امید ہے۔

اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے کہ قبائلِ عرب میں سے کون ان میں سے کس کو پوجتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی خاص قبیلہ کو ان میں سے کسی ایک کے ساتھ کچھ زیادہ خصوصیت رہی ہو لیکن ان کی عظمت تمام مشرکین کے نزدیک یکساں مسلّم تھی۔ قریش نے سارے عرب پر اپنی سیاسی و مذہبی پیشوائی کی دھاک جمانے کے لیے تمام دیویوں دیوتاؤں کی مورتیاں خانۂ کعبہ میں بھی جمع کر چھوڑی تھیں۔ ان تینوں دیویوں کے پجاریوں کی تعداد چونکہ سارے عرب میں سب سے زیادہ تھی اس وجہ سے قریش بھی ان کی سب سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔

ان دیویوں میں فرقِ مراتب

قرآن کے بیان سے یہ بات بھی واضح ہے کہ یہ تینوں دیویاں اس اعتبار سے اگرچہ ایک ہی زمرے سے تعلق رکھنے والی تھیں کہ یہ سب عالی مرتبہ خیال کی جاتی تھیں تاہم ان میں باہم فرقِ مراتب بھی تھا۔ لات اور عزّیٰ کا مرتبہ سب سے اونچا تھا۔ 'منات' اگرچہ زمرہ میں انہی کے اندر شمار ہوتی تھی لیکن مرتبے کے لحاظ سے یہ ان سے فروتر تھی۔ چنانچہ قرآن نے اس کا ذکر دو صفتوں کے ساتھ کیا ہے۔ ایک 'الثالثۃ' اور دوسری 'اُخْرٰی'۔ پہلی صفت اس کے زمرے کا پتہ دیتی ہے کہ یہ انہی تین کی تیسری ہے؛ دوسری صفت 'اخرٰی' اس کے درجے کا پتہ دیتی ہے کہ ہرچند یہ شامل تو انہی میں تھی لیکن یہ دوسرے نمبر پر تھی۔ 'اولٰی' اور 'اخرٰی' کے الفاظ درجے کو واضح کرنے کے لیے عربی زبان میں بھی معروف ہیں اور اس مفہوم کے لیے قرآن میں بھی یہ آئے ہیں: 'وَقَالَتْ اُوْلٰىھُمْ لِاُخْرٰىھُمْ' (الاعراف: ۳۹) والی آیت میں اس کی نظیر موجود ہے۔

ان ناموں کے اشتقاق سے متعلق بعض اشارات

ان ناموں کے اشتقاق اور ان کے معانی سے متعلق جو بحثیں تفسیر کی کتابوں میں آئی ہیں ان کا بیشتر حصہ بے بنیاد ہے۔ ہمارے نزدیک 'اللّٰت' کو 'الْاِلٰھَة' کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ جس طرح معبودِ اعظم کے لیے 'اللہ' تھا اسی طرح بڑی دیوی کے لیے انھوں نے 'الْاِلٰھَة' اختیار کیا جس کو عوام نے اپنے کثرتِ استعمال سے 'اللّٰت' بنا دیا۔ بعض لوگوں نے اس کو 'لَتّ' کے مادہ سے لیا ہے جس کے معنی گوندھنے اور لت کرنے کے ہیں۔ ان کا گمان یہ ہے کہ یہ ایک شخص تھا جو زمانۂ حج میں حاجیوں کو ستو گھول کر پلایا کرتا تھا۔ اس کے

مرنے کے بعد لوگوں نے اس کی قبر کی پوجا شروع کر دی اور اس نام سے وہ ایک معبود بن گیا۔ یہ رائے اشتقاق کے قاعدے کی رُو سے بھی غلط ہے اور قرآن کی تصریحات کے بھی خلاف ہے۔ قرآن کے بیان سے یہ بات واضح ہے کہ یہ دیویوں کے بُت تھے اور یہ دیویاں فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ کر بنائی گئی تھیں۔

'عُزّیٰ' ظاہر ہے کہ 'عزیز' اور 'اَعَزّ' کی مونث ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں 'عزیز' ایک نمایاں صفت ہے جو اس کی عزت و عظمت کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی پہلو سے اس دیوی کے لیے 'عُزّیٰ' کا نام اختیار کیا گیا۔

'مَنَاۃ' میرے نزدیک 'مُنْیَۃ' کے مادہ سے بنایا ہوا نام ہے جس کے معنی ہوں گے وہ دیوی جس کے قرب کی آرزو کی جائے یا جو آرزوؤں کے بر آنے کا ذریعہ ہو۔

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ۝ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى (۲۱-۲۲)

ستم بالائے ستم!

ان فقروں کا اسلوب طنزیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے لیے تو لڑکے پسند کرتے ہو اور لڑکیوں سے اس درجہ نفرت کرتے ہو کہ جس کے ہاں لڑکی پیدا ہو جائے وہ شرم سے لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے، تو جب لڑکیوں سے متعلق تمہارے احساسات یہ ہیں تو کم از کم اپنے رب پر اتنا کرم تو کیا ہوتا کہ جس چیز کو اپنے لیے اس درجہ ناپسند کرتے ہو وہ اس کی گود میں نہ ڈالتے! آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ پیدا تو ہر چیز اللہ نے کی لیکن بیٹیاں تم اس کے حصے میں ڈالو اور بیٹے اپنے حصہ میں۔ یہ تقسیم تو نہایت غیر منصفانہ اور بھونڈی تقسیم ہوئی! عدل و انصاف کا بدیہی تقاضا تو یہ تھا کہ جو چیز تم اپنے لیے ناپسند کرتے اس کو اپنے رب سے منسوب نہ کرتے۔

'ضِیْزٰی' کے معنی ہیں عدل و انصاف سے ہٹا ہوا معاملہ۔ 'ضَازَہٗ' کے معنی ہوں گے ظلمہٗ اس نے اس کے اوپر ظلم کیا، اس کے ساتھ ناانصافی کی۔

مطلب یہ ہے کہ اول تو خدا سے بیٹے بیٹیاں منسوب کرنا ہی اس کی شانِ الوہیت کے بالکل منافی اور عقل و فطرت کے بالکل خلاف ہے لیکن تم نے ستم پر ستم یہ کیا ہے کہ اس سے منسوب وہ چیز کی ہے جس کو خود اپنے لیے شرم کی چیز خیال کرتے ہو گویا اللہ کا مرتبہ تمہارے نزدیک تم سے بھی فروتر ہے۔

اِنْ هِىَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى (۲۳)

نام جن کا کوئی مسمّٰی نہیں ہے

یہ ان دیویوں کی حقیقت واضح فرمائی کہ یہ محض تمہارے اور تمہارے باپ دادا کے رکھے ہوئے نام ہیں جن کا کوئی مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ 'مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ' ان کے حق میں اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری جو تم اپنی تائید میں پیش کر سکو۔ اگر تم نے اپنے باپ دادا کو ان کو پوجتے پایا تو یہ بھی کوئی دلیل نہیں ہوئی۔ انھوں نے بھی اسی طرح اپنے اگلوں کی اندھی تقلید کی جس طرح تم کر رہے ہو۔ خدا کی اتاری ہوئی دلیل ہو سکتی تھی تو یہ کہ تمہاری عقل و فطرت میں ان کے لیے کوئی گواہی موجود ہوتی یا آفاق و انفس کے دلائل سے

ان کی تائید ہوتی یا اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے یہ خبر دی ہوتی کہ فلاں اور فلاں میری چہیتی بیٹیاں ہیں، میں ان کی سفارش لازماً قبول کروں گا اور ان کی پرستش کرنے والوں کو ضرور بخش دوں گا۔ جب اس طرح کی کوئی چیز بھی ان کے حق میں موجود نہیں ہے تو یہ محض تمہاری اور تمہارے باپ دادا کی اپنی گھڑی ہوئی دیویاں ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔

'اِنۡ یَّتَّبِعُوۡنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَہۡوَی الۡاَنۡفُسُ ۚ وَلَقَدۡ جَآءَہُمۡ مِّنۡ رَّبِّہِمُ الۡہُدٰی'۔ اوپر کے ٹکڑے میں اسلوبِ کلام خطاب کا تھا۔ اس میں اسلوب غائب کا ہو گیا ہے۔ یہ ان کی محرومی اور بدبختی پر ان کو ملامت اور ان کی ذہنی پستی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اللہ نے تو ان کی رہنمائی کے لیے خاص اپنے پاس سے ہدایت اتاری لیکن ان کا حال یہ ہے کہ یہ اللہ کی نازل کردہ ہدایت کی جگہ اپنے گمان اور اپنے نفس کی خواہشوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ اللہ کی ہدایت کے مقابل میں خواہشِ نفس کی پیروی

لفظ 'الھدیٰ' یہاں اس ہدایت کے لیے استعمال ہوا ہے جو قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی اور جس کی عظمت و طہارت کا ذکر تمہید کی آیتوں میں ہوا ہے۔ 'ظن' اور خواہشِ نفس کی پیروی یوں تو کسی حال میں بھی خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن خدا کی ہدایت کے موجود ہوتے ان کی پیروی کرنا اپنے آپ کو پورے دن کی روشنی میں ہلاکت کے کھڈ میں گرانا ہے۔

'مَا تَہۡوَی الۡاَنۡفُسُ' سے یہاں اشارہ خاص طور پر ان کی اس بدعتِ شرک کی طرف ہے جو زیرِ بحث ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بدعت کی بنیاد انسان کے نفس کی کسی نہ کسی خواہش پر ہوتی ہے۔ جب انسان کا نفس کسی حقیقت کے تقاضے پورے کرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا اور اس کا انکار بھی اس کے لیے آسان نہیں ہوتا تو وہ کوئی ایسی شکل اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ بظاہر اس کا انکار بھی نہ ہو اور اس کے اقرار سے جو بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان سے فرار کی کوئی آسان راہ بھی نکل آئے۔ آپ جس بدعت پر بھی غور کیجیے اس کی تہ میں خواہشِ نفس کا یہ خناس آپ کو چھپا ہوا ملے گا۔ ہر بدعت خواہشِ نفس سے وجود میں آتی ہے

ان دیویوں کے حق میں ظاہر ہے کہ کوئی عقلی یا نقلی دلیل موجود نہیں تھی، لیکن جزا اور سزا کی ہر خلش سے مامون کر دینے کے لیے شیطان نے ان مشرکین کو یہ فریب دیا کہ فرشتے خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ خاص طور پر اس کی فلاں اور فلاں بیٹیاں اس کو بہت محبوب ہیں۔ وہ ان کی ہر بات سنتا اور مانتا ہے۔ اس کے حضور میں ان کی ہر سفارش تیر بہدف ہے اس وجہ سے جو ان کی جے پکاریں گے اور ان کے تھانوں پر قربانی پیش کر دیا کریں گے، ان کو وہ خدا سے سفارش کر کے، اس دنیا میں بھی رزق و اولاد سے بہرہ مند کرائیں گی اور اگر آخرت کا کوئی مرحلہ پیش آیا تو وہاں بھی ان کو بڑے درجے دلوائیں گی۔ دیکھیے دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی کیسی آسان راہ نکل آئی اور آخرت کے حساب و کتاب اور جزا و سزا کا ہر خطرہ کیسی آسانی سے دور ہو گیا!

رند کے رند رہے ، ہاتھ سے جنت نہ گئی

لیکن غور کیجیے کہ خواہشِ نفس کے سوا اور کیا چیز ہے جس پر اس ساری میتھالوجی (MYTHOLOGY) کی بنیاد ہو۔ نفس نے چاہا کہ خدا کے تقرب اور اس کی جنت کے حصول کی کوئی ایسی راہ نکل آئے جس میں اپنی کسی خواہش کی قربانی نہ دینی پڑے۔ شیطان نے یہ راہ نکال دی۔

اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ۖ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى (۲۴-۲۵)

خواہشیں حقائق کو نہیں بدل سکتیں

یہ اسی اوپر والی بات پر اظہارِ تعجب بھی ہے اور اس پر تبصرہ بھی۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنی خواہشوں اور تمناؤں کی رہنمائی میں، اپنے جی کو خوش رکھنے کو، جو فلسفہ چاہو بنا ڈالو لیکن ضروری نہیں کہ تمھاری ہر تمنا اور خواہش پوری بھی ہو جائے۔ حقیقت اور خواہش میں بڑا فرق ہے۔ جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تب دیکھ لو گے کہ تم جو خیالی محل تعمیر کرتے رہے ہو اس کی بنیاد ریت پر تھی۔ تمھارے یہ معبود ذرا بھی کسی کے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ ہر ایک کو سابقہ اپنے اعمال سے پیش آئے گا۔ جس کے نیک اعمال کی میزان بھاری ہوگی وہ جنت میں جائے گا اور جس کی میزان ہلکی ہوگی وہ دوزخ میں جھونک دیا جائے گا، خواہ کوئی ہو۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ جس طرح مشرکین نے اپنے ان دیویوں دیوتاؤں کے بل پر بہت سی بے بنیاد تمنائیں اپنے دلوں میں پال رکھی تھیں اسی طرح یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں نے بھی اپنے دلوں میں بہت سی جھوٹی آرزوئیں پال رکھی ہیں جو محض خواہشِ نفس کی ایجاد سے وجود میں آئی ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کی ان بے بنیاد آرزوؤں کی، جس کو قرآن نے 'امانی' سے تعبیر کیا ہے، تفصیل سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ مسلمانوں نے ان کی تقلید میں جو عقیدے کتاب و سنت کے بالکل خلاف ایجاد کیے ہیں ان پر مفصل بحث ہم نے اپنی کتابوں ——— حقیقتِ شرک اور حقیقتِ توحید ——— میں کی ہے۔

قرآن نے اس آیت میں لفظ 'انسان' سے خطاب کر کے گویا بلا استثناء سب کو آگاہی دی ہے کہ آرزوئیں اور تمنائیں جس کا جو جی چاہے پال رکھے لیکن یاد رکھے کہ کسی کی آرزوؤں کی خاطر نہ حقائق میں کوئی تبدیلی ہوگی اور نہ خدا کا قانون سرمو کسی کی جانب داری کرے گا۔

'فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى' یعنی اگر کوئی اس طمعِ خام میں مبتلا ہے کہ کسی کی خواہشوں کی خاطر خدا کی کسی سنت یا اس کے کسی قانون میں کوئی تبدیلی ہو جائے گی تو وہ اچھی طرح کان کھول کر سن لے کہ دنیا اور آخرت دونوں کلیتہً خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ کسی کا بھی یہ مرتبہ نہیں کہ اس کے اذن کے بدون کوئی سفارش کر سکے یا اس کے کسی قانون یا فیصلہ کو تبدیل کرا سکے۔

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰى (۲۶)

اذنِ الٰہی کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکتا

یہ اسی اوپر والے ٹکڑے کی مزید وضاحت ہے کہ ان مشرکین کی ان دیویوں کا تو کیا ذکر آسمانوں میں

کتنے ہی فرشتے، بڑے اور چھوٹے، موجود ہیں جن کی شفاعت ذرا بھی کسی کے کام آنے والی نہیں ہے مگر یہ کہ اللہ ان میں سے کسی کو کسی کے باب میں شفاعت کی اجازت دے۔ اول تو کوئی خدا کے اذن کے بغیر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا اور جو اذن کے بعد زبان کھولے گا بھی تو صرف اسی کے باب میں کھولے گا جس کے لیے خدا یہ پسند فرمائے کہ اس کی سفارش کی جائے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰی (۲۷)

شرک کی دیو مالا کے مصنفین

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ کون لوگ ہیں جنھوں نے یہ ساری دیو مالا گھڑی ہے۔ فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی ہیں تو اس کی اصل حقیقت، یعنی اس بات پر ان کا ایمان نہیں ہے کہ وہ دن خدا کے کامل عدل کے ظہور کا دن ہو گا اور ہر ایک ٹھیک اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جنھوں نے فرشتوں کے نام عورتوں کے نام پر رکھ کر یہ دیو مالا تصنیف کی ہے کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں، انہی کی سفارش سے اس دنیا کی نعمتیں بھی حاصل ہوتی ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو یہی اس دن بھی ہمارا مرجع بنیں گی اور ہمیں وہ سب کچھ دلوائیں گی جو ہم چاہیں گے۔

وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْـًٔا (۲۸)

شرک کی تمام تر بنیاد ظن پر ہے

فرمایا کہ آخرت کی ذمہ داریوں سے اپنے کو بچانے کے لیے انھوں نے یہ افسانہ ایجاد تو کر ڈالا لیکن اس کی بنیاد کسی علم پر نہیں بلکہ محض ظن پر ہے۔ محض اپنی خواہشِ نفس کو حقیقت بنانے کے لیے یہ اٹکل کے تیر تکے چلائے گئے ہیں۔ ان نادانوں کو خبر نہیں کہ اٹکل بہرحال اٹکل ہے، یہ حق و حقیقت کا بدل کسی درجے میں نہیں ہو سکتی۔ جب حقیقت ظاہر ہو گی تب ان کو پتہ چلے گا کہ یہ عمر بھر محض خواب دیکھتے رہے ہیں۔

ظن اور علم میں فرق

لفظ 'ظن' آیت ۲۳ میں 'الھدیٰ' کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ 'علم' کے مقابل کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے اور حق کے مقابل کی حیثیت سے بھی۔ علم انسان کو اس کی فطرت اور عقل کی راہ سے بھی حاصل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ وحی سے بھی۔ جو علم اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ در اصل 'الھدیٰ' کا درجہ رکھتا ہے اس لیے کہ وہ ہر شبہ سے بالا ہوتا ہے چنانچہ یہاں اس کو حق سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس بات کے حق میں نہ فطرت اور عقل کی گواہی موجود ہو نہ وحی کی شہادت وہ سر تا سر ظن ہے اور یہ بالکل باطل ہے۔ قرآن نے یہاں 'وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ' فرما کر ان مشرکین کے اس ساری دیو مالا کو علم کے ہر سہارے سے محروم، ایک بالکل من گھڑت افسانہ قرار دیا ہے۔ یعنی داس کی تائید میں ان کے پاس عقل کی کوئی دلیل ہے اور نہ وحی کی۔ اہل عرب اس حقیقت سے اچھی

طرح واقف تھے کہ جس بات کے حق میں کوئی دلیل نہ ہو وہ علم نہیں بلکہ ظن ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں۔
ایک شاعر نے 'ظن' اور 'علم' کے اس فرق کی طرف یوں اشارہ کیا ہے۔

وَاعلمُ عِلمًا لیس بالظن انہٗ

(اور میں ایک علم پر مبنی بات جانتا ہوں جو ظن نہیں کہ ....)

لفظ 'ظن' کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کی وضاحت ان شاءاللہ ہم آیت 'اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ' (الحاقۃ: ۲۰) کے تحت کریں گے۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی ۵ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا (۲۹)

ہدایت سے اعراض کرنے والوں سے اعراض کی ہدایت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جو لوگ ایسے سرپھرے ہیں کہ اللہ کی ہدایت کے مقابل میں اپنی ہوائے نفس کی، علم کے مقابل میں ظن کی اور حق کے مقابل میں باطل کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، تم ان کے زیادہ درپے نہ ہو۔ جب انھوں نے ہماری یاددہانی سے منہ پھیر لیا تو تم بھی ان سے اعراض کرو۔ تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب ذمہ داری ان کی ہے۔ یہ اس کا انجام خود دیکھیں گے۔

'ذکر' سے مراد یہاں قرآن مجید ہے۔ یہ لفظ قرآن کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی طرف ہم مختلف مقامات میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اس لیے استعمال ہوا ہے کہ قرآن ان لوگوں کو آخرت اور اس کی ذمہ داریوں کی یاددہانی کر رہا ہے جو چند فرضی دیویوں کی سفارش کے بل پر اس سے بالکل بےخوف بیٹھے ہیں۔

'وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا' یہ ان کے اس اعراض کی اصل علت کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کا مقصود صرف اس دنیا اور اس کی مرغوبات کو بنا لیا ہے۔ ان سے ہٹ کر کسی اور چیز پر غور کرنے کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے۔

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ط اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ لا وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى (۳۰)

دنیا پرستوں کی تنگ نگاہی

یعنی ان لوگوں کے علم کی رسائی بس اس دنیا کے ظاہر ہی تک ہے، اس ظاہر کے پیچھے جو حقیقت پوشیدہ ہے اس تک ان کی رسائی نہ ہے اور نہ یہ اس کے طالب ہیں۔ حالانکہ اصل چیز وہی ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ دنیا ایک اندھیر نگری اور ایک بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے۔ حالانکہ اس کے ہر گوشے سے اس کے خالق کی قدرت و حکمت ایسی واضح ہے کہ ایک بلید کے سوا کوئی اس کے انکار کی جرأت نہیں کر سکتا اور ایک قدیر و حکیم ذات سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اتنا بڑا کارخانہ محض ایک کھیل کے طور پر بنا ڈالے۔

'ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ' کے اسلوب بیان سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ محض ان کی تنگ نظری اور تنک ظرفی ہے کہ یہ اس کے ظاہر پر ریجھ کر اس کے باطن سے بےپروا ہو بیٹھے حالانکہ اس کی تمام ظاہری رونقیں

عارضی اور فانی ہیں۔ اصل ابدی بادشاہی تو اس کے پیچھے ہے جس کے لیے قرآن ان کو دعوت دے رہا ہے لیکن یہ اپنی پست ہمتی اور محرومی کے سبب سے اس کا حوصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ اس پہلو کی وضاحت یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (الروم: ۷) والی آیت میں ہوئی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ لا وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور ان سرگشتگانِ دنیا کو تہدید و وعید ہے۔ حضورؐ کو خطاب کر کے ارشاد ہے کہ تم اب ان کو نظر انداز کرو۔ تمہارا رب ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور ان سے بھی اچھی طرح باخبر ہے جنھوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ اس کا علم سب کو محیط اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے۔ نہ وہ لوگ اس کی پکڑ سے بچ سکیں گے جو اس کی راہ سے برگشتہ ہیں اور نہ وہ لوگ اس کی نصرت و رحمت سے محروم رہیں گے جو اس کی راہ میں ہر قسم کے آلام کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ — دنیا پرستوں کو تہدید

۴- آگے آیات ۳۱-۵۵ کا مضمون

آگے اسی مضمون کو جو اوپر والے پیرے میں بیان ہوا ہے مزید واضح اور موکد فرمایا ہے۔

پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے قبضہ میں ہے۔ تمہارے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں میں سے کسی کو بھی اس نے اپنا شریک نہیں بنایا ہے کہ وہ اس کے عدل و انصاف پر اثر انداز ہو سکے، چنانچہ وہ لازماً ان لوگوں کو سزا دے گا جو گناہوں کے مرتکب ہوں گے اور ان لوگوں کو صلہ دے گا جو نیکی کی زندگی بسر کریں گے۔ رہے وہ لوگ جو اپنے سفارشیوں یا اپنے حسب و نسب یا بزرگوں کے ساتھ اپنی نسبت کے بل پر یا حرم اور حجاج کی چند ظاہری خدمتیں انجام دے کر، اپنے منہ میاں مٹھو بنے پھر رہے اور اپنے آپ کو جنت کا پیدائشی حق دار سمجھ رہے ہیں، ان سب کو خدا جہنم میں بھر دے گا۔ اس کی پکڑ سے صرف وہی بچیں گے جو کھلی ہوئی حق تلفیوں اور بے حیائیوں سے بچتے رہیں گے۔ اس طرح کے لوگوں سے اگر کوئی برائی وقتی طور پر صادر ہو جائے گی تو توبہ و اصلاح کے بعد اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ اس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ جو لوگ اپنی برتری اور تقدس کے زعم میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ خواہ ان کے اعمال کچھ ہی ہوں، اللہ تعالیٰ ان پر ہاتھ نہیں ڈالے گا، انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ جانتا ہے کہ ان کی خلقت کس چیز سے ہوئی ہے۔ مٹی، کیچڑ اور نجس پانی کی بوند سے پیدا ہوئی مخلوق کو اپنی پاک دامنی اور برتری کی حکایت زیادہ نہیں بڑھانی چاہیے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی بر خود غلطی پر تعجب کیا ہے جو خدا کی راہ میں دینے دلانے کا تو کوئی حوصلہ نہیں رکھتے لیکن ابراہیمؑ و موسٰیؑ سے نسبت رکھنے کے زعم میں یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ آخرت میں ان کے

لیے اونچے اونچے مراتب محفوظ ہیں حالانکہ ابراہیمؑ و موسیٰؑ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ نمایاں تعلیم یہی ہے کہ آخرت میں کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، بلکہ ہر ایک کے آگے اس کی اپنی کمائی ہی آئے گی۔

اس کے بعد یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خوشی اور غم، زندگی اور موت، رزق اور اولاد، غنیٰ اور فقر سب خدا ہی کے اختیار میں ہے اس وجہ سے ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ جن لوگوں نے موسم بہار میں طلوع ہونے والے شِعریٰ کو معبود بنا رکھا ہے کہ بہار کی رونقیں اس کی بخشش سے حاصل ہوتی ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ شِعریٰ کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اس کے بعد پچھلی قوموں کا بالاجمال حوالہ دے کر قریش کو تنبیہ فرمائی ہے کہ یہ قومیں بھی انہی گمراہیوں میں مبتلا ہوئیں جن میں تم مبتلا ہو تو ان کے انجام اور ان کی تاریخ سے سبق حاصل کرو اور خدا کے غضب کو دعوت نہ دو ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۱-۵۵ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ
اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ﴿۳۱﴾
اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ
وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ
وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ
ع ۲ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ﴿۳۲﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى
قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ
لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰٓى ﴿۳۷﴾
اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا
سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ
الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ
وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ

الذَّكَرَ وَالْأُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ عَلَيْهِ
النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ
هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾ وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَاۡ فَمَآ
اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَ
اَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾

ترجمۂ آیات ۳۱-۵۵

اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے کہ وہ بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے بُرے کام کیے ہیں ان کے کیے کا اور بدلہ دے ان لوگوں کو جنھوں نے اچھے کام کیے ہیں اچھا۔ یعنی ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے بچتے رہے مگر یہ کہ کبھی کسی برائی پر پاؤں پڑ گئے۔ سو تیرے رب کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ تم کو خوب جانتا ہے جب کہ اس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی شکل میں رہے۔ تو اپنے کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ۔ وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے۔ ۳۱-۳۲

بھلا اس کو دیکھا جس نے اعراض کیا، تھوڑا سا دیا پھر رک گیا۔ کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے۔ کیا اس کو خبر نہیں ملی اس بات کی جو موسیٰ اور ابراہیم کے جس نے اپنے قول پورے کر دکھائے صحیفوں میں ہے کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی اور یہ کہ انسان کے لیے وہی ہے جو اس نے کمائی کی ہوگی اور یہ کہ اس کی کمائی عنقریب ملاحظہ کی جائے گی، پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ سب کا

منتہیٰ تیرے رب ہی کی طرف ہے۔ ۴۲-۴۳

اور بے شک وہی ہے جو ہنساتا اور رلاتا ہے اور وہی ہے جو مارتا اور زندہ کرتا ہے اور وہی ہے جس نے جوڑے کے دونوں فرد، نر اور ناری پیدا کیے ایک بوند سے جب کہ وہ ٹپکا دی جاتی ہے اور بے شک دوبارہ اٹھانا اس کی ذمہ داری ہے اور اسی نے غنی اور سرمایہ دار کیا اور وہی شعریٰ کا بھی رب ہے۔ ۴۳-۴۹

اور اسی نے ہلاک کیا عادِ اوّل کو اور ثمود کو بھی، پس کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا اور قومِ نوح کو بھی ان سے پہلے۔ بے شک وہ نہایت ظالم اور سرکش تھے اور الٹی ہوئی بستیوں کو بھی دے مارا، پس اُن کو ڈھانک لیا جس چیز نے ڈھانک لیا تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کے باب میں جھگڑتے رہوگے۔ ۵۰-۵۵

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى (۳۱)

خدا کی بادشاہی میں کسی کی حصہ داری نہیں

اوپر کی آیات میں شرک و شفاعت کی جو تردید فرمائی ہے یہ اس کا نتیجہ سامنے رکھ دیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے۔ کسی اور کی حصہ داری ان کے اندر نہیں ہے کہ وہ خدا کے اقتدار کو چیلنج کر سکے یا اس کی مشیّت میں کوئی مداخلت کر سکے یا اس کے ارادوں اور فیصلوں پر کسی پہلو سے اثر انداز ہو سکے۔

'لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ ...... الاٰیۃ' یہ 'ل' بیانِ علّت کے لیے نہیں بلکہ بیانِ نتیجہ کے لیے ہے مطلب یہ ہے کہ جب تنہا وہی مالک و مختار ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ اپنے مزعومہ شرکاء اور سفارشیوں کے اعتماد پر میٹھی نیند سو رہے ہیں وہ محض فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ اللہ تعالیٰ عادل و حکیم ہے، وہ ان لوگوں کو ضرور سزا دے گا جو گناہوں کے مرتکب ہوں گے اور کوئی نہیں ہے جو ان کو خدا کی پکڑ سے بچا سکے۔ اسی طرح لازماً وہ ان لوگوں کو، جنھوں نے نیکی اور نیکوکاری کی زندگی گزاری ہوگی، نہایت

ہی اچھا صلہ عطا فرمائے گا اور اس صلہ کے حصول کے لیے انھیں کسی دوسرے کی سفارش کی مطلق ضرورت نہیں ہوگی۔

اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بروں کے سامنے تو صرف ان کے برے اعمال کی حقیقت آئے گی، جو کچھ انھوں نے کیا ہوگا وہ بے کم و کاست ان کے سامنے رکھ دیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس پر کوئی اضافہ نہیں کرے گا لیکن نیکوں کو صرف ان کی نیکیوں کا صلہ ہی نہیں ملے گا بلکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و انعام بھی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے اس وجہ سے وہ کسی کے ساتھ کوئی ناانصافی نہیں کرے گا لیکن وہ صاحب جود و فضل بھی ہے اس وجہ سے اپنے نیک بندوں کو ان کے حق سے زیادہ بھی بخشے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۳۲)

انسان سے اللہ تعالیٰ کا اصل مطالبہ

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک وہ ہیں جو بڑے گناہوں اور کھلی ہوئی بے حیائیوں سے بچنے والے ہیں۔ ان سے اگر کوئی برائی صادر ہوتی ہے تو اس کی نوعیت بس یہ ہوتی ہے کہ گویا چلتے چلتے کسی گندگی پر پاؤں پڑ گئے۔ وہ کبھی ٹھوکر کھا کر کسی گناہ میں مبتلا تو ہو جاتے ہیں لیکن جس طرح کوئی صفائی پسند کسی گندگی پر اپنا بستر نہیں ڈال دیتا بلکہ جلد سے جلد اس سے دور ہونے کی کوشش کرتا ہے اسی طرح یہ بھی یہ نہیں کرتے کہ اس گناہ ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیں، جلد سے جلد توبہ و اصلاح کے ذریعے سے اس سے پاک ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

'الممام' اور 'لمم' کے اصل معنی کسی جگہ ذرا دیر کے لیے اتر پڑنے کے ہیں۔ مجاہد اور ابن عباس سے 'لمم' کا مفہوم یہ نقل ہوا ہے کہ آدمی کسی گناہ میں آلودہ تو ہو جائے لیکن پھر اس سے کنارہ کش ہو جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ وہ معصوم بن کر زندگی گزارے۔ جذبات اور خواہشوں سے مغلوب ہو کر گناہ کا مرتکب ہو جانا اس سے بعید نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ مطالبہ اس سے ضرور ہے کہ اس کی حسِ ایمانی اتنی بیدار رہے کہ کوئی گناہ اس کی زندگی کا اس طرح احاطہ نہ کر لے کہ اس کے لیے اس سے پیچھا چھڑانا ہی ناممکن ہو جائے بلکہ جب بھی اس کا نفس اس کو ٹھوکر کھلائے وہ متنبہ ہوتے ہی توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے۔ جو لوگ اس طرح زندگی گزارتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ اس کا دامنِ مغفرت بہت وسیع ہے۔

سورۂ نساء میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ	اللہ پر صرف ان کی توبہ کی قبولیت کی ذمہ داری
السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ	ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر برائی کو کر بیٹھتے

مِنۡ قَرِیۡبٍ فَاُولٰٓئِکَ یَتُوۡبُ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۝ وَلَیۡسَتِ التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَہُمۡ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا ۝ (النساء: ۴: ۱۷-۱۸)

ہیں پھر جلدی توبہ کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی توبہ اللہ قبول کر لیتا ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے۔ اور ایسے لوگوں کی توبہ، توبہ نہیں ہے جو برائی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت سر پر آن کھڑی ہوئی تو وہ بولا کہ اب میں نے توبہ کی اور ان لوگوں کی بھی توبہ نہیں ہے جو کفر ہی کی حالت میں مرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

'کَبٰٓئِرَ الۡاِثۡمِ وَالۡفَوَاحِشَ' میں 'اثم' سے مراد وہ گناہ ہیں جن کا تعلق غصبِ حقوق اور ظلم و تعدی سے ہے اور 'فَاحِشَۃ' سے مراد کھلی ہوئی بے حیائیاں اور بدکاریاں ہیں۔ 'کبائر' سے بچنے کی جو ہدایت فرمائی گئی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صغائر پر کوئی گرفت نہیں ہے بلکہ اس میں حکمت، جیسا کہ اس کے محل میں ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ جو لوگ کبائر سے بچتے ہیں ان کی حسِ ایمانی اتنی قوی ہو جاتی ہے کہ وہ صغائر کے ارتکاب پر کبھی راضی نہیں ہوتے جو ہزاروں کی امانت ادا کرتا ہے وہ کسی کے دھیلے پیسے میں خیانت کر کے خائن کہلانے پر کس طرح راضی ہو گا!

ان لوگوں کو تنبیہ جو ایمان و عمل کے بغیر جنت کے خواب دیکھ رہے ہیں

یہ تنبیہ ہے ان لوگوں کو جو ہر قسم کی برائیوں اور بے حیائیوں میں تو آلودہ تھے لیکن اپنے مزعومہ شرکاء کی شفاعت، اپنے آباؤ اجداد کی بزرگی اور اپنے حسب و نسب کی برتری کے بل پر جنت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ خدا کے ہاں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے نہ کہ یہ جھوٹے سہارے۔

پیچھے ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ قریش اور اہل کتاب سب اسی قسم کے کسی نہ کسی وہم میں مبتلا رہے ہیں۔ قریش کو دیویوں دیوتاؤں کے سوا اپنے اولادِ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) اور پاسبانِ حرم ہونے پر بھی بڑا ناز تھا۔ ان کے اسی ناز پر ان کو 'اَجَعَلۡتُمۡ سِقَایَۃَ الۡحَآجِّ وَعِمَارَۃَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ...' (التوبۃ - ۹: ۱۹) والی آیت میں تنبیہ فرمائی گئی کہ حاجیوں کو پانی پلا دینا اور خانۂ کعبہ کی کچھ دیکھ بھال کر دینا نیکی ہے لیکن یہ وہ نیکی نہیں ہے جو ایمان و عمل صالح کی قائم مقام اور تمہارے دوسرے جرائم کے لیے پردہ پوش بن سکے۔ اسی طرح اہل کتاب کو یہ غرہ تھا کہ وہ برگزیدہ امت اور ابراہیم و اسحاق علیہما السلام جیسے بزرگ نبیوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے دوزخ کی آگ ان پر حرام ہے۔ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر کسی کو ڈالا بھی گیا تو صرف چند دنوں کے لیے۔ ابدی عذاب ان کے لیے بہر حال نہیں ہے۔ یہ چیز صرف دوسری قوموں کے لیے مخصوص ہے۔ ان کے اسی غرور پر سیدنا مسیحؑ نے ان کو سرزنش فرمائی کہ اولادِ ابراہیم (علیہ السلام) ہونے پر

ناز نہ کرو، میرا رب چاہے گا تو ان پتھروں سے ابراہیمؑ کے لیے اولاد پیدا کرے گا۔ انہی یہود کی پیروی ان کے بعد مسلمانوں نے کی اور اپنے کو امتِ مرحومہ قرار دے کر ایمان و عمل کی ساری ذمہ داریوں سے بری کر لیا۔ یہاں تک کہ ان کے اندر کتنے خاندان ہیں جن میں پیدا ہو جانا ہی جنت کی ضمانت ہے۔ اور کتنے قبرستان ہیں جن میں دفن ہونا ہی ابدی بادشاہی کی بشارت ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ پیدا ہونے والے اور مرنے والے کے عقائد و اعمال کیا رہے ہیں!

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى۔ اس ذہن کے سارے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے یہ تنبیہ فرمائی جا رہی ہے کہ اپنی پاک دامنی کی حکایت زیادہ نہ بڑھاؤ، اور اپنے منہ میاں مٹھو نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے اس دور کو بھی سب سے زیادہ جانتا ہے جب اس نے زمین سے تم کو پیدا کیا اور اس دور کو بھی جانتا ہے جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی صورت میں رہے۔ مطلب یہ ہے کہ پانی، کیچڑ اور مٹی سے وجود میں آنے والی مخلوق، اور پھر ذلیل پانی کی ایک بوند سے رحمِ مادر کے اندر پرورش پانے والی ہستی کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ بجائے خود اپنے وجود ہی کو بڑے سے بڑے مرتبہ کا مستحق سمجھ بیٹھے اور نیکی و تقویٰ کی راہ میں کسی جدوجہد کی ضرورت سے مستغنی ہو جائے۔ اس کا وجود، ہر شخص جانتا ہے کہ نہایت حقیر عنصر سے ہوا ہے اور اس کی ابتدائی پرورش رحمِ مادر کی تنگنائے میں ہوتی ہے۔ اس وجہ سے مجرّد وجود کی بنیاد پر تو اس کو کسی خاص شرف کے حاصل ہونے کی توقع نہیں کرنی چاہیے۔ اس کو شرف حاصل ہو سکتا ہے تو تقویٰ اور دین کی بنیاد پر ہو سکتا ہے اور اس چیز سے سب سے زیادہ واقف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی اپنی میزان میں تول کر جس کو جس مرتبہ کا مستحق پائے گا اس پر سرفراز فرمائے گا۔ اس میزان کے فیصلہ سے پہلے کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی عالی مقامی کی منادی کرتا پھرے۔ یہ مضمون سورۂ معارج کی آیات ۳۸-۳۹ میں بھی آئے گا، وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہوگی۔

وحدۃ الوجود کا عقیدہ رکھنے والوں کی بر خود غلطی

اس آیت میں انسان کے وجود کا جس حقارت آمیز انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے اس پر بھی نگاہ رہے اور فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ میں اس کے دعوائے پاکی و برتری پر جو طنز ہے وہ بھی پیش نظر رہے۔ پھر غور کیجیے اپنے ان صوفیوں کے عقیدۂ وحدت الوجود پر جو مدعی ہیں کہ انسان اللہ تعالیٰ ہی کا ایک جزو ہے، جو بالآخر اپنے کل میں مل جائے گا اور اس طرح قطرہ سمندر میں مل کر سمندر بن جائے گا۔ اگر انسان اللہ تعالیٰ ہی کا ایک جزو ہے تو کیا اللہ تعالیٰ نے العیاذ باللہ اپنے ہی وجود کے ایک جزو کا اس حقارت آمیز انداز میں ذکر کیا ہے۔

پھر اس بات پر بھی غور کیجیے کہ مجرّد وجود کی بنا پر کسی دعوائے برتری و پاکی کو قرآن نے اپنے

منہ میاں مٹھو بننے سے تعبیر فرمایا ہے لیکن صوفی حضرات بنکارتے ہیں کہ 'سبحانی ما اعظم شانی' (میں پاک ہوں، ہر عیب سے پاک! کیا کہنے ہیں میری عظمت کے! میری شان بڑی عظیم ہے!!) کیا کوئی انسان جس کے اندر ایمان کی رمق بھی ہو اپنی ذات کے بارے میں یہ فرعونی دعویٰ کر سکتا ہے؟ لیکن صوفیوں نے، چونکہ قرآن و حدیث کی جگہ باطنیہ، روافض اور برہمنوں سے رہنمائی حاصل کی ہے اس وجہ سے، ان فتنوں کو اسلام میں لا گھسایا اور آج کتنے کم سواد ہیں جو ان فقروں کو دہراتے ہیں حالانکہ وہ ان کے معنی سے بالکل بے خبر ہیں۔

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي تَوَلَّىٰ ۝ وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ ۝ أَعِندَهُۥ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ (۳۳-۳۵)

مفت کی جنت کے خواب دیکھنے والوں کی تمثیل

یہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے کردار کو ممثّل کر کے پیش کیا ہے جو اس کی راہ میں دینے دلانے کا تو کوئی حوصلہ نہیں رکھتے اور کبھی کچھ دیتے بھی ہیں تو بس چھیدا اتارنے کے لیے لیکن اپنے لیے اس کے یہاں بڑے اونچے اونچے مرتبوں کے مدعی ہیں۔ فرمایا کہ کیا ان کے پاس علم غیب کی دوربین ہے کہ وہ اس کی مدد سے ان مراتب و مقامات کو دیکھ رہے ہیں جو ان کے لیے محفوظ ہیں۔

'اَلَّذِیْ' سے ہمارے مفسرین نے عام طور پر قریش کے ایک سردار ولید بن مغیرہ کو مراد لیا ہے۔ اس سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ اس نے اسلام قبول کرنے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن اس کے ایک ساتھی کو جب اس کے ارادے کی اطلاع ہوئی تو اس نے اس سے کہا کہ اگر تم آخرت کے ڈر سے اسلام لانا چاہتے ہو تو اس سے بے فکر رہو۔ اگر تم مجھے اتنی رقم دے دو تو آخرت کے خطرے سے تم کو بچانے کا ذمہ دار میں ہوں۔ ولید نے اس کی اطمینان دہانی کے بعد اسلام لانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس کو مطلوبہ رقم دینے کا وعدہ کر لیا لیکن بعد میں اس کو تھوڑی سی رقم دے کر باقی رقم دینے سے مکر گیا۔

یہ واقعہ اگرچہ تمام مفسرین نے بیان کیا ہے لیکن اوّل تو روایت ہی کے اعتبار سے اس کا کوئی درجہ نہیں، دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ صحیح بھی ہے تو اس کا تعلق کسی پہلو سے بھی ان آیات سے سمجھ میں نہیں آیا۔ تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیجیے کہ ولید نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو کیا قرآن نے یہاں اس بات پر اس کو ملامت کی ہے کہ اس نے اپنا وعدہ کیوں نہیں پورا کیا!

اصل یہ ہے کہ 'اَلَّذِیْ' چونکہ عام طور پر معرفہ کے لیے آتا ہے اس وجہ سے ہمارے مفسرین جہاں کہیں 'اَلَّذِیْ' یا 'اَلَّتِیْ' دیکھ پاتے ہیں تو ان کو تلاش کسی خاص شخص کی ہوتی ہے جس پر اس کو منطبق کر سکیں۔ اس کوشش میں انھیں لازماً کوئی نہ کوئی واقعہ بھی بنانا پڑتا ہے، خواہ وہ کتنا ہی بے تکا اور کلام کے موقع و محل سے کتنا ہی بے جوڑ ہو۔

ہم اس کتاب میں جگہ جگہ مثالیں پیش کرتے آ رہے ہیں کہ 'اَلَّذِیْ' یا 'اَلَّتِیْ' ہر جگہ کسی خاص مرد یا کسی

معین عورت ہی کے لیے نہیں آتے بلکہ بعض مواقع میں تمثیل کے لیے بھی آتے ہیں یعنی مقصود تو کسی گروہ یا جماعت کے مجموعی کردار کو پیش کرنا ہوتا ہے لیکن وہ پیش اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا لوگوں کے سامنے اس کو ایک خاص شکل میں متشکل کر دیا گیا۔ ہم پچھلی مثالوں میں سے یہاں ایک مثال کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ نحل آیت ۹۲ میں یہود کو تنبیہ فرمائی گئی ہے: 'وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا'، کہ اس بڑھیا کی مانند نہ بن جاؤ جس نے اپنا سارا کاتا ہوا، اچھی طرح محکم کرنے کے بعد، ادھیڑ کے رکھ دیا۔ یہاں دیکھ لیجیے 'اَلَّتِیْ' آیا ہے لیکن اس سے کوئی معین بڑھیا مراد نہیں ہے کہ اس کے نام، خاندان، محلہ کا سراغ لگایا جائے اور اس بات کی تحقیق کی جائے کہ وہ کس طرح کاتتی اور کیوں اپنے کاتے ہوئے کو ادھیڑتی تھی۔ یہ ساری کاوشیں غیر ضروری ہیں اس لیے کہ یہاں اشارہ کسی معین بڑھیا کی طرف نہیں بلکہ ایک تمثیلی کردار کی طرف ہے۔

اسی طرح یہاں ان مشرکین کے سامنے جو اللہ کی راہ میں کچھ دینے دلانے کا حوصلہ تو نہیں رکھتے تھے لیکن اپنے زعمی معبودوں کی شفاعت اور اپنے خاندانی شرف کے زعم میں مدعی تھے کہ جس طرح دنیا میں وہ عالی مقام ہیں اسی طرح آخرت میں بھی، اگر وہ ہوئی، ان کے لیے مراتبِ عالیہ ہیں، ایک کردار تمثیل کی صورت میں رکھا گیا ہے جس کے آئینہ میں ولید بن مغیرہ بھی اپنی شکل دیکھ سکتا تھا، ابولہب بھی دیکھ سکتا تھا اور قریش کے وہ سارے اغنیاء و بخلاء بھی دیکھ سکتے تھے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتِ انفاق سن کر تو منہ پھیر لیتے لیکن مدعی تھے کہ جنت کی کنجیاں ان کے قبضہ میں ہیں۔

اسلوبِ کلام یہاں طنز و تحقیر کا ہے۔ یعنی ذرا ان لوالفضولوں کو تو دیکھو جو خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرنے سے تو جی چراتے ہیں، شرما شرمی میں کبھی کچھ دیتے بھی ہیں تو محض چھدا اتارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن مدعی اپنے لیے اونچے اونچے درجوں کے ہیں، گویا ان کے لیے جنت میں جو سامانِ عیش مہیا ہے اس کو غیب کی عینک سے یہیں سے بیٹھے بٹھائے دیکھ رہے ہیں۔

بخیلوں کی عام روش

'اَكْدٰى'۔ 'اكدى الحافر' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'اكدى الحافر' کا مفہوم یہ ہے کہ کھودنے والے کے آگے کھدائی کے وقت کوئی ایسی چٹان آ گئی جس کو توڑنا اس کے لیے دشوار ہو گیا۔ یہ بخیلوں کی عام روش بیان ہوئی ہے کہ اگر مارے باندھے کبھی کچھ خرچ کرتے بھی ہیں تو تھوڑا سا خرچ کرتے ہی ان پر بخل کا ایسا دورہ پڑتا ہے کہ ان کی مٹھیاں بھنچ جاتی ہیں اور اگر کوئی ان کو اکساتے کی کوشش کرے تو وہ اس کا منہ نوچنے کو دوڑتے ہیں کہ کہاں تک خرچ کیے جاؤں، چلو ہٹو، میں تو ڈھیروں مال لٹا چکا ہوں۔ 'يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا' (البلد: ۶) والی آیت میں انہی بخیلوں کی تصویر ہے۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ۝ وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ۝ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۳۶-۳۸)

قریش اور اہل کتاب دونوں کو ایک تنبیہ

یعنی یہ لوگ مفت میں، محض اپنے بزرگوں اور فرضی دیوتاؤں کی سفارش کے بل پر جنت کے خواب دیکھے جا رہے ہیں، کیا موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں کی یہ تعلیم ان کو نہیں پہنچی کہ خدا کے ہاں کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

یہ امر ملحوظ رہے کہ یہاں مخاطب اصلاً قریش اور ضمناً اہل کتاب ہیں۔ اہل کتاب حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ، دونوں نبیوں کی پیروی کے مدعی تھے۔ اسی طرح قریش حضرت ابراہیمؑ کو اپنا خاندانی بزرگ بھی مانتے تھے اور دینی پیشوا بھی، اس وجہ سے ان دونوں جلیل القدر نبیوں کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ فرمایا۔

حضرت ابراہیمؑ کا ذکر یہاں 'اَلَّذِیْ وَفّٰی' کی صفت کے ساتھ ہوا ہے یعنی وہ جس نے اپنے رب کے ہر حکم کی تعمیل کا حق ادا کر دیا، جس نے ہر عہد پورا کیا اور جو ہر امتحان میں صادق الوعد اور کامل العیار ثابت ہوا۔ دوسرے مقام میں ارشاد ہوا ہے: وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (البقرۃ: ۱۲۴) (یاد کرو، جب کہ ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں سے آزمایا تو اس نے وہ سب پوری کر دکھائیں)۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس صفت کی یاد دہانی میں قریش اور اہل کتاب دونوں کو تنبیہ ہے کہ ان کو دنیا اور آخرت میں جو رتبۂ بلند ملا وہ اپنے رب کے ساتھ کامل وفاداری کے صلہ میں ملا اور تمہارا حال یہ ہے کہ کرنے کرانے کے تو کچھ نہیں لیکن ابراہیمؑ کے نام پر استخوان فروشی کی ایک دکان کھول رکھی ہے۔

ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ 'صُحُف' کی اضافت حضرت ابراہیمؑ کی طرف بھی فرمائی ہے تو کیا حضرت ابراہیمؑ کا بھی کوئی صحیفہ تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اصطلاحی مفہوم میں تو حضرت ابراہیمؑ کا کوئی صحیفہ نہیں تھا۔ ان کی تعلیمات زبانی تھیں جو بطریق روایت ان کی ذریت کی دونوں شاخوں میں نقل ہوتی رہیں۔ بنی اسرائیل میں یہ تعلیمات زیادہ روشن رہیں اس لیے کہ ان کے اندر برابر انبیاء آتے رہے، بنی اسمٰعیل امّی تھے، اس وجہ سے ان کے اندر یہ دھندلی ہوتی چلی گئیں۔ بعد میں جب تورات مرتب ہوئی تو اس میں حضرت ابراہیمؑ کی تاریخ اور ان کی تعلیمات بھی جمع کر دی گئیں۔ ان میں یہود نے اگرچہ اپنے اغراض کے تحت بہت سی تحریف کر ڈالی جس کی طرف پچھلی سورتوں کی تفسیر میں ہم اشارے کر چکے ہیں لیکن آپ کی بنیادی تعلیمات خاص طور پر وہ جن کا یہاں حوالہ ہے، اس میں موجود ہیں۔ اس وجہ سے اگر صحفِ ابراہیم سے وہ صحیفے مراد لیے جائیں جن میں حضرت ابراہیمؑ کی تعلیمات مذکور ہیں تو یہ نسبت بالکل صحیح ہو گی۔

ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں کی بنیادی تعلیم

'اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی' یہ اس تعلیم کا حوالہ ہے جو موسیٰؑ اور ابراہیمؑ کے صحیفوں میں موجود ہے کہ خدا کے ہاں کوئی جان کسی دوسری جان کا بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی بلکہ ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ یہ اسی شفاعتِ باطل کے تصور کی تردید ہے جو اس سورہ کا موضوع ہے۔ یہ تعلیم تورات اور انجیل دونوں میں اتنی کثرت سے بیان ہوئی ہے کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ اتنی واضح ہدایات

کے باوجود ان کتابوں کے حاملین کو شیطان نے کس طرح شرک کے کھڈ میں گرا دیا۔ ہم ان کے حوالے اس کتاب میں جگہ جگہ نقل کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَاَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۙ وَاَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ۪ ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ۙ (۳۹-۴۱)

یہ اسی اوپر والی بات کی شرح مزید ہے کہ یہ حقیقت بھی اس کے ساتھ واضح کر دی گئی تھی کہ ہر انسان خدا کے ہاں صرف اپنی ہی محنت کا حاصل پائے گا، یہ نہیں ہوگا کہ نیکی تو کسی نے کی اور اس کا پھل کوئی اور کھائے، یا بدی تو زید نے کی اور اس کی سزا بکر بھگتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمھارے آباؤ اجداد بڑے نیک تھے تو ان کی نیکی کا صلہ انھی کو ملے گا، یہ نہیں ہوگا کہ ان کے اعمال کے صلہ میں تم جنت میں جا براجو۔ یہی اصول دوسرے الفاظ میں یوں بھی بیان ہوا ہے: تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَہَا مَا کَسَبَتۡ وَلَکُمۡ مَّا کَسَبۡتُمۡ (البقرۃ ۲: ۱۳۴) (یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا ہے، اس کو ملے گا جو اس نے کمایا اور تمھیں ملے گا جو تم کماؤ گے)۔

اگر نیک باپ کے اعمال کے صلہ میں اس کی اولاد جنت میں جا سکتی تو حضرت نوحؑ سے زیادہ نیک کون ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا کے باوجود ان کے بیٹے کو نہیں بخشا۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ جیسے خلیل اللہ نے اپنے باپ کے لیے دعا فرمائی لیکن وہ بھی قبول نہیں ہوئی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بھی ایک جلیل القدر پیغمبر کی بیوی تھی لیکن اللہ تعالیٰ کا قانون ایسا بے لاگ ہے کہ ایک پیغمبر کی بیوی ہونا اس کے کچھ کام نہ آیا۔ اس کے برعکس فرعون کی بیوی اللہ تعالیٰ کے ایک بہت بڑے دشمن کی بیوی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے سورۂ تحریم میں نہایت شاندار الفاظ میں اس کی تعریف فرمائی۔ باپ بیٹے اور میاں بیوی کے رشتے سب سے زیادہ محبوب رشتے ہیں اور پیغمبروں سے زیادہ خدا کا کوئی مقرب نہیں ہو سکتا لیکن آپ نے دیکھ لیا کہ جن کے پاس اپنی نیکی کا توشہ موجود نہیں تھا وہ ان رشتوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

دوسرے کی نیکی کے کام آنے کی صورتیں

آدمی کو دوسرے کی نیکی سے خدا کے ہاں کوئی فائدہ دو صورتوں میں پہنچنے کی توقع ہے۔ ایک یہ کہ یہ نیکی ایمان کے رشتۂ محبت پر مبنی ہو۔ مثلاً ایک مومن اپنے دوسرے مومن بھائی کے لیے دعا کرے تو امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو قبول فرمائے۔ دوسری یہ کہ آدمی کو بلا واسطہ یا بالواسطہ اس نیکی میں کوئی دخل ہو، مثلاً یہ کہ اس نے اس کی تعلیم دی ہو یا اپنے عملی نمونہ سے اس کی مثال قائم کی ہو یا اس کے وسائل مہیا کرنے میں کسی نوع سے اس کا حصہ رہا ہو۔ اگر اس طرح کا کوئی دخل اس نیکی میں اس کا ہے تو یہ بھی درحقیقت ایک طرح سے اس کی سعی و کسب ہی میں داخل اور اس کے لیے یہ ایک خیر جاری ہے۔

اشتراکی ذہن کے لوگوں کا ایک بے بنیاد استدلال

بعض اشتراکی ذہن کے لوگ اس آیت سے یہ استنباط کرتے ہیں کہ قرآن اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ ہر شخص کو صرف اس کی محنت کے بقدر ہی ملنا چاہیے، لیکن یہ آیت جس موقع و محل میں ہے اس سے یہ استنباط اپنی ذہانت کا بالکل بے جا استعمال ہے۔ اس وجہ سے یہاں ہم ایک غیر متعلق مسئلہ سے تعرض نہیں کرنا

چاہتے۔ البتہ نفسِ اشتراکیت کے بنیادی فلسفہ پراس کے محل میں ہم نے بحث کی ہے اور آگے بھی موزوں مقامات پر اس کے بعض پہلوؤں پر ان شاء اللہ ہم روشنی ڈالیں گے۔ بس اتنی بات یہاں یاد رکھنی چاہیے کہ اس دنیا کا نظام امتحان و آزمائش کے اصول پر مبنی ہے اور آخرت میں معاملات عدل وانعام کے اصول پر طے ہوں گے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے کسی کو اس کے حق المحنت کے طور پر کوئی چیز نہیں دی ہے بلکہ کسی کو کم دیا کسی کو زیادہ اور اس طرح دونوں کے صبر و شکر کا امتحان کیا ہے۔ آخرت میں ان لوگوں کو ان کی نیکی کا صلہ ملے گا جو اس امتحان میں پورے اتریں گے اور وہ لوگ محروم رہیں گے جو امتحان میں ناکام رہے۔ ان کی یہی ناکامی ان کو جہنم میں لے جائے گی، اس لیے کہ اس طرح کے ناکاموں کا ٹھکانا آخرت میں جہنم ہی ہے۔

وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ۝ ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۔ یعنی کوئی اس مغالطے میں نہ رہے کہ یہ کوئی ہوائی بات ہے بلکہ ہر شخص نے جو کچھ کمائی کی ہوگی وہ جلد اللہ تعالیٰ کے ملاحظے میں آئے گی اور پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ یہ اہلِ ایمان کے لیے تسلّی اور منکرینِ جزاء و سزا کے لیے تنبیہ ہے کہ اہلِ ایمان مطمئن رہیں کہ ان کی رائی کے دانے کے برابر نیکی بھی رائگاں نہیں جائے گی اور منکرین بھی آگاہ رہیں کہ ان کی چھوٹی سے چھوٹی بدی بھی نظرانداز نہیں کی جائے گی۔

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (۴۲)

سب کا مرجع صرف اللہ تعالیٰ ہی ہوگا

اور یہ بات بھی واضح رہے کہ سب کی بازگشت تیرے رب ہی کی طرف ہوگی۔ اس مغالطے میں کوئی نہ رہے کہ تیرے رب کے سوا کسی کا مولیٰ و مرجع کوئی اور بھی ہے جو اس کو خدا کی بازپرس سے بچا لے گا، یا خدا کے فیصلوں کے خلاف وہ کوئی مرافعہ اس کی عدالت میں کر سکے گا۔ خدا ہی کے حضور میں سب کی پیشی بھی ہوگی اور خدا کے فیصلے بالکل آخری اور حتمی بھی ہوں گے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ۝ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْیَا ۝ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ۝ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ۝ وَاَنَّ عَلَیْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى (۴۳-۴۷)

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں سب کا مولیٰ و مرجع اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جس کے اختیار میں ہنسانا بھی ہے اور رلانا بھی۔ یعنی وہی خوشی کے اسباب بھی پیدا کرتا ہے اور وہی غم کے اسباب سے بھی دوچار کرتا ہے۔ اسی کے اختیار میں سُکھ بھی ہے اور اسی کے اختیار میں دُکھ بھی۔ رنج و غم اور نفع و ضرر سب اسی کے اختیار میں ہے تو اس کے سوا کوئی دوسرا کس حق کی بنا پر مولیٰ و مرجع بن جائے گا؟

اسی طرح وہی موت دیتا ہے اور وہی زندگی بخشتا ہے۔ تو جب کسی دوسرے کو نہ موت کے معاملے میں کوئی دخل نہ زندگی کے معاملے میں کوئی اختیار تو اس کے سوا کسی اور کو مولیٰ و مرجع بنانے کے کیا معنی؟

اسی نے جوڑے کے دونوں فرد ——— مرد اور عورت ——— پیدا کیے۔ یہ نہیں ہوا ہے کہ

مرد کو تو کسی نے پیدا کیا ہو اور عورت کہیں اور سے وجود میں آئی ہو، بیٹے کوئی بخشتا ہو اور بیٹیاں کہیں اور سے آدھمکتی ہوں۔ تو جب اس طرح کی کسی تقسیم کا امکان عورت اور مرد کی پیدائش میں نہیں ہے تو کسی اور کے مرجع بنانے کے کیا معنی؟

ان کی پیدائش پانی کی ایک بوند سے ہوتی ہے جو ٹپکا دی جاتی ہے۔ اس ٹپکا دینے کے بعد کسی کو بھی پتہ نہیں کہ اس کی نشوونما کس شکل میں ہوگی۔ اس سے لڑکی پیدا ہوگی یا لڑکا، اس کی تکمیل ہوگی یا یہ ناتمام ہی رہے گا؟ اس کو شکل وصورت کیسی ملے گی؟ ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ یہ ساری باتیں صرف وہ خلّاق وعلیم ہی جانتا ہے جو گوناگوں پردوں کے اندر پانی کی اس بوند کی پرورش کرتا اور ایک معیّن مدت کے بعد اس کو ظہور میں لاتا اور پھر اس کو ایک مرد یا عورت کی حیثیت سے پروان چڑھاتا ہے۔ جب یہ سارے کام خدا ہی کے اختیار میں ہیں تو اولاد کے لیے درخواست کسی اور سے کیوں کی جائے؟

وَاَنَّ عَلَیۡہِ النَّشۡاَۃَ الۡاُخۡرٰی۔ یعنی جب خدا ہی سب کو پانی کی ایک بوند سے پیدا کرتا ہے تو اس کے لیے دوبارہ پیدا کرنا کیوں دشوار ہو جائے گا؟ اس کا ممکن ہونا بھی واضح ہے اور خدا کے عدل اور اس کی رحمت کے ظہور کے لیے اس کی ضرورت بھی واضح ہے۔ تو جب یہ دونوں باتیں واضح ہیں تو اللہ تعالیٰ کی حکمت واجب کرتی ہے کہ وہ ایک ایسا دن ضرور لائے جس میں سب کو اٹھا کھڑا کرے۔ ان کی نیکی اور بدی کو جانچے اور ان کے اعمال کے اعتبار سے ان کو جزا وسزا دے۔

یہ ساری باتیں معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ حضرت ابراہیمؑ کے اس اعلانِ براءت میں بھی موجود ہیں جو انھوں نے اپنی قوم سے علیحدگی کے وقت کیا ہے۔ سورۂ شعراء میں یہ یوں نقل ہوا ہے:

اَلَّذِیۡ خَلَقَنِیۡ فَہُوَ یَہۡدِیۡنِ ۙ وَالَّذِیۡ ہُوَ یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ ۙ وَاِذَا مَرِضۡتُ فَہُوَ یَشۡفِیۡنِ ۪ۙ وَالَّذِیۡ یُمِیۡتُنِیۡ ثُمَّ یُحۡیِیۡنِ ۙ وَالَّذِیۡۤ اَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لِیۡ خَطِیۡٓئَتِیۡ یَوۡمَ الدِّیۡنِ ؕ (الشعرآء: ۷۸-۸۲)	جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہ میری رہنمائی فرماتا ہے۔ اور وہ کہ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب میں بیمار پڑتا ہوں تو مجھے شفا بخشتا ہے۔ جو مجھے موت دے گا، پھر زندہ کرے گا اور وہ کہ جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ وہ جزا کے دن میری خطائیں بخشے گا۔

وَاَنَّہٗ ہُوَ اَغۡنٰی وَاَقۡنٰی ۙ وَاَنَّہٗ ہُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰی (۴۸-۴۹)

یعنی وہی ہے جو آدمی کے فقر کو غنا سے بدل دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے اس کی ضرورت سے اتنا زیادہ دے دیتا ہے کہ وہ اس کو جمع کر کے مال دار آدمی بن جاتا ہے۔ 'اَقۡنٰی'، 'قِنۡیَۃ' سے ہے جو جمع کیے ہوئے مال کے لیے آتا ہے۔ گویا 'اَغۡنٰی' یہاں ان لوگوں کے لیے استعمال ہوا جو فقر کے دائرہ سے نکل چکے

ہیں اور اُقْنٰی ان کے لیے استعمال ہوا ہے جو صرف فقر کے دائرہ سے نکل ہی نہیں چکے ہیں بلکہ مال داروں کے زمرے میں ہیں۔ اوپر آیات ۳۳-۳۴ میں ان مال داروں کا کردار بیان ہو چکا ہے جو خدا کی راہ میں دینے دلاتے تو کچھ بھی نہیں لیکن جنت کے مراتب عالیہ کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ انہی کو تنبیہ ہے کہ جو مال و ثروت ان کو حاصل ہے یہ خدا کی دین ہے۔ اس میں شِعْرٰی کو کوئی دخل نہیں ہے، جیسا کہ انھوں نے گمان کر رکھا ہے۔ شِعْرٰی کا رب بھی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

شعریٰ

شِعْرٰی ایک ستارے کا نام ہے جو موسم بہار میں طلوع ہوتا ہے، مشرکین عرب اس کو بہت مبارک سمجھتے تھے اور بہار کی تمام شادابیاں اور تمام تجارتی سرگرمیاں اسی سے منسوب کرتے تھے۔ ایک جاہلی شاعر اپنے ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے:

شامس فی القرحتی اذا ما   ذکت الشعری فبرد وظل

(وہ سردیوں کی ٹھنڈ میں لوگوں کو گرمی پہنچانے والا ہے اور جب شعریٰ طلوع ہوتا ہے یعنی موسم بہار میں) تو وہ لوگوں کے لیے ٹھنڈک اور سایہ بن جاتا ہے)

یہاں اس بحث پر نظر رہے جو ابتدائے سورہ میں 'وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی' کے تحت گزر چکی ہے کہ یہ ستارے جن کو نادانوں نے اپنی قسمتوں کا مالک سمجھ رکھا ہے، اپنے سجود و ہبوط سے خود شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا رب ہے۔

یہ امر ضروری نہیں ہے کہ یہ ساری باتیں بعینہٖ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں کے حوالوں ہی پر مبنی ہوں بلکہ ان کی نوعیت توسیعِ کلام کی ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک قول کا حوالہ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ایسے اضافے بھی کر دیے جاتے ہیں جو اگرچہ لفظاً تو اس قول کا جزو نہیں ہوتے لیکن معناً اسی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس سے بات کی پوری وضاحت بھی ہو جاتی ہے اور کلام مطابقِ حال بھی ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہی صورت یہاں بھی ہے۔ آیت ۴۲ سے آگے کی آیات توسیعِ کلام کی حیثیت رکھتی ہیں جس سے کلام قریش کے لیے گویا خود ان کی حکایت بن گیا ہے۔

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَا ۨ الْاُوْلٰى ۙ وَثَمُوْدَا۟ فَمَآ اَبْقٰى ۙ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى (۵۰-۵۲)

قریش کو تنبیہ تاریخ کے حوالوں سے

یہ بھی توسیعِ کلام ہی ہے۔ تاریخی حوالوں سے قریش کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جس طرح آج تمھیں انذار کیا جا رہا ہے اسی طرح تم سے پہلے اس ملک کی قوموں میں سے عاد اور ثمود کو بھی ان کے رسولوں نے انذار کیا اور ان سے پہلے قومِ نوح کو بھی، لیکن ان قوموں نے خدا کے انذار کی کوئی پروا نہ کی بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان سب کو ہلاک کر دیا اور اس طرح ہلاک کیا کہ ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ یہی انجام تمھارا بھی ہونا ہے اگر تم نے انہی کی روش اختیار کی۔ خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور تمھاری اپنی تاریخ

اس کی گواہ ہے۔

عاد کو یہاں عادِ اولیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ثمود انہی کے بقایا میں سے تھے اور وہ عادِ ثانی سے مشہور تھے۔

'اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى' کا تعلق صرف قومِ نوح ہی سے نہیں ہے بلکہ عاد اور ثمود سے بھی ہے۔ یعنی ان سب پر جو تباہی آئی یہ قدرت نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ یہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اور نہایت سرکش تھے۔ مطلب یہ ہے کہ قوموں پر جو تباہی آتی ہے اس کے اصل اسباب خارج میں نہیں ہوتے بلکہ وہ ان قوموں کے اندر ہی سے ابھرتے ہیں جو کبھی زلزلہ، سیلاب اور طوفان کی شکل میں نمودار ہوتے ہیں کبھی کسی دشمن کے حملہ و ہجوم کی صورت میں۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿﴾ فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى (۵۳-۵۴)

یہ قومِ لوط کی طرف اشارہ ہے۔ 'مُؤْتَفِكَة' کی تحقیق لسان العرب میں یہ بیان ہوئی ہے[1]:

"'مُؤْتَفِكَات' سے مراد وہ ہوائیں ہیں جو زمین کو بالکل تلپٹ کر دیتی ہیں جس طرح جوتنے والا کھیت کی زمین کو تلپٹ کر دیتا ہے۔ جب کوئی بڑا سیلاب آتا ہے اور وہ زمین پر مٹی اور ریت کی نئی تہ جما دیتا ہے تو اس کو بھی 'مُؤْتَفِكَة' کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس جو تند طوفانی ہوا زمین کو ریت اور کنکر سے ڈھانک دیتی ہے وہ بھی 'مُؤْتَفِكَة' ہے۔"

قومِ لوط پر اللہ تعالیٰ نے غبار انگیز ہوا بھیجی جو تند ہو کر بالآخر 'حَاصِب' یعنی کنکر پتھر برسانے والی طوفانی ہوا بن گئی۔ اس سے اوّل تو ان کے اوپر کنکروں پتھروں کی بارش ہوئی پھر اس نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ اس کے زور سے ان کے مکانات بھی الٹ گئے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے: فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا (العنکبوت - ۲۹: ۴۰) (ان میں سے بعض قوموں پر ہم نے کنکر برسا دینے والی آندھی بھیجی)۔ نیز فرمایا ہے: جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ (الحجر - ۱۵: ۷۴) (پس ہم نے اس بستی کو تلپٹ کر دیا اور ان کے اوپر سنگِ گل کی بارش کی)۔

'فَغَشّٰهَا مَا غَشّٰى'۔ اس اسلوب کی وضاحت، ہم جگہ جگہ کر چکے ہیں کہ یہ کسی ایسی صورتِ حال کی تعبیر کے لیے آتا ہے جس کی تعبیر سے الفاظ قاصر ہوں۔ یعنی ان کو ایسی چیز نے ڈھانک دیا جو الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى (۵۵)

قریش کو من حیث الجماعت ملامت — یہ خطاب قریش سے ہے۔ ضمیر اگرچہ واحد ہے لیکن مخاطب پوری جماعت ہے۔ جب جماعت کو واحد

---

[1] لسان العرب، جلد ۱، صفحہ ۲۹۱

کے صیغہ یا ضمیر سے خطاب کرتے ہیں تو مقصود جماعت کے ایک ایک فرد کو متنبہ کرنا ہوتا ہے۔ یہاں یہی صورت ہے۔ منکرین کو فرداً فرداً خطاب کر کے ملامت فرمائی ہے کہ جزاء و سزا کے یہ سارے دلائل جو عقل سے، نقل سے، موسیٰ و ابراہیمؑ کے صحیفوں اور قوموں کی تاریخ سے بیان ہوئے ہیں، تمہارے سامنے ہیں تو بتاؤ اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے اور ان کے باب میں جھگڑتے رہو گے۔

'اٰلَاءٌ'، 'اِلًی' کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہمارے مفسرین و مترجمین نے عام طور پر نعمت کے لیے ہیں لیکن یہ اس لفظ کا ادھورا مفہوم ہے۔ اس کے اصل معنی کرشمے، نشانیاں، عجائبِ قدرت، کارنامے، نوادر اور آثارِ حکمت کے ہیں۔ نعمتیں بھی چونکہ انہی کے تحت ہیں اس وجہ سے وہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں، لیکن ہر جگہ اس کا ترجمہ نعمت صحیح نہیں ہے اس لیے کہ نعمت کی طرح اللہ تعالیٰ کی نقمت کی نشانیاں بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ لفظ سورۂ رحمان میں بار بار آیا ہے اور اس کے سارے پہلو اس میں واضح ہو گئے ہیں۔ وہاں ہم اس کی وضاحت اس کے مواقع استعمال اور کلامِ عرب کی روشنی میں کریں گے۔ استاذ امام حمید الدین فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اس پر نہایت محققانہ بحث کی ہے۔

۶- آگے آیات ۵۶ - ۶۲ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ خاتمہ میں قرآن کے معروف طریقہ کے مطابق اس مضمون کی پھر یاد دہانی فرما دی گئی ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا تھا۔ یاد ہو گا کہ سورہ کا آغاز اس مضمون سے ہوا ہے کہ اس قرآن کو کاہنوں اور نجومیوں کے کلام کی قسم کی کوئی چیز خیال کر کے اس کے انذار کو ٹالنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ یہ وحی الٰہی اور کلامِ ربّانی ہے۔ اگلے زمانوں میں جس طرح نذیر آ چکے ہیں انہی کے زمرے کا نذیر یہ بھی ہے۔ یہ جس چیز سے تمہیں ڈرا رہا ہے اس کو دُور نہ سمجھو، وہ آئی کھڑی ہے اور جب آ جائے گی تو اللہ کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں بنے گا۔ اس کلام کا مذاق نہ اڑاؤ۔ یہ ہنسی مسخری کی چیز نہیں، رونے کی چیز ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اللہ ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۵۶ - ۶۲

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾ السجدة ۳ ع

ترجمۂ آیات ۵۶ - ۶۲

یہ اگلے نذیروں ہی کے زمرے کا ایک نذیر ہے۔ قریب آنے والی قریب آ گئی ہے

اللہ کے سوا اس کو کوئی ٹالنے والا نہیں ہو سکتا۔ تو کیا تم اس کلام پر متعجب ہوتے ہو! اور ہنستے ہو، روتے نہیں! اور تم مدہوش پڑے ہو! (ہوش میں آؤ!) اللہ ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ ۵۶-۶۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هٰذَا نَذِيرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْأُولَىٰ (۵۶)

ابتدا کے مضمون کی طرف اشارہ — 'ھٰذا' سے اشارہ قرآن مجید کی طرف ہے۔ چونکہ بحث کا آغاز قرآن ہی سے ہوا تھا اس وجہ سے مشارٌالیہ کے ذکر کے بغیر بے تکلف آخر میں اس کی طرف اشارہ کر دیا جس سے تمہید اور خاتمہ کا ربط بالکل واضح ہو گیا۔ اگر کوئی اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لے تو بھی کوئی فرق واقع نہیں ہو گا اس لیے کہ پیغمبر اور اس کی دعوت دو الگ الگ چیزیں نہیں ہوتیں۔ قرآن مجید میں بعض جگہ 'ذِکْرًا رَّسُوْلًا' کے الفاظ آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ 'ذکر' سے مراد قرآن ہے اور 'رسول' سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ لیکن اسلوبِ بیان ایسا اختیار فرمایا گیا ہے کہ نبی اور قرآن دونوں ایک ہی چیز کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

'نُذُرٌ' کی تحقیق اس کے محل میں گزر چکی ہے۔ یہاں یہ 'نذیر' کی جمع ہے۔ اس سے مراد پچھلے انبیاء اور پچھلے صحائف سب ہیں اور مقصودِ کلام تنبیہ ہے کہ اس کلام کو ہنسی مسخری کی چیز نہ سمجھو۔ یہ اسی طرح کا انذار ہے جس طرح کا انذار پچھلی قوموں کو کیا گیا۔ اگر تم نے اس کا مذاق اڑایا تو یاد رکھو کہ اس کا انجام تمہارے آگے بھی اسی شکل میں آئے گا جس شکل میں پچھلی قوموں کے سامنے آ چکا ہے۔

أَزِفَتِ الْآزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِن دُونِ اللَّهِ كَاشِفَةٌ (۵۷-۵۸)

ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان — 'اٰزفۃ' کے معنی ہیں قریب آنے والی۔ مراد اس سے عذاب کی وہ گھڑی ہے جس سے قرآن لوگوں کو ڈرا رہا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر جس عذاب سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے اس کو بہت دور نہ سمجھو۔ اب وہ تمہارے سروں پر منڈلا ہی رہا ہے۔

ہم اس سنتِ الٰہی کی طرف بار بار اشارہ کر چکے ہیں کہ جب کسی قوم کے انذار کے لیے اللہ تعالیٰ کا رسول آ جاتا ہے تو پھر اس کو اتنی ہی مہلت ملتی ہے جتنی اتمامِ حجت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس مہلت کے گزرتے ہی وہ قوم تباہ کر دی جاتی ہے اگر رسول کی تکذیب پر وہ اڑی جاتی ہے۔ یہ عذاب اس قوم کے لیے قیامت کے عذاب کا دیباچہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے یہ اسلوبِ بیان رسول کی زبان سے ایک حقیقتِ نفس الامری کا بیان ہوتا ہے، اس میں ذرا بھی مبالغہ کا شائبہ نہیں ہوتا۔

لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ؕ یعنی اس گھمنڈ میں نہ رہو کہ یہ گھڑی آئی تو تمہاری دیویاں ــــ لات، منات اور عزّٰی ـــــ اور تمہارے دوسرے دیوی دیوتا تمہارے کچھ کام آنے والے بنیں گے اور اس کی پکڑ سے تمہیں بچالیں گے۔ یاد رکھو کہ اللہ کے سوا اس کو دور کرنے والا کوئی بھی نہیں بن سکے گا۔

اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ۙ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ (۵۹-۶۰)

ان کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ جو کتاب تمہیں اتنے بڑے عذاب کے قرب کی خبر دے رہی ہے تم اس کے انذار پر تعجب کر رہے ہو کہ بھلا تم پر عذاب کدھر سے اور کیوں آجائے گا! آگاہ ہو جاؤ کہ یہ چیز ہنسنے اور مذاق اڑانے کی نہیں بلکہ رونے اور سر پیٹنے کی ہے لیکن تم رونے کی جگہ اس پر ہنس رہے ہو!

وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ (۶۱)

'سمد' اور 'سمود' کے معنی مدہوش ہونے کے ہیں۔ یعنی یہ کتاب تو تمہیں جھنجھوڑ کر جگا رہی ہے لیکن تم غفلت کے بستروں پر پڑے سو رہے ہو۔

فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۶۲)

یعنی خیریت چاہتے ہو تو جاگو اور دوسرے دیویوں دیوتاؤں کو چھوڑ کر اپنے رب ہی کو سجدہ اور اسی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی اور اس آفت سے نجات دینے والا نہیں بنے گا۔

اس سورہ کا آغاز ستاروں کے ہبوط و سجود سے ہوا تھا اور اس کا اختتام اللہ ہی کے لیے سجدہ اور اس کی عبادت کی دعوت پر ختم ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذٰلک۔

رحمان آباد

۲۲- جولائی ۱۹۷۷ء

۶- شعبان ۱۳۹۷ھ

تدبّرِ قرآن

۵۴

القمر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

اس سورہ کا آغاز اسی مضمون سے ہوا ہے جس پر سابق سورہ ختم ہوئی ہے۔ سابق سورہ اَزِفَتِ الْاٰزِفَۃُ (۵۷) (قریب آپہنچی قریب آنے والی) کی تنبیہ پر تمام ہوئی۔ اس سورہ کا آغاز اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (۱) (عذاب کی گھڑی قریب آن پہنچی اور چاند شق ہوگیا) سے ہوا ہے۔ گویا اَزِفَتِ الْاٰزِفَۃُ کے اجمال کی اس میں تفصیل فرما دی گئی ہے۔ اس مناسبت کے علاوہ ایک اور ظاہری مناسبت بھی دونوں میں واضح ہے۔ پہلی سورہ میں ستاروں کے ہبوط و سقوط سے دعوے پر شہادت پیش کی گئی ہے اور اس میں چاند کے پھٹنے سے۔

اس میں آیت وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ بار بار دہرائی گئی ہے۔ جس سورہ میں کسی آیت کی ترجیع ہو اس کو سورہ میں خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ گویا متکلم تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اپنے دعوے پر دلائل بیان کرتے ہوئے ضدی مخاطب کو بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اپنی ضد ہی پر کیوں اڑے ہوئے ہو، اس واضح حقیقت پر کیوں نہیں غور کرتے جو تمہارے سامنے دلائل کی روشنی میں پیش کی جا رہی ہے۔

مخاطب اس میں وہ مکذبین ہیں جو قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے کسی ایسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے تھے جو انھیں قائل کر دے کہ فی الواقع قرآن کی یہ دھمکی سچی ہو کے رہے گی اگر وہ اس کو جھٹلاتے رہے۔ ان کو پچھلی قوموں کی تاریخ، جس کی طرف پچھلی سورہ میں بھی اشارہ ہے، نسبتاً تفصیل کے ساتھ سنا کر متنبہ فرمایا ہے کہ آخر ان قوموں کے انجام سے کیوں عبرت نہیں حاصل کرتے؛ کیوں مچلے ہوئے ہو کہ جب یہی کچھ تمہارے سروں پر بھی گزر جائے گا تب مانو گے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے تمہیں عذاب کی نشانی دکھانے کی جگہ ایک ایسی کتاب تم پر اتاری ہے جو تمہاری تعلیم و تذکیر اور تمہارے شکوک و شبہات دور کرنے کے لیے ہر پہلو سے جامع و کامل اور تمام ضروری اوصاف و محاسن سے آراستہ ہے۔ لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جگہ تم اس کے عذاب کے طالب بنے ہوئے ہو۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱ - ۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی کہ ان ضدیوں کے مطالبۂ عذاب کی کوئی پروا نہ کرو۔ ان کو بڑی سے بڑی نشانی

بھی دکھا دی جائے گی تب بھی یہ ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ عقل کے پیرو نہیں بلکہ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ ان کے لیے قوموں کی تاریخ میں بڑا درسِ عبرت موجود ہے لیکن ان میں عبرت پذیری کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ تمھاری پکار سننے والے نہیں ہیں۔ ان کا معاملہ اب اس پکارنے والے پر چھوڑو جو قرآن کے بجائے ان کو جہنم کے لیے پکارے گا اور یہ اس کی پکار پر اس طرح قبروں سے نکلیں گے جس طرح پراگندہ ٹڈیاں برآمد ہوتی ہیں۔

(۹-۴۲) قریش کو قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط اور قوم فرعون کے انجام سے سبق لینے کی ہدایت کہ انھوں نے بھی تمھاری ہی طرح اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کی تو دیکھ لو کہ ان کا انجام کیا ہوا؟ وہی انجام تمھارا بھی ہوگا اگر تم نے بھی انہی کی روش اختیار رکھی۔ تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے خطرے کے ظہور سے پہلے پہلے تم کو ہوشیار کر دینے کے لیے قرآن اتارا جو عبرت و نصیحت اور یاددہانی حاصل کرنے کے لیے ہر پہلو سے آراستہ ہے لیکن افسوس کہ تم اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے عذاب کے طالب ہو!

(۴۳-۵۵) قریش کو آگاہی کہ جب ماضی کے کفار کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ رہا ہے تو آخر تمھارے ہی کفار کو ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ وہ یوں ہی چھوڑے رکھے جائیں گے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں میں ان کے لیے معافی کا کوئی پروانہ لکھ دیا ہے! کیا ان کو گمان ہے کہ وہ ہمارے مقابل میں اپنی مدافعت کر لیں گے! اگر وہ اس حماقت میں مبتلا ہیں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں اور متقیوں کے ساتھ ایک معاملہ نہیں کرے گا، بلکہ کافروں کو وہ جہنم کی سزا دے گا اور مومنوں کو جنت کے صلہ سے نوازے گا۔

سُوْرَةُ الْقَمَرِ (۵۴)

مَكِّيَّةٌ ——— آيات : ۵۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝۱ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا آیات
وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝۲ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ ۱ - ۸
اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴
حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ وقفِ لازم
الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ
الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝۷ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ
الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝۸

عذاب کی گھڑی سر پر آ گئی اور چاند شق ہو گیا، اور یہ کوئی سی بھی نشانی دیکھیں گے ترجمۂ آیات ۱ - ۸
تو اس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔
اور انھوں نے جھٹلا دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر
ہے۔ اور ان کو ماضی کی سرگزشتیں پہنچ چکی ہیں جن میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے، نہایت
دل نشین حکمت۔ لیکن تنبیہات کیا کام دے رہی ہیں! تو ان سے اعراض کرو اور اس دن
کا انتظار کرو جس دن پکارنے والا ان کو ایک نہایت ہی نامطلوب چیز کی طرف پکارے گا۔

ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور یہ نکلیں گے قبروں سے جس طرح منتشر ٹڈیاں نکلتی ہیں، بھاگتے ہوئے پکارنے والے کی طرف۔ اس وقت کافر کہیں گے، یہ تو بڑا کٹھن دن آگیا! ۱-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ (۱)

رسول قوم کے لیے خدا کی عدالت ہوتا ہے

'اَلسَّاعَةُ' سے مراد فیصلہ اور عذاب کی گھڑی ہے جس سے قریش کو، یوں تو اس گروپ کی تمام ہی سورتوں میں آگاہ کیا گیا ہے لیکن سابق سورہ میں خاص اہتمام کے ساتھ ان کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ 'اَزِفَتِ الۡاٰزِفَةُ' (۵۷) یہ قریب آنے والی قریب آگئی ہے۔ اس کو بہت دور نہ سمجھو، جاگو اور اٹھو اور اس سے بچنے کی واحد تدبیر یہ، جو تمھیں سمجھائی جارہی ہے، عمل کر کے اپنے کو اس کی آفتوں سے بچانے کی کوشش کرو۔

یہ بات ہم جگہ جگہ واضح کرتے آرہے ہیں کہ اللہ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک تو اس عذاب سے جو اس دنیا میں لازماً قوم پر آکے رہتا ہے اگر وہ رسول کے انذار کو خاطر میں نہیں لاتی بلکہ اس کی تکذیب پر اڑ جاتی ہے۔ دوسرے اس عذاب سے جو آخرت میں پیش آئے گا۔ ان دونوں عذابوں میں فرق صرف آغاز و تکمیل یا تمہید اور خاتمہ کا ہے۔ رسول کی تکذیب کے عذاب میں جو قوم پکڑی جاتی ہے وہ درحقیقت آخرت کے عذاب ہی کے لیے پکڑی جاتی ہے اس وجہ سے لفظ 'اَلسَّاعَةُ' بسا اوقات ان دونوں ہی عذابوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ہر قوم جس کے اندر رسول آگیا اس کے فیصلہ کی گھڑی سر پر آگئی۔ گویا 'اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ' کا اسلوب بیان مبالغہ کا اسلوب نہیں بلکہ یکسر بیانِ حقیقت ہے۔

ظہور عذاب کی ایک نشانی

'وَانۡشَقَّ الۡقَمَرُ' یہ علامت بیان ہوئی ہے عذاب کی گھڑی کے قریب آنے کی۔ اللہ تعالیٰ کی ایک سنت کا حوالہ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ دے چکے ہیں کہ یوں تو اس زمین و آسمان کے چپہ چپہ پر اس کی قدرت و حکمت کی نشانیاں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی نشانیاں بھی ظاہر ہوتی رہتی ہیں لیکن رسولوں کی بعثت کے زمانے میں اللہ تعالیٰ خاص طور پر ایسی نشانیاں ظاہر فرماتا ہے جس سے رسول کے انذار اور اس کے دعوائے رسالت کی صداقت ظاہر ہوتی ہے۔ قرآن میں اس سنتِ الٰہی کا ذکر جگہ جگہ ہوا ہے ہم ایک آیت بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے: 'سَنُرِيۡهِمۡ اٰيٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ' (حٰمٓ السجدۃ ۴۱: ۵۳) (ہم عنقریب ان کو دکھائیں گے اپنی نشانیاں اس کائنات میں بھی اور خود

ان کے اندر بھی یہاں نشانیوں کا مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، رسول کے انذار کو تقویت پہنچانا ہوتا ہے۔ رسول جن باتوں کی منادی زبان سے کرتا ہے اس کی تائید کے آثار و شواہد اس کائنات میں بھی، مختلف شکلوں میں، ظاہر ہوتے ہیں تاکہ لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت اچھی طرح پوری ہو جائے۔ اسی طرح کی ایک نشانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تائید کے لیے چاند کے پھٹنے کی صورت میں ظاہر ہوئی تاکہ منکرینِ عذاب و قیامت پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن ان کو جو ڈرا رہا ہے کہ زمین اس دن ہلا دی جائے گی، پہاڑ پاش پاش ہو کر فضا میں اڑنے لگیں گے، سمندر ابل پڑیں گے، سورج تاریک ہو جائے گا، یہ باتیں ان کو مرعوب کرنے کے لیے نہیں بیان ہوئی ہیں بلکہ یہ حقائق ہیں جو ایک دن پیش آکے رہیں گے اور یہ بعید از امکان بھی نہیں ہیں، ان کے شواہد کسی نہ کسی شکل میں اس دنیا میں بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔

اس طرح کی نشانیوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ رسول نے ان کو اپنے معجزے کے طور پر پیش کیا ہو بلکہ ان کا ظہور کسی اعلان و تحدّی کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کفار نے بعینہٖ اسی نشانی کا مطالبہ کیا ہو جو ظاہر ہوئی بلکہ ان کی طرف سے کسی مطالبہ کے بغیر محض اس لیے بھی ان کا ظہور ہوتا ہے کہ کفار کے پیش کردہ شبہات کا ان کو جواب مل جائے۔ کفار قیامت کو جو بہت بعید از عقل چیز خیال کرتے تھے اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ بھی تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ یہ ساری کائنات ایک دن بالکل درہم برہم ہو جائے۔ پہاڑوں سے متعلق ان کا جو سوال قرآن میں نقل ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کو وہ بالکل اٹل، غیر متزلزل اور غیر فانی سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے شقِ قمر کی نشانی دکھا کر ان کو بتایا کہ اس کائنات کی چیزوں میں سے کوئی چیز بھی خواہ وہ کتنی ہی عظیم ہو، نہ خود مختار ہے، نہ غیر فانی، نہ غیر متزلزل، بلکہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ وہ جب چاہے گا ان سب کو درہم برہم کر کے رکھ دے گا۔

ایک سوال کا جواب رہا یہ سوال کہ اس طرح کا کوئی واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پیش آیا بھی ہے تو اس کا جواب میرے نزدیک یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ سے، یہی بات نکلتی ہے کہ یہ پیش آیا اور حدیثوں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ صورتِ واقعہ کے بارے میں تو حدیثیں ضرور مختلف ہیں لیکن نفسِ واقعہ کے بارے میں کوئی اختلاف منقول نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے یہ کہا ہے کہ یہ قیامت کے دن پیش آنے والے واقعہ کی خبر ہے جس کو ماضی کے صیغہ سے اس کی قطعیت کے اظہار کے لیے بیان فرمایا گیا ہے۔ ان کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ جائے گا۔ یہ قول اگرچہ اگلوں میں سے بھی بعض لوگوں سے نقل ہوا ہے اور اس زمانے میں بھی اس کو ایک گروہ کے اندر حسنِ قبول حاصل ہے لیکن سیاقِ کلام اس سے اِباء کرتا ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں ہے کہ قیامت میں پیش آنے والے واقعات قرآن میں ماضی کے

اسلوب میں بیان ہوئے ہیں لیکن یہاں یہ معنی لیے جائیں تو کلام آگے والی بات سے بے جوڑ ہو جاتا ہے۔ آگے فرمایا گیا ہے کہ یہ کوئی سی نشانی بھی دیکھیں گے تو اس سے اعراض ہی کریں گے اور کہیں گے کہ اس میں کوئی خاص ندرت نہیں، یہ تو جادو ہے جو پہلے سے چلا آ رہا ہے۔ غور کیجیے کہ چاند کے پھٹنے کا تعلق قیامت سے ہوتا تو اس کے بعد یہ بات کہنے کا کیا محل تھا؟ قیامت کے دن تو کٹر سے کٹر منکر بھی کسی چیز کو جادو نہ کہہ سکے گا بلکہ سب اعتراف کریں گے کہ رسولوں نے جو خبر دی وہ حرف حرف سچی نکلی۔ چنانچہ آگے بیان بھی ہوا ہے کہ يَقُولُ الْكَافِرُونَ هَٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (۸) (اس دن کافر کہیں گے کہ یہ تو بڑا ہی کٹھن دن آگیا)۔

یہ شبہ صحیح نہیں ہے کہ اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو دوسری قوموں کی تاریخ میں بھی اس کا ذکر ہوتا۔ ہماری زمین اور دوسرے کُرّوں میں اس طرح کی شکست و ریخت اور ان کے ٹکڑوں کے درمیان انفصال و اتصال کے کتنے واقعات ہیں جو آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن پہلے زمانہ میں ان کا مشاہدہ ایک خاص دائرہ ہی کے اندر محدود رہتا تھا۔ ہمارے زمانے میں اس طرح کے تغیرات کی تحقیق کے لیے بین الاقوامی ادارے اور رصدگاہیں وجود میں آگئی ہیں اس وجہ سے کوئی واقعہ ظہور میں آتا ہے تو اس کی تحقیق کے لیے فوراً ساری دنیا کے تحقیقاتی ادارے بھاگ دوڑ شروع کر دیتے ہیں اور برق کی رفتار سے اس کی اطلاع دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جاتی ہے۔ پہلے تحقیق و اطلاع کے یہ وسائل موجود نہیں تھے اس وجہ سے اس کی خبر ایک خاص دائرے ہی میں محدود رہ گئی۔ لیکن یہ دائرہ نہایت ثقہ لوگوں کا ہے اس وجہ سے نفسِ واقعہ کی تکذیب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل کو سائنس دانوں کے لیے چاند کی تحقیق کی وسیع راہیں کھل جائیں اور علمی تحقیقات سے ثابت ہو جائے کہ چاند کا فلاں حصہ فلاں حصہ سے مربوط تھا لیکن اتنے سو سال پہلے وہ الگ ہو کر فلاں حصے سے جا ملا۔ اس طرح کے کتنے انکشافات ہیں جو ہمارے کرۂ زمین سے متعلق آج ہمارے سامنے آ رہے ہیں اور لوگ ان کو باور کر رہے ہیں تو آخر چاند سے متعلق قرآن کی اس خبر پر تعجب کی کیا وجہ ہے؟ سائنس نے اگر ابھی اس کی تصدیق نہیں کی ہے تو یہ اس کی نارسائی کی دلیل ہے۔ انتظار اور صبر کیجیے، شاید مستقبل میں وہ بھی اس کے اعتراف پر مجبور ہو جائے۔

وَإِن يَرَوْا آيَةً يُعْرِضُوا وَيَقُولُوا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ (۲)

پیغمبر صلعم کو تسلی — یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور مکذبین کو ملامت ہے کہ ان لوگوں کی تکذیب کی اصل علت یہ نہیں ہے کہ ان کو کوئی نشانی نہیں دکھائی جا رہی ہے۔ نشانیاں تو قدم قدم پر موجود ہیں اور آئے دن ان کو نئی نئی نشانیاں بھی دکھائی جا رہی ہیں لیکن یہ ہٹ دھرم لوگ جزا و سزا کو ماننا نہیں چاہتے اس وجہ سے کسی بڑی سے بڑی نشانی سے بھی سبق نہیں لیتے۔ اگر پیغمبر نے ان کو شقِ قمر سے بھی بڑی کوئی نشانی دکھا

دی تو اس کو بھی یہ جادو کا کرشمہ قرار دے کر نظر انداز کر دیں گے۔

'مستمر' کا مفہوم

'سحر' کے ساتھ 'مستمر' کی صفت اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ وہ اس نشانی کو صرف جادو ہی نہیں کہیں گے بلکہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے یہ بھی کہیں گے کہ جادو ہونے کے اعتبار سے بھی اس میں کوئی ایسی ندرت و جدّت نہیں ہے کہ اس کو کوئی خاص اہمیت دی جائے بلکہ یہ اسی قسم کا جادو ہے جس قسم کے جادو پچھلے جادوگروں نے دکھائے اور سکھائے اور جو برابر منتقل ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ اس نشانی کی وجہ سے ان کو خدا کا نذیر ماننا تو درکنار کوئی غیر معمولی جادوگر سمجھنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے 'مستمر' کے معنی فانی کے لیے ہیں لیکن اس معنی میں اس کا استعمال میرے علم میں نہیں ہے۔

وَكَذَّبُوا وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ أَمْرٍ مُسْتَقِرٌّ (۳)

کفار کو ڈھیل دینے کی حکمت

یہ ان کی تکذیب، سببِ تکذیب اور اس کے انجام کا بیان ہے کہ انھوں نے (یعنی قریش نے) خدا کے نذیر اور اس کے انذار کی تکذیب کر دی اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جس کے سبب سے وہ سنتِ الٰہی کے مطابق عذاب کے مستحق ہو چکے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر کام ایک معیّن پروگرام کے مطابق ہوتا ہے۔ جب ان کی اجلِ معیّن پوری ہو جائے گی تو پکڑ لیے جائیں گے۔ یعنی ان کو جو ڈھیل مل رہی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پیغمبر کا انذار محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کی ہلاکت کے لیے مقرر کر رکھا ہے تاہم وہ بالکل قریب آ گیا ہے۔

تکذیب کی علت

'كَذَّبُوا' کے بعد 'وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ' کے الفاظ سے ان کی تکذیب کی علت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ انھوں نے رسول کے انذار کی جو تکذیب کی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کے پاس اس تکذیب کی کچھ دلیلیں ہیں یا فی الواقع کچھ شبہات ہیں جو ابھی صاف نہیں ہوئے ہیں یا ان کو کوئی ایسی نشانی نہیں دکھائی گئی ہے جو ان کو مطمئن کر دے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ اگر وہ جزا و سزا کو مان لیں تو اپنی ان خواہشوں سے انھیں دست بردار ہونا پڑتا ہے جس کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے اس وجہ سے وہ مختلف قسم کی باتیں بنا رہے ہیں۔ یہ مضمون سورۂ نجم کی آیت ۲۹ کے تحت وضاحت سے گزر چکا ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْأَنْبَاءِ مَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ (۴)

عاقل وہ ہے جو دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے

یہ اسی اوپر والی بات ہی کی وضاحت ہے کہ اگر ان پر ابھی عذاب نہیں آیا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے۔ ان کو پچھلی قوموں کی جو سرگزشتیں سنائی گئی ہیں اگر وہ غور کریں تو ان کے اندر کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ ان سرگزشتوں سے انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جس قوم نے بھی رسول کے انذار کی تکذیب کی بالآخر وہ عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ گئی۔ تاخیرِ عذاب سے وہ

قومیں بھی انہی کی طرح اس مغالطے میں مبتلا ہوئیں کہ پیغمبر کی دھمکی محض خالی خولی دھمکی ہے لیکن وہ بالکل سچی ثابت ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے حق میں بہتر ہے کہ تاریخ سے سبق لیں۔ اس انتظار میں نہ رہیں کہ جب سب کچھ ان کے اپنے سروں پر سے گزر جائے گا تب مانیں گے۔ اس وقت کا اعتراف نہ پہلوں کے لیے مفید ہوا ہے نہ ان کے لیے مفید ہو گا۔

قوموں کی یہ سرگزشتیں پچھلی سورتوں میں بھی اجمالاً و تفصیلاً گزر چکی ہیں اور اس سورہ میں بھی آیت ۹ سے وہ آ رہی ہیں۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ ہر سرگزشت کے بعد فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ کی آیت بار بار آئی ہے تاکہ مخاطب پر واضح کر دیا جائے کہ رسول کے انذار کی صداقت یوں ثابت ہو کے رہتی ہے اور اس کو جھٹلانے والے یوں عذاب میں پکڑے جاتے ہیں۔

حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (۵)

یعنی ان سرگزشتوں کے اندر نہایت دل نشین حکمت موجود ہے۔ مگر دیکھ لو یہ تنبیہات کیا نفع دے رہی ہیں! 'مَا' نافیہ بھی ہو سکتا ہے اور استفہامیہ بھی، لیکن استفہامیہ میں زیادہ زور بھی ہے اور موقع کلام سے زیادہ مناسبت بھی۔

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ (۶)

نبی صلعم کو تسلی آمیز ہدایت　یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی آمیز ہدایت ہے کہ ایسے اندھوں کی آنکھوں کی پٹی کھولنا اور ان کو راہ دکھانا تمہارے بس میں نہیں ہے۔ اب تم ان سے اعراض کرو اور اس دن کا انتظار کرو جس دن اسرافیل صُور پھونکیں گے اور یہ قیامت کے عذاب کی طرف پکارے جائیں گے۔

'تَوَلَّ'، یہاں 'اِنْتَظِرْ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یہی مضمون دوسری آیت میں یوں آیا ہے: 'وَاسْتَمِعْ يَوْمَ يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ' (قٓ: ۴۱) (اور کان لگاؤ اس دن کی پکار کے لیے جس دن پکارنے والا نہایت قریب کی جگہ سے پکارے گا)۔ 'نُكُرٍ' سے اشارہ ہولِ قیامت کی طرف ہے۔ اس کی ہولناکی کی شدت ظاہر کرنے کے لیے ابہام کا اسلوب اختیار فرمایا ہے۔ یعنی آج تو ان کو اس دن کے لیے تیاری کی جو دعوت دی جا رہی ہے اس کو خاطر میں نہیں لا رہے ہیں، لیکن جلد وہ وقت آ رہا ہے کہ ایک داعی ایک ہولناک چیز کی طرف پکارے گا اور سب اس کی طرف نہایت فرمانبرداری و خشیت کے ساتھ بھاگیں گے۔

خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۙ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ (۷-۸)

نفخ صور کے بعد قبروں سے نکلنے کی تصویر　یعنی آج تو اللہ کا رسول ان کو اس دن کے ہول سے بچنے کے لیے تیاری کی دعوت دے رہا ہے تو یہ اس سے اکڑتے ہوئے اعراض کر رہے ہیں لیکن جب روزِ قیامت کا داعی پکارے گا تو یہ اس طرح قبروں سے نکلیں گے جس طرح ٹڈی دل نکلتا ہے اور ان کا حال یہ ہو گا کہ ان کی نگاہیں ذلت سے جھکی ہوئی ہوں گی

اور داعی کی طرف نہایت تیزی سے بھاگ رہے ہوں گے۔

'خُشَّعًا' اور 'مُّهْطِعِيْنَ'، دونوں حال ہیں۔ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ، نفخِ صُور کے بعد لوگوں کے قبروں سے نکلنے کی تمثیل ہے۔ برسات میں کبھی سرِ شام پتنگوں کو زمین سے ابھرتے دیکھا ہو گا۔ معلوم ہوتا ہے زمین سے پتنگوں کا طوفان اُبل پڑا ہے۔ یہی صورت ٹڈیوں کے ابھرنے کی بھی ہوتی ہے اور یہی شکل لوگوں کے قبروں سے نکلنے کی بھی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ نشانیاں دکھائی ہی اس لیے ہیں کہ انسان کو قیامت کی یاد دہانی زمین و آسمان کے گوشے گوشے سے برابر ہوتی رہے۔

يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ۔ یعنی آج تو جب اللہ کا رسول ان لوگوں کو اس دن کے ہول سے ڈراتا ہے تو ان کو ہر چیز انہونی اور ناممکن نظر آتی ہے اور نہایت ڈھٹائی سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں لیکن جب وہ دن سامنے آ جائے گا تو نہایت حسرت و یاس کے ساتھ پکار اٹھیں گے کہ لاریب وہ کٹھن دن آ گیا جس سے نبیوں اور رسولوں نے آگاہ کیا تھا!

۲- آگے آیات ۹-۱۷ کا مضمون

اوپر آیت ۴ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ میں قریش کو یہ تنبیہ جو فرمائی گئی ہے کہ آخر یہ لوگ عذاب دیکھنے ہی کے لیے کیوں مچلے ہوئے ہیں، ان کو پچھلی قوموں کی جو تاریخ سنائی گئی ہے اس سے سبق کیوں نہیں لیتے! اس کی وضاحت کے لیے آگے رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سنائی جا رہی ہے کہ تمہاری ہی طرح ان قوموں نے بھی اپنے رسولوں کے انذار کا مذاق اڑایا۔ بالآخر وہ اس عذاب کی گرفت میں آ گئیں جس سے اللہ کے رسول نے ان کو ڈرایا تو بہتر ہے کہ ان قوموں کی تقلید کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دو بلکہ اللہ نے اپنے فضلِ خاص سے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے جو کتاب اتاری ہے اس سے یاد دہانی حاصل کرو۔ یہ کتاب مقصدِ تعلیم و تذکیر کے لیے ہر پہلو سے آراستہ و پیراستہ ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۱۷ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ
وَّازْدُجِرَ ۝۹ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰ فَفَتَحْنَآ
اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝۱۱ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا
فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝۱۲ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ
وَّدُسُرٍ ۝۱۳ تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا ۚ جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝۱۴ وَلَقَدْ

تَرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝١٥ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ۝١٦
وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝١٧

ترجمۂ آیات ۹-۱۷

ان سے پہلے قومِ نوح نے بھی جھٹلایا۔ انھوں نے ہمارے بندے کی تکذیب کردی اور کہا کہ یہ تو خبطی ہے اور وہ جھڑک دیا گیا تو اس نے اپنے رب سے فریاد کی کہ میں مغلوب ہوں، اب تو ان سے انتقام لے۔ پس ہم نے آسمان کے دروازے موسلا دھار بارش سے کھول دیے اور زمین کو چشمے ہی چشمے کردیا۔ پس پانی جا لگا اس نشان پر جو ٹھہرا لیا گیا تھا اور ہم نے اس کو ایک تختوں اور میخوں والی پر اٹھا لیا جو چلتی رہی ہماری حفاظت میں۔ یہ ہم نے بدلہ لینے کے لیے کیا اس کا جس کی ناقدری کی گئی۔ اور ہم نے اس سرگزشت کو ایک داستانِ عبرت بنا کر چھوڑا (عبرت حاصل کرنے والوں کے لیے) تو ہے کوئی عبرت حاصل کرنے والا! دیکھ لو کس طرح سچا ثابت ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا! اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۹-۱۷

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ وَّازْدُجِرَ (۹)

قومِ نوح کے انجام کی طرف اشارہ

ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ آیت ۴ میں قوموں کی تاریخ کی طرف جو اجمالی اشارہ فرمایا ہے یہ اسی کی تفصیل ہے۔ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے واقعہ کو لیا ہے اس لیے کہ یہاں بیانِ واقعات کی ترتیب تاریخی ہے۔ فرمایا کہ ان سے (یعنی قریش سے) پہلے قومِ نوح بھی اللہ کے رسول کے انذار کی تکذیب کر چکی ہے۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ تنہا تمھی کو اپنی قوم کی طرف سے تکذیب سے دوچار نہیں ہونا پڑا ہے، ان مکذبین کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ان سے پہلے قومِ نوح بھی اپنے پیغمبر کی تکذیب کر چکی ہے اور دوسری قومیں بھی جن کی تفصیل آگے آ رہی ہے اپنے اپنے رسولوں

کی تکذیب کرتی آئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تاریخ کی ایک پرانی اور معروف حکایت ہے جو کچھ اگلے رسولوں کو پیش آیا ہے اس سے تمھیں بھی سابقہ پیش آئے گا اور تکذیب کے جس انجام سے دوسری قومیں دوچار ہوئی ہیں اسی سے تمھاری قوم بھی دوچار ہوگی اگر اس نے انہی قوموں کی تقلید کی۔

'فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ' 'ف' تفصیل کے لیے ہے۔ واقعہ کا اجمالاً حوالہ دینے کے بعد اب یہ اس کی تفصیل سنائی جا رہی ہے کہ انھوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا، اس کو دیوانہ اور خبطی ٹھہرایا اور اس کو جھڑک دیا گیا۔

لفظ 'عَبْدَنَا' سے حضرت نوح علیہ السلام کے لیے اللہ تعالیٰ کی جس محبتِ خاص کا اظہار ہو رہا ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ عزت و جاہ کے سرمستوں اور عیشِ دنیا کے متوالوں کو اللہ کے رسولوں نے جب عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت سے ڈرایا اور اس طرح ڈرایا کہ اس کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیے تو یہ چیز ان پر بہت شاق گزری۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر ان پر عذاب کیوں اور کدھر سے آجائے گا؟ اگر وہ سزاوارِ عذاب ہیں تو انھیں جو دولت و عزت حاصل ہے وہ کیوں حاصل ہوئی؟ یہ عزت شوکت تو دلیل ہے کہ وہ خدا کی نظروں میں معزز ہیں اور اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی اسی طرح معزز رہیں گے جس طرح یہاں ہیں۔ اس مغالطہ میں پڑ کر وہ رسول کے ہر وقت کے انذارِ عذاب سے اس درجہ برافروختہ ہوئے کہ اس کو انھوں نے دیوانہ اور خبطی کہنا شروع کر دیا کہ اس شخص کو عذاب اور قیامت کا مالیخولیا ہو گیا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے اس کو ہر طرف سے عذاب ہی آتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے دل کا غصہ بھی نکال لیتے اور اپنے عوام کو بھی اطمینان دلانے کی کوشش کرتے کہ رسول کے انذار سے وہ متاثر نہ ہوں۔ یہ کوئی رسول نہیں بلکہ ایک خبطی ہے جو ہر وقت عذاب کی رٹ لگائے ہوئے ہے۔

'وَازْدُجِرَ' سے اشارہ قومِ نوح کی ان دھمکیوں کی طرف ہے جو حضرت نوحؑ کو سنگسار کر دینے کی دی گئیں۔ مثلاً سورۂ شعراء میں آیا ہے: قَالُوا لَئِن لَّمْ تَنتَهِ يَا نُوحُ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْمَرْجُومِينَ (۱۱۶) (انھوں نے دھمکایا کہ اے نوح، اگر تم اپنی ان باتوں سے باز نہ آئے تو سنگسار کیے ہوئے لوگوں میں سے ہو کے رہو گے!)

فَدَعَا رَبَّهُ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانتَصِرْ (۱۰)

جب قوم کی عداوت اس حد کو پہنچ گئی کہ حضرت نوح علیہ السلام کو سنگسار کر دینے کی دھمکی دے دی گئی تب انھوں نے اپنے رب سے فریاد کی کہ اے رب! میرے اندر جتنا زور تھا وہ میں نے ان کو رام کرنے پر صرف کر دیا لیکن میں اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ اب میری طاقت جواب دے چکی ہے اس وجہ سے تجھ سے فریاد ہے کہ تو ان سرکشوں سے نمٹ!

'اِنْتِصَار' کے معنی مدافعت کرنے اور انتقام لینے کے ہیں۔ یعنی میری طرف سے مدافعت کر اور ان

کی سرکشی کا انتقام لے۔ حضرت نوحؑ کی اس دعا کی پوری تفصیل آگے سورۂ نوح میں آئے گی۔

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ (۱۱-۱۲)

یہ اس سائیکلونی طوفان کی تصویر ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے بعد ان کی قوم پر آیا۔ اس کی تفصیل سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ فرمایا کہ ہم نے ایک موسلا دھار بارش کے ساتھ ان پر آسمان سے تمام دروازے کھول دیے اور زمین کو چشمے ہی چشمے کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی طوفانی بارش جس کے لیے آسمان کے تمام گیٹ کھول دیے گئے ہوں تھوڑی ہی دیر میں زمین کو دریاؤں، ندیوں اور نالوں کی شکل میں تبدیل کر دے گی۔

'فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نشان پانی کے بلند ہونے کے لیے ٹھہرا لیا گیا تھا اس نقطہ پر زمین اور آسمان کا پانی باہم جا ملا اور اس نے پوری قومِ نوح کو اس طرح چھا لیا کہ کسی کے لیے بھی اس سے بچنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ (۱۳)

اصل محافظ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے

'ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ' سے مراد ظاہر ہے کہ وہ کشتی ہے جو حضرت نوح علیہ السلام نے، اللہ تعالیٰ کی خاص ہدایت کے تحت، بنائی۔ اس کا ذکر اس کے اجزائے تعمیر کی تفصیل کے ساتھ یہاں، میرے نزدیک، اللہ تعالیٰ کی قدرت، حکمت، عنایت، رحمت اور شان کے اظہار کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طوفان نے پوری قوم کا بیڑا غرق کر دیا، جس سے کوئی متنفس بھی نہ بچ سکا، اس سے اللہ تعالیٰ نے اپنے جن بندوں کو بچانا چاہا ان کو میخوں سے جڑے ہوئے لکڑی کے تختوں پر بچا لیا۔ یعنی اصل چیز اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت ہے، وہ شاملِ حال ہو تو لکڑی کے چند تختے طوفانِ نوح سے بچا لیتے ہیں اور وہ شاملِ حال نہ ہو تو بڑے سے بڑے جنگی جہاز چشم زدن میں بلبلے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں اور مضبوط سے مضبوط بند تنکوں کی طرح سیلاب کے زور میں بہ جاتے ہیں۔

تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ (۱۴)

یعنی یہ کشتی چونکہ خاص ہماری حفاظت اور ہماری نگرانی میں تھی اس وجہ سے وہ بے خوف و خطر چلتی رہی، طوفان کے تھپیڑے اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کشتی اکیلے حضرت نوحؑ کے پاس ہی تو نہیں تھی، دوسروں کے پاس بھی کشتیاں رہی ہوں گی، لیکن ان کی کشتیاں ان کے کچھ کام نہ آ سکیں اس لیے کہ ان کو خدا کی حفاظت حاصل نہیں تھی۔

'جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ شان اپنی اس لیے دکھائی کہ اپنے اس بندے کی دادرسی فرمائے جس کی ناشکری اور ناقدری کی گئی، یہاں تک کہ اس کو مضطر ہو کر اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (۱۰)

کی فریاد کرنی پڑی۔

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۱۵)

نشانیاں بہت ہیں لیکن عبرت حاصل کرنے والے تھوڑے ہیں

ضمیر مفعول کا مرجع وہ سرزمین بھی ہو سکتی ہے جس کا ذکر اوپر 'وَفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا' (۱۲) کے الفاظ سے ہو چکا ہے اور قومِ نوح کی یہ سرگزشت بھی ہو سکتی ہے جس کی تفصیل تورات کے صحیفوں میں بھی نقل ہوئی ہے اور جس کو ہر دور میں تواترِ عام کی حیثیت بھی حاصل رہی ہے۔ عربی زبان میں ضمیروں کا اس طرح استعمال ایک معروف چیز ہے۔ اس کی متعدد مثالیں اس کتاب میں ہم پیش کر چکے ہیں اور آگے بھی آئیں گی۔ بعض لوگوں نے اس سے کشتیِ نوح کے ڈھانچے کو مراد لیا ہے جس کے متعلق یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس امت کے بعض اگلوں نے کوہِ جودی کے کسی حصہ میں اس کو دیکھا تھا۔ لیکن اس روایت کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ سورۂ 'حاقّہ' کی تفسیر میں ان شاء اللہ ہم اس پر مزید روشنی ڈالیں گے۔

'فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ' یعنی نشانیاں اور عبرت انگیز واقعات تو بہت ہیں جو صفحۂ ارض پر بھی ثبت ہیں اور تاریخ کے اوراق میں بھی محفوظ ہیں لیکن عبرت حاصل کرنے والے دل کہاں ہیں!

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ (۱۶)

'نُذُرِ' اصل میں 'نُذُرِيْ' ہے۔ 'ی' قافیہ کی رعایت سے گر گئی، کسرہ اس کی نشانی کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ 'نُذُر' یہاں 'انذار' سے اسم ہے اور اس کے معنی ڈراوے، تنبیہ اور آگاہی کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس سننے والے کان اور عبرت پکڑنے والا دل ہو تو وہ اس سرگزشت میں دیکھ سکتا ہے کہ اللہ کا عذاب کیسا بے پناہ ہوتا ہے اور اس کی دھمکی کس طرح پوری ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۱۷)

یہ آیت ہر سرگزشت کے بعد، ٹیپ کے بند کے طور پر، بار بار آئے گی۔ اس کا مطلب اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے تاکہ ہر جگہ وضاحت کی ضرورت پیش نہ آئے۔

'تیسیر' اور 'ذکر' کا مفہوم

اس آیت کا مطلب عام طور پر لوگوں نے یہ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو حفظ کرنے یا نصیحت حاصل کرنے کے لیے نہایت آسان کتاب بنایا ہے۔ یہ بات اگرچہ بجائے خود صحیح ہے کہ قرآن حفظ کرنے کے لیے بھی آسان ہے اور نصیحت حاصل کرنے کے لیے بھی سہل ہے لیکن آیت کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے۔

لفظ 'تیسیر' عربی میں کسی چیز کو کیل کانٹے سے درست کرنے، پیشِ نظر مقصد کے لیے اس کو اچھی طرح موزوں بنانے اور جملہ لوازم سے اس کو آراستہ و پیراستہ کرنے کے معنوں میں آتا ہے۔ مثلاً 'يَسَّرَ الْفَرَسَ لِلرُّكُوْبِ' کے معنی ہوں گے گھوڑے کو تربیت دے کر، اس کو کھلا پلا کر، زین، لگام، رکاب سے آراستہ کر کے سواری کے لیے بالکل ٹھیک ٹھاک کر دیا۔ یہیں سے یہ لفظ کسی شخص کو کسی مہم کے لیے تیار اور جملہ لوازم سے مسلح کر کے اس کو اس کا اہل بنا دینے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک جاہلی شاعر کہتا ہے:

ونعین فاعلنا اذا امانا یہ حتٰی نیسرہ لفعل السید

(اور جب ہمارے سربراہِ کار کو کوئی مہم پیش آتی ہے تو ہم اس کی مدد کرتے ہیں یہاں تک کہ سرداروں کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی راہ اس کے لیے ہموار کر دیتے ہیں) ۔

لفظ 'ذکر' بھی یہاں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ یعنی تعلیم، تذکیر، آگاہی، تنبیہ، نصیحت، موعظت، حصولِ عبرت اور اتمامِ حجت سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں ۔ ان تمام مفہوموں میں یہ لفظ قرآن میں بھی آیا ہے ۔ یہ حقیقت بھی یہاں پیش نظر ہے کہ قرآن مجید ہمارے اوپر کوئی چیز خارج سے نہیں لادتا بلکہ ہماری ہی فطرت اور ہماری ہی عقل کے اندر اللہ تعالیٰ نے علم و معرفت کے جو خزانے ودلیعت فرمائے ہیں لیکن ہم ان سے غافل ہیں، انہی کو ہمارے سامنے اجاگر کرتا اور اس سے بہرہ مند ہونے کی دعوت دیتا ہے ۔

ان دونوں لفظوں کا صحیح مفہوم سمجھ لینے کے بعد اب آیت کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر غور فرمائیے ۔ اوپر یہ بات ارشاد ہوئی ہے کہ پیغمبر جس عذاب سے تمھیں آگاہ کر رہے ہیں وہ ایک امر شدنی ہے ۔ آفاق و انفس سب اس کے گواہ ہیں ۔ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ اس کی شاہد ہے لیکن تم مچلے ہوئے ہو کہ جب اس عذاب کی نشانی دیکھ لو گے تب مانو گے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن اتارا ہے جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے جملہ لوازم سے آراستہ و مسلح ہے تو آخر اس عظیم نعمت سے کیوں فائدہ نہیں اٹھاتے، عذاب کے تازیانے ہی کے لیے کیوں بے قرار ہو!

۴۔ تیسیرِ قرآن کے چند پہلو

تیسیرِ قرآن کے مختلف پہلوؤں پر ہم اپنی کتاب 'مبادیٔ تدبرِ قرآن' میں مفصل بحث کر چکے ہیں ۔ یہاں ان کے اعادے کی گنجائش نہیں ہے لیکن آیت کے تعلق سے چند ضروری باتوں کی طرف ہم یہاں بھی اشارہ کریں گے تاکہ ان لوگوں کی غلط فہمی رفع ہو جو اس آیت سے استدلال کرتے ہیں کہ قرآن ایک سہل اور سپاٹ کتاب ہے جو صرف حفظ و تلاوت کے لیے نازل ہوئی ہے، اس کے سمجھنے کے لیے کسی تفکر و تدبر کی ضرورت نہیں ہے ۔ ان کے زعم میں ہر شخص جو الٹی سیدھی عربی سمجھ سکتا ہے وہ بے تکلف قرآن بھی سمجھ سکتا ہے ۔ یہ غلط فہمی فہمِ قرآن کی راہ کو مسدود کر دینے والی ہے اس وجہ سے ضروری ہے کہ تیسیرِ قرآن کے جن پہلوؤں کی طرف خود اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے ہم ان کو یہاں بالاجمال یکجا کر دیں ۔

- تیسیرِ قرآن کا سب سے نمایاں پہلو جس کا قرآن نے بار بار حوالہ دیا ہے یہ ہے کہ وہ 'عربی مبین' میں نازل ہوا ہے، یعنی قریش کی فصیح و بلیغ ٹکسالی زبان میں، جس میں کوئی کج پیچ نہیں ہے تاکہ اہلِ عرب اس کو خوبی سے سمجھ سکیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو جائے ۔
- دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے بالتدریج نازل فرمایا تاکہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس کو بالتدریج سنائیں اور سکھائیں اور لوگ اس کو بالتدریج سنیں سمجھیں اور اس کی تعلیمات اچھی طرح ہضم کریں۔ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (بنی اسرائیل: ۱۰۶) (اور قرآن کو ہم نے قسط قسط کرکے اتارا تاکہ تم لوگوں کو اس کی تعلیم ٹھہر ٹھہر کر دو) اگر پورا قرآن یک دفعہ جُمْلَةً وَّاحِدَةً نازل کر دیا جاتا، جیسا کہ کفار کا مطالبہ تھا تو یہ چیز تیسیر قرآن کے منافی ہوتی۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن کی تمام بنیادی تعلیمات پہلے گٹھے ہوئے الفاظ اور فقروں اور چھوٹی جامع اور محکم سورتوں کی شکل میں نازل ہوئیں تاکہ لوگوں کے لیے ان کا اخذ کرنا، ان کو محفوظ رکھنا، ان پر عمل کرنا اور دوسروں تک ان کو پہنچانا آسان ہو۔ بعد میں جب لوگ مانوس ہو گئے تب اللہ تعالیٰ نے ان گٹھے ہوئے محکم فقروں کی وضاحت فرمائی کِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ (ھود: ۱) میں اسی تیسیر کی طرف اشارہ ہے۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ قرآن میں ہر بات گوناگوں پہلوؤں سے مختلف شکلوں، صورتوں، مختلف سوابق ولواحق اور نئے نئے اطراف و جوانب کے ساتھ بیان ہوئی ہے تاکہ ایک جگہ قاری کے ذہن میں بات نہیں آئی ہے تو دوسری جگہ آ جائے اور ایک مقام میں کوئی دلیل دل میں نہیں اتری ہے تو دوسرے سیاق و سباق میں وہ ذہن نشین ہو جائے۔ قرآن نے اس چیز کو 'تصریفِ آیات' سے تعبیر فرمایا ہے 'كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ' (الاعراف: ۵۸)

پانچواں پہلو یہ ہے کہ قرآن میں مکی اور مدنی سورتوں پر مشتمل سات گروپ ہیں۔ یہ ساتوں گروپ مل کر قرآن عظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں۔ ہر گروپ میں مطالب مشترک بھی ہیں اور فی الجملہ ایک دوسرے سے ممتاز بھی۔ ہر سورہ اپنے ساتھ ایک مثنیٰ بھی رکھتی ہے اور یہ دونوں مل کر اپنے زیر بحث موضوع کو ایک مکمل سورت میں پیش کرتی ہیں۔ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ[1] (الزمر: ۲۳) اور وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (الحجر: ۸۷) کے تحت ہم ان اجمالات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ترتیب کا یہ اہتمام اللہ تعالیٰ نے تیسیر ہی کے مقصد سے اختیار فرمایا ہے۔

۵۔ آگے آیات ۱۸-۴۲ کا مضمون

جس مقصد سے اوپر حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کی سرگزشت بیان ہوئی ہے بعینہ اسی مقصد سے آگے عاد، ثمود، قومِ لوط اور آلِ فرعون کی سرگزشتیں بیان ہوئی ہیں اور ان میں سے ہر سرگزشت بعینہ اسی ترجیع پر ختم ہوئی ہے جس پر قومِ نوح کی سرگزشت تمام ہوئی ہے ـــــ آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۸-۴۲ كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد پنجم، صفحہ ۵۸۰

[2] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد سوم، صفحات: ۶۲۲ - ۶۲۴

رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿١٩﴾ تَنزِعُ النَّاسَ كَأَنَّهُمْ
أَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنقَعِرٍ ﴿٢٠﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٢١﴾ وَلَقَدْ
يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٢٢﴾ كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ ﴿٢٣﴾ ع ۲
فَقَالُوا أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ إِنَّا إِذًا لَّفِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٢٤﴾
أَأُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِن بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ أَشِرٌ ﴿٢٥﴾ سَيَعْلَمُونَ
غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴿٢٦﴾ إِنَّا مُرْسِلُو النَّاقَةِ فِتْنَةً
لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ ﴿٢٧﴾ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ
بَيْنَهُمْ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿٢٨﴾ فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ ﴿٢٩﴾
فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٠﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً
فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿٣١﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ
مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٣٢﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿٣٣﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ
حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۖ نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ ﴿٣٤﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا ۚ
كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ ﴿٣٥﴾ وَلَقَدْ أَنذَرَهُم بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا
بِالنُّذُرِ ﴿٣٦﴾ وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَن ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ
فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٧﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً عَذَابٌ
مُّسْتَقِرٌّ ﴿٣٨﴾ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ
لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٤٠﴾ وَلَقَدْ جَاءَ آلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿٤١﴾ ع ۳
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا كُلِّهَا فَأَخَذْنَاهُمْ أَخْذَ عَزِيزٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٤٢﴾

ترجمۂ آیات ۱۸ - ۴۲

عاد نے بھی تکذیب کی تو دیکھو کس طرح واقع ہوا میرا عذاب اور میرا ڈراوا! ہم نے ان پر مسلّط کر دی بادِ تند ایک مسلسل نحوست کے وقت میں جو لوگوں کو اکھاڑ پھینکتی گویا وہ اکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے ہوں۔ تو دیکھو، میرا عذاب اور میرا ڈراوا کس طرح پیش آکے رہا! اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت سازگار بنایا ہے تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۱۸ - ۲۲

ثمود نے بھی انذار کی تکذیب کی۔ انھوں نے کہا، کیا ہم اپنے ہی اندر کے ایک بشر کی پیروی کریں گے! اگر ہم نے ایسا کیا تو ہم کھلی گمراہی اور جہنّم میں پڑے! کیا ہمارے اندر سے اسی پر یاددہانی نازل کی گئی، بلکہ وہ ایک لپاٹیا اور شیخی باز ہے! وہ کل کو جان لیں گے کہ لپاٹیا اور شیخی باز کون ہے! ہم ناقہ کو بھیجنے والے ہیں ان کے لیے آزمائش بنا کر تو ان پر نگاہ رکھ اور صبر کر۔ اور ان کو آگاہ کر دے کہ اب پانی ان کے درمیان تقسیم ہے۔ باری باری پر حاضر ہونا ہے۔ تو انھوں نے اپنے سردار سے فریاد کی پس وہ بڑھا اور اس نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ تو دیکھو، میرا عذاب اور میرا ڈراوا کس طرح واقع ہو کر رہا! ہم نے ان پر ایک ہی ڈانٹ بھیجی تو وہ باڑھ والے کی باڑھ کے چورے کی طرح ہو کر رہ گئے۔ اور ہم نے قرآن کو یاددہانی کے لیے نہایت موزوں بنایا ہے تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۲۳ - ۳۲

قومِ لوط نے بھی تنبیہات کو جھٹلایا تو ہم نے ان پر سنگ ریزے برسانے والی ہوا مسلّط کر دی۔ صرف آلِ لوط اس سے بچے۔ ہم نے ان کو نجات دی سحر کے وقت۔ خاص اپنے فضل سے۔ ایسا ہی صلہ ہم دیا کرتے ہیں ان کو جو شکر گزار رہتے ہیں۔ اور اس نے ان کو

ہماری پکڑ سے آگاہ کیا لیکن وہ تنبیہات میں مین میکھ نکالتے ہی رہے۔ اور انھوں نے اس کو اس کے مہمانوں کے بارے میں پھسلایا تو ہم نے ان کی آنکھیں اندھی کر دیں تو چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا! اور ان پر آدھمکا سویرے ایک ٹک جانے والا عذاب۔ تو چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا! اور ہم نے قرآن کو تذکیر کے لیے نہایت آراستہ کیا تو ہے کوئی یاددہانی حاصل کرنے والا! ۳۳-۴۰

اور آل فرعون کے پاس بھی تنبیہات آئیں۔ انھوں نے ہماری ساری ہی نشانیوں کو جھٹلا دیا۔ تو ہم نے ان کو ایک غالب اور قوت والے کے پکڑنے کی طرح پکڑا۔ ۴۱-۴۲

۶- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (۱۸)

عاد کی سرگزشت کا حوالہ

'کَذَّبَتْ عَادٌ' کے بعد 'بِالنُّذُرِ' برنبائے قرینہ محذوف ہے۔ آگے کے ذکر میں اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'كَذَّبَتْ ثَمُودُ بِالنُّذُرِ'۔ 'نذر'، 'نذیر' کی جمع بھی ہے اور 'انذار' سے اسم یا حاصل مصدر بھی۔ اگر 'نذیر' کی جمع مانیے تو اس کے معنی ہوں گے ڈرانے والے رسول، آگاہی دینے والی نشانیاں، بیدار کرنے والی تنبیہات، اور اگر اس کو حاصل مصدر کے مفہوم میں لیجیے تو اس کے معنی ہوں گے ڈراوا، تنبیہ، آگاہی اور تہدید و وعید۔ قرآن میں یہ لفظ ان تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ کرتے وقت موقع و محل کی مناسبت کا لحاظ ضروری ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ (۱۹)

یہ اس عذاب کی وضاحت ہے جو قوم عاد پر اللہ تعالیٰ نے مسلط کیا۔ فرمایا کہ ہم نے ان پر شمال کی بادِ تند مسلط کر دی۔ 'صرصر' شمال کی اس بادِ تند کو کہتے ہیں جو سردیوں میں چلتی ہے، جس سے ہر چیز پر ایک عام نحوست و یبوست چھا جاتی ہے۔ یہ زمانہ عرب میں قحط کا زمانہ ہوتا اس وجہ سے اہل عرب اس کو 'یوم نحس' یا 'ایام نحسات' کہتے۔ آیت میں 'یوم نحس' سے کوئی معین دن مراد نہیں ہے بلکہ وقت اور زمانہ مراد ہے۔ عربی میں یہ اس معنی میں معروف ہے۔ چنانچہ دوسرے مقام میں یہی مضمون 'ایام نحسات' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اور بعض مقامات میں یہ تصریح بھی ہے کہ یہ بادِ تند ان پر سات راتیں اور آٹھ دن

مسلط رہی۔ لفظ 'مُسْتَمِر' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ ہوا وقتی جھونکے کی طرح نہیں چلی کہ لوگ اس کو سہہ لے جاتے بلکہ سات آٹھ دن کے لیے وہ ان پر عذاب الٰہی بن کر مسلط رہی۔

تَنْزِعُ النَّاسَ ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ (۲۰)

ہوا کے زور اور اس کی قہرمانیت کا یہ حال تھا کہ وہ لوگوں کو اس طرح اکھاڑ پھینکتی گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔ سورۂ 'حاقہ' میں 'مُنْقَعِر' کی جگہ لفظ 'خَاوِيَة' آیا ہے جس کے معنی کھوکھلے کے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ جب بادِ تند چلنی شروع ہوئی تو جو جہاں تھا وہیں زمین سے چمٹ کر رہ گیا لیکن ہوا کا زور بڑھتا ہی گیا اس درجہ سے کسی کو اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اسی حال میں سب فنا ہو گئے اور ان کی لاشیں ہوا کے زور میں اس طرح لڑھکتی پھرتی تھیں جس طرح کھجوروں کے کھوکھلے تنے لڑھکتے پھرتے ہیں۔ ان کے عذاب کی پوری تفصیل سورۂ ذاریات کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۲۱-۲۲)

یہ آیتیں قومِ نوح کی سرگزشت کے آخر میں اوپر گزر چکی ہیں اور ان کی وضاحت بھی ہو چکی ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ۝ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِىْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (۲۳-۲۴)

واقعۂ ثمود یعنی قوم ثمود نے بھی اسی طرح رسول کی تنبیہات کی تکذیب کی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم اپنے ہی اندر کے ایک بشر کو رسول مان کر اس کی پیروی کریں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم گمراہی میں پڑے اور بھاڑ میں گئے۔ عام طور پر مترجموں نے 'سُعُر' کا ترجمہ جنون کیا ہے لیکن یہاں یہ لفظ جس اسلوب سے استعمال ہوا ہے وہ اس معنی سے اِبا کرتا ہے۔ میرے نزدیک یہ 'سعیر' کی جمع ہے اور آگ کے معنی میں آیا ہے۔ اسی سورہ کی آیت ۴۷ میں ہے: اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِىْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ (بے شک مجرمین گمراہی میں ہیں اور جہنم میں پڑنے والے ہیں)۔ ظاہر ہے کہ یہ انذار حضرت صالح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو کیا ہوگا۔ انہی کی کہی ہوئی بات قوم نے ان کے اوپر الٹ دی کہ یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم نے ان کی بات نہ مانی تو ہم گمراہی میں ہیں اور جہنم میں پڑیں گے، حالانکہ اگر ہم ان کے پیرو بن گئے تب گمراہی میں مبتلا ہو کر جہنم کے سزاوار ٹھہریں گے۔ بھاڑ میں جانے اور جہنم میں پڑنے کے محاورے ہماری زبان میں بھی معروف ہیں۔ گمراہی اور جہنم میں سبب اور مسبّب کا رشتہ واضح ہے لیکن گمراہی اور جنون میں اس طرح کا کوئی تعلق سمجھ میں نہیں آتا۔

ءَاُلْقِىَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ (۲۵)

یعنی اول تو یہی بات عجیب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی بشر کو رسول بنائے لیکن اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ اس کارِ عظیم کے لیے ان کی نظرِ انتخاب ہماری پوری قوم کے اندر سے انہی کے اوپر پڑی! آخر ان کے کیا ایسے موتی ٹنکے ہوئے ہیں کہ اللہ کو اپنی ہدایت اتارنی ہوئی تو اس نے ان پر اتاری! جو لوگ پشتہا پشت

سے قوم کی سرداری و پیشوائی کر رہے ہیں آخر وہ کیوں نظر انداز کر دیے گئے! 'بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ' یعنی یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ شخص اپنے دعوے اور دعوت میں سچا ہو بلکہ یہ بالکل جھوٹا ہے اور ساتھ ہی شیخی باز ہے اس وجہ سے رسول ہونے کا دعویٰ کر کے ہمارے اوپر دھونس جمانا اور اپنی برتری کا سکہ بٹھانا چاہتا ہے۔

سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ (۲۶)

یہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بات کا برسرِ موقعہ جواب دے دیا کہ یہ جو بکواس کرنی چاہتے ہیں کر لیں، فیصلہ کی گھڑی قریب ہے۔ اللہ کا عذاب آیا ہی چاہتا ہے۔ اس وقت یہ دیکھ لیں گے کہ جھوٹا اور شیخی باز کون ہے!

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ وَاصْطَبِرْ (۲۷)

یہ اس عذاب کی تمہید ہے جس کی طرف اوپر والی آیت میں اشارہ ہے۔ فرمایا کہ ہم ایک خاص اونٹنی کو ان کے لیے ایک آزمائش بنا کر بھیجنے والے ہیں تو تم ان پر نگاہ رکھو اور صبر کے ساتھ حالات کو دیکھتے جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ دیکھو یہ اونٹنی کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں اور پھر کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ اس اونٹنی کے آزمائش ہونے کی شکل آگے والی آیت میں بیان ہو رہی ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ (۲۸)

اللہ تعالیٰ نے ایک اونٹنی نامزد کر کے حضرت صالحؑ کو حکم دیا کہ ان لوگوں کو آگاہ کر دو کہ پانی پینے کا جو گھاٹ ہے اب اس پر پانی پلانے کی باری تقسیم کر دی گئی۔ اب ہر ایک کو اپنی باری پر حاضر ہونا ہوگا۔ اور جو باری اللہ کی اونٹنی کے لیے مقرر کر دی گئی ہے کسی کو حق نہیں ہوگا کہ اس کی باری میں کوئی اس سے تعرض کرے۔ اگر اونٹنی کو کوئی گزند پہنچا یا گیا تو یہ اللہ کے عذاب کا پیش خیمہ ہوگا۔ یہ امتحان اللہ تعالیٰ نے اس لیے مقرر فرمایا کہ ان کے اندر کا سارا کھوٹ باہر آجائے اور آشکارا ہو جائے کہ ان کی سرکشی کا پارا کتنا چڑھ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تنبیہ کے بعد کہ یہ اونٹنی عذابِ الٰہی کا نشان ہے اس کو گزند پہنچانے کی جسارت وہی کر سکتے تھے جن کو خود پیغمبر پر ہاتھ اٹھانے میں کوئی خوف مانع نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی قوم کے طغیان کی یہی حد ہے جس پر پہنچ جانے کے بعد وہ اللہ کے عذاب کی مستحق ہوتی ہے۔ اس کے بعد اتمامِ حجت کے لیے کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ (۲۹)

قوم کے لوگ بھلا اس پابندی کو کب گوارا کرنے والے تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ محض حضرت صالحؑ کی دھونس ہے۔ چنانچہ اپنے سردار سے انھوں نے فریاد کی۔ وہ بدبخت لپکا اور اونٹنی کی کونچیں اس نے کاٹ دیں۔ 'تعاطی' کے معنی پنجوں پر کھڑے ہو کر کسی کام کے لیے اقدام کرنے کے ہیں۔ یعنی اپنے زعم میں اس نے بڑی بسالت دکھائی اور اپنی قوم کے لیے ایک نہایت جراَت مندانہ قدم اٹھایا لیکن اس کی یہ

جسارت پوری قوم کو لے ڈوبی۔

لفظ 'عقر' اونٹ کی کونچیں کاٹ دینے کے لیے آتا ہے۔ کونچیں کاٹ دینے کے بعد اونٹ یا اونٹنی کا زندہ رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ (۳۰)

اس آیت کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس واقعہ کے بعد اللہ تعالیٰ کے انذار کے مطابق ان پر عذاب آدھمکا۔ قرآن کے دوسرے مقام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد ان کو صرف تین دن کی مہلت ملی کہ اب بھی اگر وہ توبہ کرنی چاہیں تو کر لیں لیکن انھوں نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ (۳۱)

یہ اشارہ اس عذاب کی طرف ہے جو ان پر آیا۔ 'صَيْحَة' کے معنی کڑک کے ہیں۔ دوسرے مقام میں لفظ 'صَاعِقَة' بھی آیا ہے۔ استاذ امامؒ نے سورۂ ذاریات کی تفسیر میں اس عذاب کی نوعیت پر، قرآن کی روشنی میں، مفصل بحث کی ہے۔ آخر میں خلاصۂ بحث ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان کے اوپر اللہ تعالیٰ نے سرما کے بادلوں، تند ہوا اور ہولناک کڑک کا عذاب مسلط کیا۔ لیکن اصل تباہی ہوا کے تصرفات سے واقع ہوئی۔ اس وجہ سے اگر اثر سے مؤثر پر استدلال کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ نے سرما کے دھاریوں والے بادل بھیجے جن کے اندر ہولناک کڑک اور بہرا کر دینے والی چیخ بھی تھی۔"

یہ امر بھی واضح رہے کہ اس طرح کی گرج چمک کے لوازم میں سے ژالہ باری بھی ہے جو اگر شدت اختیار کر لے تو سنگ باری کے ہولناک عذاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ہر چیز کو بھس بنا کر رکھ دیتی ہے۔

'فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ'۔ 'مُحْتَظِر' باڑھ بنانے والے کو کہتے ہیں۔ چرواہے عام طور پر اپنے گلّوں کی حفاظت کے لیے میدانوں میں جھاڑ جھنکاڑ کی باڑھ بنا لیتے ہیں جس کے اندر شب میں گلّہ کو محفوظ کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی باڑھ کچھ عرصہ کے بعد بارش، ہوا اور جانوروں کے روندنے سے ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ 'هَشِيم' اسی طرح کی ریزہ ریزہ چیز کو کہتے ہیں۔ یہ ان کی تباہی کی تمثیل ہے کہ ہوا، بارش، سنگباری اور کڑک نے اس طرح ان کو چور چور کر دیا جس طرح باڑھ والے کی باڑھ چور چور ہو کے رہ جاتی ہے۔ یعنی دیکھنے والا ان کے گھروں اور آبادیوں کو دیکھتا تو یہ گمان کرتا کہ کبھی یہاں کچھ لوگ بسے تو تھے لیکن اب صرف ان کے روندے ہوئے آثار باقی رہ گئے ہیں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ (۳۲)

یہ وہی ترجیع کی آیت ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ۝ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۖ نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ (۳۳-۳۴)

واقعۂ قومِ لوط

فرمایا کہ اسی طرح لوطؑ کی قوم نے بھی تنبیہات کو جھٹلایا تو اتمامِ حجت کے بعد ہم نے ان پر سنگ ریزے برسانے والی آندھی مسلط کر دی۔ حاصب کی نوعیت سورۂ ذاریات کی تفسیر میں واضح کی جا چکی ہے۔

'اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ' یعنی اس عذاب سے صرف آلِ لوط محفوظ رہے۔ لفظ 'آل' پر اس کے محل میں بحث گزر چکی ہے کہ اس کے مفہوم میں صرف آدمی کی صُلبی ذرّیت ہی شامل نہیں ہے بلکہ اس کی معنوی ذرّیت یعنی اس کے اتباع بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔

'نَجَّیْنٰھُمْ بِسَحَرٍ' فرمایا کہ لوطؑ اور ان کے اتباع کو ہم نے عذاب کے ظہور سے پہلے ہی سحر کے وقت بستی سے نکال لیا۔ عذاب کا وقت آگے 'وَلَقَدْ صَبَّحَھُمْ بُکْرَۃً' کے الفاظ سے واضح فرمایا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب صبح کو آیا اور یہ لوگ طلوعِ فجر سے پہلے پہلے عذاب کے علاقہ سے نکل چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ حفاظت ان کو اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت سے حاصل ہوئی۔

نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا ۚ كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ (۳۵)

ایسے ہولناک عذاب سے اس طرح بال بال بچا لیا جانا صرف اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی عنایت ہی سے ممکن ہے۔ کسی دوسرے کے لیے اس طرح کا پروگرام بنا لینا ممکن نہیں ہے۔

'کَذٰلِکَ نَجْزِیْ مَنْ شَکَرَ' میں حضرت لوطؑ کی غیر معمولی صفتِ شکر کی غیر معمولی داد بھی ہے اور اس امر کا اعلانِ عام بھی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عنایت صرف حضرت لوطؑ ہی کے لیے خاص نہیں تھی بلکہ آج بھی جو لوگ اس کے شکر کرنے والے ہوں گے وہ اس کی عنایتِ خاص کے حقدار ہوں گے۔ اس کا دامنِ رحمت بہت وسیع ہے۔

وَلَقَدْ أَنذَرَهُم بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ (۳۶)

آیت ۳۵ بیچ میں بطور جملہ معترضہ آگئی تھی۔ یہ ان کے اوپر عذاب نازل ہونے کا سبب بیان ہو رہا ہے کہ وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب اس کے سزاوار ٹھہرے۔ اللہ کے رسول نے ان کو ہر پہلو سے اچھی طرح آگاہ کر دیا کہ انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کی پکڑ میں آجائیں گے اور اس کی پکڑ سے کوئی بچانے والا نہیں بنے گا، لیکن وہ ہر تنبیہ میں حجتیں نکالتے ہی رہے۔

وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَن ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي وَنُذُرِ (۳۷)

یہ ان کی اس آخری جسارت کی طرف اشارہ ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ کا عذاب ان پر آدھمکا۔ فرمایا کہ جس بے حیائی میں وہ مبتلا تھے رسول کی تنبیہات سے اس سے باز آنا تو الگ رہا وہ اس میں دن پر دن دلیر ہی ہوتے گئے یہاں تک کہ جب فرشتے خوبصورت مردوں کے بھیس میں حضرت لوطؑ کے پاس آئے

تو یہ ان کے مکان پر چڑھ دوڑے اور ان کو راضی کرنا چاہا کہ وہ ان مہمانوں کو ان کی ہوس کاری کے لیے ان کے حوالہ کر دیں۔

جو لوگ اس طرح اندھے بہرے بن جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق وہ اندھے بہرے ہی کر دیے جاتے ہیں۔ پھر نہ کوئی موعظت وہ سننے کے اہل رہ جاتے، نہ کوئی بڑی سے بڑی نشانی دیکھنے کے۔ اس کے بعد واحد چیز جو ان کے لیے باقی رہ جاتی ہے وہ اللہ کا عذاب ہے چنانچہ یہ لوگ بھی اسی عذاب کے حوالہ کر دیے گئے۔

'فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ' کے الفاظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان کی ظاہری آنکھیں بھی مُوند دی گئی ہوں بلکہ یہ ان کے بصیرت سے کلیتہً محروم کر دیے جانے کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں اس مفہوم کے لیے یہ اسلوبِ بیان جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ محمد میں ہے:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ (محمد: ۲۳)	یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کر دی۔ پس ان کے کان بہرے کر دیے اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔

اس آیت کی روشنی میں 'طَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ' کا مطلب یہ ہوگا کہ جب وہ اپنی ہوائے نفس سے مغلوب ہو کر اس حد کو پہنچ گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عاقبت بینی کی صلاحیت سے بالکل محروم ہو گئے۔ انسان کی آنکھوں کا اصلی جوہر ان گڑھوں میں نہیں ہے جو چہروں پر نظر آتے ہیں بلکہ آنکھوں کی بصیرت میں ہے۔ یہ چیز جس کے اندر ختم ہو گئی اس پر اللہ کی لعنت ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہوئی وہ ہر لمحہ خدا کے غضب کا ہدف ہے۔

ویسے یہ بات بھی معلوم ہے کہ جب ان اشرار نے حضرت لوطؑ کو ان مہمانوں کے لیے ورغلانا چاہا تو مہمانوں نے حضرت لوطؑ پر یہ راز کھول دیا تھا کہ آپ مطمئن رہیں، ہم بشر نہیں بلکہ خدا کے فرستادے ہیں۔ ان شیاطین کی مجال نہیں ہے کہ ہمارے پاس پھٹک سکیں۔ اس کے فوراً بعد انھوں نے حضرت لوط کو روانہ ہو جانے کی ہدایت فرمائی۔ حضرت لوط علیہ السلام کے روانہ ہو جانے کے بعد قرین قیاس یہی ہے کہ وہ اپنے اصل ملکوتی روپ میں آگئے ہوں گے اور اس روپ میں ان کو بشری آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں۔

وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ (۳۸)

صبح کے وقت ان پر کنکر برسا دینے والا ہوا کا عذاب آدھمکا۔ عرب میں حملہ اور غارت گری کا وقت بالعموم صبح ہی کا وقت ہوتا تھا، اس وجہ سے لفظ 'صَبَّحَ' اس معنی میں آنے لگا۔ اوپر اشارہ گزر چکا ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام اپنے اتباع کے ساتھ سحر کے اوّل وقت بستی سے نکل چکے تھے۔ یہاں یہ وضاحت ہے کہ عذاب طلوعِ صبح کے بعد آیا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت لوطؑ کے بستی سے نکلنے کے بعد عذاب کے آنے میں اتنی دیر ہوئی کہ حضرت لوطؑ عذاب کے علاقہ سے باہر نکل گئے۔

'عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ' سے مراد ٹک جانے والا عذاب ہے۔ عذاب ایک تو وہ ہے جو محض تنبیہ کے لیے آتا ہے جس میں کافر و مومن دونوں بلا امتیاز حصہ پاتے ہیں۔ البتہ مومن اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں اور کافر اس سے اپنی قساوتِ قلب میں اضافہ کرتے ہیں۔ دوسرا عذاب وہ ہے جو رسولوں کی تکذیب کے نتیجہ میں مکذبین کا فیصلہ کر دینے کے لیے آتا ہے۔ یہ عذاب جس قوم پر آیا اس نے وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ اہل ایمان تو اس علاقہ سے نکال لیے گئے لیکن جنھوں نے رسول کی تکذیب کی وہ سب وہیں فنا کر دیے گئے۔

'مُسْتَقِرٌّ' سے مقصود اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ یہ عذاب کوئی ایسا عذاب نہیں تھا جو ایک جھونکے کی طرح آیا اور گزر گیا بلکہ یہ وہیں ٹک کے رہ گیا۔

فَذُوْقُوْا عَذَابِیْ وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ (۳۹-۴۰)

یہ وہی ترجیع ہے جو اوپر والی سرگزشتوں کے ساتھ گزر چکی ہے اور جس کی پوری وضاحت ہو چکی ہے۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ۝ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کُلِّھَا فَاَخَذْنٰھُمْ اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ (۴۱-۴۲)

واقعۂ فرعون — یہ آخر میں فرعون اور اس کی قوم کے انجام کی طرف بھی بالاجمال اشارہ کر دیا۔ آلِ فرعون سے مراد ظاہر ہے کہ صرف فرعون کے اہل و عیال ہی نہیں بلکہ اس کی پوری قوم ہے۔ 'نُذُرُ' یہاں جمع کے مفہوم میں ہے اور 'کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا کُلِّھَا' کے الفاظ سے اس کی وضاحت ہو گئی ہے۔ یعنی یہ اشارہ انذار کی ان تمام نشانیوں کی طرف ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں مصریوں کو قہرِ الٰہی سے ڈرانے کے لیے ظاہر ہوئیں اور جن کی پوری تفصیل تورات میں بھی موجود ہے اور قرآن نے بھی ان کا حوالہ دیا ہے اور ہم ان کی وضاحت کر چکے ہیں۔ ان نشانیوں میں سے ہر نشانی آنکھوں کی پٹیاں کھول دینے کے لیے کافی تھی لیکن فرعونیوں کے دل اتنے سخت ہو چکے تھے کہ وہ ساری نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی اندھے ہی بنے رہے۔

'اَخْذَ عَزِیْزٍ مُّقْتَدِرٍ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ جب ہم نے ان کو پکڑا تو اس طرح پکڑا جس طرح ایک زبردست اور بے پناہ قدرت والا پکڑتا ہے جس کی پکڑ سے کوئی بھی کسی کو بچا نہیں سکتا۔

۷۔ آگے آیات ۴۳-۵۵ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں۔ قریش کے لیڈروں کو براہِ راست خطاب کر کے ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ رسولوں اور ان کی قوموں کی جو تاریخ تمھیں سنائی گئی ہے اسی کے آئینہ میں اپنا حشر بھی دیکھ لو۔ پچھلے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہو چکا آخر تمھیں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ تمھارے سامنے وہ انجام

نہیں آئے گا۔ تم بھی انہی کی طرح اس دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہوگے اور آخرت میں جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اس سے کہیں سخت ہوگا۔ آخر میں بالاجمال اس صلہ کا بھی ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کو ملنے والا ہے۔
آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۳-۵۵

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿٤٣﴾ أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ﴿٤٤﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ ﴿٤٥﴾ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ ﴿٤٦﴾ إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ ﴿٤٧﴾ يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ ﴿٤٨﴾ إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ ﴿٤٩﴾ وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ﴿٥٠﴾ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا أَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿٥١﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ﴿٥٢﴾ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿٥٣﴾ إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ ﴿٥٤﴾ فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿٥٥﴾

وقف لازم

ع ۳ ۱۵ ۱۰

ترجمۂ آیات ۴۳-۵۵

کیا تمہاری قوم کے کفار ان قوموں کے کفار سے کچھ بہتر ہیں یا تمہارے لیے آسمانی صحیفوں میں براءت نامہ لکھا ہوا ہے! کیا ان کا زعم ہے کہ ہم مقابلہ کی قوت رکھنے والی جمعیت ہیں! یاد رکھیں کہ ان کی جمعیت عنقریب شکست کھائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ ۴۳-۴۵

بلکہ ان سے جو وعدہ ہے اس کے پورے ہونے کا اصلی وقت تو قیامت کا دن ہے اور قیامت کا دن بڑا ہی سخت اور بڑا ہی کڑوا ہوگا! ۴۶

بے شک مجرمین گمراہی میں ہیں اور دوزخ میں پڑیں گے۔ اس دن کو یاد رکھیں جب

یہ اپنے چہروں کے بل گھسیٹے جائیں گے! چکھو مزا دوزخ کی لپٹ کا! ۴۷-۴۸

ہم نے ہر چیز ایک اندازے کے ساتھ پیدا کی اور ہمارا حکم تو بس بیک دفعہ پلک جھپکنے کی طرح پورا ہو گا اور ہم نے تمھارے ہم مشربوں کو ہلاک کر چھوڑا تو ہے کوئی ان کے انجام سے عبرت حاصل کرنے والا! ۴۹-۵۱

اور جو کچھ انھوں نے کیا ہے سب رجسٹروں میں درج ہے اور ہر چھوٹی بڑی بات ان میں مرقوم ہے۔ ۵۲-۵۳

بے شک خدا سے ڈرتے رہنے والے باغوں اور نہروں کے عیش میں ہوں گے۔ ایک پائدار مقامِ عزت میں، ایک مقتدر بادشاہ کے پاس! ۵۴-۵۵

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ أُولَٰئِكُمْ أَمْ لَكُم بَرَاءَةٌ فِي الزُّبُرِ (۴۳)

اللہ تعالیٰ کو دونوں مساوات سے یکساں ہے

یہ قریش سے خطاب ہے جن سے اوپر سے بحث چلی آ رہی ہے۔ ان کو براہِ راست خطاب کر کے فرمایا کہ رسولوں کے انذار کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام ہوا اس کی تفصیل تم نے سن لی۔ اب بتاؤ کہ انہی کی روش جب تم نے اختیار کی ہے تو آخر اللہ تعالیٰ تمھارے ساتھ اس سے مختلف معاملہ کیوں کرے گا؟ کیا تمھاری قوم کے کفار ان سے بہتر ہیں یا آسمانی صحیفوں میں تمھارے لیے کوئی برارت نامہ لکھا ہوا ہے کہ تم جو چاہو کرو، تم سے کوئی پرسش نہیں ہونی ہے! اللہ کے عدل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ ایک ہی قانون کے تحت معاملہ کرے اور یہی بات اس نے اپنے صحیفوں میں لکھی بھی ہے تو آخر تم نے اپنے لیے یہ عفوِ عام کا پروانہ کہاں سے حاصل کر لیا! یہی مضمون دوسرے مقام میں یوں ارشاد ہوا ہے: أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ۝ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ (القلم: ۳۷-۳۸) (کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمھارے لیے اس میں وہی کچھ ہے جو تم چاہو گے)۔

أَمْ يَقُولُونَ نَحْنُ جَمِيعٌ مُّنتَصِرٌ ۝ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ (۴۴-۴۵)

[illegible]

یعنی اگر ان کو یہ زعم ہے کہ وہ ایک مضبوط جمعیت ہیں، کوئی ان کو ان کی جگہ سے ہلا نہیں سکتا تو یہ زعم بالکل

باطل ہے۔ اللہ کے عذاب کے آگے کوئی نہیں ٹک سکتا۔

جن کو اپنی جمعیت و قوت پر ناز ہوتا ہے وہ جس طرح اپنے حریفوں کی کسی تہدید و وعید کو خاطر میں نہیں لاتے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ رسولوں کے انذار کو وہ ناقابلِ التفات سمجھتے ہیں۔ اپنے مادی وسائل و ذرائع پر ان کو اتنا اعتماد ہوتا ہے کہ ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ ان کے اوپر عذاب کدھر سے اور کس طرح آجائے گا! فرمایا کہ اگر ان کو یہ گھمنڈ ہے کہ انھوں نے تمام مورچے سنبھال رکھے ہیں اور مدافعت کی قوت سے بھرپور ہیں تو یاد رکھیں کہ خدا کی افواجِ قاہرہ کے مقابل میں ان کی قوت و جمعیت ذرا بھی کام آنے والی نہیں بنے گی۔ اس وقت ان کی جمعیت شکست کھائے گی اور وہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَىٰ وَأَمَرُّ (۴۶)

عذابِ دنیا کے بعد عذابِ آخرت

یعنی اس ہزیمت و پامالی سے تو وہ اسی دنیا میں عنقریب دوچار ہوں گے لیکن ان کو جو وعید سنائی جا رہی ہے اس کے ظہور کا اصلی دن قیامت کا دن ہے جو ان کے لیے بڑا ہی کٹھن اور نہایت ہی کڑوا ہو گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اوپر والی آیت میں اس عذاب و ہزیمت کا ذکر تھا جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً اسی دنیا میں سابقہ پیش آتا ہے۔ اس آیت میں اس عذاب کا حوالہ ہے جو اصل روزِ حساب یعنی قیامت میں ان کے سامنے آئے گا اور جو بڑا ہی کٹھن ہو گا۔

اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اس سنتِ الٰہی کا حوالہ دے چکے ہیں کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والے اس دنیا میں بھی لازماً شکست کھاتے ہیں اور آخرت تو ان کی رسوائی کی جگہ ہے ہی۔ اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔

'مَوْعِدٌ' یہاں ظرف کے مفہوم میں ہے۔ یعنی ان کو جو وعید سنائی جا رہی ہے اس کے ظہور کا اصلی وقت یا جگہ۔

'اَدْھٰی' یعنی ایسی مصیبت کا دن ہو گا کہ اس دن کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے گا، سب کی سٹی بھول جائے گی۔

إِنَّ الْمُجْرِمِينَ فِي ضَلَالٍ وَسُعُرٍ (۴۷)

لفظ سُعُر کے جمع لانے کا فائدہ

یعنی آج تو یہ بڑے طنطنہ سے کہتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنے ہی اندر کے ایک بشر کو رسول مان کر اس کی پیروی کی تو ہم گمراہی اور جہنم میں پڑنے والے بنے لیکن اس دن یہ کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ جنھوں نے رسول کے انذار کی تکذیب کی وہ سارے مجرمین گمراہی میں تھے اور اس گمراہی کا نتیجہ ان کے آگے جہنم کی شکل میں آیا۔

لفظ 'سُعُر' ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں، جنون کے معنی میں نہیں بلکہ جہنم ہی کے مفہوم میں ہے۔ اس کے جمع کی صورت میں لانے سے مقصود اس کے مختلف طبقات کی طرف اشارہ ہے۔ لفظ 'جنت' بھی اسی طرح قرآن میں جگہ جگہ جمع کی صورت میں آیا ہے۔

يَوْمَ يُسْحَبُونَ فِي النَّارِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ ذُوقُوا مَسَّ سَقَرَ (۴۸)

استکبار کی سزا

اس دن ان مجرمین کو جس ذلت سے سابقہ پیش آئے گا، یہ اس کی یاددہانی ہے۔ فرمایا کہ آج تو یہ بہت اکڑ اکڑ اور تھنے پھلا پھلا کر جھٹلا رہے ہیں لیکن وہ دن آنے والا ہی ہے جب یہ دوزخ کی آگ میں مونہوں کے بل گھسیٹے جائیں گے۔ مونہوں کے بل گھسیٹے جانا انتہائی ذلت کی تصویر ہے۔ یہ سزا ان کو اس وجہ سے دی جائے گی کہ انھوں نے محض غرور کے سبب سے ایک واضح حقیقت کو جھٹلایا۔

ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ یہ قول زبانِ قال سے بھی ہو سکتا ہے اور زبانِ حال سے بھی۔ میں دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہوں۔ ان کا اس طرح گھسیٹا جانا خود ہی انھیں سب سے زیادہ واضح طور پر بتا دے گا کہ ان کی یہ درگت کیوں بن رہی ہے۔

اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (۴۹)

ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں وقت مقرر ہے

یعنی اس عذاب اور قیامت کا آنا تو قطعی ہے۔ رہا یہ سوال کہ ان کا آنا قطعی ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز ایک خاص اندازے کے ساتھ پیدا کی ہے۔ اس نے ہر چیز کے لیے ایک اجلِ معیّن ٹھہرائی ہے جس میں وہ اس کو مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنی غایت کو پہنچ جائے۔ قوموں کے ساتھ بھی اس کا معاملہ اسی اصول پر ہے۔ کوئی قوم سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہے تو وہ اس کو فوراً نہیں پکڑ لیتا بلکہ اس کو اتنی مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنی خیر و شر کی تمام صلاحیتیں اجاگر کر سکے تاکہ اس پر حجّت تمام ہو جائے اور قیامت کے دن اس کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ یہی معاملہ وہ تمھارے (یعنی قریش) ساتھ بھی کرے گا۔ تمھیں اتنی مہلت دے گا جتنی مہلت اس کے قانون کے مطابق تمھیں ملنی چاہیے تاکہ تم اصلاح کرنی چاہو تو رسول کی ہدایت کے مطابق اصلاح کر لو۔ اور اگر یہ نہیں تو اپنا پیمانہ اچھی طرح بھر لو تاکہ جب پکڑے جاؤ تو تمھیں یہ شکوہ نہ رہے کہ تمھارے ساتھ جلدی کی گئی، اگر مزید مہلت ملتی تو اصلاح یافتہ بن جاتے۔ پس فلاح کی راہ یہ ہے کہ اللہ نے تمھیں جو مہلت بخشی ہے اس سے فائدہ اٹھاؤ، عذاب کے لیے جلدی نہ مچاؤ۔ اس کا وقت مقرر ہے۔ جب وقت آ جائے گا تو کوئی اس کو روک نہ سکے گا۔

وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۢ بِالْبَصَرِ (۵۰)

ہر کام کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک اشارہ کافی ہے

یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ عذاب اور قیامت کے لانے کے لیے ہمیں کوئی تیاری کرنی ہے اس وجہ سے اس کے آنے میں دیر ہو رہی ہے۔ اس طرح کی کوئی رکاوٹ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ جب ہم اس کو لانا چاہیں گے تو اس کے لیے ہمارا ایک ہی حکم کافی ہوگا۔ اس حکم کو دہرانے کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور اس حکم کے لیے بھی ہمیں کسی اہتمام و انتظام کی ضرورت نہیں پیش آئے گی بلکہ یہ اس طرح بروئے کار آئے گا جس طرح چشم و ابرو کا اشارہ ظہور میں آتا ہے۔

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (۵۱)

یعنی آخر اس عذاب کی تاخیر سے تم اس مغالطے میں کیوں پڑ گئے کہ یہ محض دھونس ہے؟ اگر تم پر ابھی نہیں آیا تو تمہارے ان پچھلے ہم مشربوں پر تو آ چکا ہے جن کو ہم ہلاک کر چکے ہیں تو آخر ان کے حالات سے کیوں سبق حاصل نہیں کرتے؟ 'اَشْیَاعَکُمْ' سے اشارہ ان قوموں کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں اوپر سنائی جا چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کے عاقل ہونے کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ دوسروں کے انجام سے سبق حاصل کرے نہ کہ جب سب کچھ اپنے اوپر گزر جائے تب مانے۔ اس ماننے سے کیا نفع پہنچے گا!

عاقل دوسروں کے انجام سے سبق سیکھتے ہیں

وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِيرٍ وَّكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ (۵۲-۵۳)

یعنی اس مغالطے میں بھی نہ رہیں کہ ان کا کوئی قول و فعل خدا کے احاطۂ علم سے باہر ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کیا ہے سب ریکارڈ کے دفتروں میں محفوظ اور ہر چھوٹی بڑی بات نوشتہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے سامنے اس کا سارا کیا دھرا رکھ دے گا اور مجرم اس کو دیکھ کر پکار اٹھیں گے کہ عجیب ہے یہ رجسٹر کہ ہر چھوٹی اور بڑی بات اس نے محفوظ کر لی ہے۔

اللہ کے ہاں سب کا ریکارڈ محفوظ ہے

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ (۵۴)

'مُجْرِمِیْنَ' کے بعد یہ 'مُتَّقِیْنَ' کا ذکر ہے کہ وہ باغوں اور نہروں کے عیش میں ہوں گے۔ 'مُتَّقِیْن' یہاں مذکورہ بالا 'مجرمین' یعنی مکذبین جزا و سزا کے بالمقابل ہے اس وجہ سے اس سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو اپنے رب کے حضور پیشی اور جزا و سزا سے برابر ڈرتے رہے۔ لفظ 'جنت' کا جمع ہونا جنت کی وسعتِ اطراف کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے اور اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ہر شخص کو کئی کئی باغ ملیں گے اور ان کے اندر بھی بہت سے الگ الگ باغ باغیچے ہوں گے۔ اگلی سورہ میں اس کی وضاحت آئے گی۔ 'فِیْ' کے بعد ایک مضاف، عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، محذوف ہے یعنی وہ باغوں اور نہروں کے عیش میں گھرے ہوئے ہوں گے۔ باغ اور نہر دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بغیر نہر کے باغ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن میں جنت کے ساتھ نہر کا ذکر اسی وجہ سے تقریباً ہر جگہ آیا ہے۔

'متقین' کا انجام

فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ (۵۵)

یہ ان متقیوں کی اصل سرفرازی کا بیان ہے کہ جنت کا یہ عیش جاوداں ان کو ایک پائدار عزت والی بارگاہ میں، عظیم قدرت والے بادشاہ کے قرب میں، حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قرب ہی ہے جو جنت کو جنت بناتا ہے ورنہ اس کی حیثیت ایک باغ سے زیادہ نہیں ہے۔

'مَقْعَد' کی اضافت 'صِدْقٍ' کی طرف اس کی عزت، پائداری اور ابدیت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس طرح 'لسان صدق' کی ترکیب میں یہ تمام مفہوم پائے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دربارِ عظیم کے درباری ہونے کا جو شرف ان کو حاصل ہوگا، نہ اس کی عزت بناوٹی اور نمائشی ہوگی نہ چند روزہ کہ آج ہے اور کل کرسی چھن جائے تو کوئی بھی پوچھنے والا نہ رہے۔

'عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ'۔ 'مَلِيْك' میں 'مَلِك' کے بالمقابل زیادہ زور ہے۔ اس کے ساتھ 'مُقْتَدِر' کی صفت اس کو مزید زوردار بنانے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کا بادشاہ محض نام کا بادشاہ نہیں ہے، جیسا کہ مشرکوں اور ان گمراہ فرقوں نے مانا ہے جو خدا کو ہر چیز سے بالا محض ایک وجود معطل قرار دیتے ہیں، بلکہ وہ ہمہ گیر اقتدار رکھنے والا ہے۔

لفظ 'عِنْدَ' سے ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ انسان کو بلند سے بلند رتبہ بھی جو حاصل ہو گا وہ صرف یہ ہے کہ وہ بادشاہِ حقیقی کے قرب میں عزت کی جگہ پائے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ وہ خدا میں ضم ہو کر خود خدا بن جائے، جیسا کہ باطنی صوفیوں نے دعویٰ کیا ہے۔

ربِّ کریم کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۱۱۔ اگست ۱۹۷۷ء

۲۵۔ شعبان ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

٥٥

الرحمٰن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا مزاج، عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

اس سورہ کو بعض لوگوں نے مدنی قرار دیا ہے لیکن پوری سورہ کا مدنی ہونا تو الگ رہا اس کی ایک آیت بھی مدنی نہیں معلوم ہوتی۔ پوری سورہ بالکل ہم آہنگ و ہم رنگ ہے اور پڑھنے والا صاف محسوس کرتا ہے کہ یہ بیک دفعہ نازل ہوئی ہے۔

اپنے مزاج اور مطالب کے اعتبار سے یہ سورتوں کے اس زمرے سے تعلق رکھتی ہے جو مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہیں جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے جوش میں مخالفین اس مطالبہ پر اڑ گئے ہیں کہ جب تک ان کو کوئی نشانیِ عذاب نہ دکھا دی جائے گی اس وقت تک نہ وہ یہ ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اس نئی دعوت کی تکذیب کے نتیجہ میں ان پر کوئی عذاب آجائے گا اور نہ یہ تسلیم کرنے والے ہیں کہ فی الواقع آگے کوئی دن آنے والا ہے جس میں ان کو دائمی عذاب اور ابدی رسوائی سے دوچار ہونا پڑے۔

ضد اور ہٹ دھرمی کی اسی ذہنیت کے سبب سے سابق سورہ میں بھی آپ نے دیکھا ہے کہ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ہ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ کی تذکیر بار بار دہرائی گئی ہے اور اس سورہ میں فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ کی تنبیہ بار بار آئی ہے۔ کسی ایک ہی بات کی طرف بار بار توجہ دلانے کا یہ اسلوب ظاہر ہے کہ اسی صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب یا تو اتنا ضدی ہو کہ اپنی خواہش کے خلاف کوئی بات ماننے کے لیے تیار ہی نہ ہو یا اتنا غبی ہو کہ جب تک اس کو کان پکڑ پکڑ کر ایک ایک چیز کی طرف توجہ نہ دلائی جائے اس سے کسی معقول بات کے سمجھنے کی توقع ہی نہ کی جا سکتی ہو۔

کلام میں مخاطب کی ذہنیت اور اس کے مزاج کی رعایت ایک ناگزیر شے ہے۔ اگر متکلم یہ چیز ملحوظ نہ رکھ سکے تو اس کا کلام نہ مطابقِ حال ہو گا، نہ بلیغ۔ جو لوگ کلام کے ان تقاضوں سے نابلد ہوتے ہیں وہ اس نوعیت کے کلام کی خوبیوں اور نزاکتوں کے پرکھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ وہ ایک ہی آیت کے بار بار اعادے کو تکرار پر محمول کرنے اور اس تکرار کو ایک عیب قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ اس سورہ پر بھی بعض کم سوادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس میں ایک ہی آیت کا بار بار اعادہ ہے۔ حالانکہ اگر وہ یہ سمجھ جائیں کہ اس میں مخاطب کس ذہنیت کے لوگ ہیں تو وہ پکار اٹھیں کہ اس سورہ کی ایک ایک ترجیع اپنے محل میں اس طرح جڑی ہوئی ہے جس طرح انگشتری میں نگینہ ہوتا ہے۔

سورۂ قمر میں قریش کے ہٹ دھرموں کو یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سے آخر کیوں سبق نہیں لیتے؟ کیوں اڑے ہوئے ہو کہ جب عذاب کا تازیانہ دیکھ لوگے تب ہی مانوگے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عظیم احسان ہے کہ اس نے تمھاری تعلیم و تذکیر کے لیے ایک ایسی کتاب اتاری جو ہر پہلو سے اس مقصد کے لیے نہایت موزوں ہے! اس سورہ میں اسی مضمون کو ایک نئے اسلوب اور نہایت اچھوتے انداز سے لیا ہے اور انھیں یہ سمجھایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمانیت ہے کہ اس نے تمھاری تعلیم کے لیے قرآن اتارا۔ تمھاری فطرت کا تقاضا یہی تھا کہ اس مقصد کے لیے قرآن ہی اتارا جائے۔ جب اللہ نے تم کو نطق و بیان کی صلاحیت سے نوازا ہے تو تم بات سمجھ بھی سکتے ہو اور سمجھا بھی سکتے ہو۔ اس اعلیٰ صلاحیت کا حق یہی ہے کہ اسی کو تمھاری تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے نہ کہ عذاب کے ڈنڈے کو، لیکن تمھاری یہ بدبختی ہے کہ تم اس نعمت و رحمت سے فائدہ اٹھانے کے بجائے کوئی نئی نشانی دیکھنے کے لیے مچلے ہوئے ہو۔ اگر کوئی نشانی ہی مطلوب ہے تو آسمان و زمین اور آفاق و انفس کی نشانیوں پر کیوں نہیں غور کرتے جو ہر روز تمھارے مشاہدے میں آتی ہیں اور تمھیں انہی حقائق کے درس دیتی ہیں جن کی دعوت قرآن دے رہا ہے۔ ان نشانیوں کے ہوتے کسی نئی نشانی کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے بعد زمین و آسمان کی ایک ایک نشانی پر انگلی رکھ کر اور گویا ان ضدیوں کے کان پکڑ پکڑ کر توجہ دلائی ہے کہ یہ نشانیاں نہیں ہیں تو کیا ہیں! آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاتے رہوگے!

ب- اس سورہ کی بعض اہم مشکلات

اس سورہ میں زبان و اسلوب اور تاویل کی جو مشکلات ہیں ان سے تو ہم ان شاء اللہ متعلق آیات کے تحت ہی تعرّض کریں گے لیکن دو باتیں ایسی ہیں جن کی وضاحت ہم تمہید ہی میں کر دینی چاہتے ہیں تاکہ ان سے بار بار تعرّض کی نوبت نہ آئے۔ ان میں سے پہلی چیز لفظ 'اٰلَاءُ' کی تحقیق ہے اور دوسری 'فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ' میں خطاب کی نوعیت۔

لفظ 'اٰلَاءُ' جمع ہے 'اِلْیٌ'، 'اَلًی' اور 'اِلًی' کی۔ اس کے معنی تمام ائمۂ لغت اور ارباب تاویل کے نزدیک نعمت کے ہیں، لیکن استاذ امام مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب 'مفردات القرآن' میں اہل لغت کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے۔ مولاناؒ کے نزدیک یہ لفظ صرف نعمت کے معنی میں نہیں آتا بلکہ اس کے معنی اس سے وسیع ہیں۔ وہ اس بحث کی تمہید اس طرح اٹھاتے ہیں۔

> "ہر چند لوگوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ 'الاء' کے معنی نعمتوں کے ہیں لیکن قرآن اور کلام عرب سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ کلام عرب کے تتبع اور لفظ کے مواقع استعمال سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ تو یہ ہے کہ اس کے اصل معنی کارناموں، کرشموں اور عجائبِ قدرت و حکمت کے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کرشموں اور اس کی نشانیوں کا غالب حصہ آیاتِ رحمت پر مشتمل ہے اس وجہ سے لوگوں نے یہ گمان کر لیا کہ 'الآء' کے معنی نعمت ہی کے ہیں۔"

اسی سلسلہ میں مولاناؒ نے اس روایت کی بھی توجیہ کی ہے جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ انھوں نے اس کے معنی نعمت کے بتائے ہیں۔ مولاناؒ فرماتے ہیں کہ سلف کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب ان سے کوئی سوال کیا جاتا تو وہ سوال

کے موقع و محل کو سامنے رکھ کر جواب دیتے کہ اس خاص مقام میں لفظ کا کیا مفہوم ہے۔

اس تمہید کے بعد مولاناؒ نے شعرائے جاہلیت میں سے طرفہ، میہ بنت ضرار، مہلہل، ربیعہ بن مقروم، اجدع الہمدانی، فضالہ بن زید، خنساء اور بعض حماسی شعراء کے کلام سے اپنی تائید میں شواہد پیش کیے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ مشہور جاہلی شاعروں نے، جن کا کلام لغت اور نحو کا ماخذ ہے، اس لفظ کو صرف نعمت ہی کے معنی میں نہیں لیا ہے بلکہ وسیع معنوں میں لیا ہے جس کے اندر نعمت، قدرت، شان، نشانی، کرشمہ، کارنامہ، اعجوبہ اور اس نوع کے تمام مفہوم شامل ہیں۔

ہمارے لیے یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ قرآن مجید کے اس دور کے مترجمین و مفسرین مولاناؒ کی تحقیقات اپنی کتابوں میں (بلا حوالہ سہی) اب نقل کرنے لگے ہیں۔ لیکن مولاناؒ کی تصنیفات عربی میں ہیں اس وجہ سے جن کی عربی خام ہے بعض اوقات وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اوپر کی تصریحات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اس لفظ کو نعمت کے معنی میں لینے سے مولاناؒ کو انکار نہیں ہے بلکہ صرف نعمت کے معنی میں اس کو محدود کر دینے سے انکار ہے۔

'فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ' میں خطاب سے متعلق یہ امر تمام ارباب تاویل کے نزدیک متفق علیہ ہے کہ یہ جن و انس دونوں سے ہے۔ اس کی وضاحت خود قرآن نے اسی سورہ میں مختلف اسلوبوں سے کر دی ہے۔ البتہ دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی دعوت جس طرح انسانوں کے لیے ہے کیا اسی طرح جنوں کے لیے بھی ہے؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی حجت اپنی قوم پر تمام کی اسی طرح جنوں پر بھی کی۔

اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ رسولوں کی بعثت اور ان کی دعوت سے متعلق اللہ تعالیٰ نے جو ضابطے قرآن میں بیان فرمائے ہیں ان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا مشکل ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت جنوں کی طرف بھی تھی اور جس طرح آپؐ نے انسانوں پر حجت تمام کی اسی طرح جنوں پر بھی کی۔ قرآن میں یہ بات گوناگوں اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے کہ رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے وہ انہی کے اندر سے ہوتا ہے، انہی کی زبان میں کلام کرتا ہے، انہی کی فطرت کا اعلیٰ نمونہ ہوتا ہے اور وہ اپنی عملی مثال سے ان کے خیر کو اجاگر کرتا اور ان کے شر کو مٹاتا ہے اس وجہ سے اس کی زندگی ہر شخص کے لیے اُسوہ اور نمونہ بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی ایسی نہیں ہے جو جنوں کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ظہور میں آئی ہو۔

یہ بات بھی اپنی جگہ پر واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم کو دعوت دینے اور اس کی اصلاح و تربیت کے لیے جو جدوجہد فرمائی اس طرح کی کوئی جدوجہد جنوں کے اندر آپ کی طرف سے ہمارے علم میں نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی دعویٰ کیا جا سکتا ہے تو بس یہ کہ ایک دوبار آپ جنوں کی کسی پارٹی سے ملے

ہوں یا ان کی کسی پارٹی نے آپ کی زبان مبارک سے قرآن پاک کا کوئی حصہ سنا اور اس کو پسند کیا ہو۔ سورۂ احقاف آیات ۲۹-۳۲ کے تحت گزر چکا ہے اور آگے سورۂ جن میں ذکر آئے گا کہ جنوں کی ایک پارٹی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے قرآن پاک کی کچھ آیتیں سنیں اور ان کو نہایت پسند کیا۔ لیکن وہاں بھی اس امر کی تصریح ہے کہ جنوں کی اس پسندیدگی کی اطلاع حضورؐ کو براہِ راست نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سے ہوئی! اس طرح کی اتفاقی ملاقاتیں ظاہر ہے کہ اس دعوت اور اتمامِ حجت کے لیے کافی نہیں ہیں جو ہر نبی و رسول نے اپنی قوم کے لیے انجام دی ہیں اور جس کے لیے ہی درحقیقت کسی قوم کے اندر رسول کی بعثت ہوتی ہے۔ قرآن میں جنوں سے اس طرح کے خطاب کہیں کہیں جو پائے جاتے ہیں اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ نہیں ہے کہ وہ بھی براہِ راست اس کے مخاطب ہیں بلکہ جب ابرِ رحمت برستا ہے تو جس طرح خشک و تر سب کو سیراب کر دیتا ہے اسی طرح کبھی کبھی قرآن کی رحمت کا فیض جنوں تک بھی متعدی ہو جاتا ہے۔ بالخصوص ان کلیاتی امور میں جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہیں۔ توحید، معاد، جزاء و سزا، حق اور عدل اور اس نوع کے امور ہمارے اور ان کے مابین بالکل یکساں ہیں، اختلاف ہو سکتا ہے تو ان امور میں ہو سکتا ہے جن کا تعلق ہماری اور ان کی نوعی خصوصیات سے ہے۔ اس سورہ کا اصل مقصد، جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت اور رحمت و ربوبیت کی نشانیوں کی یاد دہانی اور غافلوں کو جھنجھوڑنا اور جگانا ہے اس وجہ سے غافل انسانوں کے ساتھ ساتھ اس میں غافل جنوں کو بھی مخاطب کر لیا ہے جس سے اس کلام کی ہیبت تمام آفاق پر چھا گئی ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ نکلتا ہے کہ جس طرح انسانوں کے اندر انسانوں میں سے نبی اور رسول آئے اسی طرح جنوں کے اندر انہی کے اندر سے نبی و رسول آئے ہوں جنھوں نے ان کی زبان اور ان کی نوعی خصوصیات و ضروریات کے مطابق ان کی اصلاح و تربیت کی ہو۔ ہم اس نتیجہ کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ یہ بات عقل و فطرت کے ٹھیک مطابق اور اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے بالکل موافق ہے جو اس نے نبیوں اور رسولوں کی بعثت سے متعلق قرآن میں بار بار واضح فرمائی ہے۔ جنات جب ہماری ہی طرح مکلف، اور ہماری ہی طرح عنداللہ مسئول اور ہماری ہی طرح اپنے اعمال کی جزا یا سزا کے سزاوار ہیں تو سنتِ الٰہی کے مطابق ضروری ہے کہ ان کی ہدایت کے لیے نبی اور رسول بھی مبعوث ہوئے ہوں اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ انہی کے اندر سے اٹھائے گئے ہوں اور انہی کی زبان میں انھوں نے ان کو دعوت دی ہو۔ ہمارے نزدیک قرآن میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو بلکہ مختلف آیات سے نہایت واضح طور پر اس کی تائید ہوتی ہے۔

سورۂ بقرہ میں آدمؑ و ابلیس کا جو ماجرا بیان ہوا ہے اس کے آخر میں آدمؑ و ابلیس دونوں سے بحیثیت جماعت خطاب کر کے فرمایا ہے کہ

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ج — ہم نے حکم دیا کہ یہاں سے اترو سب۔ پس اگر تمہارے

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (البقرۃ : ۳۸)

پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایت بھیجنے کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ جس طرح آدمؑ و اولادِ آدم سے متعلق ہے اسی طرح ابلیس اور اس کی ذریّت سے متعلق بھی ہے۔

اسی طرح دوسرے مقام میں تصریح ہے کہ جنوں کے اندر انہی کے اندر سے رسول مبعوث ہوئے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا شَهِدْنَا عَلٰۤی اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا وَشَهِدُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ (الانعام : ۱۳۰)

اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، کیا تمہارے پاس تمہی میں سے رسول میری آیتیں بیان کرتے اور تمہیں اس دن کی پیشی سے ڈراتے نہیں آئے؛ وہ جواب دیں گے کہ ہاں ہم خود اپنے خلاف گواہ ہیں۔ اور ان کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں رکھا اور انھوں نے خود اپنے خلاف گواہی دی کہ وہ کافر رہے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

اس سورہ کا نظم بالکل واضح ہے۔ ابتدا میں یہ تمہید ہے کہ قرآن خدائے رحمان کی رحمت کا مظہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اپنے فضلِ خاص سے اس کو نطق و ادراک اور گویائی کی اعلیٰ صلاحیتوں سے نوازا۔ ان اعلیٰ صلاحیتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت اعلیٰ ترین آسمانی کلام —— قرآن —— کے ذریعہ سے کی جائے نہ کہ عذاب کے تازیانے کے ذریعہ سے۔ بدقسمت ہیں وہ لوگ جو اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے کے بجائے کسی نشانیٔ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

اس کے بعد آفاق و انفس کی نمایاں نشانیوں پر گویا انگلی رکھ رکھ کے انسانوں اور جنوں، دونوں کو بار بار جھنجھوڑا ہے کہ یہ ساری نشانیاں ہی تو ہیں، تو تم اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے!

ان نشانیوں کے بیان کی ترتیب یہ ہے۔

ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ خالقِ کائنات عدل پسند ہے۔ اپنی اس دنیا کے کسی گوشے میں وہ تعدّی، طغیان اور حدود سے تجاوز کو پسند نہیں فرماتا۔

ان نشانیوں کی طرف اشارہ جو شہادت دیتی ہیں کہ خالق نے اس دنیا میں ربوبیت کا جو وسیع انتظام فرمایا ہے وہ مقتضی ہے کہ انسان اس میں شترِ بے مہار بنا کر نہیں چھوڑا گیا بلکہ لازماً ایک ایسا دن بھی آنے والا ہے جس میں اللہ تعالیٰ لوگوں کا حساب کرے گا۔ جو انعام کے مستحق ٹھہریں گے ان کو انعام دے گا اور جو سزا کے سزاوار نکلیں گے ان کو سزا دے گا۔

- خدا ہی نے جنّوں اور انسانوں کو آگ اور مٹی سے پیدا کیا اور وہ ان کو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اس کام میں اس کو کوئی زحمت نہیں پیش آئے گی۔
- یہ ساری کائنات خدا ہی کے تصرّف میں ہے۔ مشرق اور مغرب، دونوں کا رب وہی ہے۔ جو طلوع ہوتے ہیں اسی کے حکم سے طلوع ہوتے ہیں اور جو ڈوبتے ہیں اسی کے حکم سے ڈوبتے ہیں۔
- اس کائنات کے اضداد میں ان کے اپنے وجود سے بالاتر مقصد کے لیے سازگاری پائی جاتی ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ ایک بالاتر ارادہ سب پر حاوی ہے جو ان تمام اضداد کے اندر توافق پیدا کرتا اور ان کو اس کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ کائنات اپنے اضداد کے تصادم سے فنا ہو جاتی۔ اس کا باقی رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس پوری کائنات پر صرف ایک ہی قاہر و حکیم ارادہ کارفرما ہے۔
- اس بات کی نشانی کہ صرف وہی ایک ذات باقی رہنے والی ہے۔ اس کے سوا سب فانی ہیں۔
- اس حقیقت کا اظہار کہ اس کے سوا سب محتاج ہیں۔ وہی اکیلا محتاج الیہ ہے۔ سب کی ضرورتیں وہی پوری کرتا ہے۔ جو نادان دوسروں سے مانگتے ہیں وہ بھی پاتے اسی سے ہیں۔
- اس امر کا اعلان کہ حساب کتاب اور جزائے اعمال کا ایک دن ضرور آئے گا اور اس دن نہ کوئی انسان خدا کے قابو سے باہر نکل سکے گا نہ کوئی جن۔ اس دن کسی مجرم کا جرم ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت اور گواہی کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ مجرموں کی پیشانیاں خود ان کے مجرم ہونے کی گواہی دیں گی پھر وہ چوٹی اور پاؤں سے پکڑ کر جہنّم میں جھونک دیے جائیں گے۔
- اس دن مقرّبین کو جو جنتیں ملیں گی ان کا بیان۔
- اصحاب الیمین کو ملنے والی جنّتوں کی تصویر۔

سُورَةُ الرَّحْمٰنِ (۵۵)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰيات: ۷۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلرَّحْمٰنُ ۙ﴿۱﴾ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ؕ﴿۲﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ﴿۳﴾ عَلَّمَهُ آیات ۱-۳۰
الْبَيَانَ ﴿۴﴾ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۙ﴿۵﴾ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ
يَسْجُدٰنِ ﴿۶﴾ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۙ﴿۷﴾ اَلَّا تَطْغَوْا
فِى الْمِيْزَانِ ﴿۸﴾ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ ﴿۹﴾
وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۙ﴿۱۰﴾ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ
الْاَكْمَامِ ۖ﴿۱۱﴾ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ۚ﴿۱۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ
رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۳﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۙ﴿۱۴﴾
وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ﴿۱۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۶﴾ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۚ﴿۱۷﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۱۸﴾ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۙ﴿۱۹﴾ بَيْنَهُمَا
بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۚ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾ يَخْرُجُ
مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۚ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾

النصف ۲۵ ع ۱

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ﴿٢٤﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٥﴾ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿٢٦﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ
وَالْإِكْرَامِ ﴿٢٧﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٢٨﴾ يَسْـَٔلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ ۚ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ﴿٢٩﴾ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٣٠﴾

ترجمۂ آیات ۱-۳۰

خدائے رحمان نے قرآن کی تعلیم دی۔ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ اس کو گویائی سکھائی۔ ۱-۴

سورج اور چاند ایک حساب سے گردش کرتے ہیں۔ اور ستارے اور درخت بھی سجدہ کرتے ہیں۔ اور اس نے آسمان کو اونچا کیا اور اس میں میزان رکھی کہ تم بھی میزان میں تجاوز نہ کرو اور ٹھیک تولو پورے انصاف کے ساتھ۔ اور وزن میں کمی نہ کرو۔ ۵-۹

اور زمین کو اس نے بچھایا خلق کے لیے اس میں میوے اور کھجوریں ہیں جن پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں اور بھس والے اناج بھی ہیں اور خوشبودار پھول بھی —— تو اے جنو اور انسانو! تم اپنے رب کی کن کن عنایتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۰-۱۳

اس نے پیدا کیا انسان کو ٹھیکرے کی طرح کھنکھناتی مٹی سے اور پیدا کیا جنات کو شعلۂ آتش سے تو تم دونوں اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۴-۱۶

وہی مشرق کے دونوں اطراف کا خداوند ہے اور وہی مغرب کے دونوں اطراف کا بھی خداوند ہے تو تم اپنے رب کی کن کن عظمتوں کو جھٹلاؤ گے! ۱۷-۱۸

اس نے چھوڑے دو دریا، دونوں ٹکراتے ہیں لیکن ان کے درمیان ایک پردہ حائل رہتا ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کرتے تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے ۱۹-۲۱

ان دونوں ہی سے نکلتے ہیں موتی اور مونگے، تو تم اپنے رب کی کن کن نیرنگیوں کو

جھٹلاؤ گے! ۲۲-۲۳

اسی کے اختیار میں ہیں سمندروں میں پہاڑوں کی طرح اٹھے ہوئے جہاز۔ تو تم اپنے رب کے کن کن عجائب کو جھٹلاؤ گے! ۲۴-۲۵

روئے زمین پر جو بھی ہیں سب فانی ہیں اور تیرے رب کی عظمت و عزت والی ذات باقی رہنے والی ہے تو اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۶-۲۸

اسی سے مانگتے ہیں جو بھی آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ وہ ہر وقت ایک نئی شان میں ہے تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۲۹-۳۰

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلرَّحْمٰنُ ۝ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (۱-۲)

قرآن اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی رحمت ہے

یعنی اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہے کہ اس نے تمہاری تعلیم و تذکیر کے لیے قرآن کریم جیسی رحمت و برکت نازل فرمائی۔ وہ چاہتا تو تمہاری طلب کے مطابق تم پر عذاب بھی بھیج سکتا تھا، لیکن اس نے غایت رحمت کے سبب سے تم کو اپنے صحیفۂ رحمت سے نوازا کہ تم اس کو پڑھو، سمجھو اور اس کی روشنی میں اپنی عقلی و عملی کج رویوں کی اصلاح کر کے اس دنیا میں بھی پھلو پھولو اور آخرت میں بھی فلاح پاؤ ــــ مطلب یہ ہے کہ جب تمہارے ربِ رحمان نے تمہیں اپنی رحمت سے نوازا تو تم رحمت کی جگہ اس کی نقمت کے طالب کیوں بنتے ہو!

خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (۳-۴)

انسان کی فطرت مقتضی تھی کہ اس کی ہدایت کے لیے قرآن نازل ہو

یعنی اللہ تعالیٰ کی رحمانیت کے تقاضے کے ساتھ ساتھ انسان کی خلقت اور اس کی صفات کا تقاضا بھی یہی ہوا کہ اس کی رہنمائی کے لیے صحیفۂ ہدایت اترے نہ کہ تازیانۂ عذاب۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو نطق و گویائی کی تعلیم دی۔ یہ گویائی اس بات کی شہادت ہے کہ خالق نے اس کو ایک عاقل و مدرک ہستی بنایا ہے۔ وہ بات سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس کے خیر و شر میں امتیاز کر سکتا ہے اور دوسروں تک بھی اس کو پہنچا اور ان کو سمجھا سکتا ہے۔ جب ان گوناگوں صلاحیتوں سے وہ آراستہ ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ قدرت نے یہ چاہا ہے کہ اس کو کلام کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے نہ کہ جانوروں کی

کی طرح ڈنڈے کے ذریعہ سے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان میں نُطق کی صلاحیت اس کے اندر دوسری گوناگوں صلاحیتوں کی غماز ہے۔ یہ نُطق مستلزم ہے کہ انسان عاقل و مدرک ہے، وہ کلیات سے جزئیات اور جزئیات سے کلیات بنا سکتا ہے، وہ استدلال، استنباط اور اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ارسطو نے اسی وجہ سے انسان کی اسی صفت کو اس کے لیے حیوانات سے ممتاز کرنے والی صفت قرار دیا ہے۔ یہ صفت اس کے اندر نہ پائی جائے تو پھر وہ انسان نہیں بلکہ دو ٹانگوں پر چلنے والا ایک جانور ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو لوگ کسی حقیقت کو دلائل کی روشنی میں سمجھنے کی جگہ اس کو آنکھوں سے دیکھ کر ماننے کے منتظر ہیں وہ بھی جانوروں ہی کے گلّے میں شامل ہیں اگرچہ وہ رہتے شاندار بنگلوں میں ہوں۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ (۵-۶)

کائنات کی نشانیوں کی طرف ایک اشارہ

یہ اس کائنات کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ اگر قرآن کے انذار کی تصدیق کے لیے نشانیوں ہی کی ضرورت ہے تو کسی نئی نشانی کے منتظر کیوں ہو؟ اپنے سروں کے اوپر آسمان کی نشانیوں کو دیکھو، یہ سورج اور چاند کس پابندیٔ اوقات اور کس نظم و ضبط کے ساتھ اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ کبھی منٹ اور سکینڈ کا بھی کوئی فرق واقع ہونے پائے۔ پھر یہ دیکھو کہ یہ کس طرح ان حدود و قیود کی پابندی کر رہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ٹھہرا دیے ہیں۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ سورج اپنی سرحدیں لانگ کر چاند کے مدار میں گھس جائے یا چاند سورج کے حدود میں دراندازی کر دے۔ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ط وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (یٰسٓ : ۴۰) (نہ سورج کے لیے یہ روا کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کو یہ حق کہ وہ دن سے سبقت کر جائے۔ ہر ایک اپنے اپنے مدار میں گردش کر رہا ہے) کیا یہ نشانی ہر روز انسان کو یہ درس نہیں دیتی کہ جب اس کائنات کے خالق نے سورج اور چاند جیسی عظیم مخلوقات کو اپنے حدود و قیود کا پابند کر رکھا ہے تو انسان کو وہ کیوں اپنے امر و نہی کی پابندی سے آزاد رکھے گا؟ اور اگر انسان اس کے حدود و قیود کو توڑ کر دنیا میں اودھم مچانے کی جسارت کرے گا تو وہ آخر اس کو کیوں سزا نہیں دے گا؟ جو قانون اس نے اس کائنات کے ہر گوشے میں نافذ کر رکھا ہے اس کی پابندی کا سب سے زیادہ سزاوار تو انسان ہے۔

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدٰنِ۔ شمس و قمر کی پابندیٔ حدود، جس کو شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ سے تعبیر کرتے ہیں، کا حوالہ دینے کے بعد یہ آسمان کے ستاروں اور زمین کے درختوں کے سجدے کا ذکر فرمایا کہ یہ بھی اپنے خالق و مالک کو سجدہ کرتے اور اپنے عمل سے انسان کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ بھی اپنے رب سے سرکشی نہ کرے بلکہ نہایت فرمانبردارانہ اس کو سجدہ اور اس کی بندگی کرے۔

ستاروں اور درختوں کے سجدے کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس بحث کو اس کے محل

میں دیکھیے۔ یہاں اعادے میں طوالت ہوگی۔

'النجم' سے بعض لوگوں نے زمین پر پیدا ہونے والے چھوٹے پودے، جھاڑ اور بیلوں وغیرہ کے قسم کی چیزیں مراد لی ہیں۔ غالباً سجدہ کے ساتھ ستاروں کی مناسبت ان حضرات کی سمجھ میں نہیں آئی اس وجہ سے انھیں یہ تکلف کرنا پڑا حالانکہ ان دونوں کے درمیان نہایت واضح وصفی اشتراک موجود ہے۔ قرآن میں دونوں کے سجدہ کا ذکر مختلف اسلوبوں سے بار بار آیا ہے۔ اسی اشتراک کی بنا پر یہاں بھی دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہوا۔ اس سے آسمان و زمین دونوں کی ہم آہنگی واضح ہوتی ہے کہ ان کا رب ایک ہی ہے جس کو آسمان کے ستارے بھی سجدہ کرتے ہیں اور زمین کے درخت بھی۔ یہ امر واضح رہے کہ مجاہدؒ، قتادہؒ اور حسنؒ وغیرہ 'نجوم' کو اس کے معروف معنی ہی میں لیتے ہیں۔ ابن کثیرؒ نے بھی انہی لوگوں کی تائید کی ہے اور آیت 'اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یَسْجُدُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ' (الحج: ۱۸) (نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند اور ستارے بھی) کا حوالہ دیا ہے۔

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِیْزَانَ (۷)

آسمان کی بعض روشن نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد خود آسمان کی طرف توجہ دلائی کہ اس کو دیکھو، ستونوں کے بغیر کس طرح تمہارے رب نے ایسی ناپیدا کنار چھت بلند کر دی جس کی وسعتوں کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ پھر دیکھو کہ اس بے پایاں عظمت و وسعت کے باوصف اس میں اس نے ایسا توازن رکھا ہے کہ اس کے کسی کونے گوشے میں نہ کوئی کسی جھول کا پتہ دے سکتا ہے نہ کسی رخنے اور دراڑ کا۔
دوسرے مقام میں اسی حقیقت کی طرف یوں توجہ دلائی ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ (لقمان: ۱۰)	اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ایسے ستونوں کے جو تمھیں نظر آئیں اور زمین میں پہاڑوں کے لنگر ڈال دیے کہ مبادا وہ تمھارے سمیت کسی سمت کو لڑھک جائے۔

سورۂ ملک میں فرمایا ہے:

اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ (الملک: ۳-۴)	وہی ہے جس نے تہ بہ تہ سات آسمان بنائے اور تم خدائے رحمان کی اس کاریگری میں کوئی نقص نہیں پا سکتے۔ نگاہ دوڑاؤ، کیا دیکھتے ہو کہیں کوئی خلل! پھر نگاہ دوڑاؤ بار بار، نگاہ ناکام اور تھک کر واپس آ جائے گی۔

'بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا' سے یہ بات نکلتی ہے کہ آسمان کی چھت میں توازن (میزان) قائم رکھنے کے لیے

اللہ تعالیٰ نے جذب و کشش کے لیے ستون استعمال کیے ہیں جو دوسروں کو نظر نہیں آتے۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ (۸)

آسمان کے خالق کی پسند کا اظہار اس کی صنعت سے

یعنی جب خالق نے اس کے اندر میزان رکھی جس پر یہ قائم ہے، یہ نہ ہو تو آسمان درہم برہم ہو جائے تو اس سے خالق کا مزاج اور اس کا ذوق معلوم ہوا کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان بھی اپنے دائرۂ اختیار کے اندر اسی طرح توازن، عدل اور قسط کو ملحوظ رکھے۔ اس میزان میں کوئی خرابی نہ پیدا کرے ورنہ سارے نظامِ معاش و معیشت میں فساد پھیل جائے گا۔ مطلب یہ نکلا کہ اسی عدل و قسط کی دعوت تمھیں قرآن دے رہا ہے جس کی شہادت تمھارے سروں پر پھیلے ہوئے آسمان کے ہر گوشے سے مل رہی ہے اور اسی کی خلاف ورزی کے نتائج سے تمھیں وہ ڈرا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنے طغیان سے اندھے ہو کر یہ میزان درہم برہم کر ڈالی تو اس کی سزا اس دنیا میں بھی بھگتو گے اور آخرت میں بھی اس کا وبال تم پر آئے گا تو آخر یہ واضح بات جس کی شہادت آسمان و زمین کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے، تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی! آفاق کی ان سبق آموز نشانیوں کو نظر انداز کر کے کسی صاعقۂ عذاب کے درپے کیوں ہو!

وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (۹)

اوپر والی بات ایک کلیہ کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی۔ اسی کلیہ پر مبنی ایک دوسری حقیقت کی طرف توجہ دلائی جس کا تعلق ہماری روزمرہ زندگی سے ہے۔ فرمایا کہ جس خدا کے بنائے ہوئے آسمان کی چھت کے نیچے رہتے ہو جب وہ میزان رکھنے والا اور عدل پسند ہے تو اس کی دنیا میں ڈنڈی ماری کی زندگی نہ بسر کرو بلکہ ناپ تول میں پورے انصاف کے ساتھ وزن کو قائم رکھو اور ہرگز تول میں کوئی کمی نہ کرو۔ قوم شعیب کی سرگزشت کے سلسلہ میں ہم اس حقیقت کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ ناپ تول میں کمی کوئی منفرد برائی نہیں ہے بلکہ یہ پورے نظامِ تمدن میں فساد کی ایک خوفناک علامت ہے۔ یہاں ایک مزید حقیقت واضح ہوئی کہ یہ برائی درحقیقت اس میزان کے منافی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین قائم فرمائے ہیں۔ اگر کوئی قوم اس فساد کو قبول کر لیتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ اس بنیاد ہی کے ڈھا دینے کے درپے ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس عالم کی تعمیر فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بنائی ہوئی زمین پر ایسے لوگوں کو کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔

یہاں یہ چیز بھی قابلِ غور ہے کہ ایک ہی بات مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے فرمائی گئی ہے۔ قرآن مجید پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اسلوب ان مواقع پر اختیار فرمایا گیا ہے جہاں اصل حکم کی خلاف ورزی نہایت خطرناک نتائج پر منتہی ہو سکتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں کامل انصاف کا حکم ایک عظیم حکم ہے۔ یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس میزانِ عدل کی ایک فرع ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس عالم کا نظام قائم فرمایا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی نکلی کہ جو قوم اس میں فساد برپا کر دیتی ہے وہ

سارے نظامِ تمدّن میں فساد برپا کر دیتی ہے۔

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ فِيْهَا فَاكِهَةٌ ۙ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ ۝ وَالْحَبُّ ذُوالْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ (۱۰-۱۲)

زمین کے اسباب ربوبیّت کی طرف اشارہ

آسمان کے عجائبِ قدرت کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ زمین کے اسبابِ ربوبیّت کی طرف توجہ دلائی۔ آسمان کے لیے 'رفع' کا لفظ استعمال فرمایا تھا اس کے مقابل میں زمین کے لیے 'وضع' کا لفظ نہایت موزوں اور معنی خیز استعمال فرمایا کہ آسمان کو شامیانے کی طرح تان دیا اور زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا تاکہ اس کی مخلوقات کے لیے یہ ایک آرام دہ مکان بن جائے۔ پھر جس طرح آسمان پر سورج، چاند اور ستاروں کے چراغ اور قمقمے لگا دیے کہ اس گھر کو روشنی اور حرارت حاصل ہوتی رہے اسی طرح اس گھر میں مختلف قسم کے پھلوں، غلّوں اور پھولوں کے انبار بھی لگا دیے کہ اس کے مکینوں کو غذا بھی حاصل ہو، اس کے پھلوں سے وہ لذّت اندوز اور خوش کام ہوں اور اس کے پھول ان کے لیے باصرہ نوازی اور معطّر مشامی کا سامان بھی مہیا کریں۔

یہاں غلّے کے ساتھ پھلوں اور خاص طور پر پھولوں کا ذکر اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے صرف پیٹ بھرنے ہی کا سامان نہیں کیا ہے بلکہ ان کے ذوقِ جمال، لذّتِ کام و دہن اور شوقِ آرائش کا بھی سامان کیا ہے جو اس کی ربوبیّت ہی کی دلیل نہیں بلکہ خاص اہتمامِ ربوبیّت کی دلیل ہے۔ اسی طرح 'حبّ' کے ساتھ 'ذوالعصف' کی صفت اور 'نخل' کے ساتھ 'ذات الاکمام' کی صفت اس خاص عنایت پر دلیل ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرمائی ہے کہ اس نے غلّے اور پھل جو دیے تو اس طرح نہیں کہ گویا پھینک مارے ہوں بلکہ ایک ایک دانے اور ایک ایک پھل کی پیکنگ کا ایسا اعلیٰ انتظام فرمایا ہے کہ انسان اس کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنے رب کی اس پروردگاری کا حق پہچانے، اس کا شکرگزار رہے، اور یہ حقیقت ہمیشہ پیشِ نظر رکھتے ہوئے زندگی گزارے کہ جس نے اس کے لیے یہ سارا اہتمام کسی استحقاق کے بغیر کیا ہے وہ اس کو یوں ہی شترِ بے مہار کی طرح چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ حساب کتاب کا بھی ایک دن وہ لائے گا۔

اس آیت میں لفظ 'ریحان' سے متعلق ایک تنبیہ بھی ضروری ہے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی 'پتّوں' کے لیے ہیں لیکن اس معنی میں یہ لفظ نہ عربی زبان میں استعمال ہوا ہے اور نہ یہاں پتّوں کے ذکر کا کوئی محل ہے۔ معلوم ہوتا ہے غلّہ کے ذکر کے ساتھ پھول کا ذکر ان حضرات کو بے جوڑ سا معلوم ہوا اس وجہ سے انھیں یہ انوکھی تاویل کرنی پڑی حالانکہ اس کے ذکر کا ایک محل ہے جس کی وضاحت ہم نے اوپر کر دی۔

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۳)

جنوں کو خطاب کرنے کی ایک خاص وجہ

یہ آیت آگے بار بار آئے گی اور یہ اس سورہ کی اہم ترین آیت ہے اس وجہ سے ہم نے تمہید ہی میں لفظ 'الآء' کی تحقیق بھی بیان کر دی ہے اور اس میں جنوں اور انسانوں سے جو خطاب ہے اس کی نوعیت پر بھی

روشنی ڈالی ہے۔ البتہ ایک بات ہم یہاں واضح کریں گے وہ یہ کہ قریش کے مکذبین کے ساتھ جنات کے مکذبین کو بھی یہاں جو شامل کر لیا ہے تو اس کی ایک خاص وجہ ہے کہ تکذیب کی یہ مہم اس دور میں پوری شدت اختیار کر گئی تھی اور شیاطینِ انس و جن، دونوں گٹھ جوڑ کر کے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے کہ دعوتِ حق کے قدم اکھاڑ دیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دونوں کو براہِ راست خطاب کر کے ان کو سرزنش بھی فرمائی اور آگے کی آیات سے معلوم ہوگا کہ ان کو چیلنج بھی کیا ہے کہ وہ اپنا سارا زور لگا کر دیکھ لیں، کلمۂ حق ان کے علی الرغم بلند ہو کر رہے گا۔ تمہید میں یہ بات ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ سورہ مکی زندگی کے اس دور میں نازل ہوئی ہے جب قریش پر ضد اور مخاصمت کا بخار پوری شدت کے ساتھ چڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں ظاہر ہے کہ ان کو شیاطینِ جن کی کمک بھی سب سے زیادہ حاصل ہوئی ہوگی۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ دونوں مخاطب کیے جائیں۔

منعم کی شکرگزاری فطرت کا تقاضا ہے

نعمت کے ساتھ منعم کی شکرگزاری اور ربوبیت کے ساتھ مسئولیت کا احساس انسانی فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی نعمتوں سے ایک شخص متمتع تو ہو رہا ہے لیکن وہ یہ تسلیم نہیں کرتا کہ ان کے عوض میں اس کے اوپر نعمتوں کے بخشنے والے کا کوئی حق بھی قائم ہوتا ہے یا ان کے باب میں اس سے کوئی پرسش بھی ہونی ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ ان تمام نعمتوں کا مکذّب ہے۔ قرآن نے یہاں اسی تکذیب پر قریش اور ان کے ہم مشرب جنوں کو سرزنش فرمائی ہے کہ ہر قدم پر تمہارے سامنے تمہارے رب کی وہ نعمتیں موجود ہیں جو تمہیں روزِ بازپرس کی یاد دہانی کر رہی ہیں لیکن تم اس کا انکار کیے جا رہے ہو تو اس کی کن کن نعمتوں اور عنایتوں کی تکذیب کرو گے!

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ۙ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۴-۱۶)

انسانی خلقت کے مختلف مراحل سے قیامت پر استدلال

یہ جنوں اور انسانوں دونوں کو ان کی خلقت یاد دلا کر ان کی دوسری خلقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تمہارا رب ایک مرتبہ پیدا کرنے کے بعد تمہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں رہا اس وجہ سے اب کسی روزِ حساب کا معاملہ خارج از امکان ہو گیا۔ یاد رکھو کہ جس میٹیریل سے اس نے تم کو پیدا کیا ہے وہ میٹیریل بھی پوری مقدار میں موجود ہے اور خدا کی قدرتِ تخلیق بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح تمہاری خلقتِ اوّل کے وقت موجود تھی تو اگر تم اپنی خلقت کا انکار نہیں کر سکتے تو اپنی دوبارہ پیدائش سے انکار کی بھی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

'صلصال' خالص مٹی کو کہتے ہیں اور 'فخار' اس مٹی کو کہتے ہیں جو ٹھیکرے کی طرح خشک ہو جائے۔ زندگی جن مراحل سے گزرتی ہوئی انسانیت کے مرحلے تک پہنچتی ہے قرآن نے جگہ جگہ ان تمام مراحل کا حوالہ دیا ہے۔ کہیں فرمایا ہے، انسان کو پانی سے پیدا کیا، کہیں مٹی کا حوالہ دیا ہے، کہیں سڑے ہوئے گارے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں خشک مٹی کا ذکر ہے۔ اسی طرح سب سے آخری مرحلہ یہ بیان ہوا ہے کہ نطفہ سے اس

کی نسل جاری کی۔ یہ انسانی زندگی کے ارتقائی مراحل ہیں جن کی وضاحت سورۂ حجر آیت ۲۶ کے تحت ہو چکی ہے۔ ان مراحل کے بیان سے مقصود انسان کو خود اس کے وجود کے اندر خدا کی شانوں، قدرتوں اور حکمتوں کا مشاہدہ کرانا ہے تاکہ انسان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ خدا ہی کی شان ہے کہ اس نے اس کو پانی اور کیچڑ سے نکالا، پھر میدانی علاقوں کی خشک و معتدل آب و ہوا میں اس کی پرورش کی، پھر درجہ بدرجہ اس کو ایک نیا ہیولیٰ بخشا اور اس کی نسل چلانے کے لیے ایک نیا نظام قائم فرمایا۔ ان باتوں کے بیان سے ظاہر ہے کہ مقصود یہ ثابت کرنا ہے کہ جس انسان کو اللہ تعالیٰ ان طویل راستوں سے گزار کر اس اہتمام سے یہاں تک لایا ہے اس کا وجود بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا اور ساتھ ہی یہ دکھانا بھی ہے کہ جو خدائے علیم و حکیم کیچڑ کے اندر پیدا ہونے والے ایک خلیہ کو انسان بنا دے سکتا ہے اس کی قدرت سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہے، وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

جنات کی خلقت آگ کے شعلہ سے ہوئی

'وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ'۔ مارج، کے معنی شعلہ کے ہیں۔ شعلہ آگ کا خلاصہ ہوتا ہے۔ جس طرح انسان مٹی کے خلاصہ اور جوہر سے پیدا ہوا ہے اسی طرح جنات کی پیدائش آگ کے جوہر سے ہوئی ہے۔ ان کے مدارجِ حیات کی زیادہ تفصیل قرآن نے نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک بالکل مختلف نوع کے تمام مدارجِ خلقت کو سمجھنا ہمارے لیے نہایت مشکل تھا۔

اس کے بعد وہی آیتِ ترجیع ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس کا مطلب یہاں ہوگا کہ جب اپنے رب کی یہ شانیں اور یہ قدرتیں و حکمتیں خود اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کرتے ہو تو اس بات کو کیوں بعید از امکان سمجھتے ہو کہ خدا تمہیں دوبارہ حساب کتاب کے لیے اٹھا کھڑا کرے، آخر اپنے رب کی کتنی نشانیوں کو جھٹلاتے اور نئی نشانیوں کا مطالبہ کرتے رہو گے!

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۷-۱۸)

مشرق اور مغرب کے مثنیٰ لانے کی وجہ

یعنی مشرق و مغرب، سب کا رب اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ نہ کوئی اس کے حدودِ مملکت سے باہر ہے اور نہ کوئی اس کی خدائی میں حصہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مشرق و مغرب کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہے۔ اس کے آسمانوں اور زمین میں بالشت بھر علاقہ بھی کسی اور کے قبضہ میں نہیں ہے کہ وہ اس علاقہ والوں کو خدا کی پکڑ سے بچا لے۔ سورۂ معارج میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے، 'فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓي اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ' (۷۰: ۴۰-۴۱) (پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے خداوند کی، ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان سے بہتر صورت میں بدل کر ان کو اٹھا کھڑا کریں اور ہم اس کام میں عاجز ہونے والے نہیں ہیں)۔

'مشرقین' اور 'مغربین' کے مثنیٰ لانے کی توجیہ عام طور پر ہمارے مفسرین نے یہ کی ہے کہ اس سے سردی اور گرمی کے مشرق و مغرب مراد ہیں لیکن یہ محض تکلف ہے۔ قرآن میں یہ الفاظ واحد، مثنیٰ، جمع تینوں صورتوں

ہیں استعمال ہوئے ہیں اور ان تینوں ہی صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مثنیٰ کی صورت میں مقصود ان کے دونوں اطراف کا احاطہ ہوتا ہے اور جمع کی شکل میں ان کے اطراف و اکناف کی بے نہایت وسعت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ مثنیٰ اور جمع کے اس نوع کے استعمال کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔

اس کے بعد وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے یعنی جس خدا کی عظمت و شان کا حال یہ ہے کہ مشرق و مغرب سب اس کے زیرِ نگیں ہیں، اگر اس کے انذار کو سمجھتے ہو کہ یہ ڈراوے محض ہوائی ہیں تو آخر اس کی کن کن عظمتوں کی تکذیب کرو گے!

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ۝ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۱۹-۲۱)

توحید کی دلیل اضداد کے توافق کے پہلو سے

یہ اوپر کے دعوائے توحید کی دلیل اس کائنات کے اضداد میں توافق کے پہلو سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات کے ہر گوشے میں بظاہر جو تضاد نظر آتا ہے، طلوع کے ساتھ غروب، دن کے ساتھ رات، اور سردی کے مقابل میں گرمی ہے تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے اندر مختلف ارادے اور مشیتیں کارفرما ہیں۔ انسان اگر اس کی تہ میں جھانک کر دیکھے تو معلوم ہوگا کہ اس نے ہر تضاد کے اندر نہایت گہرا توافق اور نہایت عمیق سازگاری رکھی ہے۔ ہر چیز اپنے مقابل کے ساتھ مل کر ایک بالاتر مقصد کی خدمت میں لگی ہوئی ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ درحقیقت ایک ہی ارادہ اس تمام کائنات پر حکمران ہے جو اس کے تمام اضداد کو اپنی حکمت کے تحت کائنات کے مجموعی مفاد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ فرمایا کہ دیکھو، وہ دو دریاؤں کو چھوڑتا ہے، ایک کھاری ہوتا ہے، دوسرا شیریں، دونوں آپس میں ٹکراتے ہیں لیکن خدائے قادر و حکیم دونوں کے درمیان ایک ایسا غیر مرئی پردہ ڈال دیتا ہے کہ وہ دونوں ملتے بھی ہیں اور الگ الگ اپنے مزاج پر قائم بھی رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ کھاری دریا شیریں یا شیریں دریا کھاری بن جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ ظاہری تضاد کو دیکھ کر اس مغالطہ میں پڑ گئے کہ اس کے اندر متضاد ارادے کارفرما ہیں اور پھر انھوں نے اپنے اپنے تصور کے مطابق اپنے الگ الگ دیوتا بنا لیے ان کی نظر اس توافق پر نہیں پڑی جو ہر تضاد کے اندر موجود ہے اور جو توحید کی سب سے بڑی حجت ہے۔

آخر میں وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے۔ یعنی ان روشن شواہد کے بعد بھی اگر اس مغالطہ میں مبتلا ہو کر خدا نے تم کو پکڑا تو تمہارے دیوی دیوتا تم کو بچا لیں گے، تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے۔

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۲۲-۲۳)

یہ ایک مشترک مجموعی فائدہ کی طرف اشارہ ہے جو باوصف تضاد ان سے حاصل ہوتا ہے کہ ان دونوں ہی سے موتی اور مونگے حاصل ہوتے ہیں جو انسان کے لیے دولت بھی ہیں اور زینت بھی۔

بعض مفسرین کا ایک غلط دعویٰ

بعض مفسرین نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ مونگے اور موتی تو صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں اور قرآن کا بیان یہ ہے کہ دونوں سے نکلتے ہیں تو اس کا جواب کیا ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ موتی صرف کھاری پانی سے نکلتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ENCYCLOPAEDIA BRITANICA) میں موتی پر جو مضمون ہے اس کا ایک ضروری اقتباس ہم یہاں درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مونگے اور موتی میٹھے پانی سے بھی نکلتے ہیں۔ مضمون نگار لکھتا ہے:۔

"نصف کرۂ شمالی کے منطقہ معتدلہ میں میٹھے پانی کے سیپ کے گھونگے FRESH WATERS MUSSELS بہت قیمتی موتی پیدا کرتے رہے ہیں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے میٹھے پانی کے موتی زیادہ تر دریائے مس سس پی (MISSISSIPPI RIVER) سے نکلتے ہیں۔ برطانیہ میں موتی نکالنے کی صنعت اب زوال پر ہے، لیکن سکاٹ لینڈ کے دریاؤں، سپے (SPEY) اور طے (TAY) اور شمالی ویلز کے دریا کان وے (CONWAY) سے نکلنے والے موتیوں کی ایک زمانے میں بہت مانگ رہی ہے۔ چین میں میٹھے پانی سے موتی نکالنے کی صنعت ہزار برس قبل مسیح سے معروف ہے"[1]

اور بالفرض کھاری پانی ہی سے نکلتے ہوں جب بھی اس سے قرآن کے بیان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ قانونِ قدرت یہ ہے کہ اشیاء تضادات کے ملاپ سے پیدا ہوتی ہیں۔ بچہ مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے وہ پرورش اگرچہ ماں کے پیٹ میں پاتا ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ عورت اور مرد، دونوں سے وجود میں آتا ہے۔ اسی طرح موتی شیریں اور کھاری، دونوں ہی پانیوں کے ملاپ سے پیدا ہوتے ہیں اگرچہ وہ پرورش کھاری پانی ہی کے اندر پاتے ہوں۔

اس کے بعد وہی ترجیع ہے جو اوپر گزر چکی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَآتُ فِي الْبَحْرِ كَالْأَعْلَامِ ۚ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۲۴-۲۵)

تضاد کے اندر توافق کی ایک اور نشانی

تضاد کے باوصف توافق کی ایک اور نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ بھی خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ پہاڑوں کی طرح اونچے اور بھاری بھاری جہاز سمندروں کے سینے پر دوڑتے پھرتے ہیں۔ حالانکہ کوئی وزن رکھنے والی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی پانی کے اندر ڈالیے تو ڈوب جاتی ہے لیکن یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کی کارسازی ہے کہ جہاز جیسی بھاری چیز، ہزاروں ٹن سامان اپنے اوپر لادے ہوئے، پانی کو چیرتی ہوئی چلتی اور ڈوبنے سے محفوظ رہتی ہے۔ 'لَهُ' سے مطلب یہاں یہ ہے کہ تضادات کے اندر اس قسم کی موافقت و سازگاری پیدا کرنا صرف اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے اختیار میں ہے۔ صرف اسی کی قدرت و حکمت سے ایسے کرشمے ظہور میں آتے ہیں اور تم ہر جگہ یہ دیکھ رہے ہو تو اپنے رب کے کن کن کرشموں کو

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مضمون: PEARL

جھٹلاؤ گے! یہ مضمون سورۂ فاطر میں اس طرح بیان ہوا ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرَانِ ۖ هَٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهُ وَهَٰذَا مِلْحٌ أُجَاجٌ ۖ وَمِنْ كُلٍّ تَأْكُلُونَ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُونَ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ فِيهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (فاطر: ۱۲)

اور دونوں دریا یکساں نہیں ہوتے ایک شیریں اور خالص، جس کا پانی پینے کے لیے خوش گوار ہوتا ہے اور دوسرا کھاری تلخ۔ اور ان دونوں ہی سے تم تازہ گوشت بھی کھاتے ہو اور آرائش کے سامان بھی نکالتے ہو جن کو پہنتے ہو۔ اور کشتیوں کو دیکھتے ہو کہ ان میں پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں تاکہ تم اس کا فضل چاہو اور تاکہ اس کے شکر گزار بنو۔

سورۂ شوریٰ کی آیات کے تحت بھی یہ مضمون بیان ہو چکا ہے۔ مزید تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۲۶-۲۸)

مذکورہ بالا دلائل کا لازمی نتیجہ

ضمیر مجرور کا مرجع 'الارض' (زمین) ہے اس کا ذکر اوپر آیت ۱۰ سے چلا آرہا ہے۔ زمین کے اندر اللہ تعالیٰ نے انسان کی پرورش کا جو سامان کیا ہے، اس کی خلقت میں اپنی جو شانیں اور حکمتیں دکھائی ہیں، اس کے ہر گوشے پر جس طرح اس کا اقتدار محیط ہے اور اس کے اضداد کے باہمی توافق سے جس طرح اس کے خالق کی یکتائی نمایاں ہو رہی ہے، یہ باتیں متلازم ہیں کہ ایک دن یہ ساری چیزیں فنا ہو جائیں گی، صرف اللہ تعالیٰ کی باعظمت اور سزاوارِ تعظیم ذات ہی باقی رہ جائے گی، جس کے حضور سب کی پیشی ہونی ہے اور وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ سزاوار ہوگا، کسی کی مجال نہیں ہوگی کہ اس کے آگے دم مار سکے یا اس کے اذن کے بغیر کسی کی سفارش کے لیے زبان کھول سکے۔

'ذِی الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ' کے الفاظ اس سورہ کی آخری آیت میں بھی آئے ہیں۔ مقصود ان دونوں لفظوں کے لانے سے یہ ہے کہ درحقیقت وہی اپنی ذات میں باعظمت ہے اس وجہ سے وہی سب کی تعظیم و تکریم کا حقیقی سزاوار ہے۔ کوئی اور ان اوصاف میں اس کا شریک نہیں ہے۔ لفظ 'وجہ' یہاں اس کی ذات کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ چہرہ ذات کا سب سے اشرف حصہ ہے اس وجہ سے بعض اوقات اس سے پوری ذات کو تعبیر کر دیتے ہیں۔

آخر میں آیتِ ترجیع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پیغمبر کے انذار کو سنو یا نہ سنو لیکن بالآخر یہ بات ہو کے رہے گی کہ ایک دن سب فنا ہو جائیں گے، صرف اللہ جل شانہٗ کی ذات ہی باقی رہے گی تو تم اپنے رب کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے!

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ ۚ فَبِاَىِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۲۹-۳۰)

حقیقی مرجع اللہ ہی ہے

یعنی سب کا مرجع حقیقی وہی ہے۔ جو بھی پاتا ہے اسی کا دیا ہوا پاتا ہے۔ لفظ 'سوال' یہاں اپنے ثمر اور نتیجہ کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے۔ یعنی ہر مانگنے والا چونکہ پاتا اسی سے ہے اس وجہ سے خواہ کسی سے مانگے لیکن حقیقت کے اعتبار سے اسی سے مانگتا ہے۔ دوسروں سے اس کا مانگنا بالکل بے سود اور لاحاصل ہے۔ کوئی دوسرا نہ کچھ دے سکتا نہ کچھ لے سکتا۔ اس وجہ سے کسی اور کو مولیٰ و مرجع سمجھ کر اس کے آگے اپنی التجا و درخواست پیش کرنا محض سفاہت ہے۔ دنیا میں انسان کو جو کچھ ملتا ہے خدا ہی کا دیا ہوا ملتا ہے اور آخرت میں بھی جو کچھ ملے گا اسی کا دیا ہوا ملے گا۔

یہ لفظ احتیاج کے معنی میں بھی آتا ہے۔ مثلاً سورہ 'حٰمٓ السجدۃ' میں ہے: 'سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ' (۱۰) (تمام ضرورت مندوں کے لیے یکساں) یہ معنی لیے جائیں تو آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اسی کے محتاج ہیں۔

کائنات کا سارا انتظام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے

'كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ'۔ یعنی اس مغالطہ میں نہ رہو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو پیدا کر کے اس کا انتظام و انصرام تمہارے فرضی دیویوں دیوتاؤں کے سپرد کر دیا ہے اور خود بالکل معطل ہو کر کسی گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا ہے۔ جو لوگ اس مغالطہ میں ہیں وہ خدا کی شانوں سے بالکل بے خبر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی اس کائنات کا سارا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہے۔ وہی آسمانوں میں سورج اور چاند کو حرکت دیتا ہے اور وہی زمین میں اپنے بندوں کی ضروریات پوری کرتا ہے اس وجہ سے اس کا ہر لمحہ کسی نہ کسی کام میں ہے۔ 'یوم' یہاں وقت کے مفہوم میں ہے اور قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کا انتظام خود سنبھالے ہوئے ہے تو کسی اور وسیلہ و واسطہ کی ضرورت کہاں باقی رہی؟ پھر تو جس کو جو کچھ مانگنا ہو اسی سے مانگے۔

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی گوشۂ خلوت میں نہیں بیٹھا ہوا ہے بلکہ وہ ہر وقت اپنی دنیا کے انتظام و انصرام میں لگا ہوا ہے اور اس کی شانیں اس کائنات کے گوشہ گوشہ سے نمایاں ہیں تو اس کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے۔

۲- آگے آیات ۳۱-۴۵ کا مضمون

آگے اس دن کی تصویر آرہی ہے جس سے لوگوں کو ڈرایا جا رہا ہے۔ نظمِ کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۳۱-۴۵

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾ يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّ
نُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ
السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ
بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ
جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا
وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

وقف لازم

ع ۲ ۱۲

ترجمۂ آیات ۳۱-۴۵

ہم تمہارے لیے فارغ ہی ہورہے ہیں، اے دونو جتھو! تو تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! اے جنوں اور انسانوں کے گروہ، اگر تم یہ کر سکو کہ نکل بھاگو آسمانوں اور زمین کے اطراف سے تو نکل بھاگو، تم پروانۂ راہداری کے بدون نہیں نکل سکو گے۔ تو تم اپنے رب کے کن کن اختیارات کو جھٹلاؤ گے! تم پر مارے جائیں گے آگ کے شعلے اور تانبے! تو تم اپنا بچاؤ نہ کر پاؤ گے۔ تو تم اپنے رب کی کن کن قدرتوں کو جھٹلاؤ گے! ۳۱-۳۶

پس یاد رکھو اس وقت کو جب آسمان پھٹ کر کھال کی مانند سرخ ہو جائے گا تو تم اپنے رب کے کن کن کرشموں کو جھٹلاؤ گے! پس اس دن کسی انسان یا جن سے اس کے گناہ کی

یا بت سوال کی ضرورت نہیں ہوگی۔ توتم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! مجرم پہچان لیے جائیں گے اپنی علامتوں سے پس پکڑے جائیں گے چٹیا اور پاؤں سے (اور جہنم میں پھینک دیے جائیں گے) تو اپنے رب کی کن کن قدرتوں کی تکذیب کرو گے! یہ ہے وہ جہنم جس کی مجرم تکذیب کرتے رہے تھے۔ وہ اس کے اور اس کے کھولتے پانی کے درمیان چکر لگاتے ہوں گے تو اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے! ۳۷ - ۴۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۱ - ۳۲)

'ثقلان' سے مراد جن وانس، دونوں من حیث الجماعت ہیں۔ جماعتی حیثیت میں چونکہ دونوں بھاری بھرکم بن جاتے ہیں اس وجہ سے 'ثقلان' کا لفظ استعمال ہوا۔ اس لفظ کے استعمال سے اس چیلنج کی سنگینی واضح ہوتی ہے جو اس آیت میں جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں کو بیک وقت دیا گیا ہے۔ مطلب یہ نکلا کہ خواہ تم کتنے ہی بھاری لشکر ہو لیکن اللہ جل شانہٗ، تم سے تنہا نمٹنے کے لیے عنقریب فارغ ہوا چاہتا ہے۔ فارغ ہونے سے اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ ابھی تو اس دنیا کا کارخانہ چل رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا یہی ہے کہ یہ اپنی مدت پوری کرے لیکن وہ وقت دور نہیں ہے جب یہ مدت پوری ہو جائے گی۔ اس وقت اللہ تعالیٰ اس دنیا کے نظم ونسق سے بالکل فارغ ہو کر بندوں کے حساب کتاب کی طرف متوجہ ہوگا اور ایک ایک کا حساب کر کے جس کو جس جزا یا سزا کا سزاوار پائے گا اس کو وہ دے گا۔ اس اسلوبِ بیان سے یہ مضمون بھی نکلا کہ یہ کام اللہ تعالیٰ سرسری طور پر نہیں بلکہ پوری یکسوئی سے کرے گا۔ اس لیے کہ یہی کام درحقیقت اس دنیا کے پیدا کرنے کی اصل غایت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ دنیا بالکل بے مقصد بن کے رہ جاتی ہے۔ جزاوسزا کی وعید

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس دنیا میں جو واضح دلیلیں تمہارے سامنے جزاوسزا کے حق ہونے کی پیش کی گئیں وہ تو تم نے رد کر دیں لیکن اس وقت کیا کرو گے جب دیکھو گے کہ فی الواقع روزِ حساب آگیا اور اللہ تعالیٰ کی عدالت قائم ہو گئی؟ کیا اس وقت بھی جھٹلاؤ گے؟ اگر جھٹلاؤ گے تو آخر اپنے رب کی کتنی نشانیوں کو جھٹلاؤ گے؟

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۳-۳۴)

کوئی چیز خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہے

یعنی اگر تمہارا گمان ہے کہ تم بالکل غیر مسئول اور مطلق العنان ہو تو ذرا اللہ کے بنائے ہوئے آسمانوں اور اس کی پیدا کی ہوئی زمین کے حدود سے باہر نکل کر دکھاؤ تاکہ ثابت ہو جائے کہ تم اس کی گرفت سے آزاد ہو یا ہو سکتے ہو۔

'لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ'۔ لفظ 'سُلْطٰن' اختیار و اقتدار کے معنی میں بھی آتا ہے اور سند کے معنی میں بھی۔ یہاں یہ اس دوسرے معنی میں ہے۔ یعنی تم لاکھ چاہو لیکن آسمانوں اور زمین کے حدود سے باہر نہیں نکل سکتے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب تمہارے پاس پاسپورٹ ہو۔ اور یہ چیز ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور تمہیں نہیں دے سکتا۔

آگے آیت ترجیع ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تمہاری بے اختیاری و بے بسی کی یہ دلیل بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تو آخر اپنے رب کی کن کن قدرتوں اور شانوں کو جھٹلاتے رہو گے۔

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۵-۳۶)

یعنی اگر تم میں سے کوئی اللہ تعالیٰ کے مقررہ حدود سے باہر نکلنے کی کوشش کرے گا تو اس پر آگ کے شعلوں اور پگھلے ہوئے تانبے کی مار پڑے گی اور وہ ایسی بے پناہ ہوگی کہ تم میں سے کوئی بھی اس سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکے گا۔

'شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ' سے مراد شہابِ ثاقب ہیں جن کے متعلق قرآن مجید میں تصریح ہے کہ یہ ان شیاطین جن پر پھینکے جاتے ہیں جو ملاءِ اعلیٰ کے حدود میں دراندازی اور غیب کی باتوں کی ٹوہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن میں خود جنوں کی زبان سے اس امر واقعی کا اعتراف یوں نقل ہوا ہے: 'وَاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا' (الجن: ۱۲) (اور ہم نے اچھی طرح اندازہ کر لیا ہے کہ نہ ہم زمین میں چھپ کر اللہ کی گرفت سے بچ سکتے ہیں نہ آسمانوں میں بھاگ کر اس سے نکل سکتے)۔

مفسرین کی ایک غلط فہمی

'نُحَاسٌ' کے معنی عام طور پر ہمارے مفسرین و مترجمین نے دھوئیں کے لیے ہیں لیکن یہ لفظ اس معنی میں معروف نہیں ہے۔ بعض اہلِ لغت نے اگرچہ ایک شاذ معنی کی حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے اور نابغہ کے ایک شعر کا بھی حوالہ دیا ہے لیکن اول تو وہ شعر محلِ نظر ہے دوسرے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ دھوئیں کے لیے معروف لفظ 'دُخَانٌ' چھوڑ کر، جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے، ایک غیر معروف لفظ لانے کی وجہ کیا ہے جب کہ قرآن عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ اس وجہ سے ہم کو 'نحاس' کے یہ معنی قبول کرنے میں تردد ہے۔ ہمارے نزدیک یہ اپنے معروف معنی ہی میں استعمال ہوا ہے اور یہ انہی شہابوں کی ایک قسم ہے جن کا ذکر 'شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سائنس کی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ بیشتر شہابیے تو گرتے ہی فضا میں تحلیل ہوجاتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے فلزّاتی اور حجری گولوں کی شکل میں گرتے ہیں لیکن اشیاء کی حرکی توانائی (KINETIC ENERGY) غلافِ جوّی میں داخل ہوتے ہی زیادہ تر حرارت میں تبدیل ہوجاتی ہے جس سے شہاب پگھل کر آگ کے گولوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور زمین کی طرف گرنے کے دوران ان کا فلزّاتی اور حجری مادہ بڑی حد تک ضائع ہوجاتا یا عملِ تبخیر اسے غبار کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ تاہم جو شہاب زمین پر پائے گئے ہیں ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

۱- فلزّاتی شہاب (SIDERITES)

۲- حجری شہاب (AEROLITES)

۳- حجری- فلزّاتی شہاب (SIDEROLITES)

ان شہابوں کے اندر جس طرح لوہے اور پتھر کے اجزاء پائے گئے ہیں اسی طرح تحقیق سے ان کے اندر کانسی اور تانبے کے اجزاء بھی پائے گئے ہیں جس کا آیت زیرِ بحث میں 'نحاس' کے لفظ سے ذکر آیا ہے۔ یہ فلزّاتی اجزاء زیادہ تر شدتِ حرارت سے تحلیل ہوجانے والے ہیں تاہم زمین پر گرنے والوں شہابوں میں ان کا پایا جانا قرآن کی بات کی تصدیق کرتا ہے۔[۱]

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۷-۳۸)

'دِھان' کے معنی 'دِھانؑ' کے معنی لوگوں نے تیل کے تلچھٹ کے بھی لیے ہیں لیکن یہ لفظ کھال کے معنی میں بھی معروف ہے۔ سرخی کی تشبیہ کے لیے کھال زیادہ موزوں ہے اس وجہ سے ہم نے اسی معنی کو ترجیح دی ہے۔ دوسرے مقام میں 'وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ' (التکویر-۱۱) بھی آیا ہے جس کے معنی ہیں جب کہ آسمان کی کھال کھینچ لی جائے گی یعنی جس طرح کھال کھینچ لینے کے بعد جسم کا گوشت سرخ سرخ نظر آتا ہے اسی طرح آسمان بھی سرخ نظر آئے گا۔ یہاں اس کی سرخی کو سرخ کھال سے تشبیہ دی ہے اور یہ تشبیہ نہایت موزوں ہے۔ یہ روزِ قیامت کے ظہور کی تصویر ہے کہ آج تو تم بڑی ڈھٹائی سے قیامت کا انکار کر رہے ہو لیکن وہ دن بھی آنے والا ہے جب آسمان شق ہوجائے گا اور یہ نیلگوں چھت سرخ کھال کی طرح نظر آئے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کیا کروگے؟ کیا اس وقت بھی انکار کروگے؟ آخر اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے، اس کے عجائباتِ قدرت تو یکے بعد دیگرے ظاہر ہی ہوتے رہیں گے۔

---

[۱] شہابوں سے متعلق یہ تحقیق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں فہرست شہب (CATALOGUE OF METEORITES) کے مصنف (MAX H. HEY) کے مضمون 'شہاب ثاقب' سے ماخوذ ہے۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْبِهٖٓ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۹-۴۲)

مجرموں کا جرم بے تحقیق واضح ہوگا

یعنی اس مغالطے میں نہ رہو کہ اس دن تمہارے جرائم کی تفتیش و تحقیق کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے ملائکہ کو کوئی محنت کرنی پڑے گی۔ محنت تو درکنار کسی سے اس کے جرم کی بابت پوچھنے کی بھی ضرورت نہیں پیش آئے گی۔ اس دن ہر مجرم اپنی پیشانی سے پہچان لیا جائے گا کہ وہ کس درجے کا مجرم اور کس سزا کا مستحق ہے۔ سوال کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں۔ یہاں جس سوال کی نفی ہے وہ تحقیق و تفتیش کی نوعیت کا سوال ہے۔ اس کی ضرورت پیش نہ آنے کی وجہ قرآن کے دوسرے مقامات میں یہ بیان ہوئی ہے کہ اس دن آدمی کے صرف ہاتھ پاؤں ہی نہیں بلکہ اس کے ایک ایک بن مُو سے اس کے جرائم کی شہادت ملے گی۔ رہا وہ سوال جو توبیخ یا ملامت یا استہزاء اور طنز کی نوعیت کا ہوتا ہے تو اس کی نفی یہاں نہیں کی گئی ہے۔ قرآن میں جو سوالات مجرموں سے مذکور ہیں وہ اسی دوسری نوعیت کے ہیں۔ اس باب میں قرآن کے بیان میں کوئی تضاد نہیں ہے بلکہ دونوں کے مواقع الگ الگ ہیں۔

دوزخ میں پھینکے جانے کی تصویر

'فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ' یہ ان کے دوزخ میں پھینکے جانے کی تصویر ہے کہ اپنے جرم کی علامت کے ساتھ یہ دوزخ کے سنتریوں کے پاس لائے جائیں گے اور وہ ان کی چٹیا اور ان کے پاؤں پکڑ کے اٹھائیں گے اور جس طرح لکڑی کے کندے دہکتی آگ میں پھینکے جاتے ہیں اسی طرح ان کو بھڑکتی دوزخ میں پھینک دیں گے۔ یہاں دوزخ میں پھینکے جانے کا مضمون محذوف ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پکڑے جانے کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ پھینکے جانے ہی کی ہے۔ اس واضح قرینہ کی موجودگی میں اس مضمون کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔

آگے آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے کہ تمہارے سامنے مرحلہ تو یہ بھی آنے والا ہے تو آخر اپنے رب کی کن کن نشانیوں کی تکذیب کرو گے!

هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ۝ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۳-۴۵)

آگ اور کھولتے پانی کے درمیان گردش

فرمایا کہ یہ ہے اس جہنم کی تصویر جس کی مجرمین تکذیب کر رہے ہیں بالآخر وہ اس کی آگ اور اس کے کھولتے پانی کے درمیان پھیرے لگائیں گے۔ 'اٰنٍ' اس پانی کی صفت کے لیے آتا ہے جس کی گرمی اپنے آخری نقطہ پر پہنچی ہوئی ہو۔ یہ ان کی انتہائی بے کسی کی تصویر ہے کہ جب دوزخ کی آگ ان کو جھلسے گی تو وہ پانی کی تلاش میں بھاگیں گے لیکن پانی کا حال یہ ہوگا کہ وہ گرمی کے آخری نقطہ پر پہنچا ہوا ہوگا۔ انہی کے درمیان پھیرے لگانے میں ان کی زندگی گزرے گی۔ سورۂ غاشیہ میں ان کی اس حالت کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ (الغاشیۃ ۸۸: ۴-۵) (وہ بھڑکتی آگ میں داخل ہوں گے

اور جب پانی مانگیں گے تو ان کو آخری درجے میں گرم چشمہ کا پانی پلایا جائے گا)۔

آخر میں آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل واضح ہے کہ آج تو بڑی ڈھٹائی سے آخرت اور عذاب کا انکار کر رہے ہو لیکن جب یہ کچھ سامنے آئے گا تب کیا کرو گے! آخر اپنے رب کے کتنے مظاہر کو جھٹلاؤ گے!

۴۔ آگے آیات ۴۶-۷۸ کا مضمون

مجرموں کا انجام بیان کرنے کے بعد آگے اس صلہ کی تفصیل ہے جو اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کو قیامت میں ملنے والا ہے۔ اس تقابل سے دونوں گروہوں کی پوری تصویر سامنے آگئی ہے۔ نظمِ کلام بالکل واضح ہے۔ بس اتنی بات یاد رکھنے کی ہے کہ آیات ۴۶-۶۱ میں مقربین کی حیثیت کا بیان ہے اور اس کے بعد کی آیات میں اصحاب الیمین کی جنت کا۔ ان دونوں گروہوں کے فرقِ مراتب کی تفصیل اس کے بعد والی سورہ ——— الواقعۃ ——— میں آئے گی جو اس کی توام سورہ ہے ——— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۴۶-۷۸

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾
ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ
تَجْرِیٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِیْهِمَا مِنْ كُلِّ
فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰی
فُرُشٍۭ بَطَآىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ؕ وَجَنَا الْجَنَّتَیْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَیِّ
اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِیْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ
قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿۵۶﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۷﴾ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ
وَالْمَرْجَانُ ﴿۵۸﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۹﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ
اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿۶۰﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۱﴾ وَمِنْ دُوْنِهِمَا
جَنَّتٰنِ ﴿۶۲﴾ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۳﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿۶۴﴾
فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۶۵﴾ فِیْهِمَا عَیْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿۶۶﴾

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٧﴾ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿٦٨﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٩﴾ فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾ حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾
فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ
وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى
رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا
ع ۳ ۳۲ ۱۳ تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٧﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿٧٨﴾

ترجمۂ آیات ۴۶-۷۸

اور ان کے لیے جو اپنے رب کے حضور پیشی سے ڈرتے رہے دو باغ ہوں گے۔ تو تم اپنے رب کی کن کن عنایتوں کو جھٹلاؤ گے! دونوں نہایت کثیر شاخوں والے ہوں گے تو تم اپنے رب کی کتنی رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان کے اندر دو چشمے جاری ہوں گے۔ تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں ہر میوے کی الگ الگ قسمیں ہوں گی تو تم اپنے رب کے کن کن افضال کی تکذیب کرو گے! وہ ٹیک لگائے ایسے بچھونوں پر بیٹھے ہوں گے جن کے استر استبرق کے ہوں گے اور دونوں باغوں کے پھل ان کے سروں پر لٹک رہے ہوں گے تو اپنے رب کی کتنی نعمتوں کی تکذیب کرو گے! ان میں باحیا حوریں ہوں گی جن کو ان سے پہلے کسی انسان یا جن نے ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔ تو تم اپنے رب کی کتنی نوازشوں کو جھٹلاؤ گے! وہ حوریں ایسی ہوں گی گویا یاقوت اور مونگے ہوں تو تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! نیکی کا صلہ تو آخر احسان ہی ہوگا! تو تم اپنے رب کے کن کن احسانوں کو جھٹلاؤ گے! ۶۰-۶۱

اور ان دو کے سوا اور بھی دو باغ ہوں گے تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے!

دونوں سبزی سے سیاہی مائل، تو اپنے رب کی کن کن رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں دو چشمے ہوں گے اُبلتے ہوئے تو اپنے رب کی کتنی رحمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں میوے، کھجور اور انار ہوں گے تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! ان میں نیک سیرت اور خوب صورت حوریں ہوں گی تو اپنے رب کی کتنی عنایتوں کی تکذیب کرو گے! حوریں، خیموں میں رہنے والیاں تو اپنے رب کے کتنے احسانات کو جھٹلاؤ گے! ان سے پہلے ان کو نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہو گا، نہ کسی جن نے، تو اپنے رب کے کتنے افضال کو جھٹلاؤ گے! ٹیک لگائے بیٹھے ہوں گے سبز چاندنیوں اور خوب صورت قالینوں پر تو تم اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! بڑا ہی بابرکت ہے نام تیرے عظمت والے اور سزاوارِ تکریم رب کا! ۶۲-۷۸

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۚ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۴۶-۴۷)

متقیوں کا انجام

'مجرمین' کے انجام کے بعد یہ متقیوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ ان کی صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ یہ اپنے رب کے حضور پیشی سے برابر ڈرتے رہے۔ اس دن کا حوالہ قرآن کے دوسرے مقام میں 'یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ' (المطففین: ۶) کے الفاظ سے آیا ہے، یعنی جس دن لوگ اپنے رب کے حضور میں پیشی کے لیے اٹھیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کو جادۂ مستقیم پر استوار رکھنے والی واحد چیز یہی اللہ تعالیٰ کے آگے پیشی کا خوف ہے۔ یہ خوف دل سے نکل جائے تو پھر انسان کو بڑے سے بڑا جرم کرنے سے بھی کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ فرمایا کہ جو لوگ اپنے رب کے حضور جواب دہی سے ڈرتے رہے ان کے لیے دو باغ ہوں گے۔ قرآن میں لفظ 'جنّت' تمام اُخروی کامیابیوں کی ایک جامع تعبیر ہے اور دو جنتوں کا ذکر تکمیلِ نعمت کے طور پر ہوا ہے کہ ایک نہیں بلکہ دو دو جنتیں ان کو ملیں گی۔ سورۂ کہف آیت ۳۲ میں باغ والے کا جو قصہ ہے اس میں بھی دو باغوں کا ذکر ہے: 'جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَیْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ' (الکہف: ۳۲) (ان میں سے ایک کو ہم نے دو باغ انگوروں کے دے رکھے تھے اور ان کو گھیر رکھا تھا کھجوروں سے)۔ اس آیت کے تحت ہم نے لکھا ہے کہ یہ دو باغوں کا ذکر اتمامِ نعمت کے اظہار کے لیے

ہے کہ اللہ نے تو اپنے فضل سے اس کو دو دو باغ دے رکھے تھے لیکن یہ نعمت اس کے لیے شکر گزاری کے بجائے ناشکری کا سبب بنی۔

بلاغتِ کلام کا ایک نکتہ

اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور آگے جنت کی ایک ایک نعمت کے ذکر کے بعد یہ ترجیع آئے گی۔ اس کے موقع و محل کی بلاغت سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھیے کہ جن مکذبین سے یہاں خطاب ہے وہ اوّل تو قیامت کو بہت بعید از امکان چیز سمجھتے تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجے میں اس کو مانتے بھی تھے تو یہ ماننے کے لیے وہ کسی قیمت پر بھی تیار نہیں تھے کہ آخرت کی نعمتوں میں کوئی حصہ ان فتو فقیر مسلمانوں کا بھی ہوگا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر جنت کی فی الواقع کوئی حقیقت ہے تو جس طرح اس دنیا کی تمام نعمتیں ان کو ملی ہیں اسی طرح آخرت کی نعمتیں بھی انہی کو ملیں گی۔ ان کی اس ذہنیت کو اچھی طرح کچلنے اور ان کے غرور کو بالکل پامال کر دینے کے لیے یہاں جنت کی ایک ایک نعمت پر ہاتھ رکھ رکھ کے فرمایا ہے کہ یہ ہم اپنے متقی بندوں کو دیں گے اور ساتھ ہی ان مکذبین سے سوال کیا ہے کہ بتاؤ تم ہماری کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! یہاں تو تم کہتے ہو کہ یہ محض جی کو خوش کرنے کی باتیں ہیں لیکن اس وقت کس طرح تکذیب کرو گے جب ہم یہ ساری چیزیں اپنے بندوں کو دیں گے اور تم اس وقت حسرت سے اپنے سر پیٹو گے۔

ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۴۸-۴۹)

یہ ان دو باغوں کی زرخیزی، شادابی اور برگ و بار کی کثرت کی تعبیر ہے کہ وہ اجاڑ اور بے رونق نہیں ہوں گے بلکہ ایک ایک درخت شاخوں اور ٹہنیوں کی کثرت سے رشکِ چمن ہوگا۔ باغوں کی اس صفت کے بعد بھی آیت ترجیع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب کے امراء و اغنیاء کا سب سے بڑا سرمایۂ ناز باغ ہی ہوتے تھے، اور ایک گرم و خشک ملک میں کسی کے پاس اگر سرسبز و شاداب باغ ہوں تو اس کی خوش بختی و بلند اقبالی کے کیا کہنے ہیں! ان کے اسی ذوق کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ ہم اس طرح کے باغ اپنے نیک بندوں کو دیں گے تو تم ہماری کن کن بخششوں کو جھٹلاؤ گے۔

فِیْهِمَا عَیْنٰنِ تَجْرِیٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۰-۵۱)

اس کی شادابی و زرخیزی کی ضمانت کے لیے ان میں الگ الگ دو چشمے بھی رواں دواں ہوں گے۔ تو بتاؤ اپنے رب کی کتنی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے! اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِیْهِمَا مِنْ کُلِّ فَاکِهَةٍ زَوْجٰنِ ۝ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ (۵۲-۵۳)

یعنی دونوں باغوں میں ایک ہی قسم کے پھل نہیں ہوں گے بلکہ دونوں میں الگ الگ قسموں کے پھل ہوں گے۔ لفظ 'زوج' یہاں ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ اس کے بعد آیت ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَاۗىِٕنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ۭ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۴-۵۵)

یعنی یہ اہل جنت گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ایسے تختوں پر بیٹھے ہوں گے جن پر بچھے ہوئے فرشوں کے استر استبرق کے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جن بچھونوں کے استر استبرق کے ہوں ان کے ابرے کا اندازہ کون کر سکتا ہے! مزید یہ کہ دونوں باغوں کے اندر پھلوں کا حال یہ ہوگا کہ وہ سروں پر لٹک رہے ہوں گے۔ ان کے حاصل کرنے میں کسی کو کوئی زحمت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ اس کے بعد آیت ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَاۗنٌّ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۚ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۵۶-۵۹)

'فِيْهِنَّ' میں ضمیر جمع کا مرجع وہ تمام نعمتیں بھی ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے اور جنت کے وہ تمام لان، چمن اور محل بھی جو لفظوں میں مذکور نہ سہی لیکن لوازم کی حیثیت سے وہ بدیہی طور پر سمجھے جاتے ہیں۔ عربی میں اس طرح ضمیروں کا استعمال معروف ہے۔ اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ فرمایا کہ عیشِ دوام کے ان باغوں اور سامانوں کے اندر ان کے لیے شرمیلی اور باحیا نازنینیں بھی ہوں گی۔ انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہوئی ہے کہ وہ ان چیزوں سے اس وقت تک اچھی طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتا جب تک بیوی اس کے ساتھ نہ ہو جس کو قدرت نے اس کا شریکِ رنج و راحت بنایا ہے۔ چنانچہ تعریف میں فرمایا ہے کہ وہ نہایت شرمیلی اور باحیا ہوں گی۔ عورت کا یہ شرمیلا پن اس کا سب سے بڑا حسن بھی ہے اور اس کے اخلاق کا سب سے بڑا محافظ بھی۔ جو عورت شرمیلی نہیں ہے وہ ہرجائی ہے۔ ہرجائی کسی کی وفادار نہیں ہو سکتی اور جب وہ وفادار نہیں ہو سکتی تو ایک عورت کی حیثیت سے اس کا وجود بے مقصد ہے اس لیے کہ وہ کسی خاندان کی تعمیر میں بنیاد کی اینٹ کا کام نہیں دے سکتی درآنحالیکہ یہی عورت کے وجود کی غایت ہے۔

'لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَاۗنٌّ' یہ ان کے شوہر ناآشنا ہونے اور کنوارپن کی تعبیر ہے۔

'یاقوت' اور 'مرجان' سے ان کی تشبیہ ان کے حسن اور ان کی عصمت و محفوظیت کے بیان کے لیے ہے۔ ان صفتوں کے بعد بھی ترجیع والی آیت آئی ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

هَلْ جَزَاۗءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ۚ فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۶۰-۶۱)

جزا و سزا کے حق میں عقل و فطرت کی گواہی

مقربین کی جنت کے اوصاف بیان کرنے کے بعد یہ آخر میں مخاطبوں کو متوجہ کر کے نہایت بلیغ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اس بات پر تمہیں تعجب کیوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو یہ ساری نعمتیں دینے والا ہے! آخر نیکی اور پاکبازی کا بدلہ کیا ہونا چاہیے، فضل و کرم ہی ہونا چاہیے یا کچھ اور؟ اگر اس کائنات کا خالق ایک ایسا دن نہ لائے جس میں بروں کو ان کی بدیوں کی سزا اور نیکوں کو ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ دے تو اس

کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز ہی نہیں ہے بلکہ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ نعوذ باللہ وہ بدی کو زیادہ پسند کرتا ہے کہ اس نے شریروں کو سارے وسائل دے کر اس دنیا میں آزاد چھوڑ رکھا ہے کہ وہ اس میں جو اودھم چاہیں مچائیں۔ انسان کی عقل اور اس کی فطرت اپنے رب کے متعلق اس قسم کی مکروہ بدگمانی کبھی گوارا نہیں کر سکتی۔ اس کی فطرت کی شہادت یہی ہے کہ کائنات کا خالق نہایت ہی عادل اور رحیم ہے۔ وہ ان لوگوں کو سزا دے گا جو برائیوں کے مرتکب ہوں گے اور نیکوں کو ان کی ایک ایک نیکی کا بھرپور صلہ دے گا۔ یہ بات چونکہ انسانی فطرت میں راسخ ہے، کوئی عاقل، سلامتیٔ عقل و ہوش کے ساتھ، اس کا انکار نہیں کر سکتا اس وجہ سے بات ایسے اسلوب میں فرمائی ہے جو ایک واضح حقیقت کے بیان کا ہے۔ لفظ 'احسان'، نیکی کے معنی میں بھی آتا ہے اور نیک صلہ کے معنی میں بھی۔ اس آیت میں یہ نہایت خوبصورتی کے ساتھ دونوں ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع بیان یہ ہے کہ جب یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت اور مسلّم ہے تو اللہ تعالیٰ لازماً ہر نیکی کا نیک صلہ دے کے رہے گا، تم اس کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے!

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۶۲-۶۳)

اصحاب الیمین جنت — مذکورہ دو جنتوں کے سوا اب دو اور جنتوں کا ذکر آ رہا ہے جو اپنی خصوصیات کے اعتبار سے مذکورہ جنتوں کے ساتھ فی الجملہ اشتراک بھی رکھتی ہیں اور بعض اعتبارات سے ان سے مختلف بھی ہیں۔ ان کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں قسم کی جنتوں کے حق دار ایک ہی قسم کے لوگ ہوں گے یا الگ الگ قسم کے لوگ۔ اس کا صحیح جواب آگے آنے والی سورہ ـــــــ سورۂ واقعہ ـــــــ میں آئے گا۔ اس میں اہلِ ایمان کو دو گروہوں میں تقسیم فرمایا ہے: 'اصحب المیمنۃ' اور 'السابقون' اور ان دونوں کے لیے الگ الگ جنتوں کا ذکر ہے جن کے اوصاف میں فی الجملہ اشتراک بھی ہے اور بعض پہلوؤں سے اختلاف بھی۔ اس وجہ سے قرینِ قیاس بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اوپر 'سابقین اولین' یا بالفاظ دیگر 'مقربین' کی جنت کا ذکر ہے اور اب یہ 'مِنْ دُوْنِهِمَا' کی جنت کا ذکر آ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح دونوں گروہوں کے مرتبہ میں فرق ہے اسی طرح دونوں گروہوں کی جنتوں میں بھی فرق ہے، جس کا اندازہ اہلِ ذوق خود کر سکتے ہیں۔ آگے ہم بھی اس فرق کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے۔ 'مِنْ دُوْنِهِمَا' کا ترجمہ 'ان دو کے سوا'، 'ان دونوں کے بالمقابل' بھی ہو سکتا ہے اور 'ان دونوں سے فروتر' بھی۔

اس ٹکڑے کے بعد وہی ترجیع ہے جو ہر نعمت کے ذکر کے ساتھ برابر آ رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انہی دو جنتوں پر تو بس نہیں ہے اور بھی دو جنتیں ہوں گی تو تم کن کن جنتوں کو جھٹلاؤ اور ان کا مذاق اڑاؤ گے!

مُدْهَآمَّتٰنِ ۞ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۶۴-۶۵)

یعنی ان کی سرسبزی کا حال یہ ہوگا کہ وہ مائل بہ سیاہی ہو جائے گی۔ شاداب باغ کا سب سے زیادہ خوبصورت رنگ یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِمَا عَيْنَانِ نَضَّاخَتَانِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۶۶ - ۶۷)

'نضخ' کے معنی جوش مارنے اور اُبلنے کے ہیں۔ یہ پہاڑی چشموں کی تصویر ہے۔ میدانی علاقوں کے چشمے تو، جیسا کہ اوپر لفظ 'تَجْرِيَانِ' آیا ہے، صرف بہتے ہیں لیکن پہاڑی چشمے جوش کے ساتھ ابلتے ہیں۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے جس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِمَا فَاكِهَةٌ وَنَخْلٌ وَرُمَّانٌ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۶۸ - ۶۹)

'فَاكِهَةٌ' کے بعد 'نَخْلٌ' (کھجور) اور 'رُمَّانٌ' (انار) کا ذکر عام کے بعد خاص کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ دونوں میوے عرب کے محبوب میووں میں سے ہیں۔ اوپر کی جنت میں 'مِن كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجَانِ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی دونوں باغوں میں ہر پھل کی الگ الگ قسمیں ہوں گی۔ ان دونوں اسلوبوں میں جو فرق ہے وہ نگاہ میں رہے۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

فِيهِنَّ خَيْرَاتٌ حِسَانٌ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ ۝ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَانٌّ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۷۰ - ۷۵)

'خَيْرَاتٌ حِسَانٌ' کے معنی ہیں پاکیزہ سیرت اور پاکیزہ صورت۔ 'حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ' میں خاص عربی ذوق نمایاں ہے۔ خیموں کی رہائش اہل عرب کی پسندیدہ رہائش رہی ہے۔ امرائے عرب کے خیمے اور شامیانے شاندار محلوں کے لیے بھی قابلِ رشک ہوتے تھے اور یہاں تو ذکر جنت کے خیموں کا ہے۔ اوپر کی جنت میں شرمیلی نازنینوں کا ذکر ہے اور ان کو یاقوت و مرجان سے تشبیہ دی گئی ہے۔ دونوں جگہ صفات کا جو فرق ہے وہ نگاہ میں رہے۔ ہر صفت کے بیان کے بعد آیتِ ترجیع بھی آئی ہے اور اس کا موقع و محل واضح ہے۔

مُتَّكِئِينَ عَلَىٰ رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (۷۶ - ۷۷)

یعنی اس قسم کی جنتوں میں سبز چاندنیوں اور خوبصورت نادر قالینوں پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے وہ بیٹھے ہوں گے۔ لفظ 'عبقری' نادر اور قیمتی چیزوں کے لیے آتا ہے اور موقع و محل کی رعایت سے اس کا اطلاق مختلف چیزوں پر ہو سکتا ہے۔ ہم نے محض موقع کی مناسبت سے یہاں اس کو نادر قالینوں کے معنی میں لیا ہے۔ اس کے بعد آیتِ ترجیع ہے اور اس کا موقع و محل بالکل واضح ہے۔

تَبَارَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۷۸)

خاتمۂ سورہ

جس طرح اوپر جزاء و سزا کے دلائل بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ 'كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ

وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ، اسی طرح جزاء وسزا کی تفصیلات سنانے کے بعد اسی آیت کا اعادہ فرمایا ہے اور مقصود اس اعادے سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ چونکہ تیرے رب ذوالجلال والاکرام کی ذات بڑی ہی خیر و برکت والی ہے اس وجہ سے اس کی یہ تمام برکتیں لازماً ظاہر ہوں گی۔ نادان ہیں وہ لوگ جو سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا پیدا تو کر دی لیکن پیدا کر دینے کے بعد اس کے خیر و شر سے اسے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ جس طرح اوپر والی آیت میں لفظ 'وجہ' سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو تعبیر فرمایا ہے اسی طرح اس آیت میں لفظ 'اسم' سے اس کی ذات کو تعبیر فرمایا ہے۔ اسم اپنے مسمّٰی پر دلیل ہوتا ہے۔

مذکورہ جنتوں کے اوصاف پر غور کیجیے تو ایک بات واضح طور پر محسوس ہوتی ہے کہ اوپر کی جنتوں میں جو نعمتیں بیان ہوئی ہیں ان میں اہلِ عجم کا ذوق زیادہ نمایاں ہے اور بعد کی جنتوں میں اہلِ عرب کا ذوق زیادہ اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اگرچہ یہ نعمتیں بطور تشبیہ بیان ہوئی ہیں، ان کی اصل حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے تاہم ان کی مدد سے کسی حد تک یہ ہمارے تصور کے قریب آجاتی ہیں اور یہی ان تشبیہات سے مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ آج ۲۴۔ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ کو ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰی اِحْسَانِهٖ۔

لاہور

۱۰۔ ستمبر ۱۹۷۷ء

۲۴۔ رمضان المبارک ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

٥٦

الواقعة

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورتوں سے تعلق

یہ اس گروپ کی ساتویں سورہ ہے جس پر گروپ کی مکّی سورتیں تمام ہوئیں۔ اس میں اس ساری بحث کا خلاصہ سامنے رکھ دیا ہے، جو جزاو سزا سے متعلق، سورۂ قٓ سے لے کر سورۂ رحمٰن تک ہوئی ہے۔ پچھلی سورتوں میں اس موضوع کے تمام اطراف، آفاق و انفس اور عقل و فطرت کے دلائل کی روشنی میں، زیر بحث آئے ہیں، اس سورہ میں دلائل کی وضاحت کے بجائے اصل نتیجہ سے قریش کے متکبرین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ قیامت ایک امر شدنی ہے جس میں ذرا شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ تمھیں لازماً ایک ایسے جہان سے سابقہ پیش آنے والا ہے جس میں عزّت و ذلّت کے اقدار اور پیمانے ان اقدار اور پیمانوں سے بالکل مختلف ہوں گے جو اس جہان میں معروف ہیں۔ وہاں عزت و سرفرازی ان کے لیے ہوگی جنھوں نے اس دنیا میں ایمان اور عملِ صالح کی کمائی کی ہوگی، وہ مقربین اور اصحاب الیمین کے درجے پائیں گے۔ جنت کی تمام کامرانیاں انہی کا حصّہ ہوں گی۔ رہے وہ جو اسی دنیا کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں اور اسی کے عشق میں مگن ہیں وہ اصحاب الشمال میں ہوں گے اور ان کو دوزخ کے ابدی عذاب سے سابقہ پیش آئے گا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۱۰) قیامت ایک امر شدنی ہے۔ اس کے واقع ہونے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ لوگوں کو ایمان و عمل صالح کی کسوٹی پر پرکھے گی اور کتنوں کو پست اور کتنوں کو بلند کرے گی۔ اس جانچ پرکھ کے نتیجہ میں اس دن لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ اصحاب الیمین کا ہوگا، دوسرا اصحاب الشمال کا اور تیسرا گروہ سابقون الاوّلون کا۔

(۱۱-۲۶) اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرّب سابقون اوّلون ہوں گے۔ ان کو قربِ الٰہی کی جو سرفرازیاں اور جنت کی جو نعمتیں حاصل ہوں گی ان کی تفصیل اور اس گروہ میں شامل ہونے والوں کے اوصاف کا بیان۔

(۲۷-۴۰) دوسرے درجے میں اصحاب الیمین ہوں گے۔ ان کی جنت کی تفصیل اور اس گروہ میں

شامل ہونے والوں کا بیان۔

(۴۱ - ۴۸) اصحاب الشمال کے انجام کا بیان اور ان کے بعض خاص جرائم کی طرف اشارہ جن کے سبب سے وہ اس انجام کے سزاوار ٹھہریں گے۔

(۴۹ - ۴۷) قریش کے متکبرین کو خطاب کر کے یہ تنبیہ کہ اصحاب الشمال کا جو حشر بیان ہوا ہے یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے اگر تم گمراہی اور تکذیب کی اس روش پر اڑے ہوئے ہو۔ اسی ضمن میں باندازِ اتمامِ حجت قیامت اور جزاء و سزا کے بعض بدیہی دلائل کی طرف اشارہ جن کا انکار صرف ہٹ دھرم ہی کر سکتے ہیں۔

(۷۵ - ۹۶) قرآن کی عظمت اور شیطانی چھوت سے اس کے پاک اور بالاتر ہونے کا حوالہ اور قریش کو یہ تنبیہ کہ اس عظیم نعمت سے روگردانی کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دو۔ یہ کتاب جس انجام سے آگاہ کر رہی ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ خوش قسمت ہیں وہ جو آج مقربین اور اصحاب الیمین کا درجہ حاصل کرنے کی جدوجہد کریں ورنہ یاد رکھیں کہ جو لوگ ان درجوں سے محروم رہے وہ اصحاب الشمال میں ہوں گے اور ان کا انجام نہایت دردناک ہے۔

سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ (۵٦)

مَكِّيَّةٌ ———— آيات: ۹٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿١﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿٢﴾ خَافِضَةٌ آیات ۱-۵٦
رَّافِعَةٌ ﴿٣﴾ إِذَا رُجَّتِ الْأَرْضُ رَجًّا ﴿٤﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ
بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتْ هَبَاءً مُّنْبَثًّا ﴿٦﴾ وَّكُنْتُمْ أَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ﴿٧﴾
فَأَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ مَا أَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ﴿٨﴾ وَأَصْحٰبُ
الْمَشْئَمَةِ مَا أَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ ﴿٩﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ﴿١٠﴾
أُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ﴿١١﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿١٢﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْأَوَّلِيْنَ ﴿١٣﴾
وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٤﴾ عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ﴿١٥﴾ مُّتَّكِئِيْنَ
عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿١٦﴾ يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ﴿١٧﴾
بِأَكْوَابٍ وَّأَبَارِيْقَ وَكَأْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ﴿١٨﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ
عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ﴿١٩﴾ وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ﴿٢٠﴾ وَ
لَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿٢١﴾ وَحُوْرٌ عِيْنٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ
اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ ﴿٢٣﴾ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ
فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْمًا ﴿٢٥﴾ إِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ﴿٢٦﴾ وَأَصْحٰبُ

الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ﴿٢٧﴾ فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ﴿٢٨﴾ وَّطَلْحٍ
مَّنْضُوْدٍ ﴿٢٩﴾ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ﴿٣٠﴾ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ﴿٣١﴾ وَّفَاكِهَةٍ
كَثِيْرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ ﴿٣٣﴾ وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ﴿٣٤﴾
اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ﴿٣٥﴾ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ﴿٣٦﴾ عُرُبًا اَتْرَابًا ﴿٣٧﴾
لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٣٨﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٣٩﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ ع ۳۸ ۱۴
الْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿٤١﴾
فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿٤٢﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿٤٣﴾ لَّا بَارِدٍ وَّلَا
كَرِيْمٍ ﴿٤٤﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَكَانُوْا
يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ﴿٤٦﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا
وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿٤٧﴾ اَوَاٰبَآؤُنَا
الْاَوَّلُوْنَ ﴿٤٨﴾ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿٤٩﴾ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ
اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٥٠﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ
الْمُكَذِّبُوْنَ ﴿٥١﴾ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِـُٔوْنَ
مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿٥٣﴾ فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ﴿٥٤﴾ فَشٰرِبُوْنَ
شُرْبَ الْهِيْمِ ﴿٥٥﴾ هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿٥٦﴾

ترجمۂ آیات یاد رکھو، جب کہ واقع ہو پڑے گی واقع ہونے والی۔ اس کے واقع ہونے میں
۱ - ۵۶ کسی جھوٹ کا شائبہ نہیں۔ وہ پست کرنے والی اور بلند کرنے والی ہوگی۔ جب کہ زمین
بالکل جھنجھوڑ دی جائے گی اور پہاڑ بالکل ریزہ ریزہ ہو کر منتشر غبار بن جائیں گے۔

اور تم تین گروہوں میں تقسیم ہو جاؤ گے۔ ۱-۷

ایک گروہ داہنے والوں کا ہوگا، تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! دوسرا گروہ بائیں والوں کا ہوگا، تو کیا حال ہوگا بائیں والوں کا! رہے سابقون، تو وہ تو سبقت کرنے والے ہی ہیں! وہی لوگ مقرّب ہوں گے۔ نعمت کے باغوں میں۔ ان میں بڑی تعداد اگلوں کی ہوگی اور تھوڑے پچھلوں میں سے ہوں گے۔ جڑاؤ تختوں پر، ٹیک لگائے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ ان کی خدمت میں غلمان، جو ہمیشہ غلمان ہی رہیں گے، پیالے جگ اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے گردش کر رہے ہوں گے جس سے نہ تو ان کو دردِ سر لاحق ہوگا اور نہ وہ فتورِ عقل میں مبتلا ہوں گے اور میوے ان کی پسند کے اور پرندوں کے گوشت ان کی رغبت کے۔ اور ان کے لیے غزال چشم حوریں ہوں گی، محفوظ کیے ہوئے موتیوں کے مانند۔ صلہ ان کے ان اعمال کا جو وہ کرتے رہے۔ اس میں وہ کوئی لغو اور گناہ کی بات نہیں سنیں گے۔ صرف مبارک سلامت کے چرچے ہوں گے۔ ۸-۲۶

اور رہے داہنے والے تو کیا کہنے ہیں داہنے والوں کے! بے خار بیریوں، تہ بہ تہ کیلوں اور پھیلے ہوئے سایوں میں۔ اور پانی بہایا ہوا۔ میوے فراواں، نہ کبھی منقطع ہونے والے نہ کبھی ممنوع۔ اور اونچے بستر ہوں گے اور ان کی بیویاں ہوں گی جن کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہوگا، پس ہم ان کو رکھیں گے کنواریاں، دلربا اور ہم سنین۔ یہ نعمتیں داہنے والوں کے لیے ہوں گی۔ ان میں اگلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ ہوگا اور پچھلوں میں سے بھی ایک بڑا گروہ۔ ۲۷-۴۰

اور بائیں والے تو کیا ہی بُرا حال ہوگا بائیں والوں کا! وہ لُو کی لپٹ، کھولتے پانی اور

دھوئیں کے سایہ میں ہوں گے جس میں نہ کوئی ٹھنڈک ہوگی اور نہ کسی طرح کی کوئی افادیت۔ یہ لوگ اس سے پہلے خوش حالوں میں تھے اور سب سے بڑے گناہ پر اصرار کرتے رہے۔ اور کہتے تھے کہ کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے! اور کیا ہمارے اگلے آباء و اجداد بھی! ۴۱-۴۸

کہہ دو! اگلے اور پچھلے سب جمع کیے جائیں گے، ایک معیّن دن کی مقررہ مدت تک۔ پھر تم لوگ، اے گمراہو اور جھٹلانے والو، زقّوم کے درخت میں سے کھاؤ گے اور اسی سے اپنے پیٹ بھرو گے، پھر اس پر کھولتا پانی تونسے ہوئے اونٹوں کی طرح پیو گے۔ یہ جزا کے دن ان کی پہلی ضیافت ہوگی! ۴۹-۵۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ہ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ (۱-۲)

قیامت شدنی ہے

'وَاقِعَةٌ' سے مراد قیامت ہے۔ اس لفظ سے تعبیر اس کے ایک امرِ شدنی ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کے دلائل، پوری تفصیل کے ساتھ، گروپ کی پچھلی سورتوں میں، بیان ہو چکے ہیں اور ان شبہات و سوالات کا بھی ایک ایک کر کے جواب دیا جا چکا ہے جو منکرین نے اس کے امکان اور اس کے وقوع کے باب میں اٹھائے ہیں۔ اب یہ فرمایا کہ اس وقت کو یاد رکھو جب کہ وہ واقع ہونے والی، تمہارے ان تمام لایعنی شبہات و اعتراضات کے علی الرغم، واقع ہو کے رہے گی اور تم کسی طرح بھی اس سے بھاگ نہ سکو گے۔

'لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ' یہاں 'كَاذِبَةٌ' میرے نزدیک 'عَاقِبَةٌ' اور 'عَافِيَةٌ' کی طرح مصدر ہے یعنی اس کے واقع ہونے میں ذرا کسی شک و شبہ اور جھوٹ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر تم اس وہم میں مبتلا ہو کہ تم کو جھوٹ موٹ ایک ہوّے سے ڈرایا جا رہا ہے تو اس میں جھوٹ کا ادنیٰ شائبہ بھی نہیں۔ یہ ایک امرِ واقعہ ہے جس سے تمہیں لازماً دوچار ہونا ہے تو عاقبت کی بہبود چاہتے ہو تو اس کے مواجہہ کے لیے تیاری کرو۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ (۳)

قیامت میں عزت کا معیار ایمان ہوگا

یعنی اس وہم میں نہ رہو کہ تم کو جو سربلندی آج حاصل ہے وہ ہمیشہ حاصل رہے گی اور جن کو حقیر و مبتذل گمان کر رہے ہو وہ اسی طرح حقیر و پست حال رہیں گے بلکہ جب وہ واقع ہونے والی واقع ہوگی تو یہ آسمان و زمین نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ نمودار ہوں گے۔ آج عزت و شرف کے جو معیارات ہیں وہ یک قلم تبدیل ہو جائیں گے۔ اس دن تمام عزت و سرفرازی ایمان و عمل صالح کو حاصل ہوگی۔ وہ لوگ سربلند و سرفراز ہوں گے جن کے پاس ایمان و عمل صالح کا سرمایہ ہوگا اور وہ پست و ذلیل ہوں گے جو اس دولت سے محروم اٹھیں گے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی ہے۔ آگے آیت ۷ سے اس خفض و رفع کی تفصیل آ رہی ہے۔ اس سے واضح ہو جائے گا کہ اس کے لیے کسوٹی کیا ہوگی۔

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا (۴-۶)

قیامت کے دن کی ہلچل

یہ اس قیامت کی تصویر ہے کہ اس دن زمین بالکل ہلا دی جائے گی اور یہ اونچے اونچے پہاڑ جن کو نادان لوگ غیر فانی اور غیر متزلزل گمان کیے بیٹھے ہیں، غبار کی طرح پراگندہ ہو جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دن اس زمین کی ساری ہی بلندیاں پست کر دی جائیں گی۔ ایک ایسا زلزلہ آئے گا جو پوری زمین کو جھنجھوڑ کر اس کے تمام ایوانوں اور محلوں کو زمین بوس کر دے گا یہاں تک کہ یہ فلک بوس پہاڑ بھی غبار بن کر فضا میں اڑنے لگیں گے۔ یہی مضمون سورۂ حاقّہ میں یوں بیان ہوا ہے: وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (الحاقۃ-۶۹: ۱۴-۱۵) (اور اس دن زمین اور پہاڑ دونوں اٹھا کر بیک دفعہ پاش پاش کر دیے جائیں گے، پس اس دن واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی)۔

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۭ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ڏ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۭ وَاَصْحٰبُ الْمَشْـَٔــمَةِ ڏ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْـَٔــمَةِ ۭ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ (۷-۱۰)

لوگوں کی تقسیم تین گروہوں میں

یہ اس خفض و رفع کی تفصیل ہے جس کا ذکر اوپر آیت ۳ میں ہوا ہے۔ فرمایا کہ اس دن تم تین گروہوں میں تقسیم کیے جاؤ گے۔ ایک گروہ اصحاب المیمنہ کا ہوگا، دوسرا گروہ اصحاب المشئمہ کا ہوگا اور تیسرا سابقون پر مشتمل ہوگا۔

'اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ' سے مراد، خود قرآن کی تصریح کے مطابق، وہ لوگ ہیں جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ چنانچہ سورۂ حاقّہ میں فرمایا ہے: فَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۚ اِنِّيْ ظَنَنْتُ اَنِّيْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ (الحاقۃ-۶۹: ۱۹-۲۰) (تو اس دن جس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں پکڑایا جائے گا وہ لوگوں سے خوش ہو کر کہے گا کہ یہ لو میرا اعمال نامہ پڑھو۔ میں دنیا میں برابر اندیشہ ناک رہا کہ بالآخر مجھے اپنے اعمال کے حساب سے دوچار ہونا ہے)۔

'اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ' سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو اعمال نامے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ سورۂ حاقہ میں ان کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے: وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۚ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۚ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۚ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۚ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ (الحاقۃ - ۶۹: ۲۵-۲۹) (رہا وہ جس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا کہ کاش! میرا اعمال نامہ مجھ کو ملتا ہی نہ! اور مجھ کو یہ خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے! اے کاش! پہلی موت ہی فیصلہ کن بن گئی ہوتی! میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا! میرا اقتدار ہوا ہو گیا!)

'سَابِقُوْنَ' سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے دعوتِ حق کے قبول کرنے میں سبقت کی اور اس دور میں اپنے جان و مال سے اس کی خدمت کی توفیق پائی جب اس کی خدمت کرنے والے تھوڑے تھے اور اس کی مدد کے لیے حوصلہ کرنا اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈالنا تھا۔ چنانچہ سورۂ حدید میں، جو اس کی مثنیٰ سورہ ہے، اس حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے: 'لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى' (الحدید - ۵۷: ۱۰) (تم میں سے جو لوگ فتح مکّہ سے پہلے اللہ کی راہ میں انفاق اور جہاد کریں گے اور دوسرے جو اس سعادت سے محروم رہیں گے، یکساں نہیں ہوں گے۔ پہلے انفاق و جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑا ہے ان لوگوں سے جنھوں نے بعد میں انفاق و جہاد کیا اگرچہ اللہ کا وعدہ دونوں سے اچھا ہی ہے)۔

'مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ' میں جو استفہام ہے یہ اظہارِ شان و عظمت کے لیے بھی آتا ہے اور اظہارِ نفرت و کراہت کے لیے بھی۔ یہاں یہ اظہارِ شان و عظمت کے لیے ہے یعنی دہنے والوں کی شان و عظمت، ان کے عیشِ جاوداں، ان کی رفاہیت و خوش حالی اور ان کی عالی مقامی کا کیا پوچھنا ہے! بھلا اس کی تفصیل کس طرح بتائی جا سکتی ہے اور اس کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے! یہ اسلوبِ کلام اس صورت میں اختیار کیا جاتا ہے جب صورتِ واقعہ الفاظ کے احاطہ اور قیاس و گمان کی رسائی سے مافوق ہو۔ قرآن میں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔

'مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ' میں وہی اسلوب اس کے برعکس یعنی اظہارِ نفرت و کراہت کے مفہوم میں ہے یعنی جس طرح 'اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ' کی خوش حالی و بلند اقبالی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا اسی طرح 'اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ' کی بدبختی، ان کی ذلت و مصیبت اور ان کی بدانجامی کا حال بھی کچھ نہ پوچھو! اس کی تصویر بھی الفاظ میں نہیں کھینچی جا سکتی۔ اس کا اندازہ انہی کو ہو گا جن کو اس سے سابقہ پیش آئے گا۔

'وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ' میں دوسرا 'سَابِقُوْنَ' خبر کے محل میں ہے اور اس ایجاز میں غایت درجہ بلاغت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ 'سَابِقُوْنَ' کی عالی مقامی کا کیا پوچھنا ہے، وہ تو سابقون ہی ہوئے!

جب وہ سابقون ہیں تو ان کے درجہ و مرتبہ کو کون پہنچ سکتا ہے! وہ لازماً وہاں تک پہنچیں گے جو انسانی شرف و مزیّت کا آخری نقطہ ہے اور اس نقطۂ کمال کا اندازہ بھلا اس عالمِ ناسوت میں کون کر سکتا ہے!

بعض غلط فہمیوں کا ازالہ

اس تفصیل سے ایک تو یہ حقیقت واضح ہوئی کہ ان لوگوں کا خیال غلط ہے جنھوں نے یہ گمان کیا ہے کہ یہ دربارِ الٰہی میں جگہیں پانے والوں کی ترتیب بیان ہوئی ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ کے دربار سے متعلق اوّل تو دہنے بائیں اور آگے پیچھے کا تصوّر ہی ایک بے معنی تصوّر ہے اور اگر اس تصوّر کی گنجائش تسلیم بھی کر لی جائے تو یہ امر اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ اس دربار میں اصحاب الشمال کے لیے کوئی جگہ بھی نہیں ہو گی نہ بائیں نہ پیچھے بلکہ ان کا ٹھکانا جہنم ہو گا جس کی وضاحت آگے اس سورہ میں بھی آ رہی ہے اور قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی آئی ہے۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ 'اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ' عام مسلمانوں کے مفہوم میں نہیں ہے، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے۔ بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے اعمال نامے بطورِ اعزاز داہنے ہاتھ میں دیے جائیں گے اور وہ اپنے شاندار کارناموں پر نہایت شاداں و فرحاں بھی ہوں گے۔ عام مسلمانوں میں تو بے شمار ایسے لوگ بھی ہیں جن کی نسبت یہ گمان کرنا بڑا ہی فیاضانہ حسنِ ظن ہو گا کہ ان کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے اور وہ جوشِ مسرت میں 'ھَآؤُمُ اقْرَءُوْا کِتٰبِیَہْ' کا نعرہ بھی لگانے کے لائق ہوں گے۔ رہا یہ سوال کہ 'اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ' اور 'سَابِقُوْنَ' میں کس نوعیت کا فرق ہے تو اس کی طرف اوپر بھی ہم اشارہ کر چکے ہیں اور آگے بھی اس کی وضاحت آ رہی ہے۔

اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۝ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ۝ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ (۱۱-۱۴)

'سابقون' کا صلہ

چونکہ گلِ سرسبد اور سرخیلِ قافلہ کی حیثیت انہی 'سَابِقُوْنَ' کو حاصل ہو گی اس وجہ سے انہی کا مرتبہ اور صلہ سب سے پہلے بیان فرمایا۔ ارشاد ہوا کہ انہی لوگوں کو مقرّبین کا درجہ حاصل ہو گا۔ 'مقرّبین' سے مراد ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقرّبین ہیں لیکن ان مقرّبین کا ٹھکانا 'جَنّٰتِ النَّعِیْمِ' ہی بتایا ہے، دربارِ الٰہی کے قسم کی کسی چیز کا کوئی تصوّر نہیں دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقرّبینِ الٰہی کے لیے خاص ان کے درجے و مرتبے کے لحاظ سے جنتیں ہوں گی جن میں وہ رکھے جائیں گے آگے ان کی جنت سے متعلق بعض اشارات آ رہے ہیں۔

'ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ'۔ اب یہ واضح فرمایا کہ اس مبارک گروہ میں شامل ہونے کی سعادت کن لوگوں کو حاصل ہو گی۔ فرمایا کہ ان میں زیادہ تعداد تو اگلوں کی ہو گی اور ایک قلیل تعداد پچھلوں کی بھی ہو گی۔ 'ثُلَّۃٌ' کے اصل معنی تو گروہ اور جماعت کے ہیں لیکن اس کے مقابل میں چونکہ لفظ 'قَلِیْلٌ' استعمال ہوا ہے اس وجہ سے یہاں قرینہ دلیل ہے کہ اس کو گروہِ کثیر کے مفہوم

میں لیا جائے۔

'اوّلین' اور 'آخرین' سے مراد

'اوّلین اور آخرین' سے مراد ہمارے نزدیک اسی امّت کے اوّلین و آخرین ہیں۔ اوپر ہم نے سورۂ حدید کا حوالہ دیا ہے جس سے واضح ہوا کہ ان لوگوں کے انفاق اور جہاد کا درجہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اونچا ہے جنھوں نے فتح مکّہ سے پہلے جہاد و انفاق کی سعادت حاصل کی۔ بعد والوں کے جہاد و انفاق کا درجہ وہ نہیں ہوگا تاہم اللہ تعالیٰ کا وعدہ دونوں ہی سے اچھا ہے۔ یعنی بعد والے اگرچہ من حیث العموم اگلوں کے مرتبہ کو تو نہ پہنچ سکیں گے تاہم اپنے اخلاص و حسنِ عمل سے ان کے لیے اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ میں جگہ حاصل کرنے کی راہ کھلی ہوگی۔

'ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ' کے الفاظ سے یہ بات بھی نکلی کہ اگلوں میں سے لازماً سب ہی مقرّبین کا درجہ حاصل نہیں کر لیں گے بلکہ ان کی اکثریت کو یہ مقام حاصل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس درجے کا تعلّق مجرّد زمانے ہی سے نہیں ہے بلکہ اس میں اصلی دخل اوصاف و اعمال کو ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اسلام قبول کرنے کے اعتبار سے تو اوّلین میں ہو لیکن اپنی عزیمت، رسوخ اور قربانیوں کے اعتبار سے مقرّبین کا درجہ نہ حاصل کر سکا بلکہ 'اَصْحٰبُ الْیَمِیْن' ہی کے درجے تک رہ گیا۔

ایک خاص نکتہ

اسی طرح 'قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ' کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس امت کے پچھلوں میں سے بھی ایسے لوگ نکلیں گے جو سابقون الاوّلون کے زمرے میں شامل ہونے کا شرف حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو فتنوں کے زمانے میں بھی حق پر قائم رہیں گے، حق ہی کی دعوت دیں گے، اور حالات خواہ کتنے ہی صبر آزما ہو جائیں اور ان کی تعداد خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو لیکن وہ ہمت نہیں ہاریں گے۔ اس قسم کا ایک گروہ اس امت میں، جیسا کہ احادیث میں بشارت ہے، ہر دور میں پیدا ہوتا رہے گا۔ یہ لوگ زمانے کے اعتبار سے تو آخرین میں ہوں گے لیکن اپنی خدمات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ہاں اوّلین کے زمرے میں جگہ پائیں گے۔ اسی حقیقت کی طرف سیدنا مسیح علیہ السلام نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے کہ "کتنے پیچھے آنے والے ہیں جو آگے ہو جائیں گے"۔

یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنے کی ہے کہ ہر چند ان آیات کا تعلق اسی امت سے ہے لیکن اصولی طور پر یہ بات ہر نبی و رسول کی امّت پر منطبق ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں دوسری جگہ یہی بات ایک عام کلیہ کی حیثیت سے ارشاد ہوئی ہے۔ فرمایا ہے: ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ج فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ج وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ج وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ (فاطر ۳۵: ۳۲) (پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو اپنے بندوں میں سے اس کارِ خاص کے لیے منتخب کیا تو ان میں سے کچھ تو اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے نکلے، کچھ میانہ رَو ہوئے اور کچھ اللہ کی توفیق سے بھلائیوں کی راہ میں سبقت کرنے والے ہوئے)۔

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ الفاظ بدلے ہوئے ہیں لیکن اس میں بھی انہی تین گروہوں کا ذکر ہے جن کا ذکر اوپر اصحب المیمنۃ، اصحب المشئمۃ اور سابقون کے الفاظ سے ہوا ہے۔

عَلٰی سُرُرٍ مَّوۡضُوۡنَۃٍ ۙ مُّتَّکِـِٕیۡنَ عَلَیۡہَا مُتَقٰبِلِیۡنَ ۝ یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۙ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ۙ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ۙ وَ فَاکِہَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ۙ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ ۝ وَ حُوۡرٌ عِیۡنٌ ۙ کَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُـؤِ الۡمَکۡنُوۡنِ (۱۵-۲۳)

یہاں مقربین کی جنت کی تمثیل ہے۔ پہلے ان کی نشست گاہ اور ان کے اندازِ نشست کی تصویر کھینچی ہے کہ وہ جڑاؤ اور زرنگار تختوں پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ 'مَوۡضُوۡنَۃ' کے معنی بعض لوگوں نے دوسرے بھی لیے ہیں لیکن میرے نزدیک اس کا صحیح مفہوم وہی ہے جو ہم اپنی زبان میں لفظ 'جڑاؤ' سے ادا کرتے ہیں۔ قدیم زمانے کے شاہانِ عجم اپنے درباروں میں اسی طرح کے زرنگار، سونے، ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تختوں پر جلوہ افروز ہوا کرتے تھے۔ (حاشیہ: مقربین کی جنت کی تمثیل)

'مُتَّکِـِٕیۡنَ' کے لفظ کے اندر گاؤ تکیوں کا مفہوم خود مضمر ہے اس لیے کہ ٹیک لگانے کے لیے مسندیں اور گاؤ تکیے ضروری ہیں اور زمانۂ قدیم میں تختِ شاہی کے لوازم میں یہ شامل بھی رہے ہیں۔
'آمنے سامنے' بیٹھنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے دل باہمی رنج و رقابت اور کینہ و حسد سے بالکل پاک ہوں گے۔ جن کے دلوں کے اندر کدورت ہوتی ہے وہ ایک دوسرے سے منہ پھیر کے بیٹھتے ہیں لیکن اہلِ جنت کے دل کینہ و حسد سے، جیسا کہ قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، بالکل پاک ہوں گے اس وجہ سے وہ مخلص اور محبت کرنے والے عزیزوں اور ساتھیوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف رخ کر کے بیٹھیں گے۔

'یَطُوۡفُ عَلَیۡہِمۡ وِلۡدَانٌ مُّخَلَّدُوۡنَ ۙ بِاَکۡوَابٍ وَّ اَبَارِیۡقَ ۬ۙ وَ کَاۡسٍ مِّنۡ مَّعِیۡنٍ ۙ لَّا یُصَدَّعُوۡنَ عَنۡہَا وَ لَا یُنۡزِفُوۡنَ ۙ وَ فَاکِہَۃٍ مِّمَّا یَتَخَیَّرُوۡنَ ۙ وَ لَحۡمِ طَیۡرٍ مِّمَّا یَشۡتَہُوۡنَ'۔ یہ اس سامانِ ضیافت کی طرف اشارہ ہے جو ان کے لیے وہاں مہیا ہوگا۔ فرمایا کہ ان کی خدمت میں غلمان پیالے، جگ اور شرابِ خالص کے جام لیے ہوئے ہر وقت حاضر باش ہوں گے۔

'مُخَلَّدُوۡنَ' کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی سن و سال کے رہیں گے۔ ان کی حیثیت دائمی خدام کی ہوگی۔ مجلسی خدمات کے لیے ایک خاص سن کے لڑکے ہی زیادہ موزوں، خوش آداب اور مستعد و سرگرم

خیال کیے جاتے ہیں اس وجہ سے ان کو اللہ تعالیٰ ہمیشہ ایک ہی سن کا رکھے گا اور چونکہ مزاج شناس خادم ہی اپنے آقا کی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر خدمت کر سکتا ہے اس وجہ سے جو لڑکے جن کے ساتھ لگا دیے جائیں گے وہ برابر انہی کی خدمت میں رہیں گے۔ قرآن کے الفاظ سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لڑکوں کو اللہ تعالیٰ خاص اسی مقصد کے لیے بنائے گا۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ کفّار کے بچے، جو نابالغی میں وفات پا جائیں گے، ان کو اللہ تعالیٰ اہلِ جنت کی خدمت میں لگا دے گا۔ اس رائے کے حق میں اگرچہ قرآن میں کوئی اشارہ نہیں ہے لیکن کوئی ایسی چیز بھی نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔ اس لیے کہ کفّار کے بچوں کے دوزخ میں جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ اس خدمت ہی میں لگائے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی جنت بہت وسیع اور وہ بڑا کریم ہے۔ وہ ان کو ان کی بے گناہی کے صلہ میں بھی جنت دے سکتا ہے۔

'اَكْوَابٌ'، 'كُوْبٌ' کی جمع ہے اور 'کوب' اور 'کپ' (cup) ایک ہی چیز ہے۔ 'اَبَارِيْقُ' جمع ہے 'اِبْرِيْقٌ' کی۔ 'ابریق' فارسی کے آب ریز سے معرب معلوم ہوتا ہے اور یہ چیز اپنی جگہ پر ثابت ہے کہ عربوں نے بہت سے تمدنی الفاظ عجمیوں سے لیے ہیں۔ لفظ 'كَاْسٌ' ظرف اور مظروف یعنی شراب اور جامِ شراب دونوں کے لیے آتا ہے۔ 'مَعِيْنٌ' خالص پانی اور خالص پانی کے چشمہ کے لیے بھی قرآن میں آیا ہے اور شراب خالص کے ایک چشمہ کے لیے بھی جو جنت میں ہے۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔

'لَا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ' یہ شراب ایسی ہوگی کہ اس سے شراب کا جو اصل فائدہ ہے یعنی سرور، وہ تو حاصل ہوگا لیکن اس دنیا کی شراب کے تمام مضر اثرات سے وہ بالکل پاک ہوگی۔ یہاں کی شراب سے اعضاء شکنی، خمار اور دردِ سر بھی لاحق ہوتا ہے، جنت کی شراب میں یہ مفاسد نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اس دنیا کی شراب کا سب سے بڑا مفسدہ یہ ہے کہ اس سے عقل جاتی رہتی ہے درآنحالیکہ عقل ہی انسان کا اصل جوہر ہے اور ایک منٹ کے لیے بھی اس کا فتور نہ جانے کن کن ہلاکتوں میں اس کو ڈال سکتا ہے۔ جنت کی شراب اس زہر سے محفوظ ہوگی۔ 'نُزِفَ الرجل' کے معنی ہیں ذهب عقله' آدمی کی عقل جاتی رہی۔

'وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ ۙ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ'۔ شراب کے ساتھ ساتھ یہ دوسرے لوازم کا ذکر ہے کہ غلمان ان کے سامنے ان کے انتخاب کے پھل اور ان کی پسند کے پرندوں کے گوشت بھی لیے پھریں گے۔ کھانے کی چیزوں میں سرفہرست یہی دو چیزیں ہیں۔ ان کا ذکر آ گیا تو گویا سب ہی کا آ گیا۔ ان کے ساتھ 'مِمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ' اور 'مِمَّا يَشْتَهُوْنَ' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ ہر شخص کے ذوق اور انتخاب کا پورا پورا لحاظ ہوگا۔ پھل ان کے سامنے

وہ پیش کیے جائیں گے جن کا وہ انتخاب کریں گے اور گوشت ان پرندوں کے ان کے سامنے حاضر کیے جائیں گے جن کی وہ خواہش کریں گے۔

وَحُوْرٌ عِيْنٌ ۙ كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ کھانے اور پینے کی ساری لذتیں انسان کے لیے ادھوری ہیں اگر ان میں بیوی شریک نہ ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے سرمایۂ راحت و سکینت بنایا ہے۔ جس طرح اس دنیا میں آدمی اس شریک رنج و راحت کا محتاج ہے، جس کے بغیر اس کی بزم سُونی رہتی ہے' اسی طرح جنت میں بھی اس کی لذت ادھوری رہ جاتی اگر یہ اس میں شریک نہ ہوتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ وہاں اس کو غزال چشم اور دُرِّ مکنون کی طرح اچھوتی اور پاک حوریں دے گا۔ ان دو صفتوں کے اندر ان حوروں کے حسنِ ظاہر اور حسنِ باطن کے سارے پہلو جمع ہو گئے۔

جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲۴)

یہ وہ اصل سرفرازی ہے جو ان جانبازوں کو حاصل ہوگی۔ فرمایا کہ یہ جو کچھ ان کو ملے گا ان کے اعمال کے بدلے میں ملے گا۔ اس کے وہ حقدار ہوں گے اور ربِّ کریم لازماً ان کا یہ حق ادا کرے گا۔ انسان کی فطرت کے اس پہلو پر یہاں نظر ہے کہ اس کی نگاہوں میں جو قدر و قیمت اس چیز کی ہوتی ہے جو اس نے اپنے حق کے طور پر حاصل کی ہو وہ قدر و قیمت اس چیز کی نہیں ہوتی جو اس کو اتفاقاً حاصل ہو گئی ہو یا بطور صدقہ ملی ہو، خواہ یہ پہلی کے مقابل میں کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۙ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۲۵-۲۶)

یہ ان کے بے غل و غش عیش کی طرف اشارہ ہے کہ دشمنوں، معترضوں اور نکتہ چینوں کی جتنی ژاژ خائیاں اور بکواسیں سننی ہیں وہ دنیا میں سن چکے ہوں گے اور جتنے چرکے سہنے ہیں وہ سہ چکیں گے۔ وہاں نہ کسی بکواس کرنے والے کی بکواس ہوگی اور نہ کوئی گناہ کی بات ان کے کانوں میں پڑے گی۔ وہاں ان کے لیے رحمت ہی رحمت اور سلام ہی سلام ہے۔ ربِّ رحیم و غفور کی طرف سے بھی سلام، فرشتوں کی طرف سے بھی سلام اور ساتھیوں کی طرف سے بھی سلام!! صبح بھی سلام اور شام بھی سلام!!

وَاَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ (۲۷)

اصحٰب الیمین کی جنت

یہ اصحاب الیمین کی جنت کا بیان آ رہا ہے۔ اوپر ان کا ذکر 'اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ جس سے یہ بات متعین ہو گئی کہ قرآن میں 'اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ' اور 'اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ' کا مفہوم ایک ہی ہے یعنی وہ لوگ جن کے اعمال نامے ان کے دہنے ہاتھ میں دیے جائیں گے۔

'مَآ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ' کا مفہوم بھی وہی ہے جو اوپر 'مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ' کا بیان ہوا۔ یعنی کیا کہنے ہیں ان کے مرتبہ کے! کیا پوچھنا ہے ان کی عظمت و شان کا! کیا بیان ہو ان کے عیش و آرام کا!

فِيْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ ۙ وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ ۙ وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۙ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ ۙ

وَّفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوعَةٍ وَّلَا مَمْنُوعَةٍ (٢٨ - ٣٣)

یہ ان کی جنت کے پھلوں، اس کے سایہ اور اس کی طراوت کا ذکر ہے۔

'فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ'۔ 'سِدْرٌ' بیری کو کہتے ہیں۔ ہمارے علاقوں میں بیری کی کچھ زیادہ وقعت نہیں ہے اس وجہ سے ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں سوال پیدا ہو کہ یہ کیا ایسا پھل ہے جس کا قرآن نے ذکر فرمایا۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اوّل تو ہر علاقے کی بیری یکساں نہیں ہوتی بعض علاقوں میں اس کے پھل نہایت لذیذ، خوشبودار اور خوش رنگ ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ جنت کی بیری ہے، جس کا ذکر اس دنیا میں صرف تمثیل ہی کے پیرایہ میں ہو سکتا ہے۔ اس کی اصل حقیقت جاننے کا یہاں کوئی ذریعہ نہیں ہے، صرف وہی لوگ اس حقیقت سے آشنا ہوں گے جن کو اصحاب الیمین میں شمولیت کا شرف حاصل ہوگا۔ ویسے قرآن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس درخت کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ سورۂ نجم میں فرمایا ہے: 'وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۙ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى' (النجم - ٥٣: ١٣ - ١٦) (اور پیغمبر نے جبریل کو دوبارہ بھی اترتے دیکھا آخری سرے کی بیری کے پاس، اسی کے پاس جنت ماویٰ بھی ہے، جب کہ بیری کو چھائے ہوئے تھی جو چیز چھائے ہوئے تھی!) سورۂ نجم کی ان آیات کے تحت، اشاراتِ قرآن کی رہنمائی میں، ہم نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ اس بیری کا ذکر ہے جو عالمِ ناسوت اور عالمِ لاہوت کے نقطۂ اتصال پر ہے، اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے جہاں سے عالمِ لاہوت کی حدود شروع ہوتے ہیں۔ اس بیری پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان انوار و تجلیات کا مشاہدہ فرمایا جس کا ذکر 'اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى' (النجم - ٥٣: ١٦-١٧) کے شاندار الفاظ میں ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ابتدائی مشاہداتِ نبوّت، جو تورات اور قرآن میں بیان ہوئے ہیں، میں بھی ذکر آتا ہے کہ انھوں نے ایک درخت سے اللہ تعالیٰ کی آواز سنی اور اس پر انوار و تجلّیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کیا۔ اگرچہ قرآن میں کوئی اشارہ اس طرح کا نہیں ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ درخت کس چیز کا تھا لیکن دونوں واقعات میں یکسانی واضح ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ درخت بھی بیری ہی کا ہو۔

'سِدْرٍ' کے ساتھ 'مَّخْضُوْدٍ' کی صفت اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ یہ بیری دنیا کی بیریوں کی طرح آزار پہنچانے والی نہیں ہوگی کہ کوئی ایک بیر لینے کی کوشش کرے تو اپنے ہاتھوں کو اس کے کانٹوں سے زخمی بھی کرائے، بے خار اور بالکل بے آزار ہوں گی۔ اہل جنت جب چاہیں اور جہاں سے چاہیں گے ان کے پھل توڑ لیں گے۔ لفظ 'خضد' کسی کانٹوں والی چیز کے کانٹوں کو کاٹ دینے کے لیے آتا ہے۔ یہاں مقصود یہ بتانا ہے کہ ان کے پھلوں کی طرح ان کے درخت بھی

دنیا کی بیریوں سے مختلف مزاج کے ہوں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس دنیا میں بھی بیریوں کی جو قسمیں جتنی ہی اچھی ہوتی ہیں اتنے ہی ان میں کانٹے کم ہوتے ہیں۔ کانٹے زیادہ جھڑ بیریوں میں ہوتے ہیں۔ قرآن میں اہلِ سبا کے جس جنت نشان باغ کی تباہی کا ذکر ہے اس میں بیریوں کی تباہی کا بھی ذکر ہے کہ وہ جھاڑ بن کے رہ گئیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھل ان کے پسندیدہ پھلوں میں تھا اور اس کے درخت ان کے باغوں کی زینت بنتے تھے۔ اپنے خاندان کے اعتبار سے بھی بیر سیب کے خانوادہ سے نسبت رکھنے والا پھل ہے۔

'وَطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ'۔ 'طلح' کیلے کو کہتے ہیں۔ 'منضود' اس کے پھلوں کی تصویر ہے کہ وہ تہ بہ تہ ایک دوسرے سے پیوستہ ہوں گے۔ ان کی ترتیب اور ان کے چناؤ کا حسن گواہی دے گا کہ خالق نے خاص اہتمام سے اپنے بندوں کی ضیافت کے لیے ان کو چنا ہے۔

'وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ ۙ وَّمَآءٍ مَّسْكُوْبٍ'۔ یہ اس باغ کی شادابی اور اس کی طراوت کا بیان ہے کہ اس کے درخت اپنے زور اور شادابی کے سبب سے اس طرح ایک دوسرے کے متصل ہوں گے کہ ان کے اندر دھوپ کا گزر نہیں ہونے پائے گا اس وجہ سے ہر طرف سایہ ہی سایہ ہو گا اور اس میں دواماً پانی بھی بہایا جاتا رہے گا تاکہ اس کی رونق میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔

'وَفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ ۙ لَّا مَقْطُوْعَةٍ وَّلَا مَمْنُوْعَةٍ'۔ یعنی اوپر جن پھلوں کا ذکر ہوا ہے محض مثال کے طور پر ہوا ہے۔ دوسرے بہت سے پھل بھی ہوں گے اور ان کا حال بھی اس دنیا کے پھلوں سے بالکل مختلف ہو گا۔ اس دنیا کا حال تو یہ ہے کہ ایک خاص وقت پر درخت کے پھل توڑ لیے جاتے ہیں یا از خود ختم ہو جاتے ہیں لیکن وہاں کے درخت سدا بہار ہوں گے، ان کے پھل کبھی منقطع نہیں ہوں گے۔ اسی طرح اس دنیا کے باغوں کو یہ اُفتاد بھی پیش آتی ہے کہ ایک سال پھل آئے، دوسرے سال نہیں آئے یا بہت کم آئے۔ وہاں کے درختوں کو یہ آفت بھی کبھی پیش نہیں آئے گی۔ اللہ تعالیٰ ان کو بارآوری سے کبھی محروم نہیں فرمائے گا۔

وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ ۭ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً ۙ فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۙ عُرُبًا اَتْرَابًا (۳۴-۳۷)

یہ ان کی نشست گاہوں اور ان کی بیویوں کا ذکر ہے۔ اوپر سابقین مقربین کے ذکر میں، یاد ہو گا، ترتیبِ بیان اس سے مختلف ہے۔ اس فرق کے بعض نفسیاتی وجوہ ہیں لیکن اس طرح کی تفصیلات میں یہاں جانے کا موقع نہیں ہے۔

فرمایا کہ ان کے بیٹھنے کے لیے اونچے بچھونے ہوں گے اور ان کے لیے بیویاں ہوں گی جن کو ہم نے ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہو گا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بیویوں کے لیے ضمیر بغیر کسی

مرجع کے آگئی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ضمیر کے لیے لفظوں میں کوئی مرجع نہیں ہے لیکن قرینہ نہایت واضح موجود ہے۔ عربی میں مثل ہے کہ الشئ بالشئ یذکر' بات سے بات یاد آتی ہے۔ یہاں بچھونوں کے ذکر کے بعد بیویوں کا ذکر اسی نوع کی چیز ہے۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں تختوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ بیویوں کا ذکر آیا ہے۔ اسی تعلق کی بنا پر یہاں ان کا ذکر محض ضمیر سے کر دیا جس میں ایجاز کی بلاغت بھی ہے اور خواتین کے ذکر میں پردہ داری کے لحاظ کی تعلیم بھی۔ یہ بات کہ تختوں اور بچھونوں کے ساتھ قرآن میں بیویوں کا ذکر آیا ہے محتاجِ حوالہ نہیں ہے۔ لیکن محض اطمینانِ خاطر کے لیے ہم بعض شواہد نقل کیے دیتے ہیں۔ سورۂ طور میں ہے:

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ	وہ ٹیک لگائے ہوں گے صف بہ صف بچھے ہوئے
وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝	تختوں پر اور ہم ان کی شادیاں کر دیں گے غزال چشم
(الطور - ۵۲ : ۲۰)	حوروں کے ساتھ۔

اسی طرح سورۂ یٰسٓ میں ہے:

هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِیْ ظِلٰلٍ عَلَى	وہ اور ان کی بیویاں سایوں میں تختوں پر ٹیک لگائے
الْاَرَآىِٕكِ مُتَّكِـُٔوْنَ (یٰسٓ - ۳۶ : ۵۶)	بیٹھے ہوں گے۔

'اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً'۔ ان حوروں کی تعریف میں فرمایا کہ ہم نے ان کو ایک خاص اٹھان پر اٹھایا ہے اس وجہ سے ان کی خصوصیات و صفات اس دنیا کی عورتوں کی خصوصیات و صفات سے بالکل مختلف ہوں گی۔ اس دنیا کی عورت کا کنوارپن اور اس کی جوانی و دل رُبائی ہر چیز وقتی اور فانی ہے۔ ع

اگر ماند شبے ماند شبِ دیگر نمی ماند

لیکن حورانِ جنّت کو اللہ تعالیٰ نے اس سے بالکل مختلف ساخت پر نشو و نما بخشی ہے اس وجہ سے ان کے کنوارپن اور حسن و جوانی پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔

'فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ۝ عُرُبًا اَتْرَابًا'۔ 'ف' یہاں اس خاص اٹھان کی وضاحت کے لیے ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کنواریاں رہیں گی۔ ان کے مرد جب کبھی ان سے ملاقات کریں گے ان کی ملاقات اس اعتبار سے گویا پہلی ملاقات ہوگی۔

'عُرُب'، جمع ہے 'عروب' کی۔ اس کے معنی ہیں محبوب اور دل رُبا بیوی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کے حُسن، جوانی اور کنوارپن کسی چیز میں بھی فرق نہیں آئے گا تو شوہروں کی نظر سے ان کے گرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہوگی بلکہ وہ گلِ تر کی طرح ہمیشہ مطلوب و محبوب بنی رہیں گی۔

'اتراب'، جمع ہے 'تِرب' کی۔ یہ لفظ ہم سن و ہم عمر کے معنی میں آتا ہے لیکن عربیت کا ذوق

رکھنے والے جانتے ہیں کہ اس کا غالب استعمال عورتوں کے لیے ہے اس وجہ سے میرے نزدیک یہاں یہ ہم جولیوں کے معنی میں ہے۔ سورۂ نبا میں کَوَاعِبَ اَتْرَابًا (کنواری ہم جولیاں) کی ترکیب استعمال ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ جنت کو جتنی حوریں بھی ملیں گی سب ہم جولیاں اور ہم سن ہوں گی اس وجہ سے نہ ایک کو دوسری پر ترجیح دینے کا سوال پیدا ہوگا اور نہ ان حوروں کے اندر رشک و رقابت کے جذبات ابھریں گے۔ جس طرح وہ ہمیشہ جوان اور کنواریاں رہیں گی اسی طرح ان کے شوہر بھی جوان رعنا رہیں گے۔

لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۳۸)

اس کو اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً' سے متعلق بھی مان سکتے ہیں اور مبتدائے محذوف کی خبر بھی قرار دے سکتے ہیں۔ اگر پہلی صورت مانیں تو معنی یہ ہوں گے کہ اس خاص اٹھان اور ان خاص اوصاف کی حوریں ہم نے اصحاب الیمین کے لیے تیار کر رکھی ہیں۔ دوسری صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ یہ ساری نعمتیں جو اوپر بیان ہوئیں، ہمارے ہاں اصحاب الیمین کے لیے ہیں۔ میرا رجحان پہلی صورت کی طرف ہے۔ لیکن دونوں صورتوں میں سے جو بھی اختیار کی جائے باعتبار مدعا کوئی خاص فرق نہیں ہوگا، صرف بلاغتِ بیان کے اعتبار سے نازک سا فرق واقع ہوگا جس کا اندازہ اہلِ ذوق خود کر سکتے ہیں اس وجہ سے وجوہِ ترجیح کی بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (۳۹-۴۰)

اوپر 'سابقون' کے ذکر میں بتایا ہے کہ اس گروہ میں بڑی تعداد اگلوں ہی میں سے ہوگی، پچھلوں میں سے اس میں شامل ہونے کی سعادت کم ہی خوش بختوں کو حاصل ہوگی۔ یہاں بتایا کہ 'اصحٰب الیمین' میں اگلوں اور پچھلوں دونوں میں سے ایک ایک گروہ ہوگا۔ اوپر یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ اگلوں اور پچھلوں سے اسی امت کے اگلے اور پچھلے مراد ہیں جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قیام قیامت تک جتنے مسلمان اس دنیا میں آئیں گے ان میں سے ایسے لوگ برابر نکلتے رہیں گے جن کا شمار 'اصحٰب الیمین' کے طبقہ میں ہوگا اور قیامت کے دن وہ ایک ہی گروہ کی حیثیت حاصل کر لیں گے۔

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ۙ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ۙ لَّا بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ (۴۱-۴۴)

'اصحٰب الشمال' کا حشر — یہ 'اصحٰب الشمال' یعنی ان لوگوں کا حشر بیان ہو رہا ہے جن کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ فرمایا کہ وہ لوؤں اور شعلوں کی لپیٹ اور گرم پانی کے بیچ میں ہوں گے۔ جب گرمی کی ایذا سے گھبرا کر وہ پانی کی طرف بھاگیں گے تو انھیں کھولتا پانی پینے کو ملے گا۔ اسی بھاگ دوڑ میں ان کی زندگی گزرے گی۔ یہی مضمون يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ

اٰنٍ' (الرحمٰن - ۵۵ : ۴۴) کے الفاظ سے بھی بیان ہوا ہے۔

'وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ' یعنی ان کو کوئی سایہ نصیب نہیں ہو گا۔ صرف سیاہ دھوئیں کا سایہ وہاں ان کے لیے ہو گا۔ اور یہ ان تمام خوبیوں سے محروم ہو گا جو سایہ میں ہوتی ہیں۔ سایہ میں اصل چیز ٹھنڈک ہوتی ہے لیکن اس دھوئیں کے سایہ میں اذیتیں تو وہ ساری ہوں گی جو دھوئیں کے اندر ہوتی ہیں لیکن کوئی ٹھنڈک نہیں ہو گی۔ اسی طرح بعض دوسرے فوائد کا امکان بھی اس میں ہو سکتا ہے مثلاً شعلوں ہی کی لپٹ سے ذرا اس کے سایہ میں امان نصیب ہو جائے لیکن یہ چیز بھی اس سے حاصل نہیں ہو گی۔ 'کریم' کے معنی فیض بخش کے ہیں یعنی اس سایہ میں نہ ٹھنڈک ہو گی نہ کوئی اور فائدہ۔ سورۂ مرسلات میں یہی مضمون اس طرح بیان ہوا ہے: 'لَا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ' (المرسلٰت - ۷۷: ۳۱) (نہ سایہ دار اور نہ شعلوں سے بچانے والا)۔

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۝ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ ۝ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۝ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ (۴۵ - ۴۸)

یہ ان کے ان بڑے جرائم کی طرف اشارہ ہے جن کے سبب سے وہ اس انجام بد کو پہنچے۔ اسلوب بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ دن لوگوں کے سامنے حاضر کر دیا گیا ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ بدقسمت لوگ اس انجام کو پہنچے تو کیوں پہنچے!

'اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ'۔ فرمایا کہ یہ لوگ اس سے پہلے یعنی دنیا میں بڑے مالدار اور عیش و رفاہیت والے رہے ہیں۔ یہ بات ان کے جرم کی حیثیت سے نہیں بیان ہوتی ہے بلکہ اس سے ان کے ان جرائم کی سنگینی واضح ہو رہی ہے جو آگے بیان ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو ان کو عیش و آرام اور دولت و ثروت سے نوازا جس کا حق یہ تھا کہ وہ اس کے شکر گزار و فرمانبردار بندے بنتے لیکن یہ اس سے استکبار میں مبتلا ہوئے اور سب سے بڑے گناہ پر برابر اصرار کرتے رہے۔

دوسرا مقصد اس سے اس پستی و بلندی کو نمایاں کرنا ہے جس کا ذکر قیامت کی صفت کی حیثیت سے ابتدائے سورہ میں 'خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ یعنی دیکھ لو، دنیا میں جو لوگ سب سے اونچے اور سربلند رہے وہ یہاں آ کر عذاب الٰہی کے کس کھڈ میں گرے!

'وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ'۔ 'حِنْث' کے معنی گناہ کے ہیں۔ اس کی صفت یہاں عظیم آئی ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس سے مراد شرک ہے۔ شرک، فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے بھی سب سے بڑا گناہ ہے اور قرآن نے بھی اس کو ظلم عظیم سے تعبیر کیا ہے۔

وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ لا اَىِٕذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ لا اَوَ اٰبَاۗؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۔ یہ ان کے دوسرے بڑے جرم کا ذکر ہے کہ وہ آخرت اور جزا و سزا کے اس بنا پر منکر تھے کہ ان کے نزدیک مر کر سڑ گل جانے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا ایک بالکل ناممکن بات تھی چنانچہ جب ان کو آخرت کے حساب کتاب سے آگاہ کیا جاتا تو وہ اس کا مذاق اڑاتے کہ کیا جب ہم مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو از سرِ نو زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے اور ہمارے اگلے آباؤ اجداد بھی، جو مدتوں پہلے خاک میں مل چکے ہیں، از سرِ نو زندہ کیے جائیں گے! یعنی یہ بات انہونی ہے اور جو لوگ اس سے ڈرا رہے ہیں وہ محض ہم کو بے وقوف بنا رہے ہیں اور وہ خود بھی عقل سے بالکل عاری ہیں۔

قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لا لَمَجْمُوْعُوْنَ لا اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (۴۹-۵۰)

قریش کو تنبیہ

اَصْحٰبُ الشِّمَالِ کے جرائم بیان کرتے ہوئے یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے قریش کو جواب دلوایا کہ یہی استبعاد آج تم میری تذکیرِ آخرت کے جواب میں پیش کرتے ہو تو اچھی طرح کان کھول کر سن لو کہ جتنے بھی اگلے اور پچھلے ہیں سب ایک معین دن کی مقررہ میقات تک جمع کیے جاتے رہیں گے اور جب وہ میقات آجائے گی تو وہ جزا و سزا کے لیے اٹھائے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مر جاتے ہیں یہ نہ سمجھو کہ جس طرح تمہارے اندر سے وہ ختم ہو گئے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ہاں سے بھی وہ ختم ہو گئے۔ وہ سب اللہ تعالیٰ کے ذخیرہ میں جمع کیے جا رہے ہیں اور جب جزا و سزا کا یوم موعود آجائے گا تو وہ سب اٹھائے جائیں گے ـــــ خواہ وہ اگلے ہوں یا پچھلے ـــــ 'لَمَجْمُوْعُوْنَ' کے بعد 'اِلٰی' اسی طرح استعمال ہوا ہے جس طرح دوسری جگہ فرمایا ہے: كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانعام - ۶: ۱۲) (اللہ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، وہ تم کو روزِ قیامت تک لازماً جمع کرتا رہے گا)۔

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّاۗلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ لا لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ لا فَمَالِــُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ج فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ ج فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ (۵۱-۵۵)

یہ قریش کو براہِ راست خطاب کر کے ارشاد ہوا کہ اے گمراہو اور جھٹلانے والو، جانتے ہو کہ اٹھائے جانے کے بعد کیا ہو گا؟ اس کے بعد تم زقوم کے خاردار اور کڑوے پتوں اور پھلوں سے اپنے پیٹ بھرو گے، پھر اس پر کھولتا ہوا پانی اس طرح پیو گے جس طرح تونسے ہوئے اونٹ پیتے ہیں۔

'ضَاۗلُّوْنَ' اور 'مُكَذِّبُوْنَ' کی دو صفتوں سے خطاب ان کے ان دو جرموں کے اعتبار سے ہے جو مذکور ہوئے۔ اوپر ان کے شرک اور تکذیبِ آخرت کا ذکر ہوا ہے، انہی کے لحاظ سے یہاں

خطاب 'ضَآلُّوْنَ' اور 'مُكَذِّبُوْنَ' کے الفاظ سے ہوا۔ یعنی اللہ کی توحید کے باب میں کج راہ اور آخرت کے جھٹلانے والے۔

اوپر ان کے 'مُتْرَفِيْنَ' یعنی امراء و اغنیاء اور اربابِ تنعم میں سے ہونے کا بھی ذکر ہوا ہے۔ اس مناسبت سے آخرت میں ان کی غذا تھوہر ہوگی۔ وہ اس کے تنوں اور کانٹوں کو چابیں اور اس پر کھولتا پانی پئیں گے۔

'ھِیْم' جمع ہے 'اَھْیَمُ' کی۔ 'اھیم' اس اونٹ کو کہتے ہیں جس کو 'ھیام' یعنی تونس کی بیماری لاحق ہو۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ پانی پیتا چلا جاتا ہے لیکن اس کی پیاس کسی طرح نہیں بجھتی۔

هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ (۵۶)

'نُزُل' جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کرتے آ رہے ہیں، اس سامانِ ضیافت کو کہتے ہیں جو مہمان کے مرکب سے اترنے کے بعد، سب سے پہلے اس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کی اولین ضیافت تھوہر اور گرم پانی سے ہوگی کون اندازہ کر سکتا ہے کہ بعد میں ان کے سامنے کیا کچھ آئے گا!

۲- آگے آیات ۵۷-۷۴ کا مضمون

آگے بعث اور جزاء کے دلائل آ رہے ہیں جن کے انکار کا ذکر اوپر گزر چکا ہے۔ اسلوبِ بیان زجر و ملامت کا ہے۔ نظمِ کلام بالکل واضح ہے۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۵۷-۷۴

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ﴿۵۸﴾
ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿۵۹﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا
بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۶۰﴾ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ
اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِيْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۱﴾ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ
النَّشْاَةَ الْاُوْلٰى فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿۶۳﴾
ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗۤ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿۶۴﴾ لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنٰهُ
حُطَامًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ ﴿۶۵﴾ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ
مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۶۷﴾ اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ﴿۶۸﴾ ءَاَنْتُمْ

ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ ﴿۶۹﴾ لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ
اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ تُوْرُوْنَ ﴿۷۱﴾
ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ﴿۷۲﴾ نَحْنُ
جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ ﴿۷۳﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ
الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾

ع ۲ ۳۶ ۱۵

ترجمۂ آیات ۵۷-۷۴

ہم نے تم کو پیدا کیا ہے تو تم قیامت کی تصدیق کیوں نہیں کرتے ؟ کیا تم نے غور کیا ہے اس چیز پر جو تم ٹپکا دیتے ہو! اس کی صورت گری تم کرتے ہو یا صورت گری کرنے والے ہم ہیں ؟ ہم نے تمھارے درمیان موت مقدّر کی ہے اور ہم عاجز رہنے والے نہیں ہیں بلکہ قادر ہیں اس بات پر کہ ہم تمھاری جگہ تمھارے مانند بنا دیں اور تم کو اٹھائیں اس عالم میں جس کو تم نہیں جانتے۔ اور پہلی پیدائش کو تو تم جانتے ہی ہو تو اس سے کیوں یاددہانی نہیں حاصل کرتے ! ۵۷-۶۲

کیا تم نے غور کیا ہے اس چیز پر جو تم بوتے ہو؟ اس کو تم پروان چڑھاتے ہو یا پروان چڑھانے والے ہم ہیں ؟ ہم چاہیں تو اس کو ریزہ ریزہ کر چھوڑیں تو تم باتیں ہی بناتے رہ جاؤ۔ بے شک ہم تو تاوان میں پڑے ! بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم رہے ! ۶۳-۶۷

ذرا غور تو کرو اس پانی پر جو تم پیتے ہو! کیا تم نے اس کو اتارا ہے بادلوں سے یا اس کے اتارنے والے ہم ہیں ؟ اگر ہم چاہیں تو اس کو بالکل ہی تلخ بنا دیں تو تم لوگ شکر کیوں نہیں کرتے ! ۶۸-۷۰

ذرا غور تو کرو اس آگ پر جس کو جلاتے ہو! کیا تم نے پیدا کیا ہے اس کے

درخت کو یا اس کے پیدا کرنے والے ہم ہیں! ہم نے اس کو یاددہانی اور صحرا کے مسافروں کے لیے ایک نہایت نفع بخش چیز بنایا ہے۔ ۷۱-۷۳

تو تم اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو! ۷۴

۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ (۵۷)

خطاب انہی منکرینِ قیامت سے ہے جن کا قول اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ' اوپر نقل ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ جب ہم ہی نے تم کو پیدا کیا اور اس حقیقت سے تمھیں مجالِ انکار نہیں ہے تو پھر قیامت کی تصدیق سے تمھیں کیوں گریز ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جب پہلی مرتبہ تمھیں پیدا کرنے سے ہم قاصر نہیں رہے تو دوبارہ پیدا کرنے سے کیوں عاجز رہیں گے؟ اول بار پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا دوسری بار؟ یہ منطق عجیب ہے کہ جو کام زیادہ مشکل ہے اس کے واقع ہونے کو تو تم تسلیم کرتے ہو اور جو اس سے بالبداہت آسان ہے اس کو ناممکن قرار دیتے ہو! ــــ تُصَدِّقُوْنَ کے بعد اس کا مفعول 'بِالدِّيْنِ' یا 'بِالْبَعْثِ' برنبائے وضاحتِ قرینہ محذوف ہے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ (۵۸-۵۹)

انسان کی خلقت سے قیامت کی دلیل

یہ انسان کی خِلقت کی طرف توجہ دلائی کہ اگر تمھیں یہ گمان ہے کہ تمھاری خلقت میں کچھ تمھاری تدبیر و حکمت کو بھی دخل ہے جس کے بغیر اللہ تعالیٰ تمھیں وجود میں نہیں لا سکتا تو آؤ دیکھو کہ اس میں تمھارا دخل کتنا ہے؟ فرمایا کہ تم جو کچھ کرتے ہو بس اس قدر ہے کہ پانی کی ایک بوند عورت کے رحم میں ٹپکا کر الگ ہو جاتے ہو۔ اس بوند کو تہ بہ تہ تاریکیوں کے اندر گوناگوں مراحل سے گزار کر، ایک بھلے چنگے بچہ کی صورت میں عورت کے پیٹ سے باہر لانا اور پھر اس کو بچپن، بلوغ، جوانی اور بڑھاپے کے مراحل سے گزارنا کس کا کام ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ سارے کام اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت و حکمت سے ہوتے ہیں تو جو خدا پانی کی ایک بوند پر یہ تصرفات کر سکتا ہے اور اس کی صورت گری میں وہ کسی کا بھی محتاج نہیں ہے وہ اگر اس کے بغیر مجرد زمین کے ذرات ہی سے تمھیں دوبارہ متشکل کر کے اٹھا کھڑا کرے تو اس کے لیے کیا مشکل ہے!

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ (۶۰)

یعنی یہ گمان کرنے کی بھی ذرا گنجائش نہیں ہے کہ کوئی ہماری گرفت سے بچ کر کہیں نکل سکتا ہے۔ ہم نے لوگوں کے درمیان موت کا جال بچھا رکھا ہے اور یہ جال ایسا ہے کہ اس نے سب کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ ہر بڑے چھوٹے اور امیر و غریب کے لیے موت لازمی ہے اور اس طرح ہم سب کو روزِ قیامت کی پیشی کے لیے جمع کر رہے ہیں۔ آگے آیات ۸۲-۸۷ میں یہ مضمون وضاحت سے آ رہا ہے۔

عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ اَمۡثَالَکُمۡ وَ نُنۡشِئَکُمۡ فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۶۱﴾

یعنی جب پیدا کرنا بھی ہمارے اختیار میں ہے اور مارنا بھی ہمارے اختیار میں ہے تو اگر تمھاری جگہ تمھاری مانند ہم پیدا کرنا چاہیں گے تو اس سے کیوں عاجز رہیں گے؟ ہم عاجز نہیں رہیں گے بلکہ اس بات پر قادر ہیں کہ تمھارے مانند پیدا کر دیں اور ایک ایسے عالم میں تمھیں اٹھا کھڑا کریں جس کو تم نہیں جانتے۔

'عَلٰی' یہاں اس بات کا قرینہ ہے کہ 'وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ' کو مثبت معنی یعنی 'قَادِرِیۡنَ' کے مفہوم میں لیا جائے۔ گویا اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم عاجز نہیں بلکہ قادر ہیں۔ صلہ کی تبدیلی سے عربی زبان میں حذف و ایجاز کے جو تصرفات ہوتے ہیں اس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ یہی مضمون سورۂ معارج میں اس طرح آیا ہے: اِنَّا لَقٰدِرُوۡنَ ۙ عَلٰۤی اَنۡ نُّبَدِّلَ خَیۡرًا مِّنۡہُمۡ ۙ وَ مَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ (المعارج ۷۰: ۴۰-۴۱) (بے شک ہم قادر ہیں اس بات پر کہ ان کی جگہ ان سے بہتر کو لائیں، ہم اس سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں)۔

'وَ نُنۡشِئَکُمۡ فِیۡ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ' یعنی ایک ایسے عالم میں تمھیں اٹھا کھڑا کریں جس کے نوامیس و قوانین اس عالم سے بالکل مختلف ہوں گے اور تم ان سے بالکل ناآشنا ہو۔ تمھیں حیرانی ہے کہ موت اور زندگی کے ان معروف ضوابط کے خلاف، جن سے اس دنیا میں تم آشنا ہو، یہ کیسے ممکن ہے کہ مرنے اور سڑ گل جانے کے بعد مجرّد ایک صدائے صُور سے ساری خلقت ازسرِنو وجود میں آ جائے، پھر ایک ایک فرد کا حساب ہو اور پھر وہ ابدی جنت یا ابدی دوزخ کا سزاوار قرار پائے! لیکن یہ سب کچھ ہو گا اور ایک ایسے عالم میں تمھارے سامنے آئے گا جس سے تم ابھی ناآشنا ہو۔

وَ لَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَۃَ الۡاُوۡلٰی فَلَوۡ لَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۶۲﴾

یعنی اگر تم نے اس عالم کو، جس میں ہم تم کو ازسرِنو پیدا کرنے والے ہیں، نہیں دیکھا تو یہ کوئی معقول دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ تم اس کی تکذیب پر جم جاؤ۔ آخر اس جہان میں اپنی خلقت کو تو تم دیکھتے ہو تو اس سے کیوں نہیں سبق حاصل کرتے کہ جس نئی زندگی سے تمھیں آگاہ کیا جا رہا ہے اس میں ذرا بھی استبعاد نہیں ہے۔ جو خالق اس دنیا میں تمھیں لایا ہے اس کی قدرت کے دائرہ سے کوئی چیز بھی باہر نہیں ہے۔ وہ تمھیں دوبارہ بھی اسی طرح وجود میں لا سکتا ہے اور اس کی ربوبیت و حکمت کا یہ تقاضا

بھی ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو یہ دنیا بالکل بے مقصد ہو کے رہ جاتی ہے اور خالقِ کائنات سے یہ بات بعید ہے کہ وہ کوئی کارِ عبث کرے۔

أَفَرَءَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ۝ ءَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُۥٓ أَمْ نَحْنُ ٱلزَّٰرِعُونَ (۶۳-۶۴)

وسائلِ ربوبیت سے جزاء پر استدلال

انسان کی خلقت کے بعد یہ ان وسائلِ ربوبیت کی طرف توجہ دلائی جو ربِّ کریم نے اس کی پرورش کے لیے مہیا فرمائے ہیں اور جن کے مہیا ہونے میں نہ انسان کی تدبیر کو کوئی دخل ہے نہ اس کے کسی استحقاق کو۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بلا استحقاق جو نعمتیں بخشی ہیں ان کو قرآن نے مختلف اسلوبوں سے جگہ جگہ جزاء و سزا کی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے کہ ان کا بلا کسی حق کے عطا ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ایک دن ہر نعمت کے باب میں لوگوں سے پرسش ہونی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی جگہ جگہ واضح فرمائی ہے کہ یہ نعمتیں اکثروں کے لیے استکبار کا سبب بن گئیں۔ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو انھوں نے اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ اور اپنا حق سمجھا اور اس غرور میں آخرت سے آنکھیں بند کر لیں اور اگر کسی نے ان کو آنکھیں کھولنے کی دعوت دی تو اس کو وہی جواب دیا جو اوپر مُترفین کی زبان سے نقل ہوا ہے۔

فرمایا کہ زمین میں جو کچھ تم بوتے ہو، کبھی اس پر بھی غور کیا؟ کیا اپنے بوئے ہوئے بیجوں کو تم پروان چڑھاتے ہو یا ان کو پروان چڑھانے والے ہم ہیں؟ جس طرح اولاد کی پیدائش میں تمھارا حصہ صرف اتنا ہی ہے کہ تم ہل چلا کر کچھ دانے زمین میں بکھیر دیتے ہو، اس کے بعد کے سارے مراحل تم دیکھتے ہو کہ براہ راست قدرت کے اہتمام میں طے ہوتے ہیں۔ اسی نے زمین میں یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ اپنی آغوش میں دانے کی پرورش کرے۔ اسی نے بیج میں یہ صلاحیت ودیعت فرمائی کہ وہ زمین کی حرارت اور رطوبت سے فیض یاب ہو کر اپنے اندر سے سوئیاں نکالے اور ان نازک سوئیوں کے اندر یہ حوصلہ ودیعت فرمایا کہ وہ دھرتی کا سینہ چیر کر باہر نکلیں اور کھلی فضا میں پروان چڑھیں۔ پھر اللہ ہی ان نازک سوئیوں کو ڈنٹھلوں کا سہارا مہیا کرتا ہے۔ ان کے اندر برگ و بار پیدا کرتا ہے، خوشے نکالتا ہے، پھول اور پھل پیدا کرتا ہے، پھر وہ پک کر کسان کی جھولی بھرتے ہیں۔ غور کرو کہ ان میں سے کون سا کام ہے جو تمھارے کیے ہوتا ہے یا جس کو تم انجام دینے کی قابلیت رکھتے ہو۔

لَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَٰهُ حُطَٰمًا فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُونَ (۶۵)

یعنی اس معاملے میں تمھاری بے بسی تو اس بات سے واضح ہے کہ ہم چاہیں تو تمھاری ہری بھری فصل کو، عین اس وقت جب کہ تم اپنی شاندار کامیابی پر پھولے نہ سما رہے ہو، کوئی بادِ تند بھیج کر یا ژالہ باری کر کے چشم زدن میں بالکل ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیں، پھر تم باتیں ہی بناتے رہ جاؤ۔

لفظ 'تَفَكَّهُوْنَ' یہاں بطورِ طنز استعمال ہوا ہے۔ یعنی ایسی بدحواسی طاری ہو کہ کسی کی سمجھ میں نہ آئے کہ اس حادثہ کی کیا توجیہ کرے اور اپنے نقصان کا اندازہ دوسروں کو کس طرح کرائے۔ کوئی کچھ

کہے، کوئی کچھ۔ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔

اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ۙ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۶۶ - ۶۷)

یعنی کوئی تو یوں فریاد کرے کہ بھائی ہم تو تاوان میں پڑ گئے، جو کچھ لگایا وہ بھی پلّے نہ پڑا۔ دوسرے بولیں کہ اس آفت نے تو ہمیں بالکل ہی محروم کر چھوڑا، اب بیوی بچوں کی پرورش اور گزارے کی کیا شکل ہوگی! سورۂ قلم میں ایک باغ والوں کی تمثیل بیان ہوئی ہے جس سے اس صورتِ حال کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا ہے:

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ	ہم نے ان کو اسی طرح آزمائش میں ڈالا ہے جس
الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا	طرح باغ والوں کو آزمائش میں ڈالا جب کہ
مُصْبِحِيْنَ ۙ وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ۝ فَطَافَ	انھوں نے قسم کھائی کہ کل صبح صبح وہ اپنے باغ کے
عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ	پھل ضرور ہی توڑ لیں گے، اور ذرا بھی نہیں
نَآئِمُوْنَ ۝ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ۙ	چھوڑیں گے تو ابھی وہ سوئے ہی پڑے تھے کہ تیرے رب
فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ۙ اَنِ اغْدُوْا	کی جانب سے اس باغ پر ایسی گردش آئی کہ اس کا بالکل
عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ۝	صفایا ہو گیا۔ انھوں نے صبح صبح شریکوں کو پکارا
فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۙ	کہ باغ توڑنا ہے تو سویرے سویرے کھیتوں پر پہنچو۔
اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ	تو وہ کانا پھوسی کرتے نکلے کہ کوئی مسکین آج باغ میں
مِّسْكِيْنٌ ۙ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ	نہ پہنچنے پائے اور وہ بڑی امنگ اور حوصلہ سے نکلے
قٰدِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا	تو جب باغ کو دیکھا تو بولے کہ معلوم ہوتا ہے ہم رستہ
لَضَآلُّوْنَ ۙ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ۝	بھول کر غلط جگہ آ گئے! نہیں بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم
(القلم - ۶۸ : ۱۷-۲۷)	ہو کر رہ گئے۔

اَفَرَءَيْتُمُ الْمَآءَ الَّذِيْ تَشْرَبُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ اَنْزَلْتُمُوْهُ مِنَ الْمُزْنِ اَمْ نَحْنُ الْمُنْزِلُوْنَ (۶۸ - ۶۹)

غذائی نعمتوں کے بعد یہ پانی کی نعمت کی طرف توجہ دلائی کہ بھلا کبھی اس پانی پر بھی غور کیا ہے جو پیتے ہو! کیا اس کو بادلوں سے تم نے اتارا ہے یا اس کے اتارنے والے ہم ہیں! یعنی یہ ہماری ہی قدرت و حکمت اور ربوبیت ہے کہ ہم سمندروں کے کھاری پانی کو بھاپ بنا کر اڑاتے اور پھر اس کو صاف، شیریں اور خوش گوار بنا کر تمھارے اوپر برساتے جس کو تم بھی پیتے ہو، تمھارے مویشی بھی پیتے ہیں اور ان سے تمھاری فصلیں بھی سیراب ہوتی ہیں۔ بھلا بتاؤ کہ ہے کسی میں یہ قدرت کہ بادلوں سے پانی برسا دے! یہ امر واضح رہے کہ اہلِ سائنس نے اب تک پانی برسانے کے جو تجربات کیے ہیں اس کی نوعیت بچوں کے کھیل سے

سامانِ غذا کے بعد پانی کی نعمت کی طرف اشارہ

زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ بادلوں کے کسی ٹکڑے پر کچھ گرم و سرد اثرات ڈال کر چند بوندیں ٹپکا لینا اور چیز ہے؛ بادلوں کو بنانا، ان کو فضا میں پھیلانا، ان کو ایک جگہ سے ہانک کر دوسری جگہ لے جانے کے لیے ساز گار ہوائیں چلانا اور جس علاقہ کو چاہنا اس کو جل تھل کر دینا ایک دوسری چیز ہے۔

لَوۡ نَشَآءُ جَعَلۡنٰهُ اُجَاجًا فَلَوۡلَا تَشۡكُرُوۡنَ (۷۰)

یعنی ہم چاہیں تو اس پانی کو ایسا کھاری اور تلخ بنا دیں کہ یہ تمھارے کسی کام کا بھی نہ رہے۔ یعنی جب ہم ہی نے کھاری کو شیریں بنایا ہے تو ہمارے لیے کیا مشکل ہے کہ ہم پھر اس شیریں کو کھاری بنا دیں۔

ربوبیت کا تقاضا

'فَلَوۡلَا تَشۡكُرُوۡنَ'، یہ اسی ربوبیت کا تقاضا بیان ہوا ہے کہ یہ چیز تم پر واجب کرتی ہے کہ تم اپنے رب کے شکر گزار بندے بنو، ورنہ اپنی ناشکری کی سزا بھگتنے کے لیے تیار رہو۔ دین میں شکر کا جو مقام ہے اس کی وضاحت سورۂ فاتحہ میں ہو چکی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی تحریک سے بندہ اپنے رب کی راہ میں پہلا قدم اٹھاتا ہے اور منزل پر پہنچنے کے بعد اسی کا اظہار وہ اپنی جدوجہد کے نتائج دیکھ لینے کے بعد بھی کرے گا: 'وَاٰخِرُ دَعۡوٰىهُمۡ اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ'!

اَفَرَءَيۡتُمُ النَّارَ الَّتِىۡ تُوۡرُوۡنَ ‎ؕ ءَاَنۡتُمۡ اَنۡشَاۡتُمۡ شَجَرَتَهَاۤ اَمۡ نَحۡنُ الۡمُنۡشِـُٔوۡنَ (۷۱-۷۲)

پانی کے بعد آگ کی طرف اشارہ

پانی کے بعد آگ کی بھی، ضروریاتِ زندگی میں، بڑی اہمیت ہے۔ بالخصوص ان قوموں کے لیے جن کو بڑے بڑے صحرائی سفر کرنے پڑتے تھے۔ جہاں نہ تو راہ میں آبادیاں ہوتیں جہاں سے ضرورت کے وقت بآسانی آگ دستیاب ہو سکے، نہ آگ چیز ہی ایسی ہے جس کو آدمی اپنے سامان میں باندھ کے ساتھ لے سکے اور نہ اس وقت تک دیا سلائی ہی کے قسم کی کوئی چیز ایجاد ہوئی تھی جس سے یہ ضرورت پوری کی جا سکے۔ اس قسم کے ضرورت مندوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی یاد دہانی کے لیے بعض خاص قسم کے پتھر بھی پیدا کیے جن کو رگڑ کر آگ پیدا کی جا سکتی تھی اور اس سے عجیب تر اپنی قدرت و حکمت کی یہ شان دکھائی کہ دو ایسے درخت بھی پیدا کیے جن کی دو ٹہنیوں کو ایک دوسری سے رگڑ کر آگ بھڑکائی جا سکتی تھی۔ ان کو مرخ اور عفار کہتے تھے۔ سورۂ یٰسٓ میں بھی اس درخت کا ذکر ہو چکا ہے۔ فرمایا کہ اس چیز پر بھی غور کرو کہ زندگی کی اتنی بڑی ضرورت کو مہیا کرنے والے تم ہو یا ہم ہیں!

نَحۡنُ جَعَلۡنٰهَا تَذۡكِرَةً وَّمَتَاعًا لِّلۡمُقۡوِيۡنَ (۷۳)

آگ کے ذکر کے بعض خاص پہلو

فرمایا کہ ہم نے اس کو یاد دہانی اور منفعت کی چیز بنایا ہے صحرا کے مسافروں کے لیے۔ 'مقوین' صحراؤں اور چٹیل میدانوں میں سفر کرنے والوں کو کہتے ہیں، جہاں آگ کا حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ضمیر مؤنث کا مرجع 'شجرۃ' بھی ہو سکتا ہے اور وہ آگ بھی جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ دونوں صورتوں میں باعتبارِ مفہوم کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

'تذکرۃ' کے معنی یاد دہانی کے ہیں۔ اس یاد دہانی کے ہیں تو متعدد پہلو لیکن ہم صرف دو خاص اہمیت رکھنے والے پہلوؤں کی طرف یہاں اشارہ کریں گے۔

اول یہ کہ ربِّ کریم کی پروردگاری کی یہ ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ ربوبیت انسان پر مسئولیت کی ذمہ داری عائد کرتی ہے جو جزا و سزا اور دوزخ یا جنت کو مستلزم ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں۔

دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر جو دی ہے کہ دوزخ میں آگ بھی ہوگی اور اس میں زقّوم کے درخت بھی ہوں گے، یہ ایک حقیقت ہے۔ اس کو خلافِ عقل سمجھ کر کوئی اس کا مذاق اڑانے کی کوشش نہ کرے۔ جو خدا مرخ اور عفار کی ہری شاخوں کے اندر آگ بھر سکتا ہے اس کے لیے دوزخ کے اندر زقّوم پیدا کر دینا کیا مشکل ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۶۰ میں یہ بات گزر چکی ہے کہ قریش کے لیے فکرے قرآن کا مذاق اڑاتے تھے کہ یہ دوزخ میں آگ کی بھی خبر دیتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اس میں زقّوم کے درخت بھی ہوں گے۔ وہاں ان کے اس استہزاء کا جواب ایک دوسرے پہلو سے دیا ہے جس کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ اس سورہ کی آیات ۵۲-۵۳ میں بھی چونکہ زقّوم کا ذکر آیا ہے اس وجہ سے جب آگ پیدا کرنے والے اس درخت کا ذکر فرمایا تو اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ جو لوگ دوزخ میں آگ اور درخت کی یکجائی کو ناممکن بتاتے ہیں وہ اس درخت سے سبق حاصل کریں کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح یہ دونوں چیزیں یکجا کر رکھی ہیں۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۷۴)

نبی صلعم کو صبر اور نماز کی تاکید

یہ بحث کے آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے موقفِ حق پر ڈٹے رہنے اور اپنے رب کی تسبیح کرتے رہنے کی تاکید فرمائی۔ اس تاکید کا یہ محل ہے کہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ تو تمہارے ساتھ ہیں لیکن یہ ہٹ دھرم لوگ ماننے والے نہیں ہیں سو ان کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنے رب کی تسبیح میں لگے رہو۔ تسبیح یہاں وسیع معنی یعنی پاکی بیان کرنے کے مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خواہشوں کے اندھے پرستار تو یہ گمان کیے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا محض ان کے عیش کے لیے بنائی ہے۔ ان کو علم نہیں ہے کہ ربِّ عظیم اس بات سے پاک اور برتر ہے کہ وہ کوئی عبث اور محض کھیل تماشے کی قسم کا کام کرے۔ اس پر واجب ہے کہ وہ ایک ایسا دن لائے جس میں اپنے شکر گزار بندوں کو ان کی ناشکر گزاری کا صلہ دے اور جو ناشکرے ہیں وہ کیفرِ کردار کو پہنچیں۔

'بِاسْمِ رَبِّكَ' میں 'ب' کا صلہ اس امر کا قرینہ ہے کہ 'سَبِّحْ' یہاں استعانت کے مضمون پر بھی متضمن ہے جس سے معنی میں یہ اضافہ ہو جائے گا کہ اپنے رب کی تسبیح کرو اور اسی سے اس صورتِ حال کے مقابلہ کے لیے مدد مانگو۔

لفظ 'اسم' اس حقیقت کا سراغ دے رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندے کے تعلق و توسل کا ذریعہ صرف اس کے اسمائے حسنیٰ ہی ہیں۔ انہی کی معرفت سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے جو تمام صحیح علم و عمل کا سرچشمہ ہے۔

۴۔ آگے آیات ۷۵-۹۶ کا مضمون

آگے خاتمہ سورہ کی آیات ہیں۔ قریش کے لیڈروں کو خطاب کر کے متنبہ فرمایا ہے کہ قرآن جس شدنی کی خبر دے رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس سے فرار اختیار کرنے اور اس کی تکذیب کرنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ کاہنوں کی خرافات کی قسم کا کلام نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے محفوظ خزانۂ علم سے اترا ہوا باعزت کلام ہے جو نہایت پاکیزہ ذرائع سے اس کے پاکیزہ رسول پر نازل ہوا ہے۔ یہ شیاطین کی چھوت اور مداخلت سے بالکل محفوظ و مامون ہے۔ یہ تمھارے لیے ابدی ہدایت اور دائمی رزق ہے، اس کی ناقدری اور تکذیب کر کے اپنی شامت کو دعوت نہ دو۔ یاد رکھو کہ کوئی خدا کے قابو سے باہر نہیں نکل سکتا اور تمھیں جس 'خفض و رفع' سے آگاہ کیا جا رہا ہے وہ اپنے تمام لوازم و نتائج کے ساتھ سامنے آنے والا ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۷۵-۹۶ فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾
اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا
الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا
الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ
اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿۸۳﴾ وَاَنْتُمْ
حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ
لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿۸۵﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿۸۶﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۸۸﴾
فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۥ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿۸۹﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ

أَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۙ﴿۹۰﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ؕ﴿۹۱﴾ وَأَمَّآ
إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۙ﴿۹۲﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۙ﴿۹۳﴾
وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿۹۴﴾ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۚ﴿۹۵﴾ فَسَبِّحْ
بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۹۶﴾

ع ۳ ۲۲ ۱٦

ترجمۂ آیات ۷۵-۹٦

پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے گرنے کے ٹھکانوں کی! اور بے شک یہ ایک بہت بڑی قسم ہے اگر تم جانو! بے شک یہ ایک باعزت قرآن ہے۔ ایک محفوظ کتاب میں۔ اس کو صرف پاکیزہ ہی ہاتھ لگاتے ہیں۔ یہ عالم کے خداوند کا نازل کردہ ہے تو کیا تم لوگ اس کلام سے اغماض برتتے ہو! اور جو تمھارے لیے رزق ہے، اس کی تکذیب کر رہے ہو! ۷۵ - ۸۲

اگر تمھارا یہ گمان ہے کہ تم کسی کے محکوم نہیں تو کیوں نہیں اس وقت جب کہ جان حلق میں پہنچتی ہے اور تم اس وقت دیکھ رہے ہوتے ہو اور ہم اس جان کنی میں مبتلا سے تمھاری نسبت زیادہ قریب ہوتے ہیں لیکن تم نہیں دیکھ پاتے۔ پس کیوں نہیں، اگر تم غیر محکوم ہو، اس جان کو لوٹا لیتے اگر تم سچے ہو؟ ۸۳ - ۸۷

پس اگر وہ ہوا مقربین میں سے تو اس کے لیے راحت اور سرور اور نعمت کا باغ ہے۔ اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہوا تو تیرے لیے سلامتی ہے، اے صاحب یمین! اور اگر جھٹلانے والوں گمراہوں میں سے ہوا تو اس کے لیے گرم پانی کی ضیافت اور جہنم کا داخلہ ہے۔ ۸۸ - ۹۴

بے شک یہ ساری باتیں سچی اور یقینی ہیں تو اپنے رب عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ (۷۵)

'لا' فعل سے الگ ہے

یہاں 'لا' فعل 'اُقْسِمُ' سے متصل نہیں ہے بلکہ اس سے بالکل الگ ہے۔ اثبات سے پہلے یہ نفی مخاطب کے زعم باطل کی تردید کے لیے آتی ہے۔ اس طرح نفی کا لانا عربی زبان اور قرآن میں معروف ہے سورۂ نساء میں فرمایا ہے: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ (النساء - ۴: ۶۵) (پس نہیں، تیرے رب کی قسم، وہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات میں تمہی کو حکم نہ بنائیں) یعنی اگر ان منافقین کا گمان ہے کہ محض کلمہ پڑھ لینے سے یہ مسلمان بن گئے ہیں تو یہ گمان بالکل غلط ہے۔ اس کے بعد قسم کھا کر فرمایا کہ یہ اس وقت تک سچے مومن نہیں بن سکتے جب تک اپنی تمام نزاعات میں تمہی کو (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو) حکم نہ بنائیں۔ اسی طرح یہاں قسم سے پہلے 'لا' کے ذریعہ مخاطبوں کے اس زعم کی تردید فرما دی کہ قرآن العیاذ باللہ کاہنوں کی مزخرفات کی قسم کا کوئی شیطانی القاء ہے۔ اس کے بعد قسم کھا کر قرآن کی عظمت و تقدیس اور اس کے وحی الٰہی ہونے کا ذکر فرمایا۔ یہ اسلوب کلام ایک فطری اسلوب کلام ہے اس وجہ سے ہر زبان میں موجود ہے۔ ہماری زبان میں بھی یہ اسلوب معروف ہے۔ جب آپ کہتے ہیں: 'نہیں خدا کی قسم، اصل حقیقت یوں ہے'، تو یہی اسلوب استعمال کرتے ہیں اور مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل حقیقت کے اثبات سے پہلے مخاطب یا معترض کے خیال یا اعتراض کی تردید کر دیں۔ اس اسلوب کلام میں بلاغت یہ ہے کہ گویا معترض کا اعتراض اتنا لغو ہے کہ متکلم ایک لمحہ کے لیے بھی اس کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس کو اتنا توقف بھی گوارا نہیں ہے کہ صحیح پہلو کی وضاحت کرنے کے بعد اس کی تردید کرے۔

اکثر لوگوں نے اس 'لا' کو زائد مانا ہے لیکن کسی فصیح کلام میں اوّل تو کوئی حرف زائد ہوتا نہیں اور بالفرض ہوتا بھی ہو تو حرف 'لا' بہرحال ان حروف میں سے ہے جس کو کہیں بھی زائد ماننے میں بڑے خطرات مضمر ہیں۔ کسی ضابطہ کے بغیر اگر اس کو زائد ماننے کی راہ کھول دی گئی تو اس سے دین کے اندر بہت سی منہیات کے جواز کی راہ کھل سکتی ہے۔ لیکن یہاں اس مسئلہ پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ اگلی سورہ ــــــ الحدید ــــــ میں آیت ۲۹ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ...... الاٰیۃ' کے تحت ہم اس پر بحث کریں گے۔ اس 'لا' کو بھی مفسرین نے زائد قرار دیا ہے لیکن ان شاء اللہ ہم واضح کریں گے کہ یہ عربیت کے اسلوب کے بالکل مطابق ہے۔

وحیِ الٰہی کی حفاظت کے لیے ایک خاص انتظام

'مواقع' جمع ہے 'موقع' کی جس کے معنی کسی چیز کے واقع ہونے یا گرنے کی جگہ کے ہیں۔ یہاں یہ ان ٹھکانوں یا کمین گاہوں کے لیے آیا ہے جن پر ان شیاطین کے تعاقب کے لیے شہاب ثاقب پھینکے

جاتے ہیں جو ملأ اعلیٰ کے بھید معلوم کرنے کے لیے ان میں چھپ کر کان لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ شیاطینِ جن نے کچھ خاص کمین گاہیں ایسی منتخب کر رکھی تھیں جن میں وہ ملأ اعلیٰ کی باتوں کی سن گن لینے کے لیے بیٹھا کرتے تھے۔ نزولِ قرآن کے زمانے میں وحیِ الٰہی کو شیاطین کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر یہ اہتمام فرمایا کہ جو شیاطین ان کمین گاہوں میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ان پر شہابِ ثاقب کے راکٹ پھینکے جاتے۔ اس حقیقت کا اعتراف سورۂ جن میں خود جنوں کی زبان سے یوں نقل ہوا ہے:

وَأَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاءَ فَوَجَدْنَاهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيدًا وَشُهُبًا ۝ وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۖ فَمَن يَسْتَمِعِ الْآنَ يَجِدْ لَهُ شِهَابًا رَّصَدًا ۝ (الجن - ۷۲ : ۸-۹)	اور یہ کہ ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو یہ پایا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے۔ اور یہ کہ ہم اس کے کچھ ٹھکانوں میں غیب کی باتیں سننے کے لیے بیٹھا کرتے تھے لیکن اب جو کان لگانے کی کوشش کرے گا تو وہ ایک شہابِ ثاقب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

میرے نزدیک سورۂ جن کی اس آیت میں جن کمین گاہوں کو 'مقاعد' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے انہی کو آیتِ زیرِ بحث میں 'مواقع' کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ البتہ 'مقاعد' میں ان کے کمین گاہ ہونے کا مفہوم پیشِ نظر ہے اور 'مواقع' میں شہابوں کے ہدف ہونے کا۔ لفظ 'نجوم' یہاں شہابوں کے مفہوم میں ہے۔ سورۂ ملک میں فرمایا ہے: 'وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ' (الملک - ۶۷ : ۵) (اور ہم نے آسمانِ زیریں کو چراغوں سے سجایا اور ان کو شیطانوں کے سنگسار کرنے کے لیے بھی بنایا)۔ ان شہابوں پر سورۂ نجم کی آیات ۱ - ۵ اور سورۂ رحمٰن کی آیت ۳۵ کے تحت بھی بحث گزر چکی ہے۔ ان دونوں مقامات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ (۷۶)

ایک برمحل جملہ معترضہ

یہ قسم اور مقسم علیہ کے درمیان ایک برمحل جملہ معترضہ ہے۔ فرمایا کہ جس طرح تم محض ہٹ دھرمی سے قرآن کو القائے شیطانی قرار دیتے ہو اسی طرح اس قسم کے باب میں بھی کہو گے کہ بھلا شہابوں کے گرنے کو شیاطین کے رجم سے کیا تعلق! لیکن تم جان سکو تو یہ حقیقت تم پر آشکارا ہو گی کہ یہ قسم اپنے اندر ایک عظیم شہادت اس بات کی رکھتی ہے کہ جنات و شیاطین کو ملأ اعلیٰ تک کوئی رسائی حاصل نہیں ہے، جیساکہ کاہنوں کا دعویٰ ہے۔ اگر کوئی وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے تو قدرت نے اس کی سرکوبی کے لیے نہایت عظیم پیمانے پر انتظام کر رکھا ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی خدا کے شہابوں کی زد سے بچ کے نکل سکے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس کو جان سکو یا نہ جان سکو اور مانو یا نہ مانو لیکن اللہ تعالیٰ نے اس قسم میں

تمھاری آگاہی کے لیے اس کائنات کا ایک نہایت اہم راز بیان فرمایا ہے۔

اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ۙ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ۙ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ۙ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۷۷-۸۰)

قرآن شیطانی چھوت سے بالکل پاک ہے

قسم کے بعد یہ مُقسم علیہ ہے اور یہ حقیقت اپنی جگہ پر اچھی طرح واضح کی جا چکی ہے کہ قرآن مجید میں قسمیں شہادت کے طور پر کھائی گئی ہیں۔ گویا شیاطین پر سنگ باری اور آتش باری کے مذکورہ بالا انتظام کا حوالہ دے کر مخاطبوں کو متنبہ فرمایا کہ اس قرآن کو کاہنوں کے قسم کا کوئی شیطانی القاء نہ گمان کرو بلکہ یہ ایک نہایت باعزت اور برتر کلام ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک محفوظ کتاب میں ہے جس تک اس کے پاک فرشتوں کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں یعنی اس کو صرف ملائکہ مقربین ہی ہاتھ لگا سکتے ہیں، جنات اور شیاطین وہاں نہیں پھٹک سکتے۔

'تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ'۔ پس یہ گمان نہ کرو کہ جس طرح کی شیطانی وحی کاہنوں پر آتی ہے اسی طرح کی وحی العیاذ باللہ یہ قرآن بھی ہے۔ یہ القائے شیطانی نہیں بلکہ اللہ رب العالمین کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اس کا سرچشمہ لوحِ محفوظ ہے جس تک ملائکہ مقربین کے سوا کسی کی بھی رسائی نہیں۔ اس کے لانے والے حضرت جبریل امینؑ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے سب سے مقرب فرشتے ہیں اور شیاطین ان پر کسی پہلو سے بھی اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ اس کا نزول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ہوا ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے ضلالت و غوائت کے ہر شائبہ سے بالکل پاک رکھا ہے۔

فقہاء کے بعض استنباط

'لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ' کے ٹکڑے سے ہمارے فقہا نے طہارت کے بعض آداب بھی استنباط کیے ہیں جن کا اہتمام ان کے نزدیک قرآن مجید کو چھونے یا تلاوت کرتے وقت ضروری ہے لیکن یہ آیت جس سیاق و سباق میں ہے اس سے واضح ہے کہ ان مسائل سے ان کو براہ راست تعلق نہیں ہے اس وجہ سے فقہاء کے استنباطات کو ان کے اپنے دلائل کی روشنی میں جانچ کر رد یا قبول کیجیے یہ موضوع ہمارے دائرۂ بحث سے الگ ہے اس وجہ سے ہم اس سے تعرض نہیں کریں گے بس اتنا عرض کریں گے کہ جن فقہاء نے قرآن کی زبانی تلاوت یا اس کو ہاتھ لگانے تک کے لیے بھی طہارت کی وہ شرطیں عائد کی ہیں جو نماز کے لیے ضروری ہیں ان کے اقوال غلو پر مبنی ہیں۔ قرآن اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اس وجہ سے وہ ہر پہلو سے لائقِ تکریم ہے لیکن وہ ہمارے لیے ہر قدم پر حق و باطل اور خیر و شر کے جاننے کا ذریعہ، اخذ و استنباط کا حوالہ اور استدلال کا مرکز بھی ہے۔ اگر اس کو ہاتھ لگانے یا اس کی کسی سورہ یا آیت کی تلاوت کرنے یا حوالہ دینے کے لیے بھی آدمی کا طاہر و مطہر اور باوضو ہونا ضروری قرار پا جائے تو یہ ایک ایسی تکلیف مالا یطاق ہو گی جو دینِ فطرت کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس طرح کی غیر فطری پابندیاں عائد کرنے سے قرآن کی تعظیم کا وہی تصور پیدا ہو گا جس کی تعبیر سیدنا مسیحؑ نے یوں فرمائی ہے کہ

"تمھیں چراغ دیا گیا کہ اس کو گھر میں بلند جگہ رکھو کہ سارے گھر میں روشنی پھیلے لیکن تم نے اس کو پیمانے کے نیچے ڈھانپ کر رکھا ہے۔"

اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ (۸۱)

قرآن سے بے اعتنائی برتنے والوں کو تنبیہ

'اِدْهَان' کے معنی اغماض، سہل انگاری اور بے نیازی و بے اعتنائی برتنے کے ہیں۔ قرآن کی عظمت بیان کرنے کے بعد باندازِ تعجب سوال کیا ہے کہ کیا یہ قرآن، جس کو تمھارے رب نے اس اہتمامِ خاص کے ساتھ تمھاری ہدایت کے لیے اتارا ہے اس بے اعتنائی کا سزاوار ہے جو تم اس سے برت رہے ہو!

مطلب یہ ہے کہ تم اتنے بدذوق و بے بصیرت تو نہیں ہو چکے ہو کہ گہر اور پشیز میں کوئی تمیز نہ رہ گئی ہو۔ تمیز تو ہے لیکن تم قرآن کو قبول کرنا نہیں چاہتے اس وجہ سے اس کو کاہنوں کی طرح کا کلام قرار دے کر نظرانداز کر رہے ہو تو کر دیکھو لیکن یاد رکھو کہ تمھارے نظرانداز کرنے سے یہ حقیقت نابود نہیں ہو جائے گی۔ حقیقت بہرحال حقیقت ہے اور اس سے تمھیں سابقہ پیش آکے رہے گا۔ یہ تمھارے ہی حق میں بہتر ہوتا اگر تم اس کی قدر کرتے۔

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (۸۲)

رزق سے مراد قرآن ہے

یہاں 'رزق' سے مراد ہمارے نزدیک وحیِ الٰہی یا بالفاظِ دیگر قرآن ہے جس پر بحث چلی آ رہی ہے۔ وحیِ الٰہی کو قدیم صحیفوں میں بھی جابجا رزق سے تعبیر فرمایا گیا ہے اور قرآن میں بھی۔ اس کے حوالے اس کے محل میں ہم دے چکے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ "انسان صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمہ سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔" قرآن میں بھی اس کو زندگی سے تعبیر فرمایا گیا ہے: 'اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ' (الانفال - ۸: ۲۴) (اور لبیک کہو اللہ و رسول کی دعوت پر جب کہ رسول تمھیں بلا رہا ہے اس چیز کی طرف جو تمھیں زندگی بخشنے والی ہے)۔ آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے تو تمھارے لیے مائدۂ آسمانی اتارا کہ تم اس سے حیاتِ جاوداں حاصل کرو لیکن تمھاری محرومی ہے کہ تم اس کی ناقدری اور تحقیر کر رہے ہو۔

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ۝ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ۝ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۸۳-۸۷)

خدا کے قبضۂ قدرت سے کوئی باہر نہیں ہے

یعنی اس ڈھٹائی سے تم قرآن کا جو مذاق اڑا رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ جس جزا و سزا سے یہ تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ محض ایک ڈراوا ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، نہ تم کسی کے محکوم ہو اور نہ تمھیں کسی کے آگے اپنے کسی قول و فعل سے متعلق کوئی جواب دہی کرنی ہے تو اپنے آپ کو یا اپنے کسی محبوب سے محبوب کو موت کے پنجے سے کیوں نہیں بچا لیتے؟ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو اس وقت تو

تم اپنے آپ کو بالکل ہی بے بس پاتے ہو اور جان فرشتۂ اجل کے حوالہ کرنی پڑتی ہے تو اپنی اس بے بسی کا مشاہدہ کرتے ہوئے تم نے اپنے آپ کو مطلق العنان اور شتر بے مہار کیوں سمجھ رکھا ہے؟ اوپر آیت ۶۰ میں فرمایا ہے: نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ (ہم نے تمھارے درمیان موت مقدر کر رکھی ہے اور ہم کسی جان کو پکڑنے سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں) وہی حقیقت یہاں دوسرے الفاظ میں ممثّل کر کے سمجھائی ہے کہ کوئی اپنے آپ کو مطلق العنان نہ سمجھے۔ کوئی خدا کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ سب موت کے اسیر ہیں اور یہ موت اسی لیے مقدر کی گئی ہے کہ وہ ہر متنفّس کو، ایک یوم موعود میں، خدا کے آگے پیش ہونے کے لیے جمع کرتی رہے۔

موت کے اسیر سب ہیں

'فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُومَ'۔ 'بَلَغَتْ' کا فاعل 'نفس' (جان) یہاں بربنائے قرینہ محذوف ہے۔ یعنی انسان کی جان جب نزع کے وقت حلق میں آ پھنستی ہے۔ سورۂ قیامہ میں بھی اسی طرح 'بَلَغَتْ' کا فاعل محذوف ہے: فَإِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ (القیٰمۃ - ۷۵: ۲۶) (پس جب کہ جان پسلی میں آ پھنسے گی) بلاغت کے پہلو سے اس حذف کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ واقعہ کا ہول، ابہام کے سبب سے، زیادہ مؤثر ہو کر سامنے آتا ہے۔

'لَوْلَا' کا جواب آگے نہایت مؤثر انداز میں آ رہا ہے۔

'وَأَنْتُمْ حِينَئِذٍ تَنْظُرُونَ'۔ یعنی یہ نہیں ہوتا کہ یہ حادثہ دوسروں کی بے خبری میں پیش آ جاتا ہو بلکہ مبتلائے نزع کے اعزہ و اقربا، اس کے سارے محب و محبوب، اس کے معالج اور ڈاکٹر اس کے پاس موجود ہوتے ہیں لیکن موت کا فرشتہ ان سب کے سامنے سے اس کی جان نکال کے لے کر چلا جاتا ہے اور کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر وہ پاس موجود ہوتے تو فرشتۂ اجل کا ہاتھ پکڑ لیتے بلکہ ان کی ساری جاں نثاریاں اور تمام تدبیریں بالکل بے سود ہو کے رہ جاتی ہیں۔

'وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلَٰكِنْ لَا تُبْصِرُونَ'۔ 'إِلَيْهِ' میں ضمیر کا مرجع مبتلائے نزع شخص ہے۔ یعنی تم تو اس کے پاس ہوتے ہی ہو، تم سے زیادہ قریب اس کے ہم ہوتے ہیں لیکن تم ہم کو نہیں دیکھتے۔ تم کو اپنے ڈاکٹر کا ہاتھ نظر آتا ہے لیکن ہمارے فرشتہ کا ہاتھ نظر نہیں آتا کہ وہ کس چابکدستی سے اس کی جان نکال لیتا ہے۔

'فَلَوْلَا إِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِينِينَ ۝ تَرْجِعُونَهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ'۔ یہ اس 'لَوْلَا' کا جواب ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ چونکہ شرط اور اس کے جواب میں دوری ہو گئی تھی اس وجہ سے اس کو پھر دہرا دیا ہے۔ فرمایا کہ اگر تم یہ گمان رکھتے ہو کہ تم کسی ایسے کے محکوم و مقہور نہیں ہو جو تم کو پکڑ سکے اور سزا دے سکے تو اس جان کو لوٹا کیوں نہیں لیتے جس کو تمھاری آنکھوں کے سامنے ہمارا فرشتہ نکال لیتا ہے۔ 'مَدِين' کے معنی محکوم اور مقہور (UNDER CONTROL) کے ہیں۔

فَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُقَرَّبِيۡنَ ۙ فَرَوۡحٌ وَّرَيۡحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيۡمٍ (٨٨-٨٩)

موت کے بعد کے مراحل

یعنی اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ جو مرگیا اس کا قصہ ہمیشہ کے لیے تمام ہوا بلکہ اصل مرحلہ اس کے بعد سامنے آئے گا جو اوپر وَّكُنۡتُمۡ اَزۡوَاجًا ثَلٰثَةً ( ) کے الفاظ سے بیان ہوا۔ یعنی اس کا معاملہ تین شکلوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ مقربین میں سے ہوگا، یا اصحاب یمین میں سے، یا اصحاب شمال میں سے۔ فرمایا کہ اگر وہ مقربین میں سے ہوا تو اس کے لیے ابدی راحت و سرور اور نعمت کا باغ ہے۔ 'رَوۡح' کے معنی راحت کے ہیں اور 'رَيۡحَان' یہاں سرور کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں اس لفظ پر بحث گزر چکی ہے۔ 'رَيۡحَان' کے اصل معنی تو پھول کے ہیں لیکن یہ اپنے لوازم یعنی خوشبو اور سرور کے لیے بھی آتا ہے۔

وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ ۙ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ (٩٠-٩١)

اور اگر وہ اصحاب یمین میں سے ہوا تو اس کو اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں کی طرف سے داد ملے گی کہ اے صاحب یمین، تیرے لیے سلامتی اور مبارکی ہے۔

'فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنۡ اَصۡحٰبِ الۡيَمِيۡنِ' میں 'مِنۡ'، سلام کے صلہ کے طور پر نہیں آیا ہے، جیسا کہ عام طور پر مفسرین نے سمجھا ہے۔ بلکہ ضمیر خطاب کے بیان کے لیے آیا ہے اس وجہ سے میرے نزدیک اس ٹکڑے کا یہ ترجمہ صحیح نہیں ہوگا کہ 'تیرے لیے اصحاب یمین کی جانب سے سلام پہنچے' بلکہ عربیت کے صحیح قاعدے سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اے صاحب یمین تیرے لیے سلامتی ہو۔ اسی سلام و سلامتی کے اندر وہ سب کچھ ہے جو اوپر اصحاب یمین کے مرتبہ سے متعلق بیان ہوا ہے۔

وَاَمَّآ اِنۡ كَانَ مِنَ الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ ۙ فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ۙ وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ (٩٢-٩٤)

یہ اصحاب شمال کا انجام بیان ہو رہا ہے لیکن یہاں ان کا ذکر اصحاب شمال کے بجائے ان کے اصل جرم کے حوالہ سے 'الۡمُكَذِّبِيۡنَ الضَّآلِّيۡنَ' کے الفاظ سے ہوا ہے تاکہ ان کے انجام کے ساتھ ساتھ ان کے جرم کی نوعیت بھی واضح ہو جائے اور قریش کے مکذبین ضالین پر یہ پوری طرح منطبق بھی ہو جائے۔ اوپر آیت ٥١-٥٤ میں قریش کو مخاطب کر کے فرمایا ہے: ثُمَّ اِنَّكُمۡ اَيُّهَا الضَّآلُّوۡنَ الۡمُكَذِّبُوۡنَ لَاٰكِلُوۡنَ مِنۡ شَجَرٍ مِّنۡ زَقُّوۡمٍ ۙ فَمَالِـُٔوۡنَ مِنۡهَا الۡبُطُوۡنَ ۚ فَشٰرِبُوۡنَ عَلَيۡهِ مِنَ الۡحَمِيۡمِ ۚ وہی بات یہاں اختصار کے ساتھ فرمادی ہے۔ 'ضَآلُّوۡنَ' اور 'مُكَذِّبُوۡنَ' میں جو فرق ہے اس کی وضاحت ہم اوپر کر چکے ہیں۔

'فَنُزُلٌ مِّنۡ حَمِيۡمٍ ۙ وَّتَصۡلِيَةُ جَحِيۡمٍ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان لوگوں کی اولین ضیافت تو کھولتے پانی سے ہوگی۔ اس کے بعد ان کو جہنم کے اصل عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۚ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ (۹۵-۹۶)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تلقینِ صبر و استقامت اور پیامِ تسلی ہے کہ جو باتیں اوپر بیان ہوئیں سب یقینی حقائق ہیں۔ ان میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اگر تمھاری قوم کے لوگ نہیں مان رہے ہیں تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور اپنے ربِّ عظیم کی تسبیح کرو۔ اس تسبیح کے موقع و محل اور اس کے مفہوم پر آیت ۷۴ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اِحْسَانِہٖ۔

رحمان آباد

۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۷ء

۱۱۔ ذوالقعدہ ۱۳۹۷ھ

تدبرِ قرآن

٥٧

الحدید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— الواقعۃ ——— کی مثنیٰ ہے۔ اگرچہ دونوں میں مکی اور مدنی ہونے کے اعتبار سے فی الجملہ زمانی اور مکانی بُعد ہے لیکن معنوی اعتبار سے دونوں میں غایت درجہ ربط و اتصال ہے۔ سابق سورہ میں یہ اصولی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جزاء و سزا کا دن لازماً آکے رہے گا اور اس دن لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ سابقون اوّلون کا ہو گا، دوسرا اصحاب یمین کا، تیسرا اصحاب شمال کا۔

اس سورہ میں خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کو سابقین اوّلین کی صف میں اپنی جگہ پیدا کرنے پر ابھارا ہے اور اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے پہلے جو لوگ جہاد و انفاق کریں گے وہ سابقین کے زمرے میں شامل ہوں گے اور ان کا مرتبہ ان لوگوں سے اونچا ہو گا جو فتح مکہ کے بعد جہاد و انفاق کی سعادت حاصل کریں گے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ دونوں ہی سے اچھا ہے تاہم تقرب الٰہی کے اعتبار سے دونوں میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اسی ضمن میں ان مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے جو اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ایمان کے مقتضیات سے اچھی طرح آشنا نہ ہونے کے سبب سے، اس کے مطالبات پورے کرنے کے معاملے میں کمزور تھے۔ ان کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر دنیا کی محبت میں پھنس کر تم نے آخرت کی ابدی بادشاہی حاصل کرنے کا حوصلہ کھو دیا تو یاد رکھو کہ بالآخر یہود کی طرح تمہارے دل بھی سخت ہو جائیں گے اور تمہارا انجام وہی ہو گا جو ان کا ہوا۔

اس معنوی ربط کے ساتھ ساتھ دونوں صورتوں میں ظاہری ربط بھی نہایت واضح ہے۔ سابق سورہ کا خاتمہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ کے الفاظ پر ہوا ہے اور اس کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ... الآیۃ کے الفاظ سے ہوا ہے۔ گویا اُس کی آخری اور اِس کی پہلی آیت نے ایک حلقۂ اتصال کی شکل اختیار کر کے دونوں کو نہایت خوبصورتی سے باہم دگر مربوط کر دیا ہے۔ اس قسم کے ربط کی نہایت خوبصورت مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور یہ قرآن کے ایک منظّم و مربوط کتاب ہونے کا ایک واضح قرینہ ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) سورہ کی تمہید، جس میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عزّت، حکمت، قدرت، علم، خلق اور تدبیر کی طرف ایک جامع اشارہ ہے جس سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو ان صفات سے متّصف ہے وہی آخرت میں سب کا مرجع و مولیٰ بھی ہوگا اس وجہ سے وہی حمد و تسبیح کا سزاوار ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اسی کی تسبیح کر رہی ہے اور اپنے عمل سے انسانوں کو بھی دعوت دیتی ہے کہ وہ بھی اسی کی بندگی کریں اور اس بندگی میں کسی اور کو اس کا شریک نہ بنائیں۔

(۷-۱۰) مسلمانوں کو عموماً اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو خصوصاً یہ تنبیہ کہ رسول سے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا جو عہد انھوں نے کیا ہے اس کے تقاضے عزم و ہمت سے پورے کریں۔ آج اللہ کا رسول جہاد و انفاق کی جو دعوت دے رہا ہے اس پر لبیک کہنا ایمان کا بدیہی تقاضا ہے۔ یہی چیز لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گی۔ جو لوگ آج انفاق و جہاد کریں گے ان کا مرتبہ ان لوگوں سے اونچا ہوگا جو اس وقت جہاد و انفاق کریں گے جب مکّہ فتح ہو جائے گا۔ اگرچہ ان سے بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اچھا ہی ہوگا۔

(۱۱-۱۵) اللہ کی راہ میں انفاق قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے روشنی بنے گا جو اخلاص کے ساتھ انفاق کریں گے۔ اس روشنی سے وہ لوگ محروم رہیں گے جو نفاق کے سبب سے انفاق سے جی چراتے رہے۔ اس طرح کے لوگ ایمان والوں سے درخواست کریں گے کہ ذرا ہمیں بھی اپنی روشنی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیجیے لیکن ان کو جواب ملے گا کہ اس روشنی کو حاصل کرنے کا وقت پیچھے تھا جو تم نے کھو دیا۔ اب یہ چیز تمھیں نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوگی اور دوسری جانب اس کا عذاب بھڑک رہا ہوگا۔

(۱۶-۱۷) منافقین کو تہدید کہ اگر غلبۂ حق کی اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی تمھاری آنکھیں نہ کھلیں تم اسی طرح تردّد و تذبذب میں مبتلا اور خدا کی راہ میں انفاق سے جی چراتے رہے تو یاد رکھو کہ تمھارے دل بھی اسی طرح سخت ہو جائیں گے جس طرح یہود کے دل سخت ہو گئے اور پھر تمھارا انجام بھی وہی ہوگا جو ان کا ہوا۔ یاد رکھو کہ آخرت لازمی ہے۔ نہ اس کی جزا سے مایوس ہونا جائز ہے نہ اس کی سزا سے بے خوف ہونا۔

(۱۸-۱۹) جو لوگ اللہ کی راہ میں انفاق اور جہاد کرتے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو ضائع کرنے والا نہیں ہے بلکہ ان کی ہر قربانی کا صلہ ان کو مضاعف ہو کر ملے گا۔ یہی انفاق و جہاد زینہ ہے اس مرتبہ تک پہنچنے کا جو صدیقین و شہدا کے لیے خاص ہے اور اسی کے صلہ میں وہ روشنی ملے گی جس

سے منافقین محروم رکھے جائیں گے۔

(۲۰-۲۱) ان لوگوں کی پست حوصلگی اور تنگ دامنی پر اظہارِ افسوس جو اس دنیا کی چند روزہ لذتوں پر فریفتہ ہو کر اپنے رب کی مغفرت اور اس وسیع جنت کو بھول بیٹھے جس کی وسعت، زمین و آسمان کی وسعت کے مانند ہو گی۔

(۲۲-۲۴) اس حقیقت کی یاددہانی کہ فقر و غنا کا تعلق انسان کی اپنی سعی و تدبیر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تقدیر سے ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ وہ سختی و نرمی دونوں حالتوں میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے۔ اگر اس کو اللہ نے مال دے رکھا ہے تو وہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھے کہ اللہ کے اختیار میں جس طرح بخشنا ہے اسی طرح چھین لینا بھی ہے۔

(۲۵-۲۷) ان لوگوں کے زعم کی تردید جو مذہب کے رہبانی تصوّر کے تحت جہاد بالسّیف اور اس راہ میں انفاق کو دنیاداری سمجھتے اور مسلمانوں کے شوقِ جہاد پر طعن کر رہے تھے۔ نبیوں اور رسولوں کی تاریخ کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ جہاد انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور رہبانیّت نصاریٰ کی ایجاد کردہ بدعت ہے جو انھوں نے اپنے دین میں غلو کی راہ سے پیدا کی ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲۸-۲۹) مسلمانوں کو یہ تلقین کہ تم اللہ کے رسول کی دعوت پر لبّیک کہتے ہوئے سرفروشانہ جہاد کے لیے اٹھو اور اس راہ میں پوری فیاضی سے اپنے مال خرچ کرو۔ اہل کتاب میں سے جو مفسدین تمھارے دلوں میں یہ وسوسہ اندازی کر رہے ہیں کہ جہاد ایک دنیادارانہ کام ہے ان کی وسوسہ اندازیوں کو نظر انداز کرو۔ قیامِ عدل کے لیے جہاد ابتدا سے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور تم کو انہی کی سنت کی پیروی کی دعوت دی گئی ہے۔ نصاریٰ نے جو رہبانیّت ایجاد کی ہے اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ حسد کا بخار ہے جو تمھارے خلاف نکال رہے ہیں لیکن ان کے حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ تمھیں وہ مقام دے کر رہے گا جو اس نے تمھارے لیے مقدر کر رکھا ہے۔

سُوْرَۃُ الْحَدِیْدِ (۵۷)

مَدَنِیَّۃٌ ______ آیات: ۲۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ﴿۱﴾ آیات ۱-۶
لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ ۚ وَھُوَ عَلٰی
کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲﴾ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ
وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۳﴾ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۭ یَعْلَمُ
مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ
السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ۭ وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ۭ وَاللّٰہُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۴﴾ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَ
اِلَی اللّٰہِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ
النَّھَارَ فِی الَّیْلِ ۭ وَھُوَ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۶﴾

ترجمۂ آیات ۱-۶

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب و حکیم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور

باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱-۳

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکن ہوا۔ وہ جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب کو دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام امور کا مرجع اللہ ہی ہے۔ ۴-۵

وہی داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور وہ سینوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ ۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)

تسبیح کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلو

لفظ 'تسبیح' کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر تنزیہہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور بندگی و عبادت کا بھی۔ یہ چیز قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی۔ زبان سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا بھی تسبیح ہے اور نماز پڑھنا اور اس کے حضور میں قیام، رکوع اور سجود بھی تسبیح ہے۔ اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ کائنات کی ہر چیز کسی نہ کسی صورت میں اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن میں یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ جو انسان طوعاً تسبیح نہیں کرتے ہیں انھیں تکوینی دائرے میں کرہاً یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر لوگوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار اور دائرۂ تکوین میں بے ربطی نہ پیدا کریں۔ اس نکتہ کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

کائنات کی تمام چیزوں کی تسبیح کا حوالہ قرآن میں جہاں جہاں دیا گیا ہے وہ بالعموم تین مقاصد کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے۔

ایک یہ کہ لوگوں کو اس حق کی یاددہانی کی جائے کہ جب اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اپنے خالق و مالک کا حق پہچانتی اور اس کی تسبیح کرتی ہے تو انسان پر بدرجۂ اولیٰ یہ حق عائد ہوتا ہے

کہ وہ اپنے رب کی تسبیح کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ بخشا اور اپنی خلافت کی خلعت سے نوازا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ دنیا میں ناسپاسوں کی کثرت دیکھ کر بددل اور پست حوصلہ نہ ہوں۔ اگر انسانوں میں اپنے رب کا حق پہچاننے والے تھوڑے ہیں تو یہ چیز دل برداشتہ ہونے کی نہیں ہے۔ باقی ساری کائنات کی ہر چیز اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں سرگرم ہے۔ اس راہ کا مسافر تنہا نہیں ہے بلکہ قافلوں سے بھری ہوئی راہ یہی ہے۔

تیسرا یہ کہ ان لوگوں سے اظہارِ بے نیازی کیا جائے جو یاددہانی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بندگی سے گریز کر رہے ہیں اور ان کو بتایا جائے کہ اگر وہ خدا کی تسبیح نہیں کرتے ہیں تو خدا ان کی تسبیح کا محتاج نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے، اگر کچھ بدقسمت انسان اس سے گریز کر رہے ہیں تو وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنا ہی بگاڑ رہے ہیں۔

قرآن میں بعض جگہ یہ تینوں مطالب پیشِ نظر ہیں، بعض جگہ ان میں سے ایک یا دو مدِّنظر ہیں۔ ان میں امتیاز کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اگر سررشتۂ نظم پر نگاہ جمی رہے تو غور کرنے والا آسانی سے امتیاز کر لیتا ہے۔

صفاتِ عزیز وحکیم کے تقاضے

'وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ' یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ 'عزیز' اور ساتھ ہی 'حکیم' ہے اس وجہ سے وہی حق دار ہے کہ سب اسی کی تسبیح و بندگی کریں۔ 'عزیز' یعنی ہر چیز پر غالب، ہر اختیار کا مالک، کوئی نہیں جو اس کی دسترس سے باہر ہو، کوئی نہیں جو اس کو دبا سکے یا اپنے زور سے اس پر اثر انداز ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا ہر فعل حکمت، عدل اور رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے زور میں جو چاہے کر ڈالے خواہ اس میں کوئی حکمت و غایت ہو یا نہ ہو۔ یہ کائنات اس کی قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اور یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام میں اتھاہ حکمت پوشیدہ ہے۔ اس کی یہ حکمت مقتضی ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں کو صلہ عطا فرمائے جنھوں نے اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر زندگی گزاری اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کے حدود سے تجاوز کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو یہ اس کی عزّت و قدرت کے منافی ہے اور اگر کر سکنے کے باوصف نہ کرے تو یہ اس کی حکمت اور اس کے عدل و رحمت کے منافی ہے۔ اس کے بغیر یہ دنیا بازیچۂ اطفال اور ایک اندھیر نگری بن کے رہ جاتی ہے اور ایک عزیز و حکیم کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ اتنا بڑا کارخانہ محض کھیل تماشے کے طور پر بنا ڈالے۔

لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ ج وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲)

مزید صفات کا حوالہ
یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے ہاتھ میں ہے، کوئی دوسرا اس کے اقتدار میں ساجھی نہیں ہے کہ کسی قسم کی مداخلت کر سکے۔ 'یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ' وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔ یعنی جب زندگی اس کی بخشی ہوئی ہے اور موت بھی اسی کے حکم سے واقع ہوتی ہے تو اس کی بادشاہی میں کسی اور کی حصہ داری کی گنجائش کہاں سے نکلی!

'وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' یعنی کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے کہ وہ کسی معاون و مددگار کا محتاج ہو۔ اپنی مملکت کے ایک ایک چپہ پر وہ خود قابض و متصرّف ہے اور جو چاہے براہ راست اپنے کلمۂ کُن سے کر سکتا ہے۔

ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ ج وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ (۳)

احاطۂ قدرت کے بعد یہ اس کے احاطۂ علم کا بیان ہے کہ وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے۔ جب کچھ نہیں تھا وہ تھا اور جب کچھ نہیں ہوگا تب بھی وہ ہوگا۔ اسی نے ہر چیز کا آغاز کیا ہے اور بالآخر ہر چیز کی وراثت اسی کو لوٹنے والی ہے۔

'وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ' کی تفسیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے: 'انت الظاھر فلیس فوقک شیٔ وانت الباطن فلیس دونک شیٔ' (تو ظاہر ہے پس کوئی چیز تجھ سے اوپر نہیں اور تو باطن ہے پس کوئی چیز تجھ سے اوجھل نہیں) آیت ۱۳ میں یہ الفاظ بالکل اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں جس معنی میں ہم اندر باہر کے الفاظ بولتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کا علم اندر و باہر ہر چیز کو محیط ہے۔

'وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ' یہ ایک کلیہ کی شکل میں خلاصہ سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے لیے ظاہر و باطن سب یکساں ہے۔

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ط یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْھَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْھَا ط وَھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَ مَا کُنْتُمْ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۴)

اس کائنات پر اللہ تعالیٰ کے کامل تصرف کا بیان
یہ اس احاطۂ علم و قدرت کی مزید تفصیل ہے کہ اللہ ہی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے اور ان کو پیدا کر کے ان کا انتظام دوسروں کے سر ڈال کر وہ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ وہ بذاتِ خود عرشِ حکومت پر متمکن ہو کر سارے انتظام کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ 'عرش' تعبیر ہے زمامِ اقتدار اور حکومت کی۔ 'فِیْ سِتَّۃِ اَیَّامٍ' کی وضاحت ہم دوسرے مقامات میں کر چکے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے ایام نہیں بلکہ خدائی ایام ہیں۔

قرآن میں جہاں کہیں آسمانوں اور زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر آیا ہے اس سے

مقصود اس اہتمام خاص کی طرف ہم کو متوجہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام سے پیدا کی ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس کو پیدا کر کے وہ اس سے بالکل بے تعلق ہو کے بیٹھ رہے؛ نہ اس کے خیر سے اسے کوئی دلچسپی رہے، نہ اس کے شر سے اسے کوئی تعلق، لوگ جو دھاندلی چاہیں اس میں مچاتے پھریں اور وہ خاموش تماشائی کی طرح تماشا دیکھتا رہے! اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے یہ ساری کائنات محض ایک کھیل کے طور پر بنائی ہے جس میں اہتمام تو اس نے بہت صرف کیا مگر اس کا مقصد کچھ بھی نہیں۔

یَعۡلَمُ مَا یَلِجُ فِی الۡاَرۡضِ وَمَا یَخۡرُجُ مِنۡہَا وَمَا یَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعۡرُجُ فِیۡہَا ؕ وَہُوَ مَعَکُمۡ اَیۡنَ مَا کُنۡتُمۡ ؕ وَاللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ۔ یہ وضاحت ہے اس بات کی کہ وہ نہایت بیدار مغزی اور جزرسی کے ساتھ اپنی مملکت کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ فرمایا کہ زمین میں جو چیز داخل ہوتی ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے اور جو چیز نکلتی ہے اس کو بھی جانتا ہے۔ اسی طرح جو چیز آسمان سے اترتی ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے اس سے بھی وہ باخبر ہوتا ہے۔ نیز تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَاِلَی اللّٰہِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ (۵)

یعنی اللہ تعالیٰ صرف ہر چیز سے واقف ہی نہیں ہے بلکہ عملاً تمام امور کا مرجع و ماویٰ بھی وہی ہے۔ سارے امور اسی کے حکم سے جاری ہوتے ہیں اور پھر ان سب کی رپورٹ اسی کے آگے پیش ہوتی ہے۔ اس کے کارندے جملہ ہدایات کے لیے اسی سے رجوع کرتے اور اپنی کارگزاریاں اسی کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ نہ کوئی اپنی صوابدید پر کچھ کرنے کا مجاز ہے اور نہ کوئی اس کے آگے مسئولیت سے بری ہے۔

یُوۡلِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَیُوۡلِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَہُوَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ (۶)

یعنی یہ رات اور دن کا چکر جو چل رہا ہے نہ اپنے آپ چل رہا ہے اور نہ کوئی اور اس کو چلا رہا ہے بلکہ یہ اللہ ہی ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور نکالتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے تعاقب میں برابر سرگرم تگاپو ہیں۔

وَہُوَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ یعنی جب دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں کا لانے والا وہی ہے۔ وہی دن کی روشنی نمودار کر کے رات کی عالم گیر تاریکی کو کافور اور اس کی ڈھانکی ہوئی ہر چیز کو بے نقاب کرتا ہے تو اس سے کوئی چیز کس طرح مخفی رہ سکتی ہے۔ وہ ہر مخفی سے مخفی راز یہاں تک کہ سینوں کے بھیدوں سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔

۲- آگے آیات ۷-۱۵ کا مضمون

آگے ان مسلمانوں کو مخاطب فرمایا ہے جو کلمہ پڑھ کر اور 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا اقرار کرکے مسلمانوں کے زمرے میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن جب انفاق و جہاد کا مرحلہ سامنے آیا تو وہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں بودے ثابت ہوئے۔ اس طرح کے کمزور مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے آئینہ میں اپنے کردار کا جائزہ لیں اور جس ایمان کا انھوں نے اظہار کیا ہے اس کے مطالبے پورے کریں۔ آج اگر وہ چاہیں تو رسول کی دعوتِ انفاق و جہاد پر لبیک کہہ کے اپنا مقام سابقینِ اسلام کی صف میں محفوظ کر سکتے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ ان کا حشر منافقین کے ساتھ ہوگا اور جو فرصت آج وہ کھو دیں گے اس کے پا سکنے کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ آیات ۷ - ۱۵
فِيْهِ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۷﴾ وَمَا
لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ
وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِيْ
يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖۤ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ
اِلَى النُّوْرِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹﴾ وَمَا لَكُمْ اَلَّا
تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ؕ اُولٰٓئِكَ
اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ؕ وَ
كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۰﴾ ع مَنْ ع ۱ ۱۷
ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ
اَجْرٌ كَرِيْمٌ ۚ ﴿۱۱﴾ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى

نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ﴿۱۲﴾ يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا
انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ
فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ
فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ يُنَادُوْنَهُمْ
اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ
اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ
فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ؕ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۵﴾

ترجمۂ آیات ۷ - ۱۵

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں اس نے تم کو امین بنایا ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور خرچ کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لا رہے ہو درآنحالیکہ رسول تم کو تمھارے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکا ہے، اگر تم مومن ہو! ۷ - ۸

وہی ہے جو اتار رہا ہے اپنے بندے پر واضح آیات تاکہ تمھیں نکالے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور بے شک اللہ تمھارے حال پر نہایت ہی شفیق اور مہربان

ہے۔ اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کو لوٹنے والی ہے! تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے انفاق و جہاد کریں گے اور جو بعد میں انفاق و جہاد کریں گے یکساں نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کا درجہ ان سے بڑا ہوگا جو بعد میں انفاق اور جہاد کریں گے۔ اگرچہ اللہ کا وعدہ ان میں سے ہر ایک سے اچھا ہی ہے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۹-۱۰

کون اٹھتا ہے کہ اللہ کو قرض دے اچھا قرض کہ وہ اس کو اس کے لیے بڑھائے اور اس کے لیے باعزت صلہ ہے! اس دن کو یاد رکھو جس دن ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے داہنے چل رہی ہو گی ——— تمھارے لیے آج کے دن خوش خبری ہے باغوں کی جن میں نہریں جاری ہوں گی ان میں ہمیشہ رہو گے! یہی دراصل بڑی کامیابی ہے! جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں کو آواز دیں گے کہ ذرا ہمیں بھی موقع عنایت کیجیے کہ ہم آپ کی روشنی سے فائدہ اٹھا لیں! ان کو جواب ملے گا کہ تم پیچھے لوٹو اور وہاں روشنی تلاش کرو۔ پس ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا۔ اس کے اندر کی جانب میں رحمت ہو گی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہو گا۔ یہ ان سے فریاد کریں گے کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں تھے ؟ وہ جواب دیں گے کہ ساتھ تو تھے لیکن تم نے اپنے کو فتنوں میں مبتلا رکھا، ہمارے لیے گردشوں کے انتظار میں رہے، شبہات میں مبتلا رہے اور آرزوؤں نے تمھیں دھوکے

میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو گیا اور فریب دینے والے نے تمھیں اللہ کے باب میں مبتلائے فریب ہی رکھا۔ پس آج نہ تو تم سے کوئی فدیہ قبول ہو گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تم سب کا ٹھکانا آگ ہے۔ وہی تمھارا مرجع ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے!! ۱۱-۱۵

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ (۷)

عام خطاب سے منافقین کو تنبیہ

'اٰمِنُوْا' کا خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن آگے قرائن سے واضح ہو جائے گا کہ روئے سخن درحقیقت خام قسم کے مسلمانوں اور منافقین کی طرف ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ تو کر بیٹھے لیکن جب اس ایمان کے مطالبے، انفاق اور جہاد کی صورت میں، سامنے آئے تو ان سے کترانے اور منہ چھپانے لگے۔ اس طرح کے مدعیانِ ایمان سے خطاب کر کے فرمایا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ ظاہر ہے کہ یہاں فعل 'اٰمِنُوْا' اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے جس طرح 'يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا' (اے وہ لوگو جو ایمان کے مدعی ہو سچا اور پکا ایمان لاؤ) میں ہے۔ فعل کے اپنے ابتدائی معنی اور اپنے کامل معنی میں استعمال کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

ایمان کا لازمی تقاضا

'وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ' یہ اس ایمان کا لازمی تقاضا بھی بیان ہوا ہے اور اس کی نہایت واضح عقلی اور فطری دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان کا حق صرف 'اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ' کے اقرار و اظہار سے نہیں ادا ہو جاتا بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال و جان کی قربانی کی دعوت دی جائے تو اس پر لبیک کہو۔ جو لوگ مال بھی خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ان سے جان کی قربانی کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے! اور جو نہ مال قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں نہ جان، ان کے دعوائے ایمان کی کیا وقعت ہے۔

مال اللہ تعالیٰ کی امانت ہے

'مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ' یعنی اس مال کے متعلق تمھیں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ تم نہ تو اس کے خالق ہو نہ مالک بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمھیں اس میں خلیفہ بنایا ہے کہ تم اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر اس میں تصرف کرو اور اس کے حضور میں اس کی پائی پائی کی جواب دہی

کے لیے تیار رہو۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم اس مال کے خالق و مالک نہیں بلکہ صرف اس کے امین ہو تو جب اس مال کے خرچ کرنے کا مطالبہ اسی کی طرف سے ہو رہا ہے جس نے تم کو اس کا امین بنایا ہے تو اس میں لیت و لعل کرنے کے کیا معنی؟

انفاق ایمان کی تصدیق ہے

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَاَنْفَقُوْا لَھُمْ اَجْرٌ کَبِیْرٌ۔ یہاں 'اٰمَنُوْا' کے بعد 'اَنْفَقُوْا' ایمان کی تصدیق اور شہادت کے طور پر آیا ہے۔ یعنی جو لوگ ایمان کا اظہار کرنے کے بعد اپنے 'انفاق' سے اپنے اس اقرار کی تصدیق کر دیں گے وہ مطمئن رہیں کہ ان کا یہ سودا خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ اللہ کے ہاں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ وہ ایک کا دس پائیں گے تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے وہ کیوں گھبرائیں۔

یہاں وہ بات یاد رہے جس کی طرف اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ سورہ کی تمہید میں جو صفاتِ الٰہی بیان ہوئی ہیں وہ بمنزلہ ایک آئینہ کے ہیں تاکہ اس کو سامنے رکھ کر وہ لوگ اپنے اخلاق و کردار کو سنواریں جنھوں نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے۔ اوپر ارشاد ہوا ہے کہ اللہ ہی اوّل و آخر ہے اور ساری چیزیں اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو اس دنیا میں انسان کو جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا امین ہے تو جب اصل مالک اللہ ہے تو اس کا مال اسی سے دریغ رکھنے کے کیا معنی!

وَمَا لَکُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ج وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّکُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۸)

یہ اس طرح کے کمزور مسلمانوں کے لیے نصیحت باندازِ ملامت ہے کہ جب تم رسول سے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا عہد کر چکے ہو تو اس عہد کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم اترے اور رسول جس بات کی دعوت دیں اس پر 'اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' کہتے ہوئے عمل کرو لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ رسول، اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دے رہا ہے اور تم منہ چھپاتے پھر رہے ہو! تو یہ کس قسم کا عہد اور کس نوع کا ایمان ہے! اور جب آج تمھارے ایمان اور عہد کا یہ حال ہے جب کہ رسول تمھارے اندر موجود ہے اور بذاتِ خود تمھیں ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی دعوت دے رہا ہے تو کل تمھارا کیا حال ہوگا جب رسول تمھارے درمیان موجود نہیں ہوگا۔

اس آیت سے دو باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آئیں۔

ایک یہ کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی ہر اس چیز پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اور رسول نے جس کی دعوت دی۔ ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار بھی سب کے انکار کے ہم معنی ہے۔

دوسری یہ کہ ایمان عمل ہی سے متشکل اور وجود پذیر ہوتا ہے اور انفاق کو اس کے نشو و نما اور اس کے تغذیہ و تقویت میں خاص دخل ہے چنانچہ اسی بنا پر یہاں انفاق کی دعوت کو ایمان کی دعوت سے تعبیر فرمایا ہے۔

میثاق سے سمع و طاعت کا عہد مراد ہے — 'میثاق' سے مراد میرے نزدیک یہاں سمع و طاعت کا وہ عہد ہے جو ہر مسلمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے وقت کرنا پڑتا۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اس عہد کی طرف معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۸۱ میں ہے۔ میں نے اس پر غور کیا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ دوسرے سیاق و سباق کی بات ہے، یہاں اس کا محل نہیں ہے۔ میرے خیال کی تائید سورۂ مائدہ کی آیت، سے بھی ہوتی ہے: وَاذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (پس اپنے اوپر اللہ کے فضل اور میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا اور تم نے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کہہ کر اس کا اقرار کیا)۔

هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹)

انفاق تاریکی سے روشنی میں لاتا ہے — یعنی رسول تمھیں انفاق کی جو دعوت دے رہے ہیں اس کو گراں اور اپنے لیے نقصان رساں سمجھ کر اس سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر یہ روشن آیتیں اس لیے نازل فرما رہا ہے کہ تمھیں خواہشاتِ نفس اور حُبِّ دنیا کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان اور حُبِّ آخرت کی روشنی میں لائے۔ یہ نہ گمان کرو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں نقصانات اور مشقتوں میں ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ رؤف رحیم ہے۔ وہ تمھاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہبود کی راہ کھول رہا ہے نہ کہ تمھیں کسی زحمت و مشقت میں ڈال رہا ہے۔

'اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ' سے مراد یوں تو وہ ساری ہی تعلیمات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے لوگوں کو مل رہی تھیں لیکن یہاں خاص طور پر ان آیات کی طرف اشارہ ہے جو انفاق و جہاد سے متعلق ہیں اور جن کا ایک حصہ آگے اس سورہ میں بھی نہایت روشن دلائل کے ساتھ آ رہا ہے۔

'ظُلُمٰت' سے مراد شہواتِ نفس اور حُبِّ دنیا کی تاریکیاں ہیں جن کا واحد علاج اللہ کی راہ میں انفاق ہے اور 'نُور' سے وہ نور مراد ہے جو انفاق سے پیدا ہوتا ہے اور جس کا ذکر آگے آیت ۱۲ میں آ رہا ہے۔

'رَءُوْف' اور 'رَحِيْم' کی وضاحت ان کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ پہلے میں دفعِ شر کا پہلو غالب ہے، دوسرے میں اثباتِ خیر کا۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ

وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۱۰)

ترغیبِ انفاق کی دو دلیلیں

یہ انہی کمزور قسم کے مسلمانوں کو انفاق پر ابھارا ہے اور اس مقصد کے لیے دو دلیلیں انفاق کے محرک کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ ایک وہی جس کی طرف اوپر آیت ۷ کے تحت اشارہ گزر چکا ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس دنیا میں انسان کو جن چیزوں پر بھی تصرّف حاصل ہوتا ہے وہ بالکل عارضی طور پر، اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور امین کی حیثیت سے، حاصل ہوتا ہے۔ بالآخر ہر چیز اللہ ہی کی طرف لوٹ جانے والی ہے تو جب انسان کی حیثیت چند روزہ امین کی ہوئی تو امانت کے مال پر مارِ گنج بن کر بیٹھ جانے کے کیا معنی! پھر تو اس کے لیے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ بخل کرے نہ کرے لیکن جس نے اس کی تحویل میں اپنی امانت رکھی ہے اس کو، جب وہ طلب کرے، پوری فیاضی کے ساتھ دے۔

دوسرا یہ کہ حالات کے تغیر سے اعمال کی قدر و قیمت میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ آج جب کہ کفر اور اہلِ کفر کا مکّہ پر غلبہ ہے (واضح رہے کہ یہ سورۂ فتحِ مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے) اور قریش کی ہیبت بدستور عرب پر قائم ہے جو لوگ اسلام کو غالب کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کریں گے اور جنگ میں حصّہ لیں گے ان لوگوں کا درجہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان سے کہیں زیادہ بلند ہو گا جو فتحِ مکّہ کے بعد، جب کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے گا، انفاق اور جہاد کریں گے۔ بڑے ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آج کے کٹھن حالات میں اسلام کی خدمت کی توفیق پائیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں یہ موقع حاصل ہوا ہے تو اس کو اپنی پست حوصلگی سے ضائع نہ کرو بلکہ ہمت کر کے اسلام کے سابقین اوّلین اور اللہ تعالیٰ کے مقرّبین میں اپنی اپنی جگہ محفوظ کرنے کی کوشش کرو۔

سورۂ واقعہ میں یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ سابقین و مقرّبین کے زمرے میں زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہو گی جنھوں نے اسلام کی غربتِ اولیٰ کے دور میں اولوالعزمی کے ساتھ اس کی خدمت کی توفیق پائی۔ بعد کے ادوار کے لوگوں میں سے تھوڑے ہی لوگوں کو ان کے زمرے میں جگہ ملے گی اور یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو بڑے سخت امتحانوں سے گزرنا پڑا ہو اور انھوں نے دین کی راہ میں کوئی بہت بڑی بازی کھیلی ہو۔

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ۔ یعنی وعدہ تو اللہ کا دونوں ہی سے اچھا ہے۔ فتح مکہ کے بعد بھی اسلام کے لیے قربانیاں کرنے والوں کے لیے ان کی خدمات کے اعتبار سے درجے اور مرتبے ہیں۔ حسنِ نیت اور اخلاص کے ساتھ جو لوگ بھی اسلام کی خدمت کریں گے وہ اپنی قربانیوں کا صلہ پائیں گے بلکہ ان میں سے ایسے لوگ بھی نکلیں گے جو اگلوں کی صف میں جگہ حاصل کریں گے تاہم فتح مکہ سے پہلے کا دور اور ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس دور کی قدر پہچانیں اور اس سے صحیح فائدہ اٹھائیں۔

فتح سے فتح مکہ مراد ہے

یہاں 'فتح' سے مراد ظاہر ہے کہ فتح مکہ ہی ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے صلح حدیبیہ بھی مراد لی ہے لیکن صلح حدیبیہ کی حیثیت اصل فتح کی نہیں بلکہ فتح مکہ کی تمہید کی ہے۔ لفظ 'فتح' سے ذہن فتح مکہ ہی کی طرف جاتا ہے۔ اس جدوجہد کے دوران میں ہر مسلمان کے دل میں یہ بات بطور ایک عقیدہ کے راسخ تھی کہ بعثتِ محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اصل مقصود بیت اللہ کو، کفر و شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں خلق کے سامنے نمایاں کرنا ہے۔ چنانچہ ہر سچے مسلمان کو اس واقعہ کے ظہور کا ارمان بھی تھا اور انتظار بھی۔ صرف منافقین اپنے تھڑدلے پن کے سبب سے مذبذب تھے۔ ان کے اس تذبذب کا ذکر آگے ان کے نفاق کی دلیل کی حیثیت سے آ رہا ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ (۱۱)

جہاد کے لیے مالی اعانت کی نہایت مؤثر اپیل

اب یہ نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں جہاد کے لیے مالی اعانت کی اپیل ہے کہ کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسن دینے کے لیے اٹھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھائے اور اس کو باعزت اجر عطا فرمائے۔ لفظ 'قرض' سے اگرچہ عام انفاق بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہاں سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اس سے جہاد کے لیے مالی اعانت ہی مراد ہے۔ آگے ہم اس کے بعض قرائن کی طرف ان شاء اللہ اشارہ کریں گے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لیے قرض کے لفظ میں جو اپیل ہے وہ محتاجِ وضاحت نہیں ہے۔ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی سپرد کردہ امانت ہے۔ اب یہ کتنا بڑا فضل ہے اس ربِ کریم کا کہ وہ اپنا ہی عطا کیا ہوا مال اپنی راہ میں خرچ کرنے کی جب بندوں کو دعوت دیتا ہے تو اس کو اپنے ذمہ قرض ٹھہراتا ہے جس کی واپسی کا وہ گویا اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح ایک قرض دار اپنے مہاجن کی رقم کی واپسی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

'فَیُضٰعِفَہٗ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ یہ قرض اس لیے نہیں مانگ رہا ہے کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے، جب سب کچھ اسی کا پیدا کردہ اور اسی کا عطا کردہ ہے تو اس کے پاس کمی کا کیا سوال! بلکہ وہ تو صرف اس لیے مانگ رہا ہے کہ لوگوں کے عطا کردہ مال کو وہ اپنے بنک میں جمع کر کے اس کو اچھی طرح بڑھائے تاکہ اس کا منافع ایک ابدی زندگی میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سرمایہ کی صورت میں ان کے کام آئے۔ اس اسلوبِ بیان میں سود خواروں پر جو تعریض ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اپنا سرمایہ اس دنیا کے بنک میں جمع کرتا ہے تو یہ دنیا اور اس کا سرمایہ، ہر چیز چند روزہ ہے البتہ جو اپنا مال اپنے رب کے پاس جمع کرتے ہیں ان کا منافع ابدی اور ہر اندیشہ سے محفوظ ہے۔

'مُضَاعَفَۃ'، کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے دگنا کرنا کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنی

بڑھانے کے ہیں۔ یہ بڑھانا دگنا، چوگنا، دس گنا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہوسکتا ہے۔ اس کا تعلق دینے والے کے خلوص اور ان حالات سے ہے جن میں وہ مال دیا گیا ہے اور سب سے زیادہ اس ربِّ کریم کے فضل سے ہے جس نے اپنے بندوں کے لیے ابدی منفعت کی یہ راہ کھولی ہے۔

قرضِ حسن کے شرائط

اس کے ساتھ یہاں صرف ایک شرط لگائی ہے کہ یہ قرض 'قرضِ حسن' ہو۔ قرآن میں اس کی وضاحت میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرض، 'قرضِ حسن' اس شکل میں بنتا ہے جب دل کی پوری فراخی اور بلند حوصلگی کے ساتھ دیا جاتا ہے، دل کی تنگی کے ساتھ محض مارے باندھے یا دکھاوے کے لیے نہیں دیا جاتا، اچھے مال میں سے دیا جاتا ہے، محض چھیدا اتارنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جاتا ہے، کسی غرض دنیوی کے لیے نہ دیا جاتا ہے اور نہ دینے کے بعد اس کے دیے جانے پر احسان جتایا جاتا یا کسی پہلو سے کوئی دل آزاری کی جاتی ہے۔

'وَلَہٗٓ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ'۔ یعنی اس کے دیے ہوئے مال میں جو بڑھوتری ہوگی وہ تو ہوگی ہی، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ خاص اپنے فضل سے بھی اس کو نہایت باعزت اجر دے گا۔ اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی نُوۡرُہُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَبِاَیۡمَانِہِمۡ بُشۡرٰىكُمُ الۡیَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (۱۲)

انفاق قیامت کے دن روشنی بنے گا

یہ اسی باعزت صلہ کے ایک خاص پہلو کی وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کی رہنمائی جنت کی طرف روزِ حشر اس طرح کرے گا کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور داہنے چل رہی ہوگی اور وہ اس روشنی میں جنت کی طرف بڑھیں گے جب کہ دوسرے لوگ جنھوں نے یہ روشنی اپنے اندر نہیں پیدا کی ہوگی تاریکی میں گھرے ہوئے ہوں گے۔

آیات کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ روشنی اسی انفاق کے فیض سے حاصل ہوگی جس کی یہاں دعوت دی جارہی ہے۔ اوپر آیت ۹ 'ھُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ' کے تحت ہم اشارہ کرچکے ہیں کہ 'اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ' سے اشارہ یہاں خاص طور پر ان آیات کی طرف ہے جو انفاق کی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے لیے نازل ہوئیں۔ اسی انفاق سے نفاق کی جڑ کٹتی ہے اور اسی سے وہ نورِ حکمت عطا ہوتا ہے جو اس دنیا کی تاریکیوں میں بھی انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور آخرت میں بھی یہ رہنمائی کرے گا۔

'سعی' یہاں دوڑنے کے مفہوم میں نہیں ہے۔ یہ لفظ کسی کام کے سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ہونے یا اس کو مستعدی کے ساتھ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال اسی معنی میں ہے۔ یہاں

یہ اسی مفہوم میں ہے۔ یہ نور صرف ان کے آگے اور ان کے داہنے پھیلے گا، بائیں جانب اس کا عکس نہیں پڑے گا تاکہ اصحاب الشمال اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ آگے ان کی اس نور سے محرومی کا ذکر آ رہا ہے۔

'بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'۔ یہ بشارت صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور فرشتوں کی زبانی بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں نظائر دونوں کی تائید میں موجود ہیں۔

'ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ'۔ یعنی اگر کسی کو اللہ نے مال بخشا ہے تو اس سے وہ سب سے بڑا فائدہ جو حاصل کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اپنے دل کے اندر وہ روشنی پیدا کرے جو قیامت کے اندھیرے میں اس کی رہنمائی کرے۔ اس کے سوا جتنے فائدے بھی ہیں وہ وقتی اور عارضی ہیں اور ان کے اندر جو ضرر مضمر ہے وہ دائمی اور ابدی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلہ ہے تو اس 'فوزِ عظیم' کو حاصل کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کرو۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۱۳)

منافقین کی نور سے محرومی

اس دن منافقین کا حال یہ ہوگا کہ وہ اندھیرے میں بھٹک رہے ہوں گے۔ انھوں نے اللہ کی راہ میں انفاق کر کے وہ روشنی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جو آخرت میں ان کے کام آتی۔ وہ جب دیکھیں گے کہ ایک گروہ ان لوگوں کا، جن کے اندر وہ دنیا میں رہے بسے، اپنے ساتھ ایسی روشنی رکھتا ہے جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کی رہنمائی کر رہی ہے تو وہ نہایت حسرت کے ساتھ ان سے درخواست کریں گے کہ ذرا ہمیں بھی قریب پہنچ لینے دیجیے کہ ہم بھی آپ کی روشنی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کو جواب ملے گا کہ اس روشنی سے فائدہ اٹھانے کی تمنا نہ کرو۔ پیچھے پلٹو اور وہاں روشنی تلاش کرنے کی کوشش کرو اگر کر سکتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس روشنی کے حاصل کرنے کی جگہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے اب اس کو پانے کا وقت گزر چکا۔ تمھارے لیے اب حسرت، ندامت اور اس تاریکی کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس قول کو العیاذ باللہ محض ایک حکمہ سمجھا ہے لیکن یہ حکمہ نہیں بلکہ بیان حقیقت ہے۔ کسب و اکتساب کی جگہ یہ دنیا ہے۔ جس نے اس میں نیکی کی کمائی نہیں کی آخرت میں اس کا حصہ صرف محرومی ہے۔

اس جواب کے بعد فوراً ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں صرف ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کے حصہ میں رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی جانب

عذاب ہوگا۔ اہلِ ایمان اس دروازے سے رحمت والے حصہ میں چلے جائیں گے اور منافقین عذاب کی تاریکی میں گھر جائیں گے۔ اس قسم کی ایک دیوار کا ذکر سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو وہاں دیکھیے۔

یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۱۴)

منافقین کی فریاد اور ان کو جواب

منافقین جب دیکھیں گے کہ روشنی کی جو جھلک نظر آتی تھی وہ بھی اوجھل ہوگئی اور جن کے ساتھ دنیا میں رہے ان سے بالکل ہی رابطہ ٹوٹ گیا تو وہ دل شکستہ ہو کر فریاد کریں گے کہ بھائیو، آپ لوگوں نے ہمیں بالکل ہی کاٹ پھینکا، کیا دنیا میں ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہے بسے! اپنے بھائیوں سے یہ بے اعتنائی و بے پروائی!!

جواب ملے گا کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ دنیا میں تم لوگ بظاہر ہمارے ہی ساتھ رہے لیکن تمہارے دل ہمارے ساتھ نہیں تھے بلکہ تم انہی فتنوں میں مبتلا رہے جن سے اللہ نے تم کو نکالنا چاہا۔ تم نے ایمان کا دعویٰ بڑی بلند آہنگی سے کیا لیکن اس ایمان کے جتنے مطالبے تمہارے سامنے آئے ان میں سے ایک کو بھی پورا کرنے کا حوصلہ تم نے نہیں کیا۔ اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کے دین اور اس کے رسول سے تم نے زیادہ عزیز جانا، تمہاری وفاداریاں اسلام کے دشمنوں کے ساتھ رہیں اور حق کی جگہ ہمیشہ اپنے مفادِ ذاتی کو تم نے ترجیح دی۔

'وَتَرَبَّصْتُمْ' یعنی تم برابر ہمارے لیے گردشوں اور آفتوں کے منتظر رہے۔ سورۂ توبہ میں ان منافقین کا کردار ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: 'وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّیَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ' (التوبۃ - ۹: ۹۸) (اور ان بدوی منافقین میں وہ بھی ہیں جو اگر کبھی اسلام کی راہ میں کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کو اپنے اوپر ایک تاوان خیال کرتے ہیں اور تمہارے لیے برابر گردشوں کے انتظار میں رہتے ہیں) انہی لوگوں کا کردار سورۂ نساء میں یوں بیان ہوا ہے: 'اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ' (النساء - ۴: ۱۴۱) (جن کا حال یہ ہے کہ وہ تمہارے لیے منتظر تو رہتے ہیں شکست کے لیکن ان کے علی الرغم اگر اللہ تمہیں فتح دے دیتا ہے تو غنیمت کی طمع میں بھاگے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہے ہیں؟)

'وَارْتَبْتُمْ' یعنی تم برابر شک اور تذبذب میں مبتلا رہے۔ اسلام اور پیغمبرؐ کی حقانیت پر کبھی تمہارا دل نہیں جما۔ تم نے کفر اور اسلام دونوں سے تھوڑا تھوڑا تعلق جوڑے رکھنا چاہا کہ اس کشمکش میں جس کو غلبہ حاصل ہوا اپنا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ کر لو گے۔ اس ذہنی کیفیت کی تصویر

دوسرے مقام میں اس طرح کھینچی گئی ہے: مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ (النسآء-۴: ۱۴۳) (ان دونوں کے درمیان مذبذب، نہ یکسوئی کے ساتھ اِدھر نہ یکسوئی کے ساتھ اُدھر)۔

وَغَرَّتْکُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰی جَآءَ اَمْرُ اللّٰہِ وَغَرَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ۔ یعنی تم جھوٹی آرزوؤں میں برابر پھنسے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھیں جو ڈھیل ملی تو تم اس دھوکے میں مبتلا ہو گئے کہ تمھاری یہ دو رُخی پالیسی کامیاب ہے اور اس کو تم آخر تک کامیابی کے ساتھ نباہ لے جاؤ گے لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ شیطان نے تمھیں دھوکے ہی میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حق کو غالب کرنے کے لیے صادر ہو گیا اور تمھیں یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔

وَغَرَّکُمْ بِاللّٰہِ الْغَرُوْرُ' میں لفظ 'غرور' شیطان کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے باب میں دھوکے میں رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں یہ آگاہی جو دی جاتی رہی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول اتمامِ حجت کے لیے بھیج دیا ہے، جو لوگ اس کے بعد بھی اپنے کفر پر اڑے رہیں گے یا نفاق کے پردے میں چھپنے کی کوشش کریں گے وہ لازماً خدا کی گرفت میں آ جائیں گے تو شیطان تم کو یہ سبق پڑھا دیتا تھا کہ یہ سب محض دھونس جمانے کی باتیں ہیں، جو نہ پہلے سچ ثابت ہوئی ہیں نہ آئندہ ہوں گی، ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْکُمْ فِدْیَۃٌ وَّلَا مِنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ط مَاْوٰىکُمُ النَّارُ ط ھِیَ مَوْلٰىکُمْ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (۱۵)

یعنی یہ صورتِ حال جو تمھیں پیش آئی ہے پوری آگاہی اور اتمامِ حجت کے بعد پیش آئی ہے اس وجہ سے اب اس سے چھوٹنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ یہاں کسی کے پاس نہ تو کوئی چیز فدیہ میں دینے کی ہے اور نہ کسی سے فدیہ قبول ہی ہو گا۔ نہ تم سے اور نہ ان کافروں سے جن کے ساتھ تمھارا یارانہ رہا ہے۔ تم چونکہ اسلام کی طرف یکسو نہیں ہوئے اس وجہ سے ایمان کے ادعا کے باوجود تمھارا اور ان کفار کا حشر ایک ہی ساتھ ہو گا۔ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہی تمھارا 'مولیٰ' یعنی مرجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے لیے نہ خدا کے سامنے کسی داد و فریاد کی گنجائش ہے اور نہ وہاں اب تمھاری کوئی شنوائی ہونی ہے۔ تمھارا مرجع اب دوزخ ہے۔ اب جو کچھ پاؤ گے اسی سے پاؤ گے اور یاد رکھو کہ وہ برا ٹھکانا ہے۔

۴۔ آگے آیات ۱۶-۲۴ کا مضمون

آگے کی آیات میں خطاب کا رخ ان منافقین ہی کی طرف ہے جن سے اوپر کے پیرے میں

خطاب ہے۔ ان کو پہلے تو اس تذبذب کی روش کے انجام بد سے ڈرایا ہے کہ رسولؐ کی تائید میں اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی اگر تمھارا تذبذب دور نہیں ہوا تو بالآخر تمھارے دلوں پر بھی اسی طرح کی قساوت چھا جائے گی جس طرح کی قساوت یہود پر چھا گئی تھی جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔

اس کے بعد ان کو کچھ ابھارا ہے کہ موجودہ حالات سے ہراساں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت و رحمت پر بھروسہ رکھو۔ جس اللہ کی یہ شان دیکھتے ہو کہ وہ اس سرزمین کو مردہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اس سے بعید نہیں ہے کہ وہ اس دعوتِ حق کو اتنا فروغ دے کہ یہاں کفر کا کوئی نشان باقی نہ رہ جائے۔ اسی ذیل میں ان کو یہ اطمینان بھی دلایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے خسارے میں رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ایک کا ستر پائیں گے اور یہی راستہ ہے اس امت کے صدیقین اور شہداء میں داخل ہونے کا۔

پھر اس دنیا کی ان چیزوں کی بے ثباتی و بے حقیقتی کی تصویر کھینچی ہے جن کے عشق میں پھنس کر لوگ آسمانوں اور زمین کے برابر کی اس ابدی بادشاہی کو بھول بیٹھے ہیں جس کو وہ چاہیں تو اپنے جمع کردہ خزف ریزوں کے عوض خرید سکتے ہیں۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ اس دنیا میں یسر اور عسر، دکھ اور سکھ، فقر اور غنا انسان کی اپنی تدبیروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تقدیر پر ہے۔ اس وجہ سے نہ تو انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ فراخی حاصل ہو تو اس کو اپنی تدبیر کا کرشمہ سمجھ کر اس پر اترانے اور اکڑنے لگ جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ کوئی ابتلاء پیش آجائے تو مایوس و دل شکستہ ہو کر واویلا شروع کر دے بلکہ وہ نعمت میں شکر اور مصیبت میں صبر کی روش اختیار کرے اور دونوں صورتوں میں اپنے رب پر اپنے دل کو جمائے رکھے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۶-۲۴

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنْ تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا
نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلُ
فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِنْهُمْ
فَاسِقُونَ ﴿١٦﴾ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ
بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٧﴾ إِنَّ الْمُصَّدِّقِينَ وَ

الْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ
اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ
وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ع ۲ ۹ ۱۸
وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ
كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ؕ وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ
وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا
مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ
وَلَا فِىْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۚ ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ
وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ ﴿۲۳﴾
الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ
فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاددہانی اور اس حق کے آگے جھک جائیں جو نازل ہو چکا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ بن کے رہ جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی پس ان پر طویل مدت گزر گئی، بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہتیرے نافرمان ہیں - ۱۶

یاد رکھو کہ اللہ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد ہم نے تمہارے لیے اپنی آیتیں واضح کر کے بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو - ۱۷

بے شک اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مرد اور عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کو قرض دیا اچھا قرض، ان کا دیا ہوا ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے باعزت صلہ ہے اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی لوگ اپنے رب کے ہاں صدّیقوں اور شہداء کے زمرے میں ہوں گے - ان کے لیے ان کا صلہ بھی ہوگا اور ان کی روشنی بھی - رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی جنھوں نے تکذیب کی وہ جہنم والے بنیں گے - ۱۸ - ۱۹

جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ——— لہو و لعب، زیب و زینت اور مال و اولاد کے معاملے میں باہمی تفاخر و تکاثر ——— کی تمثیل اس بارش کی ہے جس کی اُپجائی ہوئی فصل کاشتکاروں کے دل کو موہ لے، پھر وہ بھڑک اٹھے اور تم اسے زرد دیکھو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور آخرت میں ایک عذابِ شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی، اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کی ٹٹّی ہے - ۲۰

تم مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایک ایسی جنت کی طرف جس کا طول و

عرض آسمان و زمین کے طول و عرض کے مانند ہو گا۔ وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، اس کو بخشے گا وہ جس کو چاہے گا اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔ ۲۱

اور تمھیں کوئی مصیبت بھی نہیں پہنچتی ہے، نہ زمینی پیداواریں اور نہ تمھارے اپنے نفوس کے اندر مگر یہ کہ وہ لکھی ہوئی ہے ایک کتاب میں اس سے پہلے سے کہ ہم اس کو وجود میں لائیں اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ یہ بات تمھیں اس لیے بتائی جا رہی ہے کہ جو چیز جاتی رہے اس پر غم نہ کرو اور نہ اس چیز پر اتراؤ جو اس نے تمھیں بخشی ہے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ اکڑنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ اور جو اعراض کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۲۲-۲۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ (۱۶)

منافقین کے سامنے ایمان کے تقاضوں کی وضاحت

'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے مراد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہی منافقین ہیں جن کا رویہ یہاں زیرِ بحث ہے۔ چونکہ وہ ایمان کے مدعی تھے اس وجہ سے ان کے دعوے کے مطابق ان کا ذکر 'اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' کی صفت سے کیا تاکہ وہ ان مطالبات پر سنجیدگی سے غور کریں جو اس دعوائے ایمان کے تعلق سے ان پر عائد ہوتے ہیں اور اگر ان کے اندر اس دعوے کی کچھ لاج ہے تو اس کا حق ادا کریں۔

'اَلَمْ يَاْنِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب دعوتِ حق کی صداقت و حقانیت اور اس کے غلبہ کے اتنے آثار و شواہد نمایاں ہو چکے

تھے کہ جن کے اندر کچھ شکوک و شبہات تھے وہ دور ہو جانے چاہییں تھے۔ اگر اتنے آثار دیکھ لینے کے بعد بھی ان کے شبہات علیٰ حالہٖ باقی ہی رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس وقت تک شرحِ صدر کے ساتھ اسلام کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے جب تک وہ اس کے ہر دعوے کی صداقت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ اس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں ہے اس وجہ سے ان لوگوں کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اب بھی وہ شبہات ہی میں مبتلا رہے تو ان کا وہی حال ہو گا جو یہود کا ہوا۔ وہ بھی برابر شبہات میں مبتلا رہے اور اسی حالت میں ان پر ایک مدت گزر گئی بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے۔ یہاں تک کہ حق کی روئید گی کی صلاحیت ہی ان کے اندر سے ختم ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

ایک سنت الٰہی

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی امرِ حق میں شبہ و تردد کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ کچھ عرصے تک اس کا باقی رہنا کوئی قابلِ ملامت چیز ہے۔ ایک نیک نیت آدمی کے اندر بھی یہ حالت پیدا ہو سکتی ہے لیکن کوئی شخص اگر ان شبہات کی آڑ لے کر اپنے اندر حق کی آواز کو برابر دباتا ہی رہے اور اس کو باطل سے چمٹے رہنے کے لیے ایک بہانہ بنالے تو سنتِ الٰہی کے مطابق ایسا شخص قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی طرف سے حق کی ناقدری کو زیادہ عرصے تک گوارا نہیں فرماتا۔

شک کی بیماری مہلک ہے

'اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ' میں 'ذِكْرِ اللّٰهِ' اور 'حق' سے مراد تو قرآن مجید ہی ہے لیکن قرآن کے دو خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کے لیے دو الگ الگ لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'ذکر اللہ' سے مراد وہ تنبیہات ہیں جو ان خطرات و مہالک سے آگاہ کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں جن سے ان لوگوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا جو حق سے اعراض کے لیے بہانے ڈھونڈتے رہیں گے اور 'حق' سے وہ کلیات مراد ہیں جو قرآن نے از سرِ نو باطل سے الگ کر کے اجاگر کیے فرمایا کہ ان کی تائید میں اتنے شواہد و قرائن ظاہر ہو چکے ہیں کہ چاہیے تھا کہ لوگوں کے دل ان کے آگے سرافگندہ ہو جاتے۔ اگر اب بھی نہیں ہوتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں جس میں یہود مبتلا ہوئے۔

یہود کے متعلق پیچھے، مختلف سورتوں میں تفصیل سے یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ شک کے ایسے مریض تھے کہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں، قدم قدم پر، اس کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھتے ہوئے، برابر بے یقینی اور تردد میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اسی بیماری نے ان کو تورات سے محروم کر دیا اور اسی کی پاداش میں ان کی اکثریت قرآن سے بھی محروم رہی۔ یہاں اسی روش بد اور اس کے انجام سے قرآن نے ان منافقین کو متنبہ کیا ہے کہ تم بھی یہود ہی کی طرح، اپنے رسول کی موجودگی میں، بے یقینی

کے مرض میں مبتلا ہو، ایسا نہ ہو کہ یہ مرض تمہارے لیے بھی اسی طرح مہلک بن جائے جس طرح ان کے لیے مہلک بنا۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۷)

یہ آیت یہاں نہایت ہی برمحل وارد ہوئی ہے اور اس میں دو مختلف پہلوؤں سے اس بے یقینی کا علاج مضمر ہے جس میں یہ منافقین مبتلا تھے۔

سب سے نمایاں پہلو تو یہ ہے کہ آدمی میں اگر آخرت کا یقین نہ ہو تو اس کے لیے جان یا مال کی قربانی نہایت کٹھن کام ہے۔ ان منافقین کی اصل بیماری یہی تھی کہ ان کے اندر آخرت کا یقین نہیں تھا اس وجہ سے وہ قرآن کے وعدوں کو محض ایک بہلاوا خیال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ بے یقینی دور کرنے کے لیے اپنی ان نشانیوں اور دلیلوں کی طرف توجہ دلائی جو قیامت کے ایک معلوم و مشہود حقیقت ہونے پر اس نے نہایت تفصیل سے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہیں۔ یہاں چونکہ مقصود محض آخرت کے ایک امر واقعی ہونے کی یاددہانی ہے اس وجہ سے اس کے امکان کی ایک بدیہی دلیل کی طرف اشارہ کر کے بالاجمال یہ فرما دیا کہ اس کی دلیلیں ہم تفصیل سے قرآن میں بیان کر چکے ہیں، ان کو مستحضر کرو اور سمجھو تاکہ تمہارے اندر جان و مال کی قربانی کا حوصلہ پیدا ہو۔ بے یقینی کا علاج

دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ منافقین مخالفینِ اسلام کی سطوت سے بہت مرعوب تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ مٹھی بھر مسلمان اعدا کی دَل بادل افواج سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے اور کس طرح مکہ سے قریش کی جمی جمائی حکومت اکھاڑ کر بیت اللہ کو پھر دعوتِ ابراہیمی کا مرکز بنا سکیں گے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بعض جنگیں ہو چکی تھیں جن میں مسلمانوں کا پلّہ بھاری رہا تھا لیکن منافقین کے دلوں سے ابھی ڈر نہیں نکلا تھا۔ اسلام کے مستقبل کی طرف سے وہ بدستور مایوسی و بے یقینی میں مبتلا تھے۔ ان کی اس مایوسی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ جس خدا کی یہ شان برابر دیکھتے ہو کہ وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کی قدرت سے بعید نہ سمجھو کہ وہ اس کفرستانِ عرب کو ازسرِنو ایمان و اسلام کی زندگی سے معمور کر دے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِیْمٌ (۱۸)

یہ آیت ۱۱ کے مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے لیا ہے اور منافقین کو ابھارا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا خسارے کا سودا نہیں بلکہ نہایت نفع بخش کاروبار ہے۔ جو لوگ برابر صدقہ کرتے رہتے ہیں اور جب کبھی کسی ہنگامی ضرورت کے موقع پر ان سے مدد کی اپیل کی جائے تو اس وقت بھی وہ فراخ دلی سے مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی پائی پائی خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ وہ ان کے لیے

اس کو بڑھا رہا ہے اور بڑھا کر ایک لازوال خزانے کی شکل میں ان کو واپس کرے گا۔ علاوہ ازیں ان کے لیے ایک بہت بڑا با عزت اجر بھی ہے۔ یعنی ان کا دیا ہوا تو کئی گنا بڑھ کر ان کو واپس کیا جائے گا ہی، اس کے علاوہ بھی ربِ کریم ان کو خاص اپنے پاس سے ایک اجرِ عظیم دے گا۔

صدقہ اور قرض

یہاں انفاق کے لیے صدقہ اور قرض کے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلا فاعل یا صفت کی شکل میں دوسرا فعل کی صورت میں۔ اس اختلاف کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ایک انفاق تو وہ ہے جس کا مطالبہ ہر ذی استطاعت مسلمان سے عام حالات میں ہے اور جو تزکیۂ نفس کے پروگرام کا ایک لازمی حصّہ ہے۔ دوسرا وہ انفاق ہے جس کا مطالبہ کسی ناگہانی ضرورت کے موقع پر ملّت کے تحفّظ کے لیے کیا جاتا ہے۔ پہلے کو یہاں صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کے لیے فاعل اور صفت کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ دواماً مطلوب ہے۔ دوسرے کو قرض سے تعبیر فرمایا ہے جو عند الضّرورت دیا جاتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے فعل کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

مردوں کے ساتھ یہاں عورتوں کے خاص طور پر ذکر کی حکمت

ان آیات میں یہ امر بھی خاص توجہ کے لائق ہے کہ نفاق اور انفاق کے بیان میں قرآن نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ذمہ داری خاص طور پر نمایاں فرمائی ہے۔ اس کی وجہ، غور کرنے سے، یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیوی بچے بخل اور بزدلی کے بڑے اہم عوامل میں سے ہیں اور یہی دو چیزیں دراصل نفاق میں مبتلا کرنے والی ہیں۔ یہ حقیقت حدیث شریف میں بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ بیوی بچے بخل و بزدلی کے سبب بنتے ہیں۔ اسی پہلو کے سبب سے یہاں منافقین کے ساتھ منافقات اور مصدّقین کے ساتھ مصدّقات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے تاکہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں پر بھی یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص اپنی ذمہ داریوں سے متعلق مسئول ہوگا، مرد ہو یا عورت۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۹)

قرینہ دلیل ہے کہ جس طرح آیت ۷ میں لفظ ایمان اپنے کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے اسی طرح اس آیت میں بھی اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

منافقین کو ایک تنبیہ

یہ منافقین کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدّیقین اور شہداء کے لیے جو درجے ہیں وہ ہر مدعی ایمان کو نہیں حاصل ہو جائیں گے بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان لائیں گے اور اپنے عمل سے اپنے دعوائے ایمان کی صداقت ثابت کریں گے۔ یہاں چونکہ زیر بحث خاص طور پر انفاق ہے اس وجہ سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ دین کی نصرت کے لیے فراخ دلی سے اپنے مال خرچ کریں گے درحقیقت وہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں

اور وہی لوگ ہیں جن کو صدیقین اور شہداء کے زمرے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوگی۔

صدیق کی تعریف

لفظ 'صدیق' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ اس کی اصل روح قول و عمل کی کامل مطابقت اور اس کی پختگی ہے۔ عربی میں اس نیزے کو 'صادق الکعوب' کہیں گے جس کی گرہیں تجربہ سے بھی ویسی ہی محکم ثابت ہوں جیسے وہ دیکھنے میں نظر آتی ہیں۔ صادق اور صدیق اس شخص کو کہیں گے جو اپنے قول کا پکا ہو۔ اس پختگی کی اوّلین عملی شہادت یہ ہے کہ وہ اس مقصدِ حق کی خاطر اپنی محنت کی کمائی قربان کرنے والا ہو جس کا اس نے اقرار و اعلان کیا ہے۔ اسی قربانی سے وہ اس مقصدِ حق کی شہادت دینے والا بنتا ہے اور ایسے ہی مردِ حق سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کو امتحان پیش آیا تو وہ اپنی جان دے کر بھی اس حق کی شہادت دے گا۔ اسلام میں اس وصف کے سب سے نمایاں مصداق حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔ انھوں نے اپنے اقرارِ ایمان کی صداقت، نازک سے نازک زمانے میں، اپنے انفاق سے جس طرح ثابت کی ہے وہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب ہے۔

شہید

'شُهَدَآءُ' یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ - ۲: ۱۴۳) (اسی طرح ہم نے تم کو وسط راہ پر قائم رہنے والی امّت بنایا کہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے) میں استعمال ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس امت کو 'شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ' ہونے کا جو عظیم اعزاز حاصل ہے وہ مجرّد ایمان کا دعویٰ کر دینے سے کسی کو نہیں حاصل ہو جائے گا بلکہ یہ صرف انہی کو حاصل ہوگا جن کا ہر ہر بُنِ مُو ان کے ایمان کی گواہی دے۔ یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کو جو شہید کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شہادت علی النّاس کے فرضِ منصبی کا حق اس راہ میں اپنی جان قربان کر کے دیتے ہیں۔ یہ شہادت چونکہ سب سے بڑی شہادت ہے اس وجہ سے ان کو شہید کہتے ہیں۔

بعینہٖ یہی بات ان منافقین ہی کو خطاب کر کے سورۂ نساء میں یوں فرمائی گئی ہے:

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (النسآء - ۴: ۶۹)	اور جو پوری وفاداری سے اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے وہی لوگ اللہ کے انعام یافتوں: انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوں گے۔

'لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ' یعنی اوپر آیات ۱۲-۱۱ میں جو اجر اور جو نور بیان ہوا ہے وہ انہی جاں بازوں کے لیے ہے۔ ہر مدّعی ان کا حق دار نہیں بن جائے گا۔

'وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ' یعنی وہ سارے لوگ جو کفر اور تکذیب

کے مرتکب ہوئے وہ جہنم میں پڑیں گے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہی حکم ان لوگوں کا بھی ہوگا جنھوں نے اگرچہ زبان سے تکذیب نہ کی ہو لیکن اپنے عمل سے تصدیق بھی نہ کی ہو بلکہ ان کا عمل ان کے دعوے کے بالکل برعکس ہی رہا ہو۔

اِعۡلَمُوۡۤا اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا لَعِبٌ وَّ لَہۡوٌ وَّ زِیۡنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَ تَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَ الۡاَوۡلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیۡثٍ اَعۡجَبَ الۡکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَہِیۡجُ فَتَرٰىہُ مُصۡفَرًّا ثُمَّ یَکُوۡنُ حُطٰمًا ؕ وَ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّ مَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَ رِضۡوَانٌ ؕ وَ مَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ (۲۰)

زر پرستوں کو تنبیہ — یہ ان مال پرست منافقین کو تذکیر و تنبیہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی، یعنی لہو ولعب، زینت و آرائش کا شوق، مال و اولاد کی تکثیر کی بھاگ دوڑ اور معیار زندگی اونچا کرنے کا باہم مقابلہ، جن میں جو تم ہر وقت ڈوبے ہوئے ہو، یہ کوئی خوش انجام سرگرمی نہیں ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ بارش اچھی ہو جائے جس سے فصل لہلہا اٹھے اور اس کو دیکھ کر ناشکرے لوگ پھولے نہ سمائیں لیکن پھر اس پر کوئی ایسی افتاد آپڑے کہ وہ سوکھ کر زرد ہو جائے پھر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ یہی حشر تمھاری ان تمام سرگرمیوں کا ہونا ہے جو تم اس دنیا کے حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے کر رہے ہو۔ ان میں سے کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں ہے۔

وَفِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ۙ وَّمَغۡفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضۡوَانٌ ؕ وَمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَاۤ اِلَّا مَتَاعُ الۡغُرُوۡرِ۔ یعنی تم نے اپنی نادانی سے اس دنیا کی لذات کو زندگی کا مقصود، اپنی تمام مساعی کا حاصل اور گول قرار دے رکھا ہے حالانکہ یہ دنیا محض ایک سرمایۂ غرور اور دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اصل گول تو آخرت ہے اور وہاں دو چیزوں میں سے ایک سے سابقہ پیش آنا ہے۔ ایک طرف عذاب شدید ہوگا، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کے مطامع کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور خوشنودی کے حصول کا حوصلہ نہیں کر پائے گا تو وہ لازماً اس کے عذاب شدید سے دوچار ہوگا۔

ایک خاص نکتہ — اس آیت میں تالیفِ کلام عام مفسرین کے نزدیک تو اس طرح ہے کہ وہ اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا کو مبتدا اور اس کے بعد کی ساری عبارت کو خبر قرار دیتے ہیں لیکن میرے نزدیک اَنَّمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا کے بعد لَعِبٌ وَّلَہۡوٌ وَّزِیۡنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیۡنَکُمۡ وَتَکَاثُرٌ فِی الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ کے الفاظ بطور بدل بیان آئے ہیں اور کَمَثَلِ غَیۡثٍ …… الآیۃ اس مبتدا کی خبر ہے۔ اس اسلوب کلام کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، مثلاً لَنَسۡفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ۙ نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ (العلق ۹۶: ۱۵-۱۶) (ہم اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے، جھوٹی، نابکار، گنہگار چوٹی) اس تالیفِ کلام سے معنی میں بڑا فرق پیدا ہو جائے گا۔ مفسرین کے نزدیک تو آیت کا مطلب یہ

ہے کہ یہ دنیا کی زندگی محض لہو ولعب، زینت و آرائش اور تفاخر و تکاثر ہے۔ میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی یعنی لعو ولعب، زینت و آرائش اور تفاخر و تکاثر کی تمثیل یوں ہے جس طرح ....

مفسرین کی تاویل کی رو سے یہ دنیا اور اس کی زندگی بحیثیتِ مجموعی ایک قابلِ نفرت و لعنت چیز ٹھہرتی ہے اور اس سے اسی رہبانی تصور کی تائید نکلتی ہے جس کی قرآن نے پوری شدت سے آگے اسی سورہ میں تردید کی ہے۔ اور اگر وہ تاویل لی جائے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے تو اس سے دنیا بحیثیتِ مجموعی نہیں بلکہ اس کا صرف وہ پہلو قابلِ نفرت قرار پائے گا جس پر کفار و منافقین ریجھتے ہیں اور جو ان کو جہنم میں لے جانے کا سبب بنتا ہے۔

فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی بجائے خود لعنت نہیں ہے بلکہ اس کے لعنت یا رحمت ہونے کا تعلق انسان کے رویّہ سے ہے۔ اگر انسان ان حدود کے اندر زندگی گزارے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں تو اس دنیا کی حیاتِ چند روزہ اس کے لیے آخرت کی ابدی بادشاہی کی ضامن ہے اور اگر وہ ان حدود سے بے پروا ہو کر اس کو خود معبود بنا بیٹھے اور اس کی لذتوں میں کھو جائے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ اس آیت میں اس کے اسی پہلو سے ہوشیار کیا گیا ہے۔

ایک اور نکتہ آیت میں لفظ 'کفّار' بھی قابلِ غور ہے۔ اس کے معنی مفسرین نے عام طور پر 'زرّاع' یعنی کسانوں کے لیے ہیں لیکن دلِ اس پر نہیں جمتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں معروف نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جس مادے سے ہے اس کے اندر یہ معنی لینے کی گنجائش بھی ہے لیکن محض اتنی بات ایک ایسے لفظ کو، جو ایک اصطلاح کی حیثیت سے، ایک خاص مفہوم میں قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، ایک ایسے شاذ معنی میں لینے کے لیے کافی نہیں ہے جس معنی میں اس کی کوئی اور مثال قرآن میں نہیں ہے۔ سورۂ فتح کی آیت فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۲۹) (پس وہ کھیتی اپنے تنوں پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو لبھاتی ہوئی کہ ان سے کافروں کے دل آزردہ ہوں) میں دونوں لفظ اپنے اپنے خاص معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اپنے معانی میں معروف و متعین ہیں۔ اس وجہ سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'کفّار' اپنے اصل مفہوم ہی میں ہے۔ چونکہ اس تمثیل میں پیشِ نظر منکرینِ آخرت ہی کے رویّہ کو نمایاں کرنا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ اس دنیا کی عارضی رونقیں منکرینِ آخرت کے دلوں کو لبھا لیتی ہیں، وہ انہی کے اندر پھنس کے رہ جاتے ہیں اور بالآخر اس عذاب سے دوچار ہوتے ہیں جو اس قسم کے محروم القسمت لوگوں کے لیے مقدر ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تمثیل و تشبیہ میں بعض اوقات ایسے الفاظ داخل کر دیے جاتے ہیں جن سے مقصود ان لوگوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جو اس تشبیہ یا تمثیل میں پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اس طرح کی بعض چیزوں کی طرف

ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں ان پر نگاہ رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ تشبیہ یا تمثیل کا اصل حسن ظاہر نہیں ہوتا۔ یہاں یہ لفظ استعمال کر کے ان لوگوں کا سراغ دے دیا گیا ہے جو تمثیل میں پیش نظر ہیں۔

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لا اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ط ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۲۱)

اصل میدانِ مسابقت

اوپر کی آیت میں بتایا کہ اہلِ کفر کی بھاگ دوڑ اور ان کا تکاثر و تفاخر بس اسی دنیا کی عارضی و فانی مطلوبات و مرغوبات کی راہ میں ہے، وہ ان سے آگے جانے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں رکھتے لیکن اہلِ ایمان کا نصب العین اپنے رب کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہونا چاہیے اور اس دنیا کی تنگ نائے کی جگہ انھیں اس جنت کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے جس کا طول و عرض آسمانوں اور زمین کے طول و عرض کے برابر ہے اور جو ان مومنین صادقین کے لیے اللہ نے تیار کر رکھی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان رکھنے والے ہیں۔

لفظ 'عرض' یہاں قرینہ دلیل ہے کہ طول و عرض یعنی وسعت اور پہنائی کے مفہوم میں ہے اور 'سماء' جنس یعنی 'سمٰوٰت' کے معنی میں ہے چنانچہ دوسرے مقام میں یہی مضمون جمع کے لفظ سے بیان ہوا ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران - ۳ : ۱۳۳) (اور مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایک ایسی جنت کے لیے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے مانند ہو گی)۔

اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ۔ یعنی اس کو بہت دور کی چیز نہ سمجھو، یہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لیے تیار کی ہوئی موجود ہے۔ جونہی اس دنیا کا امتحان ختم ہوا ہر ایک کے سامنے اس کی جنت بے نقاب ہو جائے گی۔ اور اس بات پر بھی تعجب نہ کرو کہ چند دنوں کی نیکیوں کے صلہ میں اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسی ناپیدا کنار جنتیں دے گا۔ اللہ بڑے فضل والا ہے، وہ جس کو چاہے بخشے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (۲۲)

تقدیر کا نوشتہ اٹل ہے

یعنی یہ حقیقت بھی ہمیشہ پیش نظر رکھو کہ جو مالی یا جانی مصیبت بھی تمھیں پیش آنی ہے وہ پیش آ کے رہے گی، تم اس سے بچنے کے کتنے ہی جتن کرو لیکن اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہر دکھ اور سکھ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ایک کتاب میں لکھ رکھا ہے اور یہ کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ وہ نوشتۂ تقدیر کو بدل سکے۔ اللہ تعالیٰ کا علم حاضر و مستقبل سب پر محیط ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ کام ذرا

بھی مشکل نہیں ہے۔ تم اپنے محدود علم پر قیاس کر کے اس کو بعید از امکان خیال کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس کے لیے یہ معمولی بات ہے کہ وہ جس کو وجود بخشے اس کے وجود سے پہلے ہی اس کی تقدیر بھی لکھ دے۔

یہاں دعوتِ انفاق کے ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت اس وجہ سے ضروری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاقِ مال و جان سے جی وہی لوگ چراتے ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کو جو مال حاصل ہوتا ہے وہ ان کی اپنی تدبیر سے حاصل ہوتا ہے اور جو زندگی عطا ہوئی ہے اس کے محافظ وہ خود ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا کہ مال، اللہ تعالیٰ کا عطیّہ ہے اس وجہ سے یہ انتہائی نادانی ہے کہ اس کو خدا سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ جو چیز خدا ہی کی بخشش سے ملی ہے اس کو کوئی خدا سے کس طرح بچا سکتا ہے؟ اگر وہ اللہ کے حق میں بخالت کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کوئی آفت بھیج کر اس کا مال چھین لے۔ انسان کے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے اور اپنے رب سے یہ امید رکھے کہ جس طرح اس نے آج اپنی مدد سے نوازا ہے اسی طرح آئندہ بھی ہر مشکل میں وہ مدد فرمائے گا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں منافقوں اور بخیلوں کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اس اندیشہ سے جی چراتے ہیں کہ کل کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو کیا بنے گا۔ گویا وہ اپنی بخالت کو آئندہ پیش آنے والی مشکلوں اور گردشوں کا علاج سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ پیش آنا ہے وہ اٹل ہے۔ اس کا علاج خدا سے بخالت نہیں بلکہ اس کی راہ میں انفاق اور اسی پر توکّل ہے۔

'فِی الْاَرْضِ' سے یہاں اشارہ ان مالی قسم کی آفتوں کی طرف ہے جو زمین کی پیداوار کو لاحق ہوتی ہیں اور 'فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ' سے وہ تکلیفیں اور مصیبتیں مراد ہیں جو جسم اور جان کو لاحق ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں انسان کو جو آزمائشیں بھی پیش آتی ہیں انہی دونوں راہوں سے پیش آتی ہیں۔ فرمایا کہ ان دونوں ہی راہوں سے جو کچھ بھی پیش آنے والا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں نوشتہ ہے۔ اس وجہ سے انسان کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ وہ اپنے رب سے اپنا مال چرائے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اس سے اپنی جان چرانے کی کوشش کرے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی وہ خدا سے بچا سکنے پر قادر نہیں ہے۔ انہی منافقین کو خطاب کر کے قرآن میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ آج تم خدا کی راہ سے جی چراتے اور موت سے ڈرتے ہو لیکن موت کا جو وقت مقرر ہے وہ اس وقت آ کے رہے گی اور تم کتنے ہی محکم قلعوں کے اندر چھپ کے بیٹھو لیکن وہ تم کو ڈھونڈ لے گی۔

'فِیْ کِتٰبٍ' سے مراد وہ کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی تقدیر رقم فرما رکھی ہے۔ اس کو لوحِ محفوظ سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس سے مراد درحقیقت علمِ الٰہی ہے۔

اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ۔ یعنی تمہارا علم بہت محدود ہے اس وجہ سے تمہارے لیے یہ تصور کرنا بڑا مشکل ہے کہ ایک ایک فرد کی زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ لکھا ہوا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ اس پوری کائنات کا خالق اور اس کا علم محیط کل ہے وہ ہر ایک کے متعلق جانتا ہے کہ وہ کن مراحل سے ہوتا ہوا کس منزل تک پہنچے گا۔

لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۲۳-۲۴)

تقدیر کا فلسفہ

یہاں 'لِكَيْلَا' سے پہلے کچھ حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ اس موقع پر تمہیں اس حقیقت کی یاد دہانی اس لیے کرائی جا رہی ہے کہ نہ تم کسی چیز کے فوت ہونے پر غم کرو اور نہ کسی چیز پر جو تمہیں ملے اتراؤ اور فخر کرو، بلکہ اس عقیدے کی روشنی میں تمہارا کردار یہ ہونا چاہیے کہ تمہیں کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچے تو اس پر صبر کرو کہ یہ نوشتۂ تقدیر کے مطابق پہنچا ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اگر کوئی نفع پہنچے تو اس پر اپنے رب کے شکر گزار بنو کہ اسی نے تمہیں اپنے فضل سے نوازا ہے۔ اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اترانے نہ لگو کہ یہ تمہاری تدبیر و قابلیت کا ثمرہ اور تمہارے استحقاق کا کرشمہ ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ جو لوگ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتیں پا کر اکڑنے والے بن جاتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ 'پسند نہیں کرتا' کے الفاظ اگرچہ بظاہر نرم ہیں لیکن باعتبارِ معنی بہت سخت ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ بسا اوقات اس طرح کے منفی اسلوب میں جو بات کہی جاتی ہے اس کو مثبت اسلوب میں کہیں تو وہ یوں ادا ہو گی کہ اِنَّ اللّٰهَ يُبْغِضُ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ لیکن متکلم صاف لفظوں میں بات کہنے کے بجائے اپنے تیور اور لب و لہجہ سے اپنی شدتِ نفرت کا اظہار کر دیتا ہے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ۔ یہ ان کے اسی کردار کے دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کے لوگ چونکہ اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے اپنی تدبیر سے حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے وہ اپنی نمائش و آرائش اور تکاثر و تفاخر کے سوا دین و ملت کی راہ میں خرچ کرنے کو خسارہ اور تاوان سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے کاموں میں وہ خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ ان کی سجالت پر پردہ پڑا رہے۔ بخیلوں کے کردار کا یہ پہلو قرآن میں بعض جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ ان کی خواہش اور کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ بخیل ہیں اسی طرح دوسرے بھی بخیل بنے رہیں تاکہ ان کی سجالت پر پردہ پڑا رہے۔

لفظ 'امر' یہاں مشورہ دینے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ معروف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ دوسروں کو دینی و ملی کاموں میں خرچ کرتے دیکھتے ہیں تو ان کو خیر خواہانہ انداز میں مشورے دیتے ہیں کہ بہت شاہ خرچ مت ہو ورنہ کوئی سخت وقت آ پڑا تو پچھتاؤ گے اور اس وقت کوئی مدد کرنے والا نہیں بنے گا۔

'وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ'۔ یہ اس طرح کے بخیلوں سے نہایت تہدید آمیز الفاظ میں اظہارِ بے نیازی و اعلانِ بیزاری ہے کہ اگر یہ لوگ اس تذکیر و تعلیم کے بعد بھی اعراض ہی کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ خدا بھی ان سے بالکل بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو انفاق کی دعوت دے رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے بلکہ اس نے یہ اپنے بندوں کے لیے (جیسا کہ آیت ۱۸ میں بیان ہوا) ایک ابدی نفع کمانے کی راہ کھولی ہے۔

'غنی' کے ساتھ صفت 'حمید' اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں بالکل بے نیاز و بے پروا ہے۔ اسے کسی کی حاجت نہیں۔ وہ لوگوں سے مانگتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کا محتاج ہے بلکہ وہ 'حمید' ہے اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں کو اپنے افضال کا حق دار بنائے اور ان کے دیے ہوئے خزف ریزوں کو ایک لازوال خزانے کی شکل میں تبدیل کر کے ان کو واپس کرے۔

۶- آگے آیات ۲۵-۲۹ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے اٹھائے ہوئے ایک اعتراض کا برمحل جواب دیا گیا ہے۔ اوپر کی آیات میں اہل ایمان کو جس انفاق کی دعوت دی گئی ہے اس کا تعلق، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، جہاد سے ہے۔ مسلمان جب تک مکہ میں مظلوم و مغلوب رہے اس وقت تک تو اہل کتاب اور قریش نے ان کی کمزوری اور بے بسی کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کیا لیکن جب انھوں نے مدینہ میں ایک منظم جمعیت کی شکل اختیار کر لی یہاں تک کہ انھوں نے قلتِ تعداد کے باوجود، قریش کو بعض جنگوں میں نہایت کھلی ہوئی شکست بھی دے دی تو قریش اور اہل کتاب دونوں نے مل کر ان کے جوشِ جہاد کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ جماعت مذہبی جماعت کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ اس کے نزدیک سب سے بڑا نیکی کا کام جنگ و خونریزی ہے، بھلا اللہ کے رسولوں اور ائمہ کے نیک بندوں کو جنگ و خونریزی سے کیا تعلق، وہ تو دنیا میں امن و سلامتی اور صلح و محبت کے داعی ہوتے ہیں! اس دور میں مذہب کا رہبانی تصور ذہنوں پر غالب تھا اس وجہ سے قریش نے اہل کتاب کے اٹھائے ہوئے اس اعتراض کو اٹھا لیا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر انھوں نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا کہ یہ اللہ کے رسول کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ انھوں نے بھائیوں کی تلوار بھائیوں ہی کی گردنوں پر چلوا دی۔ قرآن نے جگہ جگہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ سورۂ انفال اور سورۂ حج میں اس کے بعض اہم پہلو زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہاں اس کے جواب میں انبیاء و رسل کی تاریخ کی روشنی میں تین باتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے نبی اور رسول بھی بھیجے اس لیے بھیجے کہ لوگ ان کی ہدایات کی روشنی میں حق و عدل کی شاہراہ پر چلنے والے بنیں۔ اسی مقصد کے لیے اللہ نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ کتاب ان کے لیے میزانِ حق کا کام دے اور وہ اس کسوٹی پر پرکھ کر لوگوں کو بتائیں کہ کیا حق ہے، کیا باطل، کیا عدل ہے، کیا ظلم؟

دوسری یہ کہ عدل و قسط کا قیام اس امر کو مستلزم ہے کہ ظلم و جور کا سدِّ باب کیا جائے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ کتاب و میزان کے ساتھ قوت و طاقت بھی ہو تاکہ عدل کی مزاحم طاقتیں اس کے قیام میں مانع ہوں تو ان کو دبایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ لوہا بھی اتارا جس میں خلق کے لیے دوسرے گوناگوں فوائد کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے وہ قوت حاصل کی جا سکتی ہے جو قیامِ حق و عدل کی راہ میں جہاد کے لیے ضروری ہے۔ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا ایک امتحان ہے جس سے وہ مخلصین و منافقین کو پرکھتا ہے کہ کون حق کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے سکتے ہیں اور کون محض دکھاوے کے مسلمان ہیں۔

تیسری یہ کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی ذرّیت میں جتنے نبی و رسول بھی آئے سب اسی مقصدِ حق اور قیامِ عدل کے لیے آئے اور انہی کے طریقہ پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح ابن مریم کو بھی بھیجا۔ ان کے پیروؤں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رافت و رحمت رکھی تھی جس کی آڑ میں ان کے بعد کے نام لیواؤں نے رہبانیّت ایجاد کر لی جو محض ان کی اپنی ایجاد کردہ بدعت ہے۔ ان پر جو چیز فرض کی گئی تھی وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی تھی جو تمام نبیوں اور رسولوں کی مشترک تعلیم ہے لیکن اپنی غلو پسندی کے سبب انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے اور رہبانیّت ایجاد کر کے خدا کے دین کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اب اسی بگڑے ہوئے دین کو دلیل بنا کر اسلام کے حکمِ جہاد پر اعتراض کر رہے ہیں۔

اس فتنۂ رہبانیّت کے سبب سے سب سے زیادہ گمراہی چونکہ نصاریٰ ہی کو پیش آئی اس وجہ سے آخر میں ان کو خاص طور پر اسلام کی دعوت بھی دے دی گئی کہ جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان کے مدّعی ہیں وہ رہبانیّت وغیرہ جیسی بدعات میں پھنس کر اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ ہوں۔ اگر وہ اللہ کے آخری رسول پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اپنی رحمت میں ان کو دو

حصے دے گا اور یہ یہود جو اللہ کے تمام فضل و رحمت کا اجارہ دار تنہا اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں حسد کی اسی آگ میں جلتے رہیں گے جس میں وہ جل رہے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۵-۲۹

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۗ
۳ ع۶ ۱۹ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ
وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ
وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا
وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ۬ وَجَعَلْنَا فِيْ
قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ
ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۤءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا
رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ
وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ
وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ
لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۸﴾
لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ
فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۤءُ ۭ
۴ ع۳ ۲۰ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۹﴾

ترجمۂ آیات ۲۵-۲۹

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ

کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور لوہا بھی اتارا جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے اس میں دوسرے فوائد بھی ہیں اور اس سے اللہ نے یہ بھی چاہا کہ وہ ان لوگوں کو ممیز کر دے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد غیب میں ہوتے کرتے ہیں بے شک اللہ بڑا ہی زور آور اور غالب ہے۔ ۲۵

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور ان دونوں کی ذرّیت میں نبوّت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ پس ان میں سے کچھ تو ہدایت پانے والے بنے اور زیادہ ان میں نافرمان نکلے۔ پھر انہی کے نقشِ قدم پر ہم نے اپنے اَور رسول بھی بھیجے اور انہی کے نقشِ قدم پر بھیجا عیسٰی ابنِ مریم کو بھی اور اس کو عنایت کی انجیل۔ اور ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی رافت و رحمت رکھی اور رہبانیّت انھوں نے خود ایجاد کی۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی خوشنودی کی طلب فرض کی تھی تو انھوں نے اس کے حدود کما حقہٗ ملحوظ نہیں رکھے۔ تو ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان پر جمے رہے ان کا اجر عطا فرمایا اور زیادہ ان میں نافرمان نکلے۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصّے دے گا اور تمھارے لیے روشنی بنائے گا جس کو لے کر تم چلو گے اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ اللہ بڑا ہی غفور رّحیم ہے۔ تاکہ اہل کتاب نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۲۶-۲۹

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۲۵)

رسولوں کی بعثت کا مقصد

یہ رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا مقصد واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں کہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں حق و عدل کے اختیار کرنے والے بنیں۔ عقائد میں وہ راہ اختیار کریں جو ہر کج پیچ سے پاک، سیدھی اور بیچ (وسط) کی راہ ہو اور اعمال میں، خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے، وہ روش اختیار کریں جو حق و عدل پر مبنی اور ظلم و جور کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محض وعظ سنا دینے کے لیے نہیں بھیجے اور نہ اپنی کتابیں محض تلاوت کے لیے نازل کیں بلکہ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کی رہنمائی میں حق و عدل پر قائم رہنے والے اور اس کو قائم کرنے والے بنیں۔

'کتٰب' کے ساتھ 'میزان' کا ذکر میرے نزدیک کتاب ہی کے سب سے بڑے مقصد کی وضاحت کے لیے ہے کہ وہ تول کر بتاتی ہے کہ کس کے ساتھ کتنا حق ہے اور اس میں کتنا غیر مطلوب اضافہ ہے۔ سورۂ شوریٰ میں کتاب الٰہی کے اس پہلو کو نہایت وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے[۱]۔ وہاں پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ اللہ کے تمام رسولوں نے صرف توحید کی تعلیم دی ہے اور اس راہ سے معمولی انحراف کو بھی نہایت شدت کے ساتھ روکا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی ہے کہ تم اسی راہ کی لوگوں کو دعوت دو اور اپنے مخالفوں کو آگاہ کر دو کہ میں اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لایا ہوں تو تمہاری بدعتوں کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہ کتاب دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس منصب پر مامور فرمایا ہے کہ میں تمہارے درمیان فیصلہ کروں اور اس میزان پر تول کر بتاؤں کہ تم میں سے کس کے پاس کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ اس بحث کا خاتمہ آیت ذیل پر ہوا ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ	اللہ ہی ہے جس نے اتاری ہے کتاب حق کے
بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ وَمَا	ساتھ اور جو فیصلہ کے لیے میزان ہے۔ اور تمہیں
یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ	کیا خبر کہ شاید قیامت کی گھڑی بھی (فیصلہ کے لیے)
(الشوریٰ - ۴۲: ۱۷)	قریب ہی آ لگی ہو۔

---

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد ششم، صفحات ۱۵۲-۱۵۷

اسی پہلو سے قرآن کو 'مہیمن' بھی کہا گیا ہے۔ 'مہیمن' کے معنی کسوٹی کے ہیں۔ یعنی قرآن ایک کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ عدل اور قسط کو قائم کرنے کے لیے میزان اور کسوٹی کا ہونا ضروری ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ دونوں صفتیں واضح فرمائی ہیں۔

قیامِ عدل کے لیے طاقت کی ضرورت

'وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ'۔ یعنی جب رسولوں کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نازل کرنے سے اصل مقصود قیامِ قسط ہوا تو یہ کام مجرّد وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو رسولوں کو بیّنات یعنی نہایت واضح دلائل کے ساتھ اور کتابوں کو میزان اور کسوٹی بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں پر عقلی و اخلاقی پہلو سے اچھی طرح حجّت تمام ہو جائے، دوسری طرف لوہا بھی اتارا کہ جو لوگ اتمامِ حجّت کے بعد بھی حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوں اور اپنے اغراض کے لیے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے ہی پر تلے ہوں ان کو طاقت کے ذریعہ سے زیر کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ جب اس نے کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجا تو اتمامِ حجّت کے بعد اس کو دو صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیش آئی۔ اگر اس کے اندر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوئی، اکثریت کفر پر جمے رہ جانے والوں ہی کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے کوئی ارضی و سماوی عذاب بھیج کر کفار کو تباہ کر دیا اور اپنے باایمان بندوں کو ان کے اندر سے نکال لیا اور اگر اس کے اندر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوئی تو رسول اور اس کے ساتھیوں کو کفّار سے جہاد بالسّیف کا حکم دیا گیا جس کے نتیجہ میں بالآخر کفّار کا استیصال ہو گیا۔ قرآن مجید میں رسولوں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ اس سنتِ الٰہی پر شاہد ہے اور ہم جگہ جگہ اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔

ہر خیر کا منبع اللہ ہے

لوہا اگرچہ نکلتا زمین ہی سے ہے لیکن اس کے لیے لفظ 'اَنۡزَلۡنَا' استعمال ہوا ہے۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح چوپایوں کے پیدا کیے جانے کے لیے یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ مقصود اس سے ایک طرف تو اس عنایتِ خاص کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کے اندر انسانوں کی بہبود کے لیے مضمر ہے۔ دوسری طرف یہ لفظ ہر چیز کے اصل منبع و مصدر کا سراغ دیتا ہے کہ کوئی چیز کہیں سے حاصل ہو لیکن حقیقت میں وہ نازل خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب تک انسان کی نظر اس پہلو پر نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

ایک نکتہ

اس ٹکڑے میں یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ لفظ 'باس'، مقدّم ہے لفظ 'منافع' پر۔ جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوہے کی اصل افادیت جہاد کی قوت فراہم کرنا ہے۔ اس کے دوسرے تعمیری و تمدنی فوائد مزید برآں اور ضمنی ہیں۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہاں لوہے کا ذکر اصل ابتدائی ذریعۂ جنگ کی حیثیت سے

کیا ہے۔ اس زمانے میں بیشتر اسلحہ جنگ اسی سے بنتے تھے۔ اب لوہے کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے، اصل اہمیت دوسری چیزوں کو حاصل ہوگئی ہے۔ حالات کی تبدیلی سے ان دوسری چیزوں کو اب وہی اہمیت حاصل ہو جائے گی جو پہلے لوہے کو حاصل تھی۔

جہاد کی حکمت

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ یہ جہاد کی حکمت واضح فرمائی کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ خود قوی اور غالب ہے، وہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو چشم زدن میں شکست دے سکتا ہے لیکن اس جہاد کے ذریعے سے وہ اپنے بندوں کا امتحان کرتا ہے کہ کون غیب میں ہوتے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے اور کون محض دکھاوے کا مجنوں ہے جو امتحان میں پھسڈی ثابت ہوتا ہے۔ 'عَلِمَ يَعْلَمُ' کے معنی کی وضاحت ہم کر چکے ہیں کہ یہ تمیز کر دینے کے معنی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تو سب کچھ ہے لیکن اس طرح کے امتحان کے ذریعہ سے وہ جھوٹے اور سچے میں امتیاز بھی کرا دیتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۲۶)

تاریخ انبیاء کا حوالہ

یہ تمام انبیاء کی تاریخ کا حوالہ ہے کہ اللہ نے جتنے نبی اور رسول بھی بھیجے اسی مقصد سے بھیجے کہ وہ لوگوں کو عدل و قسط کے قیام کی دعوت دیں لیکن ان کی ذریت میں سے تھوڑے ایسے نکلے جو اس مقصد پر استوار رہے، اکثریت اپنی بدعت پسندیوں کے سبب سے اس نصب العین سے منحرف ہو کر نافرمان بن گئی۔

رسولوں میں سے یہاں نام کی تصریح کے ساتھ صرف دو رسولوں — حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام — کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی حیثیت آدم ثانی کی ہے اور بنی اسرائیل و بنی اسماعیل میں جو انبیاء آئے ان کے ابوالآباء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان دو کا ذکر ہو گیا تو گویا نبوت کے تمام سلسلوں کا ذکر ہو گیا۔ یہ آیت تمہید ہے اس مضمون کی جو آگے آ رہا ہے۔

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓي اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۲۷)

رہبانیت دین میں کس طرح گھسی؟

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب تمام انبیاء کا طریقہ وہی رہا ہے جو اوپر بیان ہوا تو دین میں رہبانیت کی بدعت اور جہاد کو خلافِ دینداری قرار دینے کی ضلالت کہاں سے اور کس طرح گھسی؟ فرمایا کہ نوح

اور ابراہیمؑ کے بعد جتنے نبی بھی ہم نے بھیجے انہی کے نقش قدم پر بھیجے یعنی سب نے لوگوں کو نقطۂ عدل پر استوار ہونے کی دعوت دی اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو انھوں نے قیام قسط کے لیے سنتِ انبیاء کے مطابق جہاد بھی کیا۔ ان میں سے کسی رسول کا عمل بھی اس طریقہ کے خلاف نہیں ہوا۔ ٹھیک اسی مقصد کے لیے عیسیٰ ابن مریمؑ کی بھی بعثت ہوئی اور انھیں انجیل عطا کی گئی۔ وہ لوگوں کو رہبانیت کی تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے۔ بس یہ بات تھی کہ ان کے پیروؤں میں رافت و رحمت کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رکھا تھا۔ اسی کا سہارا لے کر بعد کے مبتدعین نے رہبانیت کا ایک نظام کھڑا کر دیا حالانکہ ان پر رہبانیت نہیں فرض کی گئی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی فرض کی گئی تھی لیکن انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے بلکہ فطرت و شریعت کے حدود توڑ کر بالکل دوسری وادیوں میں بھٹک گئے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین میں رہبانیت کی بدعت داخل تو ہوئی ہے نصاریٰ کے ذریعہ سے لیکن اس میں سیدنا مسیحؑ کی تعلیم یا انجیل یا ان کے اصل خلفاء کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر بعد کے مبتدعین کی ایجاد ہے۔

وَجَعَلْنَا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَرَحْمَةً۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوّلین پیروؤں کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رافت و رحمت رکھی تھی۔ اس تعریف سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ ان کے یہی بہترین انسانی اوصاف بعد والوں کے لیے رہبانیت کی دلیل بن گئے حالانکہ رافت و رحمت کی تعلیم جس طرح سیدنا مسیح علیہ السلام نے دی ہے اسی طرح اللہ کے ہر نبی و رسول نے دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے کہ حَرِيصٌ عَلَيْكُم بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (التوبۃ - ۹ : ۱۲۸) (وہ تمھاری ہدایت کا حریص اور مومنین کے لیے نہایت شفیق و مہربان ہے) خود مسلمانوں کے باب میں رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں رحم دل ہیں) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ احادیث میں مسلمانوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ ان سے زیادہ واضح ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ اہل ایمان باہمی ہمدردی و دردمندی میں اس طرح ہیں جس طرح ایک جسم کے اعضاء باہم گر ہوتے ہیں۔ سعدی نے ایک حدیث ہی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ؎

چو عضوے بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نماند قرار

رافت و رحمت عدل و قسط کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کا اوّلین تقاضا عدل و قسط کا قیام ہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قیامت کو، جو عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے، اپنی صفتِ رحمت ہی کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا ہے: كَتَبَ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ (الانعام - ۶ : ۱۲) (اللہ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، وہ تمھیں قیامت کے دن کے لیے ضرور جمع کر کے رہے گا) سیدنا مسیح علیہ السلام کے پیروؤں کو چونکہ آپ کی زندگی میں جہاد کا موقع

نہیں ملا اس وجہ سے بعد والوں نے ان کی رافت و رحمت کو رہبانیت کی دلیل بنا لیا۔ حالانکہ انھیں جہاد کا موقع ملا ہوتا، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اس کی سعادت حاصل ہوئی، تو وہ بھی 'اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ' کی تصویر ہوتے[1]۔

رہبانیت بدعت ہے

'وَرَھْبَانِیَّۃَ نِ ابْتَدَعُوْھَا مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا'۔ یعنی ان کے دلوں میں رافت و رحمت تو ہم نے ضرور رکھی لیکن اس کی آڑ میں یہ رہبانیت جو بعد والوں نے ایجاد کی اس کو مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ 'رَھْبَانِیَّۃً'، 'وَجَعَلْنَا' کے تحت نہیں ہے۔ اس کا نصب ایک فعل مضمر کے زیر اثر ہے جس کی وضاحت بعد کے فعل 'اِبْتَدَعُوْھَا' سے ہو رہی ہے۔ البتہ یہاں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رہبانیت کی ایجاد ہوئی تو ایک اچھے محرک سے لیکن ہے یہ خدا کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز، جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کی وہ ایک اچھے محرک کے باوجود اپنی بدعت پسندی، غلو اور تشدد کے باعث بالکل غلط راہ پر جا پڑے۔

'مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ'۔ یعنی یہ رہبانیت جو انھوں نے اپنے اوپر لادلی یہ ہماری فرض کردہ نہیں ہے بلکہ یہ ان کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ ہم نے ان پر جو چیز فرض کی تھی وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کی جدوجہد تھی۔ اگر یہ رہبانیت اسی حد تک ہوتی تو ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں باعث خیر و برکت ہوتی لیکن انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے۔

'فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا' میں ضمیر مؤنث کا مرجع ظاہر ہے کہ 'رَھْبَانِیَّۃً' ہی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رہبانیت کے معاملے میں نصاریٰ کی اصل غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اس کے حدود کما حقہٗ ملحوظ نہیں رکھے جس کے سبب سے اس میں فطرت اور عقل کے خلاف باتیں داخل ہو گئیں۔ اگر وہ اس کے حدود ملحوظ رکھتے تو ابتغاء رضوان اللہ کے نصب العین سے یہ متجاوز نہ ہوتی اور یہ چیز ایسی ہے جو تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم میں مشترک ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد اور جنگ و قتال اس رہبانیت کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت سورۂ توبہ میں یوں فرمائی گئی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ	اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض میں خرید لیے ہیں۔ وہ

---

[1] جہاد کے باب میں سنتِ الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط (التوبۃ - ۹ : ۱۱۱)

اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس قتل کرتے بھی ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ قطعی وعدہ ہے، تورات، انجیل اور قرآن سب میں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا طلبی کے لیے جنگ و قتال تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی مشترک تعلیم ہے۔ یہی تعلیم نصاریٰ کو انجیل میں بھی دی گئی تھی اس لیے کہ انجیل میں درباب احکام تورات کی پوری پابندی کی بار بار تاکید کی گئی ہے لیکن انھوں نے ایک ایسی رہبانیت ایجاد کر لی جس میں یہ اصل نصب العین غائب ہو گیا۔

یہاں ایک اور حقیقت بھی ذہن میں از سر نو تازہ کر لیجیے جس کی طرف سورۂ توبہ کی تفسیر میں لفظ 'سَائِحُوْنَ' کے تحت، ہم توجہ دلا چکے ہیں کہ رہبانیت اور سیاحت وغیرہ کے باب میں ہمارے ہاں منفی اور مثبت دونوں ہی طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود مطعون چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان میں خرابی ان کے حدود کی حفاظت نہ کرنے کے سبب سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن نے 'فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اسلام نے سیاحت و رہبانیت کے وہ تمام اجزاء اپنے نظام میں داخل کر لیے ہیں جو فطرت کے موافق اور ابتغائے رضوان اللہ کے نصب العین سے ہم آہنگ ہیں البتہ وہ چیزیں اپنے نظام سے خارج کر دی ہیں جو مبتدعین نے عقل و فطرت کے خلاف ایجاد کی ہیں۔ اسلام کے نظام عبادت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز، روزہ، حج، انفاق ہر عبادت کے اندر رہبانیت کے صالح اجزاء موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض احادیث میں جہاد کو بھی رہبانیت کہا گیا ہے۔

سچے نصاریٰ کی تعریف

'فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ'۔ قرینہ دلیل ہے کہ فعل 'اٰمَنُوْا' یہاں اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی حضرت مسیح کے نام لیواؤں میں سے جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم پر استوار اور ثابت قدم رہے ان کو تو ہم نے ان کے حصہ کا وہ اجر دیا جس کے وہ سزاوار ٹھہرے لیکن ان کی اکثریت نافرمان ہی نکلی جو اپنے کیفر کردار کو پہنچی۔

یہاں 'لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کے سچے خلیفہ شمعون اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے نصاریٰ ہی ہیں جو ہر قسم کے مخالف حالات کے باوجود اصل دین پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ جب اسلام کی دعوت بلند ہوئی تو یہی بقیۃ السلف کے صالحین تھے جنھوں نے نہایت دلی جوش

---

۵ یہ لفظ میں نے یہاں معروف لغوی معنی میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے۔

کے ساتھ اس دعوت کا خیر مقدم کیا۔ قرآن نے متعدد مقامات پر نہایت شاندار الفاظ میں ان لوگوں کی حق پرستی کی تعریف کی ہے۔

'وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ' سے اشارہ پال اور اس کے پیرؤوں کی طرف ہے جنھوں نے تثلیث اور رہبانیت کی بدعتیں ایجاد کر کے دینِ مسیحی کا حلیہ بگاڑا اور رومیوں کی تمام ضلالتیں اپنے دین میں گھسا دیں۔ بعد میں منافقین و مضلین کے اسی گروہ کو اکثریت حاصل ہو گئی یہاں تک کہ اصل نصرانیت کے جاننے اور ماننے والے بہت تھوڑے رہ گئے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱتَّقُواْ ٱللَّهَ وَءَامِنُواْ بِرَسُولِهِۦ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِۦ وَيَجْعَل لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِۦ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۸)

سچے نصاریٰ کو دعوتِ ایمان

یہاں 'ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ' سے خطاب انہی نصاریٰ سے ہے جن کا ذکر اوپر والی آیت میں 'فَـَٔاتَيْنَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ جب بات ان کے ذکر تک پہنچ گئی تو انہی کے حوالہ سے ان نصاریٰ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دے دی گئی جن کے اندر ایمان کی رمق موجود تھی۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے لوگو جو ایمان لائے (یعنی مسیحؑ پر ایمان لائے) اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ تو خدا تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصے دے گا اور تمھارے لیے ایک نور نمایاں فرمائے گا جس کو لے کر تم آخرت میں چلو گے اور اللہ تمھاری مغفرت فرمائے گا وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔

سورۂ مائدہ میں نصاریٰ کے ایک گروہ کی تعریف ان الفاظ میں آئی ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ ٱلنَّاسِ عَدَٰوَةً لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱلْيَهُودَ وَٱلَّذِينَ أَشْرَكُواْ ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ ءَامَنُواْ ٱلَّذِينَ قَالُوٓاْ إِنَّا نَصَٰرَىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ٥ وَإِذَا سَمِعُواْ مَآ أُنزِلَ إِلَى ٱلرَّسُولِ تَرَىٰٓ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ ٱلدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُواْ مِنَ ٱلْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ رَبَّنَآ ءَامَنَّا فَٱكْتُبْنَا مَعَ ٱلشَّٰهِدِينَ ٥	تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکینِ قریش کو پاؤ گے اور اہلِ ایمان کی دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ بات اس وجہ سے ہے کہ ان کے اندر علماء اور راہب موجود ہیں اور یہ لوگ استکبار میں مبتلا نہیں ہیں۔ یہ لوگ جب اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو اس حق کو پہچان لینے کے سبب سے جو اس کے اندر موجود ہے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب، ہم ایمان لائے تو ہمیں آخری رسول کی گواہی دینے

والوں میں لکھ۔ (المائدۃ - ۵: ۸۲ - ۸۳)

آیت زیر بحث میں ان تمام نصاریٰ کو جن کے اندر ایمانِ سابق کی رمق باقی ہے نبیؐ امی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کے اس رسول پر ایمان لاؤ جس کی بشارت دینے پر تم مامور کیے گئے تھے۔ اللہ سے ڈرنے کی تنبیہ اس لیے فرمائی گئی ہے کہ بہت سے نصاریٰ یہ سمجھتے تو تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبیؐ امی ہیں جن کی پیشین گوئی انجیل میں وارد ہے لیکن اسلام کے خلاف خاکبازی کرنے والوں سے یہ لوگ ڈرتے تھے کہ اگر انھوں نے اس حق کا اعتراف کر لیا تو یہ سارے لوگ ان کے دشمن بن جائیں گے۔ ان کے اس اندیشے کی بنا پر متنبہ فرمایا کہ لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف اللہ سے ڈرو۔ لوگوں کے ڈر سے تم نے اللہ کے ڈر کو نظر انداز کر دیا تو اس کے انجام کو اچھی طرح سوچ لو۔

دُہرے اجر کا وعدہ

'یُؤْتِكُمْ كِفْلَیْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ'۔ یہ اس وعدے کا اعادہ ہے جو سچے اور راست باز اہلِ کتاب کے لیے سورۂ قصص میں مذکور ہوا ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے جو اپنے دین پر بھی استوار رہے اور جب ان کے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کے مطابق ان کے پاس اللہ کا آخری رسول آیا تو انھوں نے اس کے موعود اور برحق ہونے کی بھی گواہی دی تو ان کو ان کا اجر دُہرا ملے گا اس لیے کہ انھیں حق کی گواہی دینے کے لیے دو کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا اور وہ دونوں امتحانوں میں کامیاب رہے۔ فرمایا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا یُتْلٰى عَلَیْهِمْ قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِهٖۤ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلِهٖ مُسْلِمِیْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّیِّئَةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝

جن کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب عطا فرمائی وہی اس (قرآن) پر ایمان لانے والے بنیں گے۔ اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ بے شک یہ ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے اور ہم پہلے سے اس کے ماننے والے رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کو ان کا اجر دو مرتبہ ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور لوگوں کی ایذا رسانیوں کو اچھے سلوک سے دفع کرتے اور ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔

(القصص - ۲۸: ۵۲ - ۵۴)

سورۂ قصص کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ 'اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ' سے اچھے اہلِ کتاب بالخصوص نصاریٰ کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جس کی حق دوستی اور خشیتِ رب کا ذکر

سورۂ مائدہ کی محوّلہ بالا آیت میں ہوا۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ اہل کتاب کے صالحین کو دُہرا اجر پانے کا یہ شرف اس بنا پر نہیں حاصل ہوگا کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں بلکہ اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے اس حق کی بھی گواہی دی جو حضرت مسیح علیہ السلام اور سابق نبیوں پر نازل ہوا اور اس حق کی بھی شہادت دی جو نبیِ اُمّی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ امت چونکہ اس تمام حق کی بلا کسی تفریق و تحزّب کے گواہی دینے والی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، خواہ وہ سابق انبیائے کرام پر نازل ہوا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس وجہ سے یہ دہرا اجر پانے کی حق دار ہے۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس امت میں داخل ہوں گے وہ اس شرف سے بہرہ مند ہوں گے۔ احادیث میں اس کی وضاحت ہوئی ہے لیکن اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس وجہ سے ہم زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ۔ یہ اسی طرح کی بشارت ہے جس طرح کی بشارت اسی سورہ کی آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے: يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (جس دن تم مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں چل رہا ہوگا) وہی بشارت ان صالحین کو بھی دی گئی ہے کہ ان کو اللہ نے ایمان کی جو روشنی دی تھی اس کی انھوں نے حفاظت کی، اس سے خود بھی رہنمائی حاصل کی اور اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی راہ دکھائی۔ اس کے صلے میں ان کو آخرت میں ایک نور عطا ہوگا جس کو اس دن کے اندھیرے میں یہ لے کر چلیں گے اور وہ سارے لوگ اس سے کسبِ نور کریں گے جنھوں نے دنیا میں ان کا ساتھ دیا ہوگا۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۹)

یہود کے حسد کی طرف اشارہ

یہ ان لوگوں کو ابھارا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اس فضلِ عظیم کے حاصل کرنے کے لیے سبقت کرو اور حاسد یہود کو چھوڑو، وہ نبیِ اُمّی اور ان پر ایمان لانے والوں کے خلاف حسد کی جس آگ میں جل رہے ہیں اسی میں جلتے رہیں۔ ان کے اس حسد کا سبب ان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اللہ کے تمام فضل کا اجارہ دار اپنے کو سمجھتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ اللہ کے فضل کے مالک وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کا مالک خود ہے۔ وہ اس کو بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے، جس کو چاہے بخش دے۔

'اَهْلُ الْكِتٰبِ' اگرچہ باعتبار الفاظ عام ہے، یہود و نصاریٰ دونوں ہی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد یہود من حیث الجماعت ہیں اس لیے کہ وہی

اللہ تعالیٰ کے تمام فضل و انعام کے وارث و مورث ہونے کے خبط میں مبتلا تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ان سے باہر نہ کسی کو نبوت و رسالت مل سکتی اور نہ ان کے سوا کوئی خدا کے ہاں کسی اجر اور فضل کا حق دار ہے چنانچہ اپنے اسی پندار کے سبب سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کے شدید مخالف تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ دعوت برابر بڑھتی جا رہی ہے یہاں تک کہ ان کی اپنی صفوں کے اندر سے بھی بہت سے اخیار ٹوٹ کر اس کے جاں نثار بنتے جا رہے ہیں تو ان پر حسد کا ایسا بخار چڑھا کہ بالآخر وہ ان کو ہلاک کر ہی کے اترا۔ اس حسد کے اسباب اور اس کے اثرات و نتائج پوری تفصیل سے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتٰبِ ..... الآیۃ سے مراد یہاں یہود کی اس جہالت و حماقت کے لازمی نتیجہ یعنی برابر مبتلائے حسد رہنے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس حسد میں اس وجہ سے مبتلا تھے کہ وہ اپنے کو اللہ کے تمام فضل و انعام کا پشتینی حق دار اور اجارہ دار سمجھے بیٹھے تھے۔ اگر وہ اس حماقت میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے کہ نبوت و رسالت اور سیادت و امامت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جس کو چاہے بخشے تو ان کے لیے کسی غصہ اور حسد میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ اب تک اللہ نے اس منصب پر ان کو سرفراز رکھا، اب اگر وہ اس کے لیے کسی دوسرے کو منتخب کر رہا ہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور ان کی سعادت اب حسد اور مخالفت میں نہیں بلکہ اپنے رب کے فیصلہ کو قبول کر لینے میں ہے لیکن وہ برابر اپنے اسی خبط میں مبتلا رہے جس میں مبتلا تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ وہ جس حسد و بغض کی آگ میں جل رہے تھے وہ برابر تیز سے تیز تر ہی ہوتی گئی۔ گویا اصل بات جو یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان لانے والے اللہ کے آخری رسول پر ایمان لا کر اپنے کو دہرے اجر کا حق دار بنائیں اور ان حاسد یہودیوں کو ان کے حال پر چھوڑیں، وہ برابر اپنے حسد کی آگ میں جلتے رہیں۔ اس بات کے بیان کرنے کے لیے اسلوب یہ اختیار فرمایا گیا ہے کہ یوں کہنے کے بجائے کہ ان یہودیوں کو ان کے حسد میں جلنے مرنے دو، تم اپنے آپ کو اپنے رب کے دہرے اجر کا حق دار بناؤ، بات یوں فرمائی گئی کہ یہود کو ان کی اس جہالت میں مبتلا رہنے دو کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی تمام سرفرازیوں کا حق دار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ محض ان کی حماقت ہے اور یہی حماقت ان کے سارے رنج و حسد کا سبب ہے۔

اس اسلوب میں بات کہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ یہود کی اصل بیماری بھی واضح ہو گئی اور اس کا اصل سبب بھی معلوم ہو گیا اور کلام میں کوئی تلخی بھی پیدا نہیں ہونے پائی۔

اس سورہ کی ان آخری آیات کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اگر ان

کے اقوال نقل کر کے ہم ان پر تنقید کرتے تو اس میں بڑی طوالت ہوتی جس کا کچھ خاص فائدہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے زبان، نظام اور نظائرِ قرآن کی روشنی میں ہمارے نزدیک جو تاویل صحیح ہے وہ ہم نے بیان کر دی ہے۔ امید ہے کہ تدبّر کرنے والوں کو اس سے اطمینان ہو جائے گا۔

یہاں خاص طور پر زبان اور اسلوب سے متعلق دو باتیں پیشِ نظر رکھیے:

زبان کا ایک اسلوب

ایک یہ کہ بعض مرتبہ کلام میں مدّنظر ظاہر کلام نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جو فرمایا کہ 'تاکہ اہلِ کتاب نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے'، تو مقصود اس سے اس کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اس جہالت کے لازمی نتیجہ یعنی فضل والوں پر حسد میں مرتے رہیں۔

دوسری یہ کہ حرف 'لا' نہ یہاں زائد ہے اور نہ قرآن میں اس کے زائد ہونے کی کوئی مثال موجود ہے بلکہ، جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، یہ ان حروف میں سے ہے جن کو زائد ماننے کی گنجائش کسی شکل میں نہیں ہے۔ ورنہ اس سے مفسدین اور اہلِ بدعت کے لیے دین میں فتنے پیدا کرنے کی راہیں کھل جائیں گی البتہ کبھی کبھی بنظرِ احتیاط تاکید کے لیے یہ دہرا دیا جاتا ہے اور یہ بات زبان کے معروف قاعدے کے مطابق ہوتی ہے جس کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں بہت ہیں، مثلاً 'مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ' (الاعراف ۷: ۱۲) یا 'وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ' (الانبیاء ۲۱: ۹۵) وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۱۵۔ دسمبر ۱۹۷۷ء

۴۔ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

۵۸

المجادلة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ کا خاتمہ اہل کتاب کے اس اعتراض کے جواب پر ہوا ہے جو انھوں نے جہاد کے خلاف اٹھایا۔ اس اعتراض سے تعرض کی ضرورت ظاہر ہے کہ اس وجہ سے پیش آئی کہ مخالفین کے یہ اعتراضات منافقین اٹھا لیتے اور پھر ان کو چپکے چپکے مسلمانوں کے اندر پھیلانا شروع کر دیتے کہ ان کے عقیدہ کو متزلزل اور ان کے جوش جہاد کو سرد کریں۔ اس سورہ کے زمانۂ نزول میں معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کی یہ سرگرمیاں بہت بڑھ گئی تھیں۔ یہ صورت حال داعی ہوئی کہ اس خفیہ پراپیگنڈا کا سدّباب کیا جائے چنانچہ اس سورہ میں منافقین کی اس طرح کی حرکتوں پر نہایت شدّت کے ساتھ گرفت بھی کی گئی اور اس کے سدّباب کے لیے بعض ضروری تدبیریں اختیار کرنے کی بھی مسلمانوں کو ہدایت فرمائی گئی۔ ساتھ ہی ایک نہایت مؤثر عملی مثال سے یہ سبق بھی لوگوں کو دیا گیا کہ اگر کسی کو اسلام کے سبب سے زندگی میں کوئی مشکل پیش آئے تو اس کو نہایت خلوص کے ساتھ اللہ و رسول کے سامنے عرض کرے۔ امید ہے کہ اس کی مشکل حل ہونے کی کوئی راہ اللہ تعالیٰ کھول دے گا۔ رہے وہ لوگ جو کسی فرضی یا واقعی مشکل کو بہانہ بنا کر اسلام کے خلاف پراپیگنڈے کی مہم شروع کر دیتے ہیں وہ درحقیقت اللہ و رسول کے خلاف محاذ جنگ کھولنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ یاد رکھیں کہ وہ ذلیل ہو کے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قطعی فیصلہ ہے کہ غلبہ اور سرفرازی صرف اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) ایک مومنہ کے ایک واقعہ کا حوالہ جس کو دین کے معاملہ میں ایک نہایت سخت مشکل پیش آئی لیکن اس نے دین سے بدگمان و مایوس ہونے کے بجائے اپنی مشکل، نہایت خلوص و اعتماد کے ساتھ اللہ و رسول کے سامنے پیش کی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی مشکل حل کرنے کی راہ کھول دی اور لوگوں کے سامنے اس کے اس مومنانہ اور شائستہ طریقہ کو بطور مثال پیش کیا کہ دین کے سبب سے کوئی مشکل کسی کو پیش آئے تو اس کے حل کا صحیح طریقہ یہ ہے نہ کہ وہ جو منافقین نے اختیار کیا ہے کہ شریعت کی جس بات کو اپنے نفس پر گراں محسوس کرتے ہیں اس کو اللہ و رسول کے خلاف خفیہ معاندانہ پراپیگنڈے کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

(۵-۸) ان لوگوں کی روش سے اظہارِ بیزاری جو اللہ و رسول پر اعتماد کرنے کے بجائے دین کے خلاف محاذ آرائی میں سرگرم تھے، برابر دین کے خلاف پراپگینڈا اور سرگوشیاں کرتے پھرتے، رسول کی توہین کرتے اور اللہ کی ڈھیل کو اپنے رویہ کی صحت کی دلیل سمجھے بیٹھے تھے۔ ان کو تنبیہ فرمایا گیا کہ یہ دنیا میں بھی ذلیل ہوں گے جس کی شہادت تاریخ میں موجود ہے اور آخرت میں بھی ان کا حصہ جہنم ہے جو ساری کسر پوری کر دے گی۔

(۹-۱۰) مسلمانوں کو گناہ، تعدی اور رسول کے خلاف سرگوشی کی ممانعت اور نیکی و پرہیزگاری کے لیے سرگوشی کی ہدایت۔ ساتھ ہی یہ اطمینان دہانی کہ منافقین ان کے خلاف جو سرگوشیاں کرتے پھر رہے ہیں ان کو وہ خاطر میں نہ لائیں، اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کسی کی سرگوشی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اہلِ ایمان کے شایانِ شان رویہ یہ ہے کہ اس طرح کی باتوں سے مبتلائے رنج و تشویش ہونے کے بجائے اپنے رب پر بھروسہ رکھیں۔ اللہ مفسدین کے شر سے ان کو محفوظ رکھے گا۔

(۱۱-۱۲) مجلسِ نبوی کے آداب و احترام کو ملحوظ رکھنے کی ہدایت اور اس کو نجویٰ کی جگہ بنانے کی ممانعت۔ ساتھ ہی نجویٰ کی بڑھتی ہوئی بیماری کو روکنے کے لیے مجلسِ نبوی سے متعلق بعض ہنگامی احکام کا اعلان۔

(۱۳) ہنگامی ضرورت پوری ہو جانے کے بعد وقتی حکم کی منسوخی کا اعلان اور اس امر کی ہدایت کہ عبادات میں سے ان چیزوں کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے جو اس بیماری کے سدِ باب کے لیے نافع ہیں جس کے لیے ہنگامی قانون نافذ کیا گیا تھا۔

(۱۴-۲۲) منافقین کے اصل مرکزِ وفاداری کی نشان دہی کہ وہ اللہ کے مغضوب یہودیوں کے ایجنٹ ہیں۔ یہ محض اپنے قول اور اپنی قسموں کے بل پر مسلمانوں کے ساتھی بنے ہوئے ہیں۔ ان کے دل اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ہیں۔ یہ مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہیں۔ شیطان نے ان کو اللہ کے خوف اور اس کی یاد سے غافل کر دیا ہے اور یہ اس کی پارٹی میں شامل ہو کر اللہ کے رسول کے خلاف محاذ آرائی میں سرگرم ہیں۔ یہ لوگ بالآخر نامراد ہوں گے۔ اللہ کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے ہے۔ سچے اہلِ ایمان صرف وہی ہیں جو اللہ و رسول کے دشمنوں سے، خواہ وہ ان کے باپ، بیٹے، بھائی اور اہلِ قبیلہ ہی کیوں نہ ہوں، بالکل قطعِ علائق کر لیں۔ اللہ انہی لوگوں سے راضی ہے۔ یہی اللہ کی پارٹی ہیں اور یہی فلاح پانے والے ہیں۔

سُوْرَةُ الْمُجَادَلَةِ (۵۸)

مَدَنِيَّةٌ ——— آيات : ۲۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴ قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَی
اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۱﴾
اَلَّذِیْنَ یُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآىِٕهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ
اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔیْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا
مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ﴿۲﴾ وَالَّذِیْنَ
یُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِیْرُ
رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ
بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۳﴾ فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَهْرَیْنِ
مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ
فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْكِیْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ
وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴ اللہ نے سن لی اس عورت کی بات جو تم سے جھگڑ رہی تھی اپنے شوہر کے بارے میں اور شکوہ کر رہی تھی اللہ سے اور اللہ سن رہا تھا تم دونوں کی گفتگو۔ اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ۱

تم میں سے جو اپنی بیویوں سے ظہار کر بیٹھتے ہیں وہ ان کی مائیں نہیں بن جاتی ہیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہوں گی جنھوں نے ان کو جنا ہے۔ البتہ اس طرح کے لوگ ایک نہایت ناگوار اور جھوٹی بات کہتے ہیں۔ اور اللہ درگزر فرمانے والا اور بخشنے والا ہے۔ اور جو لوگ ظہار کر بیٹھیں اپنی بیویوں سے پھر لوٹیں اسی چیز کی طرف جس کو حرام ٹھہرایا تو ایک گردن کو آزاد کرنا ہے قبل اس کے کہ وہ ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ یہ بات ہے جس کی تمھیں نصیحت کی جا رہی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔ پس جس کو غلام میسر نہ آئے تو اس کے اوپر لگاتار دو مہینے کے روزے ہیں، ہاتھ لگانے سے پہلے اور جو اس کی طاقت نہ رکھے تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے اس کے ذمہ۔ یہ اس لیے کہ اللہ اور اس کے رسول پر تمھارا ایمان راسخ ہو۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ ۲-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ (۱)

'سنن' قبول کرنے کے معنی میں

'قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ' کے معنی، موقع کلام دلیل ہے کہ یہاں، صرف سن لینے کے نہیں بلکہ قبول کر لینے کے ہیں۔ اس معنی میں یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے اور عربی زبان میں بھی معروف ہے۔ بلکہ ہماری زبان میں بھی 'سننا' قبول کرنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

'تُجَادِلُكَ' سے پہلے عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق فعل ناقص محذوف ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جن خاتون کا واقعہ یہاں مذکور ہے ان کو اپنا معاملہ پیش کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بار بار حاضر ہونا پڑا۔

مُجادلہ کا مفہوم

مُجادلۃ، قرآن میں اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ برے معنی اس کے کٹ حجتی کرنے اور جھگڑنے کے ہیں اور اچھے معنی اس کے کسی سے اپنی بات محبت، اعتماد، حسنِ گزارش، تذلّل اور اصرار کے ساتھ منوا لینے کی کوشش کرنے کے ہیں۔ اس میں جھگڑنا تو بظاہر ہوتا ہے لیکن یہ جھگڑنا محبّت اور اعتماد کے ساتھ ہوتا ہے جس طرح چھوٹے اپنی کوئی بات اپنے کسی بڑے سے، اس کی شفقت پر اعتماد کر کے منوانے کے لیے جھگڑتے ہیں۔ اس مجادلہ محبّت کی بہترین مثال سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا وہ مجادلہ ہے جو انھوں نے قومِ لوط کے باب میں اپنے رب سے کیا ہے اور جس کی اللہ تعالیٰ نے نہایت تعریف فرمائی ہے۔ اس کی تفصیل ہم اس کے محل میں پیش کر چکے ہیں۔ یہاں ان خاتون کے جس مجادلہ کی طرف اشارہ ہے اس کی نوعیت بالکل یہی ہے۔ اردو میں اس کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کوئی موزوں لفظ سمجھ میں نہیں آیا اس وجہ سے میں نے ترجمہ جھگڑنا ہی کیا ہے لیکن یہ جھگڑنا خاص مفہوم میں ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے بشرطیکہ آدمی موقع و محل کو ملحوظ رکھ سکے۔

جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اس کی نوعیت

آیت میں جن خاتون کی طرف اشارہ ہے روایات میں ان کا نام خولہ بنت ثعلبہؓ آیا ہے۔ ان کے شوہر اوس بن صامتؓ انصاری تھے۔ ایک مرتبہ غصہ میں آ کر وہ بیوی کو کہہ بیٹھے کہ اَنْتِ عَلَیَّ کَظَھْرِ اُمِّیْ (اب تجھ کو کبھی ہاتھ لگایا تو گویا اپنی ماں کی پیٹھ کو ہاتھ لگایا) زمانۂ جاہلیت میں بیوی کو اس طرح کی بات کہہ دینے سے ایسی طلاق پڑ جاتی جس کے بعد بیوی لازماً شوہر سے جدا ہو جاتی۔ اس وجہ سے حضرت خولہؓ کو سخت پریشانی پیش آئی کہ اس عمر میں شوہر اور بچوں سے جدا ہو کر کہاں جائیں! بالآخر انھوں نے معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کیا اور باصرار و بالحاح آپ سے درخواست کی کہ آپ ان کی اس پریشانی کا کوئی حل بتائیں۔ آپ کے سامنے وحیِ الٰہی کی کوئی واضح رہنمائی اس بارے میں موجود نہیں تھی اس وجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جواب میں کچھ توقّف فرمایا جس کے سبب سے ان کو بار بار اپنے معاملے کی طرف حضورؐ کو توجہ دلانی پڑی۔

الفاظِ قرآن سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ انھوں نے اس معاملے میں اپنے شوہر کی بھی کچھ مدافعت کی۔ حضرت اوسؓ کے مزاج میں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے، کچھ تیزی تھی جس کے سبب سے غصہ میں ان کی زبان سے ایک ناروا فقرہ نکل گیا۔ مقصد ہرگز بیوی کو طلاق دینا نہیں تھا اس وجہ سے میاں بیوی دونوں کو سخت پریشانی پیش آئی۔ حضرت خولہؓ نے یہ صورتِ حال بھی حضورؐ کے سامنے رکھی ہوگی تاکہ یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے کہ یہ فقرہ کہتے ہوئے ان کے شوہر کے ذہن میں طلاق کا کوئی خیال موجود نہ تھا محض اشتعال میں ایک فقرہ بلاقصد ان کی زبان سے نکل گیا۔

ایک سوال کا جواب

ظہار کا ذکر سورۂ احزاب میں بھی آیا ہے لیکن بالکل ضمناً، صرف اتنا آیا ہے کہ وَمَا جَعَلَ أَزْوَاجَكُمُ اللَّائِي تُظَاهِرُونَ مِنْهُنَّ أُمَّهَاتِكُمْ (الاحزاب - ۳۳ : ۴) (اور تمھاری وہ بیویاں جن سے تم ظہار کرتے ہو خدا نے ان کو تمھاری مائیں نہیں بنایا ہے) لیکن اوّل تو یہ ضروری نہیں کہ سورۂ احزاب سورۂ مجادلہ سے پہلے نازل ہوئی ہو۔ دوسرے نازل ہوئی بھی ہو تو اس سے صرف اتنی ہی بات معلوم ہوتی ہے کہ ظہار سے کسی کی بیوی اس کی ماں نہیں بن جاتی۔ یہ نہیں واضح ہوتا کہ کوئی شخص یہ حرکت کر بیٹھے تو اس سے اس کے اوپر کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور اس کی تلافی کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس وجہ سے حضورؐ کے سامنے سورۂ احزاب والی آیت رہی بھی ہو جب بھی آپ حضرت خولہؓ کے معاملے میں کوئی قطعی فیصلہ اسی صورت میں فرما سکتے تھے جب وحیٔ الٰہی آپ کی رہنمائی فرمائے۔ چنانچہ آپ نے وحیٔ الٰہی کے انتظار میں توقف فرمایا یہاں تک کہ ان خاتون کے اس شکوہ و مجادلہ کی برکت سے نہ صرف ان کے لیے بلکہ اللہ کے بے شمار بندوں اور بندیوں کے لیے جاہلیت کی ایک بے ہودہ رسم کے عواقب سے چھوٹنے کی ایک نہایت مبارک راہ کھل گئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرما کر ان کو اور ان کے اس مجادلہ کو زندۂ جاوید بنا دیا اور لوگوں کو سبق دیا کہ جن کو دین کے معاملے میں کوئی مشکل پیش آئے انھیں اس مومنہ خاتون کی طرح اپنی مشکل اپنے رب کے آگے پیش کرنی چاہیے، منافقوں کی طرح اس کو نکتہ چینی، سرگوشی اور اللہ و رسول کے خلاف محاذ آرائی (محادہ) کا بہانہ نہیں بنا لینا چاہیے۔

ہر مشکل کی کلید اللہ تعالیٰ سے استعانت ہے

وَاللَّهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا یعنی یہ شکوہ و مجادلہ چونکہ خاص اللہ تعالیٰ ہی سے تھا اس وجہ سے وہ خاص توجہ و مہربانی سے اس کو سنتا رہا۔ چنانچہ اس نے اپنی اس بندی کی مشکل حل کرنے کی راہ کھول دی۔ اس سے یہ بات نکلی کہ جو لوگ اپنی کوئی مشکل اپنے رب سے عرض کرتے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو نہایت توجہ و شفقت سے سنتا ہے۔ وہ سمیع و بصیر ہے اور جب وہ سنتا ہے اور ہر چیز کی قدرت بھی رکھتا ہے تو بندہ اس سے مایوس و بدگمان کیوں ہو!

یہاں یہ بات بھی یاد رکھیے کہ دنیوی و مادی مشکلات کی طرح روحانی و عقلی الجھنوں سے نکلنے کی بھی سب سے زیادہ کامیاب راہ یہی ہے کہ آدمی اس کو اپنے رب کے آگے پیش کرے۔ بسا اوقات کوئی ایسی علمی و عقلی مشکل پیش آ جاتی ہے جس کا حل کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور اس سے دین کے معاملے میں شکوک پیدا ہونے لگتے ہیں۔ اس طرح کے حالات میں آدمی اگر اپنی مشکل اپنے رب کے آگے پیش کرے اور اس سے ہدایت کا طالب ہو تو ان شاء اللہ اس کو شرحِ صدر حاصل ہو جائے گا بشرطیکہ آدمی صبر کے ساتھ اپنے رب سے استعانت کرے۔ طالبینِ حق کا طریقہ ہمیشہ یہی رہا ہے لیکن جو لوگ سفلہ اور جلد باز ہوتے ہیں وہ یہ راہ اختیار کرنے کے بجائے یا تو اپنے اوہام و شکوک ہی کو دین بنا لیتے

ہیں یا ان کو دین پر نکتہ چینی کا ذریعہ بنا کر اس کے خلاف محاذ آرائی شروع کر دیتے ہیں جس کا نتیجہ وہی نکلتا ہے جس کا ذکر اسی سورہ میں آگے تفصیل سے آئے گا۔

الَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْكُمْ مِّنْ نِّسَآئِهِمْ مَّا هُنَّ اُمَّهٰتِهِمْ ؕ اِنْ اُمَّهٰتُهُمْ اِلَّا الّٰٓـِٔيْ وَلَدْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَيَقُوْلُوْنَ مُنْكَرًا مِّنَ الْقَوْلِ وَزُوْرًا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ (۲)

ظہار اور اس کا شرعی حکم

اس سلسلہ میں پہلی اصولی بات یہ فرمائی کہ جو لوگ اپنی بیویوں کو اس طرح کی کوئی بات کہہ بیٹھتے ہیں اس سے ان کی بیویاں ان کی ماؤں کے حکم میں نہیں داخل ہو جاتیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنھوں نے ان کو جنا ہے۔ ان کو جو حرمت حاصل ہوئی ہے وہ جننے کے تعلق سے حاصل ہوئی ہے جو ایک فطری اور ابدی حرمت ہے۔ یہ چیز کسی دوسری عورت کو مجرد اس بنیاد پر نہیں حاصل ہو جائے گی کہ ایک شخص نے اس کو یا اس کے کسی عضو کو اپنی ماں یا اس کے کسی عضو سے تشبیہ دے دی۔ اس طرح کی بات کسی نے کہی ہے تو اس کی بات بھونڈی اور جھوٹی ہے جس پر وہ تنبیہ و تادیب کا مستحق ضرور ہے لیکن اس سے اس کی بیوی اس پر حرام نہیں ہو جائے گی۔

وَاِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ۔ یعنی اس طرح کی منکر اور خلافِ حقیقت بات اشتعال میں آکر کوئی مسلمان اپنے منہ سے نکال بیٹھا پھر اس کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تو اللہ تعالیٰ درگزر فرمانے والا اور معاف کرنے والا ہے۔ چنانچہ اس معاملے میں بھی چونکہ غلطی کے مرتکب کو اپنی غلطی کا پورا پورا احساس ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر فرمایا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جاہلیت میں عربوں نے جس طرح منہ بولے بیٹوں کو بالکل صُلبی بیٹوں کا درجہ دے رکھا تھا اسی طرح ظہار کے معاملے میں بھی ان کا رویّہ نہایت متشدّدانہ تھا۔ کوئی شخص اپنی بیوی کو اس طرح کی بات کہہ گزرتا جس کا حوالہ اوپر گزرا تو رواجِ عام اس کی بیوی کو فی الواقع اس کی ماں ہی کی طرح حرام بنا دیتا؛ مجال نہیں تھی کہ کوئی شخص ظہار کے بعد بیوی سے زن و شو کا تعلق قائم کر سکے۔ کوئی اس طرح کی جسارت کرتا تو لوگ اس کو بالکل اسی نگاہ سے دیکھتے گویا اس نے اپنی ماں کو نکاح میں رکھ چھوڑا ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس طرح کی خلافِ فطرت باتوں کی اصلاح کرتے ہوئے ہر جگہ اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ فطرت کے قانون میں جس چیز کے لیے جو جگہ ہے اس کو اسی جگہ رکھو۔ اس میں ردّ و بدل کر کے دینِ فطرت کو مسخ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ سورۂ احزاب کی تفسیر میں یہ بحث تفصیل سے گزر چکی ہے۔ یہاں بھی اس رسمِ بد کی اصلاح کرتے ہوئے معترضین کا منہ بند کرنے کے لیے پہلے ہی یہ بات واضح فرما دی کہ اس طرح کی ناروا باتوں سے فطرت کے قوانین نہیں بدل جاتے۔ بیوی محض کسی شخص کی ایک جھوٹ بات کی وجہ سے اس کی ماں نہیں بن جائے گی۔

ایک نحوی سوال

'مَا ھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ' میں ایک سوال 'اُمَّھٰتِھِمْ' کے اعراب سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس کو نصب کیوں ہے؟ میرے نزدیک یہاں 'مَا' معنی میں 'لَیْسَ' کے ہے۔ قرآن میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً سورۂ حآقّہ میں فرمایا ہے: 'فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ' (۴۷) (تو کوئی بھی تم میں سے اس کو بچانے والا نہیں بنے گا)۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ (۳)

ظہار کا کفارہ

یہ اس کا حل بتایا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی سے ظہار کر بیٹھے پھر وہ اس چیز کی طرف لوٹنا چاہے جس کو اس نے حرام ٹھہرایا تو اس کو اس سے پہلے کفّارہ کے طور پر ایک غلام آزاد کرنا ہو گا۔

یعنی اس کی بیوی اس کے ظہار کے سبب سے اس کی ماں کی طرح حرام تو نہیں ہو جائے گی لیکن چونکہ نکاح و طلاق کے اثرات معاشرتی زندگی پر نہایت دُور رس ہوتے ہیں اس وجہ سے اس معاملے میں جدّ و ہزل دونوں ہی کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ ایسے شخص کو کچھ تنبیہ و تادیب کی جائے تاکہ وہ بھی آئندہ احتیاط کی روش اختیار کرے اور دوسروں کو بھی اس سے سبق حاصل ہو۔ چنانچہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ بیوی کو ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرے۔ یہاں لفظ 'رقبۃ' آیا ہے جس کے معنی گردن کے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ غلام یا لونڈی کی کوئی تخصیص نہیں ہے بلکہ بعض فقہاء نے تو مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید بھی ضروری نہیں سمجھی ہے۔ دونوں میں سے جو بھی میسر ہو اس سے کفّارہ ادا ہو جائے گا بس اتنی بات ہے کہ مسلم غلام میسر ہو تو اس کو ترجیح حاصل ہو گی۔

یہاں یہ امر ملحوظ رہے کہ غلام کی آزادی کو مقدم رکھا ہے۔ اگر غلام میسر نہ آئے تو دوسری متبادل شکلیں، جو آگے مذکور ہیں، اختیار کرنے کی اجازت ہے۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جس کا اظہار ہم نے سورۂ نور کی تفسیر میں کیا ہے کہ اسلام نے اپنے نظام میں غلاموں کی آزادی کی نہایت وسیع راہیں کھول دی تھیں یہاں تک کہ بہت سے چھوٹے بڑے گناہوں کا کفّارہ بھی غلام آزاد کرنا قرار دے دیا تاکہ اس مہم کو ہر پہلو سے تقویت حاصل ہو۔

منکرات کا ذکر ابہام کے ساتھ

'ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا' میں تھوڑا سا ابہام ہے۔ اس ابہام کی وجہ یہ ہے کہ جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ بالبداہت بھی منکر ہے اور قرآن نے بھی اس کو 'مُنْكَر' اور 'زُوْر' قرار دیا ہے۔ ایک منکر بات کا ذکر صراحت کے ساتھ موزوں نہیں تھا اس وجہ سے قرآن نے مبہم الفاظ میں اس کی طرف اشارہ کر دیا۔ مطلب یہی ہے کہ ظہار کے بعد وہ پھر وہی کام کرنا چاہیں جس کو انھوں نے اپنی ماں کی حرمت کی طرح حرام ٹھہرایا تو ان کے لیے ہاتھ لگانے سے پہلے ایک غلام آزاد کرنے کا حکم ہے۔

اس ابہام کی وضاحت اوّل تو 'مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا' کے الفاظ سے بھی ہو جاتی ہے پھر بعینہٖ

یہی اسلوبِ کلام اسی سورہ کی آیت ۸ میں بھی استعمال ہوا ہے۔ فرمایا ہے: ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُھُوْا عَنْہُ (پھر وہ کرتے ہیں وہی کام جس سے وہ روکے گئے ہیں) اسی طرح یہاں بھی اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پھر وہ کریں وہی کام جس سے رکنے کا انھوں نے عہد کیا یا جس کو اپنے اوپر حرام ٹھہرایا۔ 'قَالُوْا' اور 'یَقُوْلُ' وغیرہ کے الفاظ میں تقاضائے بلاغت و ایجاز جو ابہام ہوا کرتا ہے اس کی ایک عمدہ مثال سورۂ مریم کی آیت ۸۰ میں بھی ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو اس کی تفسیر پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

'مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا' میں زور اس بات پر ہے کہ یہ کفارہ ہاتھ لگانے سے پہلے پہلے ادا کر دیا جائے۔ آگے والی آیت میں بھی اس قید کا اعادہ ہے جس سے اس کا مؤکد ہونا ظاہر ہوتا ہے اس وجہ سے یہ جائز نہیں ہے کہ غلبۂ نفس سے بے بس ہو کر کفارہ ادا کرنے سے پہلے تعلق قائم کر لیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو یہ حدود اللہ سے، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، تجاوز ہوگا۔

تنبیہ 'ذٰلِکُمْ تُوْعَظُوْنَ بِہٖ ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ'۔ یہ تنبیہ ہے کہ ان باتوں کی نصیحت تمھیں تمھارے رب کی طرف سے کی جا رہی ہے۔ اگر تم نے درپردہ یا علانیہ ان کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے سارے اعمال کی خبر رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ خبر رکھتا ہے تو اس کی گرفت سے نہ بچ سکو گے۔ 'ذٰلِکُمْ' میں اشارہ ان تمام باتوں کی طرف ہے جو اوپر بیان ہوئیں۔ یعنی نہ تو ظہار کے معاملے میں جاہلیت کے رسوم پر اصرار کرو اور نہ کفارہ سے متعلق جو ہدایت کی جا رہی ہے اس سے فرار کے لیے چور دروازے اور فقہی حیلے ایجاد کرو بلکہ ہر حکم کی تعمیل اس کی صحیح سپرٹ میں کرو۔ اسی میں دین و دنیا دونوں کی فلاح ہے۔

فَمَنْ لَّمْ یَجِدْ فَصِیَامُ شَہْرَیْنِ مُتَتَابِعَیْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا ج فَمَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا ط ذٰلِکَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ط وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ ط وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۴)

یعنی غلام میسر نہ آئے تو لگاتار دو مہینے کے روزے رکھے اور اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ اس زمانے میں عملاً یہی دو شکلیں باقی رہیں گی اس لیے کہ غلامی ختم ہو چکی ہے اور یہ بات عین منشائے اسلام کے مطابق ہوئی ہے۔

لفظ 'مُتَتَابِعَیْنِ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر دو ماہ کے روزے تمام ہونے سے پہلے پہلے اختلاط کر لیا تو از سرِ نو پورے روزے رکھنے پڑیں گے۔

یہاں اگرچہ 'اِطْعَامُ سِتِّیْنَ مِسْکِیْنًا' کے ساتھ 'مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّتَمَآسَّا' کی قید نہیں ہے لیکن اس صورت میں بھی یہ قید مفہوم ہے۔ اس کے ذکر نہ کرنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہ شکل اصل نہیں بلکہ اصل کی فرع ہے تو جب اصل کے ساتھ اس کا ذکر ہے تو فرع کے ساتھ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔

'ذٰلِکَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ'۔ یہ ان ہدایات کا فائدہ بتایا ہے کہ یہ اس لیے دی گئی ہیں کہ اللہ اور

رسول پر تمہارا ایمان مستحکم ہو۔ 'لِتُؤْمِنُوْا' یہاں عربیّت کے معروف اسلوب کے مطابق اپنے کامل معنی میں ہے جس کی مثالیں اس کتاب میں پیچھے گزر چکی ہیں۔ انسان اگر اپنی کسی غلطی یا کمزوری کی تلافی کے لیے کوئی مشقت اٹھاتا ہے تو اس سے اس کی غلطی کی تلافی بھی ہوتی ہے اور اصل مقصد میں اس کے قدم راسخ بھی ہوتے ہیں۔

'وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ' یہ اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ 'ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ' کے الفاظ سے اوپر گزر چکی ہے۔ یعنی یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود ہیں۔ ان کو توڑنے کی جسارت نہ کرنا ورنہ اس کا انجام نہایت برا ہوگا۔

'وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یعنی اللہ کے حدود کو توڑنے والے کافر ہیں اور ان کے لیے آخرت میں دردناک عذاب ہے تو بدقسمت ہوں گے وہ لوگ جو اسلام کا دعویٰ رکھتے ہوئے اپنے کو کافروں میں شامل کر لیں۔

ظہار سے متعلق بعض اور سوالات بھی ہیں لیکن ان کا تعلق تفسیر سے نہیں بلکہ فقہ سے ہے اس وجہ سے ہم ان سے تعرض نہیں کریں گے۔ تفصیل کے طالب فقہی جزئیات کے لیے فقہ کی کتابوں کی مراجعت کریں۔

۲- آگے آیات ۵ - ۱۱ کا مضمون

مجادلۂ حسن کے بعد اب آگے ان لوگوں کا کردار بیان ہو رہا ہے جو 'محادّہ' یعنی اسلام دشمنی اور رسول دشمنی کے روگ میں مبتلا تھے۔ اگرچہ یہ لوگ بظاہر مسلمانوں کے اندر شامل تھے لیکن یہ ساختہ پرداختہ یہود کے تھے اور مسلمانوں کے اندر ان کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا مخصوص طریقۂ کار یہ تھا کہ یہ کسی چیز کو بہانہ بنا کر اسلام اور پیغمبر کے خلاف مسلمانوں کے اندر سرگوشیاں کرتے تاکہ ان کے عقیدے کو متزلزل اور اسلام کے مستقبل سے ان کو مایوس کریں۔ یہاں ان کی انہی ریشہ دوانیوں سے پردہ اٹھایا اور ان کو خبردار کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی ایک ایک سرگوشی سے اچھی طرح باخبر ہے اور بہت جلد اس کا انجام ان کے آگے آجائے گا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان کے شر سے محفوظ رہنے اور مجلسِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی سرگوشیوں سے پاک رکھنے کی بعض تدبیریں بتائی گئی ہیں ــــــ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵ - ۱۱

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ

عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿۵﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا
أَحْصٰهُ اللّٰهُ وَنَسُوهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿۶﴾ أَلَمْ تَرَ ع ۱
أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ مَا يَكُونُ مِنْ
نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ
وَلَا أَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا
ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ
عَلِيمٌ ﴿۷﴾ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نُهُوا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُودُونَ
لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ
الرَّسُولِ وَإِذَا جَاءُوكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ
وَيَقُولُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ
جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿۸﴾ يٰأَيُّهَا الَّذِينَ
اٰمَنُوا إِذَا تَنٰجَيْتُمْ فَلَا تَتَنٰجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَ
مَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنٰجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ
الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿۹﴾ إِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ
لِيَحْزُنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْـًٔا إِلَّا بِإِذْنِ
اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿۱۰﴾ يٰأَيُّهَا الَّذِينَ
اٰمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ
اللّٰهُ لَكُمْ وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِينَ

اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ⑪

ترجمۂ آیات ۵ - ۱۱

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف محاذ آرائی کر رہے ہیں وہ ذلیل ہوں گے جس طرح ان سے پہلے ان کے ہم مشرب ذلیل ہوئے۔ اور ہم نے نہایت واضح تنبیہات اتار دی ہیں اور کافروں کے لیے نہایت سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ اس دن کو یاد رکھیں جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا اور ان کو ان کے سارے اعمال سے آگاہ کرے گا۔ اللہ نے اس کو شمار کر رکھا ہے اور یہ لوگ اس کو بھلائے بیٹھے ہیں اور اللہ ہر چیز کے پاس حاضر ہے۔ ۵-۶

کیا سمجھتے نہیں کہ اللہ جانتا ہے اس سارے کو جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے! نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے۔ اور نہ اس سے کم یا زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں پھر وہ ان کو ان کے سارے کیے سے آگاہ کرے گا قیامت کے دن بے شک اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔ ۷

کیا نہیں دیکھتے ان کو جو سرگوشیوں سے روکے گئے، پھر وہ وہی کام کر رہے ہیں جن سے روکے گئے اور یہ لوگ گناہ، تعدّی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔ اور جب تمہارے پاس آتے ہیں تو تم کو سلام کرتے ہیں ایسے لفظ سے جس سے اللہ نے تم کو سلام نہیں بھیجا اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ اللہ اس کی پاداش میں ہم کو عذاب کیوں نہیں دیتا جو ہم کہتے ہیں۔ ان کے لیے جہنّم ہی کافی ہے۔ یہ

اس میں پڑیں گے۔ پس وہ برا ٹھکانا ہے۔ ۸

اے ایمان والو! جب تم سرگوشی کرو تو گناہ، تعدّی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی سرگوشی کرو اور اللہ سے ڈرو جس کے حضور میں تم سب اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۹

یہ سرگوشیاں شیطان کی طرف سے ہیں تاکہ وہ ایمان والوں کو غم پہنچائے حالانکہ اللہ کے اذن کے بدون وہ ان کو ذرا بھی نقصان پہنچانے پر قادر نہیں۔ اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔ ۱۰

اے ایمان والو، جب تم کو کہا جائے کہ مجلسوں میں کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھو، اللہ تمھارے لیے کشادگی پیدا کرے گا اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ تو اٹھ جاؤ، اللہ ان لوگوں کے، جو تم میں سے اہلِ ایمان ہیں اور جن کو علم عطا ہوا ہے، مدارج بلند کرے گا۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ ۱۱

۳۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ کُبِتُوْا کَمَا کُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ ط وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّہِیْنٌ (۵)

'محادّۃ' کا مفہوم

'مُحَآدَّۃ' کے معنی مخالفت اور دشمنی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ 'مُوَآدَّۃ' کا مقابل ہے۔ اسی سورہ میں یہ دونوں لفظ ایک ہی آیت میں نہایت خوبی سے استعمال ہوئے ہیں اور ایک دوسرے کے مفہوم پر روشنی ڈال رہے ہیں۔ فرمایا ہے: 'لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ' (۲۲) (تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو پھر وہ ان لوگوں کو دوست بنائے جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہوں)۔

اوپر کے پیرے میں، جیسا کہ واضح ہوا، ان لوگوں کا کردار بیان ہوا ہے جن کو دین کے معاملے میں

کوئی مشکل پیش آتی تو وہ اس کو اللہ و رسول کے آگے ہی پیش کرتے اور اپنا شکوہ و مجادلہ اللہ و رسول ہی سے کرتے۔ اب ان کے مقابل میں یہ ان لوگوں کا کردار بیان ہو رہا ہے جو مدعی تو تھے ایمان و اسلام کے لیکن ان کا رویہ اللہ و رسول کے ساتھ مخالفت کا تھا۔ اسلام کی جو بات ان کو اپنے مفاد اور اپنی خواہشوں کے خلاف محسوس ہوتی اس کے خلاف سرگوشیوں اور خفیہ پراپیگنڈے کی مہم شروع کر دیتے تاکہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر کے ان کے ایمان و اسلام کو بھی متزلزل کر دیں۔ ان کی ساری ہمدردیاں، جیسا کہ آگے واضح ہو گا، اسلام کے دشمنوں بالخصوص یہود کے ساتھ تھیں۔ یہ مسلمانوں کے اندر یہود کے ایجنٹ تھے اور انہی کے زیرِ ہدایت برابر اس کوشش میں رہتے کہ جو موقع بھی ملے اس سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت زینبؓ کے معاملے میں انھوں نے جو فتنے اٹھائے ان کی تفصیلات سورۂ نور اور سورۂ احزاب کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔ ظہار کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے تھا جس کے بارے میں وہ قرآن کی رعایت کو نکتہ چینی کا ہدف بنا سکتے تھے جس سے سادہ لوحوں کے اندر غلط فہمیاں پھیل سکتی تھیں۔ دورِ جاہلیت میں، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، اس کو لوگوں نے طلاقِ مغلظہ کا درجہ دے رکھا تھا۔ یہ اشرار آسانی سے لوگوں میں یہ سرگوشی کر سکتے تھے کہ اسلام نے نعوذ باللہ اپنے پیرؤوں کے لیے ماں کے ساتھ نکاح کو بھی جائز کر دیا۔ یہ صورت متقضی تھی کہ اس موقع پر ان شریروں کو اچھی طرح بے نقاب کر دیا جائے تاکہ کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش وہ کریں تو اس کا سدِّ باب ہو سکے۔

رسول کے مخالفین کا انجام 'کُبِتُوْا کَمَا کُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ'۔ 'کبت' کے معنی ذلیل و خوار کر کے تباہ کرنے کے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ ذلیل و خوار ہو کر ان لوگوں کی طرح تباہ ہوں گے جس طرح ان سے پہلے ان کے ہم مشرب تباہ ہو چکے ہیں۔ 'وَقَدْ اَنْزَلْنَآ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ' (اور اس دعوے کی صداقت کی نہایت واضح دلیلیں ہم قرآن میں اتار چکے ہیں)۔ یہ اشارہ ان تاریخی حقائق کی طرف ہے جو قرآن میں نہایت تفصیل سے یہ واضح کرنے کے لیے بیان ہوئے ہیں کہ اللہ کے رسولوں کی مخالفت کرنے والے بالآخر ذلیل و خوار ہو کر تباہ ہوتے ہیں۔

'وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ'۔ فرمایا کہ ان کافروں کے لیے بھی بالآخر ایک ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ یہ اشارہ ان کافروں کی طرف ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں سرگرم تھے۔ فرمایا کہ یہ بھی بالآخر اسی طرح ذلیل و خوار ہوں گے جس طرح ان کے پیش رو ذلیل و خوار ہو چکے ہیں۔ جب ان کا کردار وہی ہے جو ان کا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کی تاریخ ان سے مختلف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا قانون سب کے لیے ایک ہی ہے۔

قرآن کی یہ دھمکی اس وقت پوری ہو گئی جب قریش کی طاقت بھی ختم ہو گئی اور یہود بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔ اس وقت ان منافقین کے لیے بھی کوئی جائے پناہ باقی نہیں رہی جو یہود کی زیرِ سرپرستی ریشہ دوانیاں کرتے تھے۔ ان کا حشر بھی وہی ہوا جو ان کے مرشد یہود کا ہوا۔ آگے کی سورتوں میں ان کے انجام کی عبرت انگیز

تفصیل آ رہی ہے۔

ان کے عذاب کو ذلیل کرنے والا عذاب اس لیے کہا گیا کہ ان کو نہایت رسواکن قتل و جلا وطنی اور غلامی کی سزاؤں سے دوچار ہونا پڑا اور کسی کو بھی ان کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوئی بلکہ سب نے ان پر لعنت ہی کی۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ۭ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (۶)

'يَوْمَ' کا نصب اگرچہ 'عَذَابٌ مُّهِيْنٌ' سے بھی ہو سکتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ معروف ضابطۂ عربیت کے مطابق، فعل محذوف سے منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں تو جو پیش آئے گا آئے گا ہی، یہ لوگ اس دن کو بھی یاد رکھیں جس دن اللہ تعالیٰ ان سب کو اٹھائے گا اور جو کچھ انھوں نے کیا ہو گا وہ سب ان کے آگے رکھ دے گا۔ 'جَمِيْعًا' کی قید اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے کہ آج جو سازشیں اور سرگوشیاں ہو رہی ہیں ان کے تمام ارکان و عوامل جمع کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کے سامنے اس کے سارے راز بے نقاب کر دے گا کہ کس نے کیا مشورے دیے اور کس نے کس طرح اس کی تعمیل کی۔

'فَيُنَبِّئُهُمْ' سے مراد ظاہر ہے کہ اس کا لازم ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان کے سارے کیے دھرے سے ان کو آگاہ کرے گا تاکہ وہ اس کے نتائج بھگتیں۔

ایک مغالطہ پر تنبیہ

'اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ' میں ایک بہت بڑے مغالطہ سے آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اس غلط فہمی میں نہ رہیں کہ جس طرح یہ سب کچھ کر کے بھول گئے اللہ بھی اس کو بھول گیا ہے۔ ان لوگوں کو ان کی شرارتوں کی سزا نہیں ملی اس وجہ سے سمجھ بیٹھے کہ اللہ بھول گیا ہے لیکن اللہ نے ان کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رکھی ہے اور جزا و سزا کے لیے ایک دن مقرر کر رکھا ہے جس دن سب کی نیکی بدی اس کے سامنے آ جائے گی۔

'وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ' یہ اس کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں غائب نہیں ہوتا ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۷)

اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے

یہ اوپر والی بات کی مزید وضاحت ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ ایک ایک چیز سے باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کے سامنے اس کا ایک ایک عمل رکھ دے گا۔ 'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں عام ہے اور یہ اسلوب بیان اس موقع پر اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر شخص پر واضح ہونی چاہیے۔ جب اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے وہی اس سارے نظام کو چلا رہا

ہے، اس کے ایک ایک پرزے کی حرکت اس کے اذن سے ہوتی ہے اور اسی کے حکم سے اس کے ایک ایک متنفس کی زندگی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ آسمانوں اور زمین کی کسی چیز سے بھی وہ بے خبر رہے۔ 'اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ' (کیا وہ نہ جانے گا جس نے سب کو پیدا کیا ہے)۔

'مَا یَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ...... الاٰیۃ' فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کا علم ہر چیز کو محیط ہے تو یہ اللہ اور رسول کے خلاف سرگوشیاں کرنے والے یاد رکھیں کہ جب ان کے تین سرگوشیاں کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ چوتھا اللہ ہوتا ہے اور جب ان کے پانچ سرگوشیاں کر رہے ہوتے ہیں تو ان کے ساتھ چھٹا اللہ ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اس سے کم ہوں یا زیادہ اللہ ان کے پاس لازماً ہوتا ہے۔

'اَیْنَ مَا کَانُوْا' اور یہ بات بھی یاد رکھیں کہ وہ جہاں کہیں بھی چھپ کر سرگوشی کریں گے، اللہ وہاں ان کے پاس موجود ہوگا۔ آسمانوں اور زمین میں کوئی گوشہ وہ ایسا نہیں تلاش کر سکتے جہاں وہ اپنے آپ کو خدائے عالم الغیب سے چھپا سکیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نُھُوْا عَنِ النَّجْوٰی ثُمَّ یَعُوْدُوْنَ لِمَا نُھُوْا عَنْہُ وَیَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ ز وَاِذَا جَآءُوْکَ حَیَّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِہِ اللہُ لا وَیَقُوْلُوْنَ فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ لَوْلَا یُعَذِّبُنَا اللہُ بِمَا نَقُوْلُ ط حَسْبُھُمْ جَھَنَّمُ ج یَصْلَوْنَھَا ج فَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (۸)

سرگوشیوں کی اصل غایت

یہ ان کی حالت پر اظہارِ تعجب ہے کہ ذرا ان کی جسارت تو دیکھو کہ یہ جس نجویٰ سے روکے گئے ہیں اسی کا ارتکاب بار بار کر رہے ہیں اور اس سے بڑی جسارت یہ ہے کہ یہ گناہ، تعدی اور رسول کی نافرمانی کی سرگوشی کرتے ہیں اور ان کو نہ ذرا اپنی اس حرکت پر شرم آتی ہے اور نہ ان کو ذرا خوفِ خدا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب ان کی سرگوشیوں کا آغاز ہوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی حرکتوں پر توجہ دلائی لیکن اس کا انھوں نے کوئی اثر قبول نہیں کیا بلکہ یہ شرارت بڑھتی ہی گئی۔ بالآخر ان آیات میں ان کو آخری تنبیہ فرمائی گئی۔

'وَیَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ'۔ یعنی ان کی ساری سرگوشی میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہوتا حالانکہ سرگوشی، جیساکہ آگے ذکر آ رہا ہے، خیر کی بھی ہو سکتی ہے لیکن ان کے سینے خیر سے بالکل خالی ہیں اس وجہ سے ان کی ہر سرگوشی گناہ و تعدی اور رسول کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارنے کے لیے ہوتی ہے۔ 'اثم' ان گناہوں کو کہتے ہیں جن میں حق تلفی کا پہلو نمایاں ہوتا ہے اور 'عدوان' ان گناہوں کے لیے آتا ہے جن میں تعدی، سرکشی اور طغیان کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ یہ دونوں لفظ جب ایک ساتھ استعمال ہوتے ہیں تو گناہ کی تمام اقسام پر حاوی ہو جاتے ہیں۔

'مَعْصِیَتِ الرَّسُوْلِ' کے الفاظ یہاں ان اشرار کی سرگرمیوں کے اصل ہدف کے اظہار کے لیے آئے

ہیں کہ ان کی اس تمام تگ و دو کا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر اللہ کے رسول کے خلاف بغاوت کا جذبہ ابھاریں تاکہ یہ شیرازہ درہم برہم ہو جائے۔

یہ منافقین، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اور آگے تفصیل آ رہی ہے، یہود کے ساختہ پرداختہ تھے اور ان کی تمام سرگرمیوں کا منتہا یہ تھا کہ صحابہؓ کے اندر کوئی ایسا فتنہ برپا کریں کہ یہ گروہ ایک ناقابلِ شکست طاقت بننے سے پہلے پہلے ختم ہو جائے۔ ان کے ان فتنوں کی تفصیلات پیچھے بھی اس کتاب میں گزر چکی ہیں اور آگے بھی آئیں گی لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ذلیل و رسوا کیا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے جو حزب اللہ منظم ہوئی وہ حق کے تمام دشمنوں پر غالب آ گئی۔

اشرار کی کینہ توزی

'وَاِذَا جَآءُوْکَ حَیَّوْکَ بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ان شریروں کی کینہ توزی کی ایک مثال بیان ہوئی ہے کہ جب یہ تمھارے پاس آتے ہیں تو تمھیں سلام کرتے ہوئے اس لفظ کے بالکل برعکس لفظ استعمال کرتے ہیں جو اللہ نے تمھارے لیے پسند فرمایا۔ اللہ اور اس کے ملائکہ تو تمھارے اوپر رحمت اور سلام بھیجتے ہیں[1] اور ان بدبختوں کا حال یہ ہے کہ تمھیں سلام کرتے ہوئے لفظ 'السلام' اس طرح بگاڑ کر نکالتے ہیں کہ 'اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ'، 'اَلسَّامُ عَلَیْکَ'[2] بن جاتا ہے۔

'بِمَا لَمْ یُحَیِّکَ بِہِ اللّٰہُ' کے الفاظ سے مقصود ان کی شقاوت کو ظاہر کرنا ہے کہ ان لوگوں کی بدبختی و محرومی میں کیا شک کی گنجائش رہی جو اس ذاتِ اقدس کے لیے موت کی بددعا کریں جس پر اللہ اور اس کے فرشتے درود و سلام بھیجیں! اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے پیامِ تسلّی بھی ہے کہ اگر یہ تمھارے لیے موت کے متمنّی ہیں تو رہیں، تمھارے اوپر خدا کی رحمت اور اس کے فرشتوں کی دعائے رحمت ہے تو تمھیں کسی اور کی دعا و بددعا کی کیا پروا!

یہود اور ان کے ایجنٹ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے لیے اپنی زبان توڑ مروڑ کر الفاظ کو جس طرح بگاڑتے تھے اس کی مثالیں سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہیں۔ 'رَاعِنَا' اور 'سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا' کے تحت ہم ان کی اس شرارت پر روشنی ڈال چکے ہیں[3]۔ اسی قسم کا تصرف لفظ 'اَلسَّلَامُ' میں کر کے اس کو وہ 'اَلسَّامُ' کر دیتے کہ سننے والے کو دھوکا 'اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ' کا ہوتا حالانکہ فی الحقیقت وہ 'اَلسَّامُ عَلَیْکَ' کہتے۔

---

[1] چنانچہ الاحزاب - ۳۳ : ۵۶ میں ارشاد ہے: 'اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ ..... الایۃ'
(بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر سلام و رحمت بھیجتے ہیں)

[2] عربی میں لفظ 'سام' موت کے معنی میں آتا ہے۔

[3] ملاحظہ ہو تدبرِ قرآن۔ جلد اول، صفحات: ۲۵۰ - ۲۵۲ اور ۲۲۸

وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ ۔ یہ ان کے اس مغالطے کی طرف اشارہ ہے جس کے سبب سے وہ اپنی ان شرارتوں میں دلیر ہوتے جا رہے تھے۔

فرمایا کہ ان کی ان شرارتوں پر چونکہ فوراً پکڑ نہیں ہو رہی ہے اس وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ رسول کی تکذیب و تفضیح میں یہ بالکل بجانب حق ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ اللہ کے رسول ہوتے تو لازماً ان باتوں پر ہماری پکڑ ہو جاتی لیکن جب اس طرح کی کوئی بات نہیں ہو رہی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا دعویٰ محض دھونس ہے۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ ۔ فرمایا کہ ان کے لیے جہنم ہی کافی ہے جس میں وہ لازماً پڑیں گے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ اس کے ہوتے اس دنیا میں اگر ان کے اوپر عذاب نہ بھی آئے تو اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ وہی ساری کسر پوری کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ان اشرار کو اس دنیا میں بھی عذاب کی دھمکی دی گئی ہے، جیسا کہ اوپر آیت ۵ میں اشارہ گزر چکا ہے اور آگے بھی آ رہا ہے، لیکن اصل حقیقت یہی ہے کہ جب جہنم موجود ہے تو اس کے ہوتے دنیا کی پکڑ سے کوئی بچ بھی گیا تو اس میں اس کے لیے اطمینان کا کوئی پہلو نہیں ہے۔

شریروں کا اصل مغالطہ

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ انسان کی غفلت اور سرکشی میں سب سے زیادہ اضافہ اس کے اسی مغالطہ سے ہوتا ہے جو یہاں مذکور ہوا۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی شرارتوں پر اس دنیا میں کوئی گرفت نہیں ہو رہی ہے تو وہ مطمئن ہو بیٹھتا ہے کہ اس پر کہیں بھی اور کبھی بھی گرفت نہیں ہو گی اور ملا جو ڈراوے سناتے پھر رہے ہیں یہ محض ان کی دھونس ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ حالانکہ یہ محض انسان کی بے بصیرتی ہے۔ اگر اعمال کے نتائج فوراً سامنے آ جانے والے ہوتے تو کس کی مجال تھی کہ وہ نیکی کے سوا کبھی بدی کی جرأت کر سکتا۔ پھر تو سبھی صالح و متقی بن کے رہتے۔ اس دنیا کا اصل بھید تو یہی ہے کہ یہ دار الجزاء نہیں بلکہ دار الامتحان ہے۔ دار الجزاء آگے ہے اور وہ اس کائنات کی سب سے زیادہ واضح اور اٹل حقیقت ہے۔ اگر وہ نہ ہو تو یہ سارا عالم ایک اندھیر نگری اور کسی کھلنڈرے کا کھیل بن کر رہ جائے گا حالانکہ اس عالم کا خالق کوئی کھلنڈرا نہیں بلکہ وہ بالبداہت ایک عزیز و حکیم ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُولِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۹)

نجویٰ کی پاکیزہ قسم

یہ مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ نجویٰ، بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ہے۔ اجتماعی و معاشرتی زندگی میں ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں جب باہم دگر رازدارانہ مشورت کی ضرورت پیش آتی ہے۔

شوریٰ اجتماعی زندگی کی اساسات میں سے ہے اور اس میں رازداری کی ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔ اگر یہ مشورت نیکی، تقویٰ اور اصلاحِ ذات البین کے لیے ہے تو یہ نجویٰ باعثِ خیر و برکت ہے اور تم جب بھی کوئی رازدارانہ مشورت کرو تو کسی مقصدِ خیر ہی کے لیے کرو۔ البتہ وہ نجویٰ شیطانی نجویٰ ہے جو گناہ، تعدی اور معصیتِ رسول کے مقصد سے یہ منافقین کرتے ہیں۔ اہلِ ایمان کو اس سے بچنا چاہیے اور اس اللہ سے ڈرتے رہنا چاہیے جس کے حضور میں سب اکٹھے کیے جائیں گے اور جو سب کے نجویٰ سے اچھی طرح باخبر ہوتا ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۰)

اہلِ ایمان کو تسلی

یہ مومنین مخلصین کو تسلی دی گئی ہے کہ منافقین کی یہ ساری سرگوشیاں شیطان کی تحریک اور اس کی وسوسہ اندازی سے وجود میں آئی ہیں اور شیطان زیادہ سے زیادہ بس یہی کر سکتا ہے کہ اس طرح کی باتوں سے اہلِ ایمان کے دلوں کو ذرا رنج و ملال پہنچا دے۔ اس سے زیادہ اس کے امکان میں کچھ نہیں ہے۔ وہ اللہ کے اذن کے بدون اہلِ ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا تو اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ شیطان کی ان وسوسہ اندازیوں کی کوئی پروا نہ کریں بلکہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھیں کہ وہ ان کو ہر شریر کی شرارت سے محفوظ رکھے گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قِيلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوا فِي الْمَجَالِسِ فَافْسَحُوا يَفْسَحِ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَإِذَا قِيلَ انْشُزُوا فَانْشُزُوا يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۱۱)

مجلسِ نبوی کو نجویٰ سے پاک رکھنے کے لیے بعض ہدایات

منافقین کی سرگوشیاں یوں تو ہر مجلس و مقام میں ہوتی تھیں لیکن مجالسِ نبوی میں اس شرارت کے لیے وہ خاص اہتمام کرتے اس لیے کہ اسلام پر طعن، مسلمانوں کی دل آزاری و حوصلہ شکنی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین و تضحیک کے مواقع سب سے زیادہ ان کو وہیں ملتے۔ چنانچہ وہ مجلسِ نبوی میں اپنے مخصوص جتھے بنا کر بیٹھتے اور اس امر کا اہتمام رکھتے کہ کوئی غیر ان کے درمیان نہ گھسنے پائے تاکہ وہ حضورؐ کی باتوں پر جو نقد و تبصرہ اور جو طعن و طنز کرنا چاہیں آسانی سے کر سکیں۔ بسا اوقات وہ یہ بھی کرتے کہ حضورؐ مجلس سے اٹھ جاتے یا مجلس کے برخاست ہونے کا اعلان ہو جاتا لیکن یہ لوگ اپنے مفسدانہ اغراض کے لیے دھرنا دیے بیٹھے رہتے تاکہ لوگوں کے اندر کچھ وسوسہ اندازی کریں یا آپس میں کسی نئی شرارت کی کوئی سکیم بنائیں۔ یہ صورتِ حال متقاضی ہوئی کہ مجلسِ نبوی سے متعلق کچھ ایسی ہدایات دے دی جائیں کہ منافقین اس کو اپنے شیطانی نجویٰ کے لیے استعمال نہ کر سکیں۔

بعض مجلسی آداب

'اِذَا قِیْلَ لَکُمْ تَفَسَّحُوْا فِی الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا' قرینہ دلیل ہے کہ مجلس سے یہاں مراد اصلاً مجلسِ نبوی ہے لیکن لفظ جمع استعمال کر کے یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ یہاں جو آداب بتائے جا رہے ہیں وہ مسلمانوں کی تمام مجالس کے لیے عام ہیں تاکہ ان کی ہر مجلس میں مجلسِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا عکس پایا جائے۔ قرآن میں اسی طرح بعض جگہ لفظ 'مساجد' جمع کی شکل میں استعمال ہوا ہے۔ اگرچہ اصلاً اس سے مراد مسجدِ حرام ہے، جیساکہ 'اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ' (التوبۃ - ۹: ۱۸) میں ہے لیکن لفظ جمع استعمال کر کے یہ تعلیم دی گئی کہ جو ہدایت اس مرکزی مسجد سے متعلق دی جا رہی ہے وہی حکم تمام مساجدِ الٰہی کا ہو گا اس لیے کہ وہ سب اسی کے تابع ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب صدرِ مجلس کی طرف سے ہدایت کی جائے کہ لوگ مجلس میں کھل کر بیٹھیں تو اس حکم کی بے چون و چرا تعمیل ہونی چاہیے اور ایک دوسرے سے ہٹ ہٹ کر بیٹھنا چاہیے تاکہ دوسرے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو آسانی بھی ہو اور منافقین کے لیے مجلسِ نبوی میں جتھہ بندی کر کے بیٹھنے اور سرگوشیاں کرنے کی گنجائش بھی کم ہو جائے۔ اوپر ہم نے اشارہ کیا کہ منافقین مجلسِ نبوی میں، ایک پارٹی کی شکل میں اس طرح بیٹھتے کہ ان کے جتھے سے باہر کے کسی آدمی کے لیے ان کے اندر گھسنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے تاکہ وہ جس ردِ عمل کا اظہار کرنا چاہیں اس میں نہ دوسرے کوئی مزاحمت پیدا کر سکیں، نہ ان کی سرگوشیوں، ان کے اشاروں، کنایوں اور ان کے طنز یہ فقروں کی پردہ دری ہو سکے۔ اپنے اس طرزِ عمل سے انھوں نے بعض اوقات بڑی بڑی الجھنیں پیدا کر دیں جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں بھی موجود ہیں اور قرآن نے بھی ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اس سورہ کے زمانۂ نزول میں، جیساکہ واضح ہے، یہ فتنہ بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کے سدِ باب کے لیے ہدایت ہوئی کہ جب صدرِ مجلس کی طرف سے حکم دیا جائے کہ لوگ کھل کر بیٹھیں تو لوگوں کو اس حکم کی بے چون و چرا تعمیل کرنی چاہیے۔

'فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ' یعنی اگر تم دوسروں کے لیے کشادگی پیدا کرو گے تو اللہ بھی تمھارے لیے کشادگی پیدا کر دے گا۔ اگرچہ اس کا ظاہر مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے جنت میں کشادگی پیدا کرے گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ جو انسان اپنا سینہ دوسروں کے لیے کشادہ رکھتا ہے اللہ تعالیٰ دوسروں کے سینے اس کے لیے اس دنیا میں بھی کشادہ کر دیتا ہے۔ آدمی کا ہر عمل، ظاہری ہو یا باطنی، نیک ہو یا بد، اپنا ایک قدرتی اثر رکھتا ہے جس کا حقیقی ظہور تو آخرت ہی میں ہو گا لیکن اس کے برگ و بار اس دنیا میں بھی دیکھے جاتے ہیں بشرطیکہ دیکھنے والی آنکھیں ہوں۔

'وَاِذَا قِیْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا' یعنی اسی طرح صدرِ مجلس کی طرف سے اگر اٹھ کھڑے ہونے کا حکم دیا جائے تو اس کی بھی بے چون و چرا، بغیر کسی احساسِ کہتری کے، تعمیل کی جائے۔

اس حکم کی نوعیت اجتماعی بھی ہو سکتی ہے، انفرادی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ پوری مجلس برخاست کر دی

جائے تو لوگ اس کو بھی بخوشی قبول کریں، یہ نہ خیال کریں کہ ہمارے وقت کی ناقدری کی گئی، ذاتی آرام کو جماعتی کام پر ترجیح دی گئی، ہمیں اظہارِ خیال کا موقع نہیں دیا گیا، اس بارے میں ہماری رائے نہیں لی گئی۔

اسی طرح انفرادی طور پر بھی اگر کسی شخص کو ہدایت کی جائے کہ وہ مجلس میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کسی دوسری جگہ بیٹھ جائے، یا مجلس سے باہر چلا جائے یا اپنی جگہ کسی دوسرے کے لیے خالی کر دے تو وہ اس حکم کی بھی بغیر کسی نکیر کے، تعمیل کرے۔ اجتماعی نظم زندگی کے احترام میں اگر وہ یہ کسرِ نفسی گوارا کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اس ایثار کو ذریعۂ رفعت بنائے گا۔

'فَانْشُزُوْا یَرْفَعِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ .... الایۃ'۔ یہ بالکل مقابل میں ہے 'فَافْسَحُوْا یَفْسَحِ اللّٰہُ لَکُمْ' کے۔ یعنی اس کھڑے ہونے میں بظاہر ذلت بھی ہو تو اللہ اس کو ان لوگوں کے لیے باعثِ عزت و رفعت بنائے گا جو تم میں سے اہل ایمان ہیں۔

یہاں 'اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ' کے الفاظ بڑے معنی خیز ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر جو منافقین گھسے ہوئے ہیں وہ تو اس قسم کے حکم پر بہت ناک بھوں چڑھائیں گے کہ ان کی توہین ہوئی کہ ان کو اٹھا کر دوسروں کو ان کی جگہ دی گئی۔ ان میں سے بعض یہ بھی محسوس کریں گے کہ کیا وہ باعتبارِ علم و عمل فلاں اور فلاں سے فروتر تھے کہ ان کو ان کے اوپر ترجیح دی گئی لیکن جو اہل ایمان و اصحابِ علم خوش دلی سے اس حکم کی تعمیل کریں گے اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کے مدارج پر بلند کرے گا۔

'وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ'۔ یہ ان اصحابِ ایمان و علم کو تسلی دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل سے باخبر ہے۔ اس کو آگاہ ہونے کے لیے اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ تمہاری خدمات کا اشتہار اخباروں میں چھپے تب ہی اس کے علم میں آئے۔ تم دین و ملت کے قیام اور نظمِ جماعت کے احترام کی خاطر جو ایثار بھی کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔

عصرِ حاضر کی مجالس کا حال

یہ ہدایت اگرچہ اصلاً مجلس نبوی سے متعلق دی گئی ہے لیکن، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی آدابِ مسلمانوں کی تمام مجالس میں ملحوظ ہونے چاہئیں۔ آج اہلِ مغرب کی کورانہ تقلید میں جو طریقے اختیار کر لیے گئے ہیں اگرچہ ان کو بہت ترقی یافتہ خیال کیا جاتا ہے لیکن یہ انہی کی برکت ہے کہ ہماری پارلیمنٹیں اور کونسلیں اکھاڑے بنتی جا رہی ہیں جن میں مختلف پارٹیاں جتھے بنا بنا کر آتی ہی ایک دوسرے کو شکست دینے، اشارہ بازیاں اور سرگوشیاں کرنے، فقرے اڑانے، پھبتیاں چست کرنے کے لیے ہیں، یہاں تک کہ بسا اوقات ایک دوسرے کا منہ نوچنے اور ان پر جوتے اور کرسیاں پھینکنے تک بھی نوبت آجاتی ہے اور صدرِ مجلس کو آدابِ مجلس کی یاددہانی کے بجائے پولیس کی مدد حاصل کرنی پڑتی ہے۔

۴۔ آگے آیات ۱۲-۱۳ کا مضمون

اوپر کی آیات میں جس طرح مجلسِ نبوی کو سرگوشیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بعض تدبیریں بتائی گئی ہیں اسی طرح آگے کی آیت میں خود ذاتِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سرگوشیاں کرنے والوں کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک ہدایت دی گئی۔ جب یہ فتنہ بڑھا اور اس پر قرآن میں نکیر بھی فرمائی گئی تو بہت سے منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رازدارانہ طور پر مل کر اپنی صفائی پیش کرنے اور اپنے سر کا الزام دوسرے بے گناہوں کے سر تھوپنے کی کوشش میں لگ گئے۔ یہ لوگ کھلی مجلس میں تو اپنی صفائی پیش کرنے کا حوصلہ کر نہیں سکتے تھے اس وجہ سے ہر ایک کی کوشش یہ رہی ہو گی کہ اس کو حضورؐ سے خلوت میں بات کرنے کا موقع ملے۔ یہ صورتِ حال متقضی ہوئی کہ آپ سے ملاقات پر بعض پابندیاں عائد کر دی جائیں تاکہ ہر شخص آپ کا وقت ضائع نہ کر سکے۔ یہ حکم ایک ہنگامی حکم تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب اس کا مقصد پورا ہو گیا تو یہ منسوخ کر دیا گیا اور منسوخ کرنے والی آیت کو بھی قرآن کی ترتیب میں ابتدائی حکم کے ساتھ ہی جگہ دی گئی تاکہ نظمِ کلام کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہ پیش آئے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۲-۱۳

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا
بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَ
اَطْهَرُ ۭ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲﴾
ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۭ
فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ
وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۲-۱۳

اے ایمان والو، جب تمہیں رسول سے رازدارانہ بات کرنی ہو تو اپنی رازدارانہ بات سے پہلے کچھ صدقہ کرو۔ یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ پس

اگر اس کی استطاعت نہ پاؤ تو اللہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔ ۱۲

کیا تم اس بات سے اندیشہ ناک ہوئے کہ اپنی رازدارانہ باتوں سے پہلے صدقے پیش کرو۔ پس جب تم نے یہ نہیں کیا اور اللہ نے تم پر رحم فرمایا تو نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۱۳

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ ؕ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۲)

سرگوشیوں کو روکنے کے لیے ایک ہنگامی حکم

یہ حکم، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، سرگوشیوں کی اس وبائے عام کے زمانے میں اس لیے دیا گیا کہ منافقین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز اوقات میں مداخلت سے روکا جائے۔ جب ان لوگوں کے رویّہ پر گرفت ہوئی تو ان میں سے ہر ایک کو فکر ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی میں مل کر اپنی چکنی چپڑی باتوں سے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش بھی کرے اور ہو سکے تو اپنے گناہوں کا بوجھ کسی دوسرے بے گناہ کے سر تھوپ دے۔ حضورؐ نے اپنی ملاقاتوں پر چونکہ کوئی پابندی نہیں رکھی تھی اس وجہ سے اس طرح کے اصحاب الاغراض حضورؐ کی اس فیاضی سے بہت غلط فائدے اٹھاتے۔ اس دور میں انھوں نے اس سے خاص طور پر فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پابندی عائد کر دی گئی کہ جو شخص آپ سے تنہائی میں کوئی رازدارانہ بات کرنی چاہے وہ اس سے پہلے راہِ خدا میں کچھ صدقہ کرے۔ اس حکم سے ان لوگوں کو مستثنیٰ رکھا گیا جو نادار ہوں تاکہ یہ حکم کسی غریب مسلمان کے لیے باعثِ زحمت نہ بنے اور صدقے کی کوئی مقدار بھی معین نہیں کی گئی تاکہ لوگ اس کو زیادہ گراں نہ محسوس کریں۔

اس سے اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، منافقین کے بڑھتے ہوئے رجحانِ سرگوشی کی حوصلہ شکنی تھا۔ بخل اور حرصِ مال کی بیماری ان منافقین میں عام تھی۔ قرآن نے ان کی اس بیماری کی جگہ جگہ نشان دہی کی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے یہ پابندی عائد کر دی تاکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے

تنہائی میں ملاقات کا معاملہ ایک سنجیدہ معاملہ بن جائے کہ اس طرح کے لوگ اپنی بجالت کے سبب سے اول تو اس کا حوصلہ ہی نہ کریں اور اگر کریں تو ان کا انفاق ان کے لیے تطہیر و تزکیہ کا ذریعہ بنے اور فساد کی باتوں سے ان کو بچنے کی توفیق حاصل ہو۔

ذٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ۔ اس حکم کا مقصد یہ ہے کہ اگر تم اس پر نیک نیتی سے عمل کرو گے تو یہ تمہارے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں بھلائی کا ذریعہ اور تمہارے دلوں کو پاک کرنے کا وسیلہ ہوگا۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ یہ حکم پیغمبر کے آرام و آسائش کے خیال سے نہیں بلکہ تمہاری صلاح و فلاح کے لیے دیا جا رہا ہے بشرطیکہ تم اس کی قدر کرو۔

فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ یعنی غریبوں اور ناداروں کے لیے بدستور پیغمبر سے تنہائی میں ملنے اور عرض معروض کرنے کی راہ کھلی ہوئی ہے۔

ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ ۚ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۳)

ناسخ اور منسوخ دونوں یکجا ہیں

یہ آیت کچھ عرصہ کے بعد سابق آیت کے حکم کو منسوخ کرنے کے لیے نازل ہوئی لیکن اس کو جگہ یہیں سورہ کے بیچ میں اصل ابتدائی حکم کے ساتھ ہی دی گئی تاکہ منسوخ اور ناسخ دونوں آیتیں یکجا ہو جائیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں آیتوں کے درمیان اتنا وقفہ گزرا ہوگا کہ سابق حکم کا مقصد فی الجملہ پورا ہو گیا ہوگا یعنی منافقین کی سرگوشیوں کا وہ فتنہ دب گیا ہوگا جس کو دبانے کے لیے صدقہ کا مذکورہ بالا حکم نازل ہوا۔ لیکن بعض تفسیری روایات سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ ان دونوں آیتوں کے درمیان بس صبح و شام کا فاصلہ ہے۔ غالباً اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آیتیں قرآن میں ایک ہی جگہ ہیں لیکن یہ چیز اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ دونوں کے زمانۂ نزول میں سرے سے کوئی فرق ہی نہ ہو یا محض برائے نام فرق ہو۔ قرآن میں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ناسخ آیت عرصہ کے بعد نازل ہوئی لیکن ترتیب میں اس کو جگہ منسوخ حکم کے ساتھ ہی ملی۔ اس کی ایک نہایت واضح مثال سورۂ مزمل میں موجود ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تنہائی کی ملاقاتوں پر جو پابندی عائد کی گئی وہ، جیسا کہ ہم نے وضاحت کی، ایک خاص فتنہ کے سدباب کے لیے، ایک خاص دور میں عائد کی گئی تھی۔ یہ پابندی اسی وقت اٹھائی گئی ہوگی جب یہ فتنہ یا تو دب گیا ہوگا یا لوگوں کے اندر اس سے احتراز کا احساس پیدا ہو گیا ہوگا۔ یہ مقصد چند گھنٹوں میں پورا نہیں ہو سکتا۔ اس میں لازماً کچھ وقت صرف ہوا ہوگا اس وجہ سے ان دونوں آیتوں کے زمانۂ نزول میں اتنا بُعد لازماً ہوگا جتنا اس طرح کے کسی مقصد کے حاصل ہونے کے لیے ضروری ہے۔

'ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ' سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرنے کا رجحان جو بہت بڑھ رہا تھا وہ اس حکم کے بعد دب گیا۔ منافقین تو اپنی بخالت کے سبب سے رک گئے ہوں گے اور مخلصین غربت کے علاوہ اس وجہ سے بھی محتاط ہو گئے ہوں گے کہ انھوں نے اندازہ کر لیا ہوگا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رازدارانہ کوئی بات کرنی اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے۔ بہرحال اس ہنگامی حکم سے جو اصل مقصود تھا جب ایک حد تک وہ حاصل ہوگیا تو یہ منسوخ کر دیا گیا۔

'فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ' سے ایک تو یہ بات نکلتی ہے کہ لوگوں نے نہ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے رازدارانہ بات کرنے کی جرأت کی، نہ صدقہ دینے کی نوبت پیش آئی اور دوسری بات یہ نکلتی ہے کہ لوگوں کے اندر فی الجملہ ندامت کا احساس ابھرا کہ اب تک ان کی جو روش رسول کے معاملے میں رہی وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں پسندیدہ نہیں تھی اس وجہ سے وہ مستحقِ تادیب و تنبیہ ٹھہرے۔ 'تَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ' کے معنی ہیں اللہ نے تمھاری توبہ قبول کی۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ نظرِ کرم ان پر اس وجہ سے ہوئی کہ انھوں نے اپنے احساسِ ندامت سے اپنے آپ کو اس کا سزاوار بنایا۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ سخت دل ایسے بھی رہے ہوں جو اس تنبیہ کے بعد بھی متنبہ نہ ہوئے ہوں لیکن آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بحیثیتِ مجموعی لوگوں کے اندر ندامت کا احساس پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ جب جماعت کے اندر کوئی اچھا احساس بحیثیتِ مجموعی ابھرتا ہے تو اس کو وہ قبولیت سے محروم نہیں فرماتا۔ چنانچہ یہ پابندی اٹھالی گئی۔

'فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ..... الاٰية'۔ یہ بات بطورِ بدرقہ ارشاد ہوئی ہے کہ یہ پابندی اگرچہ اٹھالی گئی لیکن احتیاط کے طور پر ضروری ہے کہ نماز و زکوٰۃ اور اللہ و رسول کی اطاعت کا خاص اہتمام رکھو تاکہ معاشرے میں اس طرح کی بحرانی کیفیت پھر نہ پیدا ہونے پائے اور شیطان کو نجویٰ کا فتنہ اٹھانے کا موقع پھر نہ مل سکے۔

'وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ'۔ اور اس حقیقت کو ہمیشہ مستحضر رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر عمل سے باخبر ہے۔

۶۔ آگے آیات ۱۴-۲۲ کا مضمون

بیچ میں جو ناسخ آیت آگئی تھی اس کی نوعیت جملہ معترضہ کی تھی۔ اس کے ختم ہوتے ہی سلسلۂ کلام پھر منافقین کے ذکر سے مربوط ہوگیا اور یہ بتایا گیا کہ ان منافقین کا اصل رشتہ اسلام کے ساتھ نہیں بلکہ اسلام کے دشمن یہود کے ساتھ ہے۔ یہ ان سے دوستی رکھتے ہیں اور اپنی جھوٹی قسموں کے بل پر

مسلمانوں کے اندر گھسے ہوئے ہیں۔ ان کی اصل بیماری دنیا کی محبت ہے جس کے سبب سے یہ شیطان کے ساتھی بنے ہوئے ہیں اور اللہ کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ غلبہ اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہوگا اور شیطان کی پارٹی شکست کھائے گی۔ ایمان باللہ کے ساتھ اعدائے دین کی دوستی جمع نہیں ہو سکتی۔ سچے اہل ایمان وہی ہیں جو اعدائے دین سے اپنے تمام تعلقات کاٹ لیں اگرچہ وہ ان کے کتنے ہی قریبی رشتہ دار اور عزیز ہوں۔ یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہوں گے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۴-۲۲

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ط
مَا هُمْ مِنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُونَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ
يَعْلَمُونَ ﴿١٤﴾ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا ط إِنَّهُمْ سَاءَ
مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٥﴾ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا
عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ﴿١٦﴾ لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ
أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ط أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ط
هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿١٧﴾ يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللَّهُ جَمِيعًا فَيَحْلِفُونَ
لَهُ كَمَا يَحْلِفُونَ لَكُمْ وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ ط أَلَا إِنَّهُمْ
هُمُ الْكَاذِبُونَ ﴿١٨﴾ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنْسَاهُمْ ذِكْرَ
اللَّهِ ط أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ط أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ
الْخَاسِرُونَ ﴿١٩﴾ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ
فِي الْأَذَلِّينَ ﴿٢٠﴾ كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ط إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ
عَزِيزٌ ﴿٢١﴾ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ
يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ

أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ
الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۖ وَيُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا
۳ ع ۹ ۳ عَنْهُ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ اللَّهِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۲۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۴-۲۲

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو اس قوم سے دوستی رکھتے ہیں جس پر اللہ کا غضب ہوا! یہ لوگ نہ تم میں سے ہیں اور نہ ان میں سے ہیں۔ اور یہ جھوٹی بات پر جانتے بوجھتے قسم کھاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ بے شک نہایت بُرا ہے جو کچھ یہ کر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے اور اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں تو ان کے لیے ایک ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۴-۱۶

ان کے مال اور ان کی اولاد ان کو اللہ کے عذاب سے ذرا بھی بچانے والے نہیں بنیں گے۔ یہ لوگ دوزخ والے ہیں۔ یہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جس دن اللہ ان سب کو اٹھائے گا تو وہ اس سے بھی اسی طرح قسم کھائیں گے جس طرح تم سے کھاتے ہیں اور گمان کریں گے کہ وہ ایک بنیاد پر ہیں۔ آگاہ ہو کہ یہ لوگ بالکل ہی جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان مسلّط ہو گیا ہے پس اس نے ان کو خدا کی یاد بھلا دی ہے۔ یہ لوگ شیطان کی پارٹی ہیں۔ سن لو کہ شیطان کی پارٹی ہی نامراد ہونے والی ہے۔ ۱۷-۱۹

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ مخالفت ہیں، وہی لوگ ذلیل ہونے والوں میں ہوں گے۔ اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ بے شک میں غالب رہوں گا اور میرے رسول

بے شک اللہ قوی و عزیز ہے۔ ۲۰-۲۱

تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو اور وہ دوستی رکھے ان سے جو اللہ اور اس کے رسول سے برسرِ مخالفت ہوں اگرچہ وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا اہل کنبہ ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرما دیا ہے اور اپنی طرف سے ایک فیضانِ خاص سے ان کی تائید فرمائی ہے اور ان کو داخل کرے گا ایسے باغوں میں جن کے اندر نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہی لوگ اللہ کی پارٹی ہیں۔ سن رکھو کہ اللہ کی پارٹی ہی فلاح پانے والی ہے! ۲۲

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ ط مَا ہُمْ مِّنْکُمْ وَلَا مِنْہُمْ لا وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَہُمْ یَعْلَمُوْنَ (۱۴)

منافقین اپنے مفاد کے سوا کسی کے ساتھی نہیں ہیں

یہ ان منافقین کے حال پر اظہارِ تعجب ہے کہ ایک طرف تو یہ ان لوگوں کے دوست بنے ہوئے ہیں جو اللہ کے مغضوب ہیں دوسری طرف یہ تم کو (مسلمانوں کو) بھی قسمیں کھا کھا کے یقین دلاتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ فرمایا کہ مَا ہُمْ مِّنْکُمْ وَلَا مِنْہُمْ' نہ یہ لوگ تمہارے ساتھ ہیں اور نہ ان کے ساتھ ہیں۔ تمہارے ساتھ تو اس وجہ سے نہیں ہیں کہ اللہ اور رسول پر ایمان اور اللہ کے مغضوبوں کے ساتھ دوستی میں نسبت ضدین کی ہے۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں اور ان کے ساتھ یہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ ان کی دوستی اپنے مفاد کے ساتھ ہے۔ اگر ان پر کوئی سخت وقت آیا تو یہ ان کی خاطر کوئی چوٹ کھانے کو تیار نہیں ہوں گے بلکہ شیطان کی طرح اظہارِ برارت کر کے بھاگ کھڑے ہوں گے۔

'وَیَحْلِفُوْنَ عَلَی الْکَذِبِ وَہُمْ یَعْلَمُوْنَ' یعنی وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے مفاد کے سوا وہ کسی کے ساتھ نہیں ہیں لیکن وہ جھوٹی قسمیں کھا کھا کے تم کو بھی راضی رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان کو بھی۔

'غَضِبَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ' سے اشارہ یہود کی طرف ہے جن کو قرآن کی پہلی ہی سورہ میں 'مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ'

کہا گیا ہے۔ اگرچہ ان منافقین کی دوستی مشرکینِ مکہ سے بھی تھی جس کا ذکر تفصیل سے اگلی سورتوں میں آئے گا لیکن یہاں خاص طور پر یہود کے ساتھ ان کی موالات کی طرف اشارہ ہے۔ ہم پیچھے اشارہ کر آئے ہیں کہ یہ منافقین زیادہ تر یہود ہی کے ساختہ پرداختہ اور انہی کے ایجنٹ کی حیثیت سے مسلمانوں کے اندر گھسے ہوئے تھے۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۱۵)

یعنی یہ بدقسمت لوگ سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے بڑی دانشمندانہ سیاست اختیار کی ہے کہ اپنی قسموں کے ذریعہ سے دونوں کو مطمئن کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہ دانشمندانہ سیاست نہیں بلکہ نہایت مہلک کھیل ہے جو یہ کھیل رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے جس سے یہ دوچار ہوں گے۔ اللہ اور رسول کے دشمنوں پر اس دنیا میں جو عذاب آئے گا یہ اس میں بھی حصہ پائیں گے اور آخرت میں ان کے لیے جو عذاب ہے وہ تو ہے ہی۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ (۱۶)

جھوٹی قسموں کی آڑ میں چھپنے کی کوشش

انھوں نے قسموں کو اپنی ڈھال بنا رکھا ہے ان کی جس غلطی پر بھی گرفت کی جائے اس کے بارے میں جھوٹی قسموں سے یہ اطمینان دہانی کی کوشش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی دانست میں اپنے کو بچا لینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان قسموں کی آڑ میں انھوں نے اپنے لیے جائے پناہ بنائی ہے تاکہ دین کے مطالبات سے اپنے کو بچائے رکھیں۔ ایمان کا اظہار کر کے اللہ کی راہ میں انھوں نے جو قدم اٹھایا تھا اس کو روک لیا اور اب آگے بڑھنے کے بجائے قسموں کے ذریعہ سے اپنی دینداری کا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ اس طرح کب تک اپنا بھرم قائم رکھیں گے۔ بالآخر ان کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔

لفظ 'صدّ' قرآن میں لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ یہاں یہ لازم معنی میں ہے یعنی اللہ کی راہ میں آگے بڑھنے سے رک گئے۔

لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَـيْــــًٔا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (۱۷)

یہ ان بیڑیوں کی طرف اشارہ ہے جو ان کے پاؤں میں پڑی ہوئی ہیں اور جو اللہ کی راہ میں ان کو آگے نہیں بڑھنے دے رہی ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے اموال و املاک اور بیوی بچوں کی محبت میں گرفتار ہیں اس وجہ سے دین کی راہ میں آگے بڑھنے کا حوصلہ نہیں کر رہے ہیں۔ انھیں معلوم نہیں ہے کہ ان کے مال اور ان کی اولاد خدا کے عذاب سے ان کو ذرا بھی بچانے والے نہیں ہیں۔ 'مِنَ اللّٰهِ' میں مضاف محذوف ہے یعنی مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اسی طرح مال و اولاد کی محبت میں گرفتار رہے تو یہ چیزیں ان کو جہنم میں لے جائیں گی اور پھر یہ اس سے کبھی نہیں چھوٹیں گے۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰي شَيْءٍ ۭ

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ (۱۸)

اگر یہ اسی طرح مال و اولاد کی محبت میں پھنسے ہوئے دین کے تقاضوں سے بھاگتے رہے تو اس دن کو یاد رکھیں جس دن اللہ ان کو اور ان کی اولاد کو اٹھائے گا اور اس دن بھی ان کے پاس اس جھوٹی قسم کے سوا کوئی اور سہارا نہیں ہوگا جس کا سہارا انھوں نے آج لے رکھا ہے۔ اس دن وہ اپنے رب کے سامنے اپنی برٔیت میں اسی طرح جھوٹی قسمیں کھائیں گے جس طرح تمھارے سامنے کھا رہے ہیں۔ سورۂ انعام کی آیت ۲۳ میں مشرکین کے بارے میں بیان ہوا ہے کہ جب عذاب دیکھیں گے تو قسم کھا کر اپنی بے گناہی کا اظہار کریں گے کہ 'وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ' (اللہ ہمارے خداوند کی قسم ہم شریک ٹھہرانے والوں میں نہیں تھے)۔

'وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ' یعنی جھوٹی قسم کھا کر سمجھیں گے کہ اپنی بے گناہی کے ثبوت میں ایک بہت بڑی دلیل انھوں نے پیش کر دی اور گمان کریں گے کہ جس طرح اس دنیا میں انھوں نے جھوٹی قسموں سے بہتوں کو فریب دے رکھا ہے اسی طرح آخرت میں بھی ان کا فریب چل جائے گا لیکن وہاں ان کا یہ فریب کچھ کام نہ دے گا۔ اس دن اللہ مجرمین کی زبانوں پر مہر لگا دے گا اور ان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے دوسرے اعضاء و جوارح ان کے جرائم کی خود گواہی دیں گے جس کے بعد کسی کے لیے کسی معذرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔

'اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ'۔ فرمایا کہ سب کان کھول کر اچھی طرح سن لیں کہ اگر کسی نے غلط فہمی سے ان کو سچا گمان کر رکھا ہے تو وہ اس گمان کو اپنے ذہن سے نکال دے۔ اصل جھوٹے یہی ہیں جنھوں نے یہاں بھی لوگوں کو اپنے جھوٹ سے مغالطہ دے رکھا ہے اور آخرت میں اپنے رب کو بھی دھوکا دینے کی جسارت کریں گے۔

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۹)

جو خدا کو بھلا بیٹھتا ہے وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے

'اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمْ' کے معنی ہیں 'تسلّط علیھم' شیطان نے ان پر اپنا پورا تسلّط جما لیا ہے۔ شیطان جن پر پورا تسلط جما لیتا ہے ان کو خدا کی یاد سے بالکل غافل کر دیتا ہے اور جو خدا کو بھلا بیٹھتے ہیں وہ شیطان کی پارٹی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جہاں تک وسوسہ اندازی کا تعلق ہے شیطان سب پر اپنا یہ ہنر آزماتا ہے لیکن اس کا تسلط انھی پر جمتا ہے جو اس کی وسوسہ اندازیوں کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتے اور اس کو اپنا ناصح و مرشد سمجھنے لگتے ہیں۔ جو لوگ اس طرح اس کے مرید بن جاتے ہیں ان کے دلوں سے خدا کی یاد بالکل غائب ہو جاتی ہے پھر وہ اپنی عاقبت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنی باگ اس کے ہاتھ میں پکڑا دیتے ہیں۔ اس طرح کے لوگ سب شیطان کی پارٹی کے ممبر بن جاتے ہیں اور شیطان ان کا لیڈر بن کر ان کو جدھر چاہتا ہے آوارہ گردی کراتا ہے۔ انسان کی اصل محافظ خدا کی یاد ہے۔

اس سے محروم ہو جانے کے بعد وہ شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور پھر اس کو اس کے چنگل سے چھوٹنا نصیب نہیں ہوتا۔

شیطان کی پارٹی کے لیے نامرادی مقدر ہے

اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّیْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ فرمایا کہ اس دنیا میں اگرچہ ہر ایک کو اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت ایک خاص حد تک مہلتِ عمل ملی ہوئی ہے۔ چنانچہ شیطان کی پارٹی کو بھی مہلت دی جاتی ہے کہ وہ اپنا ہنر آزما لے لیکن ہر شخص اچھی طرح جان لے کہ بالآخر شیطان کی پارٹی ہی نامراد ہونے والی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِی الْاَذَلِّیْنَ (۲۰)

شیطان کی پارٹی کا اصل کام اللہ و رسول کی مخالفت اور ان کے مقابل میں محاذ آرائی ہے۔ فرمایا کہ ان کو جتنی ڈھیل ملتی ہے یہ اللہ اور رسول کے خلاف زور آزمائی کرتے ہیں لیکن بالآخر یہ انہی ذلیل ہونے والوں میں شامل ہوتے ہیں جو ان سے پہلے یہ زور آزمائی کر کے ذلیل ہو چکے ہیں۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ (۲۱)

رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی

یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا اعلان فرمایا ہے جو ازل سے اس نے لکھ رکھی ہے کہ جو کشمکش اللہ و رسول اور حزب الشیطان کے درمیان برپا ہوگی اس میں غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کو حاصل ہوگا، شیطان کی پارٹی ذلیل و خوار ہوگی۔ اس سنت اللہ کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آرہے ہیں کہ رسول[1] جتنے بھی دنیا میں آئے وہ جس قوم کے اندر آئے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے۔ اس کے بعد اس قوم کا لازماً فیصلہ ہو گیا۔ اگر قوم نے بحیثیتِ مجموعی رسول کی تکذیب کر دی تو اس کے اندر سے رسول اور اس پر ایمان لانے والے افراد کو الگ کر کے باقی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا کر دیا۔ اور اگر ایمان لانے والوں کی تعداد معتدبہ ہوئی تو اتمامِ حجت کے بعد اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ جہاد کے لیے تلوار اٹھائیں اور ان اعدائے حق سے مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیں کہ زمین ان کے فتنہ سے پاک ہو جائے۔ قرآن نے رسولوں کی جو تاریخ پیش کی ہے ان میں سے اکثر کو پہلی صورت پیش آئی یعنی رسول اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد قوم پر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کن عذاب آگیا۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں دوسری صورت پیش آئی کہ ہجرت کے بعد آپ کو جہاد کا حکم ہوا اور آپ کے اعداء نے آپ کے صحابہؓ کی تلوار سے شکست کھائی یہاں تک کہ ان کا بالکل قلع قمع ہو گیا۔

اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ یہ اس دعوے کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ کیوں اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے غلبہ لازمی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے بلکہ وہ قوی و عزیز ہے۔ وہ

---

[1] یہاں نبی اور رسول کے درمیان وہ فرق ملحوظ رہے جو ہم نے اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کیا ہے۔

جب اپنے بندوں کے پاس اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول، اللہ کا سفیر ہوتا ہے جو لوگوں کے پاس ان کے حقیقی بادشاہ کے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ اگر لوگ اپنے مالکِ حقیقی کے احکام کی بجا آوری کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ زمین میں ان کو اقتدار بخشتا اور ان کو اپنے افضال و عنایات سے نوازتا ہے اور اگر وہ خود اللہ سے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ باغی قرار پاتے ہیں اور اتمامِ حجت کے بعد اللہ تعالیٰ ان باغیوں کے وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ ط اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ ط وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ ط اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۲۲)

منافقین کے سامنے ایک واضح کسوٹی

اب یہ آخر میں ایک نہایت واضح کسوٹی منافقین کے سامنے رکھ دی تاکہ حزب اللہ اور حزب الشیطان کے درمیان کوئی التباس باقی نہ رہے اور وہ جس کا بھی ساتھ دیں علیٰ وجہ البصیرت ساتھ دیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان دونوں میں سے وہ ایک ہی کو اختیار کر سکتے ہیں، یہ نہیں ہو سکتا کہ بیک وقت وہ دونوں کے ساتھ چل سکیں۔ فرمایا کہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی قوم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان بھی رکھتی ہو اور ان لوگوں سے دوستی بھی گانٹھے رکھے جو اللہ اور رسول سے نبرد آزمائی کر رہے ہیں۔ اگر کوئی جماعت اللہ و رسول کے مخالفین کے ساتھ دوستی بھی رکھتی ہے اور ساتھ ہی ایمان کی بھی مدعی ہے تو وہ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹی ہے۔ اس لیے کہ ان دونوں میں نسبت ضدین کی ہے اور انسان کے پہلو میں دل ایک ہی ہوتا ہے، دو دل نہیں ہوتے کہ وہ دو متضاد و متحارب چیزوں کی محبت اپنے اندر جمع کر سکے۔

وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ۔ یعنی دوسرے رشتے اور روابط تو درکنار، باپ بیٹے، بھائی اور کنبہ و قبیلہ کے روابط جو سب سے زیادہ قریبی ہیں اور جن کے ساتھ انسان کو فطری وابستگی ہوتی ہے، وہ بھی یہ درجہ نہیں رکھتے کہ وہ ایمان کے ساتھ متصادم ہوں تو کوئی مومن ان کو اپنے دل میں جگہ دے۔

اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ۔ یعنی جو لوگ اس کسوٹی پر اپنے کو پرکھنے اور پرکھوانے کے لیے تیار ہوں درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان ثبت فرمایا ہے اور ان کو اپنی طرف سے ایک خاص فیضانِ روحانی سے نوازا ہے۔ رہے وہ لوگ جو ایمان کے مدعی بھی ہیں اور اللہ و رسول کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہیں تو یہ لوگ محض زبان کے مسلمان ہیں، ان کے دل ایمان سے آشنا نہیں ہوئے۔

'اَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ' کے الفاظ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ باپ، بیٹے، بھائی اور کنبہ و قبیلہ کے روابط دل کے ریشہ ریشہ میں رچے بسے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو کاٹ دینا کوئی آسان بازی نہیں ہے لیکن جو لوگ ایمان کی غیرت و حمیت اپنے اندر زندہ رکھتے ہیں جب ان کو اس طرح کی کوئی نازک آزمائش پیش آتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے خاص روحانی فیض سے ان کو قوت بہم پہنچاتا ہے اور وہ اس آزمائش سے بھی سُرخرو ہو کر نکلتے ہیں۔ ع

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرماید
دیگراں ہم بہ کنند آنچہ مسیحا می کرد

یہ اسی فیضِ روحانی کا کرشمہ تھا کہ ابو عبیدہ بن جراحؓ نے غزوۂ احد میں اپنے باپ عبداللہ الجراح پر تلوار چلائی، سیدنا ابوبکرؓ نے بدر میں اپنے فرزند کو للکارا، مصعب بن عمیرؓ نے احد میں اپنے بھائی عبید بن عمیر کو قتل کیا، حضرت عمرؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو قتل کیا اور علی، حمزہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ عنہم نے عتبہ، شیبہ اور ولید بن عتبہ کو لقمۂ اجل بنایا۔

'وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا' یعنی زندگی میں اللہ نے ان کو رسوخِ ایمان اور فیضانِ روحانی سے نوازا اور ان کو پابرجا رکھا اور مرنے کے بعد ان کو جنت میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

'رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ' یہ سب سے بڑا اعزاز ہے جو ان کو اس دن حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگا کہ انھوں نے جس ایمان کا اقرار کیا اس کا پورا حق ادا کر دیا، جس امتحان میں بھی وہ ڈالے گئے اس میں پورے اترے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے جس کردار کا مظاہرہ چاہتا ہے انھوں نے ہر امتحان میں اسی کردار کا مظاہرہ کیا اس وجہ سے ربِّ کریم ان کو شاباش دے گا کہ ہم تم سے راضی ہوئے۔ ہم نے جو چاہا وہ تم نے پورا کر دکھایا۔ اب تم ہم سے جو چاہو گے وہ تمھیں ملے گا۔

'وہ اللہ سے راضی ہوئے' کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کے جن وعدوں پر اس دنیا میں جیے اور مرے وہ سارے وعدے ان کی امیدوں اور ان کے گمانوں اور قیاسوں سے کہیں بہتر شکل میں ان کے سامنے آئیں گے اور وہ اس طرح نہال ہو جائیں گے کہ ان کے دل کا ہر ارمان پورا ہو جائے گا۔

'اُولٰٓئِکَ حِزْبُ اللّٰہِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰہِ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'۔ فرمایا کہ یہ لوگ ہیں جن کو حزب اللہ میں ہونے کا شرف حاصل ہے اور یہی لوگ فلاح پانے والے بنیں گے۔ اوپر حزب الشیطان اور اس کی خصوصیات کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب حزب اللہ کے ذکر پر یہ سورہ تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔ اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

رحمان آباد
۱۰۔ جنوری ۱۹۷۸ء
۲۹۔ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۵۹

الحَشْر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ——— المجادلۃ ——— میں فرمایا ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کر رہے ہیں وہ بالآخر ذلیل و خوار ہو کے رہیں گے، غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے ہے، اس سورہ میں اسی دعوے کو بعض واقعات سے مُبرہن فرمایا ہے جو اس دوران میں پیش آئے اور منافقوں کو آگاہ کیا ہے کہ اگر وہ آنکھیں رکھتے ہیں تو ان واقعات سے سبق لیں کہ جن دشمنوں کو وہ ناقابلِ تسخیر خیال کیے بیٹھے تھے اللہ تعالیٰ نے کس طرح ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ خود اپنے ہاتھوں اپنے گھروں کو اجاڑ کر جلا وطنی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے اور ان کے حامیوں میں سے کوئی ان کا ساتھ دینے والا نہ بنا۔

پوری سورہ میں خطاب منافقین ہی سے ہے۔ آخر میں یہ بات بھی ان پر واضح فرما دی گئی ہے کہ ان کے شبہات و شکوک دور کرنے اور ان کے دلوں کے اندر گداز پیدا کرنے کے لیے اس قرآن میں اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ نازل کر دیا جو ضروری ہے۔ اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی اللہ کی خشیت سے پاش پاش ہو جاتا۔ اگر یہ تمہارے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں اور تم سزاوار ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ وہی معاملہ کرے جو تمہارے جیسے سنگ دلوں کے ساتھ وہ کیا کرتا ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) یہود بنی نضیر کی جلا وطنی کی طرف اشارہ۔ نقضِ عہد اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کے جرم میں ان کو ان کے گھروں سے نکل جانے کا حکم دیا گیا۔ پہلے تو وہ اس کی تعمیل پر راضی ہو گئے لیکن بعد میں، اپنے بعض حلیفوں کی شہ مل جانے سے، وہ اکڑ گئے۔ بالآخر حضورؐ نے فوج کشی کی اور ان کو جلا وطن ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان کو یہ اجازت دی گئی کہ اپنے جو سامان وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں لے جائیں۔ چنانچہ جو کچھ وہ لے جا سکے لے گئے۔ بقیہ سامان پر مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ یہ لوگ جلا وطن ہو کر خیبر چلے گئے۔ یہ واقعہ ۴ھ میں پیش آیا۔ منافقین کو اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ تم سمجھتے تھے کہ ان کو نکالا نہیں جا سکتا حالانکہ یہ نکلے اور اس طرح نکلے کہ اپنے بنے بنائے گھروں کو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اجاڑا۔ اللہ کے رسول کے مخالفین کا یہی حشر ہوا کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ان کا سہارا لینے کی کوشش کی تو یہ اجڑے گھر کی دربانی ہو گی اور تمہارا

بھی وہی حشر ہوگا جو ان کا ہوا۔

(۱۰-۵) ایک جملہ معترضہ جس میں بر بنائے موقع یہود اور منافقین کے بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔ جو انھوں نے بنی نضیر کے باغوں کے اجاڑنے اور اموالِ فے کی تقسیم سے متعلق اٹھائے۔ نیز انصار اور مہاجرین کے اس سیر چشمانہ رویہ کی تحسین فرمائی گئی ہے جو منافقین کے برعکس انھوں نے اموالِ فے کے معاملے میں اختیار کیا۔

(۱۱-۱۷) منافقین کی ایک اور شرارت کی طرف اشارہ۔ انھوں نے بنی نضیر کے جلاوطن ہو جانے کے بعد بنو قریظہ کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اگر بنی نضیر کی طرح آپ لوگ بھی نکالے گئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکلیں گے اور اگر آپ پر حملہ ہوا تو ہم آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ قرآن نے آگاہ کیا کہ یہ محض زبان کے سورما ہیں، نہ نکلنے میں ساتھ دینے والے ہیں نہ لڑنے میں۔ یہ وہی کریں گے جو شیطان کیا کرتا ہے کہ مجرم کو جرم پر ابھارتا ہے اور جب وہ جرم کر بیٹھتا ہے تو وہ اس سے براءت کا اعلان کر کے الگ ہو جاتا ہے۔ اگر ان کی شہ پر بنو قریظہ بھی نقضِ عہد کر بیٹھے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو بنی نضیر کا ہو چکا ہے۔

(۱۸-۲۴) خاتمۂ سورہ ــــ جس میں مسلمانوں کو عام طور پر اور منافقین کو خاص طور پر تنبیہ ہے کہ ہر وقت آخرت کو یاد رکھو۔ ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو خدا کو بھلا کر اپنے مقصدِ وجود اور اپنے انجام سے غافل ہو بیٹھے۔ دوزخ والوں اور جنت والوں میں بڑا فرق ہوگا۔ اس فرق کو کوئی معمولی فرق گمان کر کے اس کو نظر انداز نہ کرو۔ آسمان و زمین کی کامیابی صرف اہلِ جنت کا حصہ ہوگی۔ یہ بھی یاد رکھو کہ تم پر اتمامِ حجت کے معاملے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے۔ یہ قرآن وہ چیز ہے کہ کسی پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ خشیتِ الٰہی سے پاش پاش ہو جاتا۔ اگر تمھارے دل اس سے اثر پذیر نہیں ہو رہے ہیں تو یہ قرآن کا قصور نہیں بلکہ تمھارے دلوں کا قصور ہے کہ وہ پتھروں سے بھی سخت ہیں۔

آخر میں اسمائے الٰہی کا حوالہ تاکہ اہلِ ایمان میں ان کے ذکر سے کامل تفویض و تسلیم، ضعفاء میں عزم و توکل اور منافقین کے اندر خوف و خشیت پیدا ہو۔ پھر سورہ کا خاتمہ اسی آیت پر ہوا ہے جس سے اس کا آغاز ہوا۔

سُوْرَةُ الْحَشْرِ (۵۹)

مَدَنِيَّةٌ ــــــــــــ اٰيات: ۲۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۴

وقف النبی علیہ السلام

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ
الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ
اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ
يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ
اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ
يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا
يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ﴿۲﴾ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمُ الْجَلَآءَ
لَعَذَّبَهُمْ فِي الدُّنْيَا ۭ وَلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ﴿۳﴾
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَآقِّ اللّٰهَ
فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴﴾

ترجمۂ آیات ۱-۴

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہی غالب و حکیم ہے۔ وہی ہے جس نے نکالا ان لوگوں کو جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا، ان کے گھروں سے حشر اوّل کے لیے۔ تمہارا گمان نہ تھا کہ وہ کبھی اپنے گھروں سے نکلیں گے اور ان کا گھمنڈ یہ تھا کہ ان کے قلعے ان کو اللہ کی پکڑ سے بچائے رکھیں گے تو اللہ کا قہر ان پر وہاں سے آدھمکا جہاں سے ان کو گمان بھی نہیں ہوا۔ اور اس نے ان کے

دلوں میں رعب ڈال دیا۔ وہ اپنے گھروں کو اجاڑ رہے تھے خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے بھی۔ پس عبرت حاصل کرو اس سے، اے آنکھیں رکھنے والو! ۱-۲

اور اگر اللہ نے ان کے لیے جلاوطنی نہ مقدر کر رکھی ہوتی تو ان کو دنیا میں عذاب دیتا اور ان کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔ یہ اس جرم میں کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، جو اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں تو اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۳-۴

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ج وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (۱)

اس آیت کی اہمیت اور حکمت

یہ آیت سورۂ حدید کے شروع میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے مضمرات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہاں خاص توجہ کی چیز یہ ہے کہ اس سورہ کا آغاز اور اختتام دونوں، نہایت معمولی فرق کے ساتھ، اسی آیت پر ہوا ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ اس میں جو حقائق بیان ہوئے ہیں وہ اس آیت کے مضمرات کی تائید و تصدیق کرتے ہیں۔ گویا یہ سورہ اپنے اصل دعوے کو بھی ثابت کرتی ہے جو سابق سورہ میں بیان ہوا اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات کی شہادت بھی فراہم کرتی ہے جو تمہید کی اس آیت میں بیان ہوئی ہیں۔

یہ آیت جس حقیقت کی یاد دہانی کرتی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ یہ ساری کائنات اپنی تسبیح و تقدیس اور اپنی بندگی و سرافگندگی سے اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ اس کا خالق ہر عیب، ہر کمزوری اور ہر شائبۂ شرک سے بالکل پاک و منزّہ ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت و اختیار رکھتا ہے۔ اس کے کسی ارادے میں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ اس وجہ سے بندوں کے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کریں، اسی پر بھروسہ کریں، اسی کے احکام کی تعمیل کریں، اسی سے ڈریں اور اسی سے امید رکھیں۔ متصرّف حقیقی وہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر کوئی چیز اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی۔

اسی حقیقت کے ذہن میں راسخ ہونے سے صحیح ایمان پیدا ہوتا ہے جو تمام عزم و قوت کا سرچشمہ ہے اور اسی کے اندر رخنہ پیدا ہونے سے نفاق اور کفر و شرک کو دل کے اندر گھسنے کی راہ ملتی ہے جس سے علم و عمل کے ہر گوشے میں فساد پھیل جاتا ہے۔

هُوَ الَّذِيٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ۚ
مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ
مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ
وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ (۲)

بنی نضیر کی غداری اور ان کا حشر

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ' سے مراد مفسرین کے نزدیک یہود بنی نضیر ہیں جو مدینہ منورہ کے قریب آباد تھے۔ بخاریؒ کے بیان کے مطابق مختصراً ان کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اگرچہ صلح و امن کا معاہدہ کر رکھا تھا لیکن بدر کے چھٹے مہینہ معاہدے کے خلاف انھوں نے اسلام کے دشمنوں سے ساز باز بھی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی ایک ناکام سازش کے بھی مرتکب ہوئے۔ ان کے اس جرم کی پاداش میں آپ نے ان کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا۔ پہلے تو وہ اس حکم کی تعمیل پر آمادہ ہو گئے لیکن بعد میں مشہور منافق عبداللہ بن اُبی نے انھیں اکسایا کہ میرے دو ہزار آدمی تمھارے ساتھ ہیں نیز قریش اور غطفان بھی تمھاری حمایت کریں گے، تم نکلنے سے انکار کر دو۔ عبداللہ بن اُبی کی ان باتوں سے وہ اس کے چکمے میں آ گئے اور نکلنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر فوج کشی کی۔ اس وقت نہ بنو قریظہ نے ان کا ساتھ دیا نہ قریش اور غطفان نے۔ ناچار انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ آپ نے از راہِ عنایت یہ اجازت انھیں دے دی کہ جتنا سامان وہ اونٹوں پر لے جا سکتے ہیں اتنا لے جائیں۔ چنانچہ وہ جتنا سامان لے جا سکے لے کر خیبر اور اذرعات چلے گئے۔ ان کی باقی املاک و جائداد پر آپ نے قبضہ کر لیا۔

'لِاَوَّلِ الْحَشْرِ' یعنی ان کا یہ اخراج پہلے حشر کے طور پر ہوا۔ اس کے اندر یہ تنبیہ ہے کہ اس کے بعد بھی انھیں اسی طرح کے حشر سے دوچار ہونا پڑے گا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے عہد میں انھیں وہاں سے بھی نکلنا پڑا اور سب سے بڑا حشر ـــــ قیامت کا حشر ـــــ آگے آنے والا ہے۔

منافقوں سے خطاب

'مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ' یہ خطاب انہی منافقین سے ہے جن کا ذکر پچھلی سورہ میں گزر چکا ہے۔ فرمایا کہ تم کو ان کی قوت و جمعیت اور ان کے حلیفوں کی حمایت و نصرت پر بڑا اعتماد تھا، تم سمجھے بیٹھے تھے کہ انھیں یہاں سے ہلایا نہیں جا سکے گا اور خود ان کو بھی اپنے قلعوں اور اپنی گڑھیوں پر بڑا ناز تھا کہ بھلا کسی کی مجال ہے کہ وہ

ان سے دُو بدو ہونے کی جرأت کرسکے لیکن دیکھ لو ان کا غرور کس طرح پامال ہوا۔

مغروروں ذہنیت

'مِّنَ اللّٰهِ' میں عربیت کے قاعدے کے مطابق مضاف محذوف ہے یعنی مِنْ بَأْسِ اللّٰهِ یا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ یا مِنْ بَطْشِ اللّٰهِ۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے قلعے اور گڑھیاں بنالیں تو اس زعم میں مبتلا ہو گئے کہ وہ صرف انسانوں ہی سے نہیں بلکہ خدا کی پکڑ سے بھی مامون ہو گئے۔ یہ مغروروں کی ذہنیت کی بالکل صحیح تصویر ہے۔ جن کو اس دنیا میں قوت و شوکت حاصل ہو جاتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ بھلا ان کے قلعہ کے اندر کہاں سے کوئی رخنہ پیدا ہو سکتا ہے! یہاں تک کہ اگر اللہ کا کوئی بندہ ان کو خدا کی پکڑ سے بھی ڈرائے تو بھی ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ ان کے اس محفوظ حصار کے اندر خدا کدھر سے آجائے گا!

حملہ ج ہے

'فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا'۔ یعنی انھوں نے تو اپنی دانست میں اپنے قلعوں کے اندر خدا کے در آنے کے لیے بھی کوئی جگہ نہیں چھوڑی تھی لیکن خدا وہاں سے ان پر آدھمکا جہاں سے ان کو سان گمان بھی نہ تھا۔

'وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ'۔ یہ نشان دہی فرمائی ہے کہ خدا نے کدھر سے ان پر تاخت کی۔ فرمایا کہ وہ اپنے ارد گرد اینٹوں اور پتھروں کی دیواریں چن کر سمجھے کہ خدا کی پکڑ سے باہر ہو گئے لیکن اللہ نے ان کی دیواریں ہٹانے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی بلکہ براہ راست ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ قلعے اور گڑھیاں رکھتے ہوئے ایسے مرعوب ہوئے کہ اپنے بنائے ہوئے گھروں کو انھوں نے خود اپنے ہاتھوں اجاڑا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اصل طاقت اسلحہ اور قلعوں کی دیواروں کے اندر نہیں بلکہ دلوں کے اندر ہوتی ہے جو اللہ پر ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر یہ طاقت موجود ہو تو فی الواقع بے تیغ بھی سپاہی لڑتا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو ایٹمی آلات کی بڑی سے بڑی مقدار بھی بے سود ہے بلکہ اندیشہ اس بات کا بھی ہے کہ یہ چیزیں دشمن کے بجائے خود اپنی ہی تباہی کا ذریعہ بن جائیں۔

'يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ'۔ یہ ان کی مرعوبیت کی تصویر ہے کہ اپنے جو مکانات انھوں نے نہ جانے کتنے ولولوں اور ارمانوں سے بنائے تھے خود اپنے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے۔ 'يُخْرِبُوْنَ' یہاں تصویر حال کے لیے ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ان کو یہ اجازت دے دی گئی تھی کہ اپنے اونٹوں پر جتنا سامان لے جا سکتے ہیں اتنا لے جائیں۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مکانوں کی شہتیریں، کڑیاں، دروازے اور کھڑکیاں بھی اکھاڑ کر اپنے اونٹوں پر لاد لینے کی کوشش کی۔ حرص مال کے علاوہ مسلمان دشمنی کا جذبہ بھی کارفرما تھا اس وجہ سے انھوں نے یہ کوشش بھی کی ہو گی کہ جو چیز بچ بھی رہے اس کو بھی اس طرح ناکارہ بنا دیں کہ مسلمان اس

سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

وَاَیۡدِی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ: ان کی اس تخریب میں مسلمانوں نے بھی ہاتھ بٹایا ہوگا کہ یہ مفسدین جس قدر جلد ممکن ہو ان کے قریب سے دفع ہوں۔ علاوہ ازیں آگے کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض باغ مسلمانوں نے جنگی ضرورت کے لیے بھی کاٹے۔

فَاعۡتَبِرُوۡا یٰۤاُولِی الۡاَبۡصَارِ: یہ اس واقعہ سے ان تمام لوگوں کو عبرت حاصل کرنے کی دعوت دی گئی ہے جن کے اندر عبرت پذیری کی صلاحیت ہے کہ دیکھ لو قرآن کی ہر بات کس طرح سچی ثابت ہوئی۔ اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والوں کو کس طرح ذلت سے دوچار ہونا پڑا۔ حزب اللہ کے مقابل میں حزب الشیطان کو کس طرح شکست ہوئی۔ اگر اس کے بعد بھی کچھ لوگ اللہ و رسول کے دشمنوں سے دوستی رکھنے کے خواہش مند ہیں تو کرکے دیکھ لیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔

وَلَوۡلَاۤ اَنۡ کَتَبَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمُ الۡجَلَآءَ لَعَذَّبَہُمۡ فِی الدُّنۡیَا ؕ وَلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابُ النَّارِ (۳)

یعنی یہ تو اللہ نے ان کے ساتھ رعایت فرمائی کہ ان کو جلا وطنی ہی کی سزا دی۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ اسی تنبیہ پر کفایت کی جائے کہ ان کے اندر عبرت پذیری کی کچھ صلاحیت ہو تو وہ اپنے رویہ کی اصلاح کریں۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس دنیا ہی میں ان پر اس طرح کا کوئی فیصلہ کن عذاب بھیج دیتا جس طرح کے عذاب عاد و ثمود اور فرعون وغیرہ پر آئے جن سے ان کا قصہ ہی پاک ہو گیا۔

وَلَہُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابُ النَّارِ: یعنی اس سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو معاملہ اس جلا وطنی ہی پر ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ آخرت میں ان کے لیے دوزخ کا عذاب بھی ہے جو ساری کسر پوری کر دے گا۔

ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ شَآقُّوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ ۚ وَمَنۡ یُّشَآقِّ اللّٰہَ فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ (۴)

یعنی یہ غضب ان پر اس وجہ سے ہوا کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور سنتِ الٰہی یہی ہے کہ جو اللہ کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس کی شدید پاداش سے دوچار ہوتے ہیں۔

اس آیت میں یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ 'وَمَنۡ یُّشَآقِّ اللّٰہَ' میں 'وَرَسُوۡلَہٗ' کو حذف کر دیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رسول سے مخاصمت درحقیقت اللہ سے مخاصمت ہے اور جو اللہ سے مخاصمت کے لیے اٹھتا ہے وہ اچھی طرح سوچ لے کہ اس کا کیا انجام ہو سکتا ہے!

۲- آگے آیات ۵-۱۰ کا مضمون

آگے اصل سلسلۂ مضمون سے ذرا ہٹ کر، بطور جملۂ معترضہ، یہود اور منافقین کے بعض اعتراضات و شبہات کے جواب دیے ہیں جو اسی واقعۂ بنی نضیر کے تعلق سے پیدا ہوئے۔

ایک اعتراض تو یہود نے اٹھایا کہ مسلمانوں نے ان کے باغوں کے بہت سے بار آور درخت کاٹ دیے۔ یہ درخت اگرچہ جنگی مصلحت سے کاٹے گئے تھے لیکن یہود اور ان کے ہمدردوں نے اس کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی کہ یہ افساد فی الارض ہے درآنحالیکہ مسلمان اصلاح فی الارض کے مدّعی ہیں۔ اس اعتراض سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اسلام کی دعوت کو لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک بنائیں کہ یہ دین کی دعوت نہیں بلکہ حصولِ اقتدار کی کشمکش ہے، جس میں دین کا نام محض لوگوں کو، العیاذ باللہ، دھوکا دینے کے لیے لیا جا رہا ہے۔ اس نوعیت کے ایک اعتراض کا جواب سورۂ حدید میں بھی گزر چکا ہے جو اہل کتاب ہی کا اٹھایا ہوا تھا۔

دوسرا سوال منافقین نے بنی نضیر کے متروکہ اموال و املاک سے متعلق اٹھایا کہ ان کو بھی اموالِ غنیمت کی طرح، پانچواں حصہ الگ کر کے، باقی فوجیوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے لیکن قرآن نے اس کو مالِ غنیمت کے بجائے مالِ فَے کی حیثیت دی اور اس کے متعلق یہ حکم دیا کہ یہ سب کا سب سرکاری خزانے میں جمع ہو گا تاکہ اس سے غربا، مساکین اور خاص طور پر ان مہاجرین کی مدد کی جائے جو صرف دین کی خاطر اپنے گھروں سے نکالے اور اپنی جائیدادوں سے محروم کیے گئے ہیں۔ اسی ذیل میں انصار اور مہاجرینِ اوّلین کے ایثار اور ان کی سیر چشمی کی تحسین فرمائی کہ وہ اپنے مہاجر بھائیوں کے لیے نہایت فراخ دل ہیں اور اپنی ضرورت پر ان کی ضرورت کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی رویّہ اہلِ ایمان کے شایانِ شان ہے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۵-۱۰

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ
اللّٰهِ وَلِيُخْزِىَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ
فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ
رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۶﴾ مَآ
اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَ

لِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ کَیْ لَا یَکُوْنَ
دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ ؕ وَمَاۤ اٰتٰىکُمُ الرَّسُوْلُ
فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۷﴾ لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا
مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا
وَّیَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۸﴾ ۚ
وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ یُحِبُّوْنَ مَنْ
هَاجَرَ اِلَیْهِمْ وَلَا یَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّاۤ اُوْتُوْا
وَیُؤْثِرُوْنَ عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ؕ وَمَنْ
یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۹﴾ ۚ وَالَّذِیْنَ
جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا
الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا
لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَاۤ اِنَّکَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۰﴾ ع ۱

ترجمہ آیات ۵-۱۰

کھجوروں کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جو سلامت چھوڑ دیے تو یہ اللہ کے حکم سے ہوا اور تاکہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔ ۵

اور اللہ نے ان کی طرف سے جو کچھ اپنے رسول کی طرف لوٹایا تو تم نے اس پر نہ اپنے گھوڑے دوڑائے نہ اونٹ بلکہ اللہ ہے جو اپنے رسولوں کو مسلّط کر دیتا ہے جن پر چاہتا ہے، اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو کچھ اللہ بستیوں والوں کی طرف سے

اپنے رسول کی طرف لوٹائے تو وہ اللہ اور رسول اور قرابت مندوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ تاکہ اس کی گردش تمھارے مال داروں ہی کے اندر محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اور رسول جو تمھیں دے اس کو لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت پاداش والا ہے۔ یہ خاص طور پر ان محتاج مہاجرین کے لیے ہے جو اپنے گھروں اور اپنی املاک سے نکالے گئے ہیں اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہوئے یہی لوگ اصل راستباز ہیں۔ ۶-۸

اور جو لوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کیے ہوئے ہیں وہ دوست رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آ رہے ہیں اور جو کچھ ان کو دیا جا رہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں اور وہ ان کو اپنے اوپر ترجیح دے رہے ہیں اگرچہ انھیں خود احتیاج ہو۔ اور جو خود غرضی سے محفوظ رکھے گئے تو درحقیقت وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۹

اور جو ان کے بعد آئے وہ دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم کو بھی بخش اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش جنھوں نے ایمان لانے میں ہم پر سبقت کی اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کینہ نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب، بے شک تو نہایت شفیق و مہربان ہے! ۱۰

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ (۵)

'لِیْنَۃٌ' کھجور کے مثمر درخت کو کہتے ہیں۔ یہ یہود اور ان کے حلیفوں کے ایک اعتراض کا برمحل جواب ہے۔ مسلمانوں نے جب بنی نضیر پر فوج کشی کی تو جنگی ضرورت و مصلحت کے تحت ان کے باغوں کے کچھ درخت انھیں کاٹنے پڑے۔ اس چیز کو انھوں نے اسلام کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بنا لیا کہ مسلمان دعویٰ تو کرتے ہیں کہ وہ ملک میں اصلاح کے لیے اٹھے ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے باغوں کے پھل لانے والے عمدہ درخت کاٹ کے ڈال دیے۔ بھلا مثمر درختوں کا کاٹنا بھی کوئی اصلاح کا کام ہوا، یہ تو صریح افساد فی الارض ہے!

ایک اعتراض کا برمحل جواب

'اَوْ تَرَکْتُمُوْهَا قَآئِمَۃً' کے بظاہر ذکر کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی اس لیے کہ ان کو اعتراض درختوں کے کاٹنے پر تھا نہ کہ ان کے چھوڑنے پر لیکن اس کے ذکر سے ان کے اعتراض کے ایک خاص پہلو پر روشنی پڑتی ہے جس پر اس کے بغیر روشنی نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ یہ کہ جب انھوں نے یہ اعتراض اٹھایا ہو گا تو اس کو مؤثر بنانے کے لیے یہ بھی کہا ہو گا کہ اگر مسلمانوں کو صرف وقتی ضرورت کے لیے لکڑی مطلوب تھی تو وہ فلاں اور فلاں درخت کاٹ سکتے تھے جن کے کاٹنے سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا لیکن وہ درخت تو انھوں نے کھڑے چھوڑ دیے اور یہ اچھے بھلے، مثمر درخت انھوں نے کاٹ کے ڈھیر کر دیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقدام کسی واقعی ناگزیر ضرورت کے لیے نہیں بلکہ محض انتقام کے جذبہ کے تحت، معاشی تباہی پھیلانے کے لیے کیا گیا ہے جو اصلاح نہیں بلکہ صریح افساد ہے۔

'فَبِاِذْنِ اللّٰہِ وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ': یہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے لیکن معترضین کو مخاطب کرنے کے بجائے صرف مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے کہ تم ان ناصحوں کی مطلق پروا نہ کرو کہ تمھیں کون درخت کاٹنے اور کون چھوڑنے تھے۔ تم نے جو کچھ کیا رسول کی موجودگی میں، اس کی ہدایت کے تحت، کیا جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کام اللہ کے اذن کے تحت ہوا ہے اور جب اللہ کے اذن کے تحت ہوا تو اللہ سے بڑھ کر کوئی حکمت و مصلحت کو جاننے والا ہو سکتا اور نہ اصلاح و افساد کے درمیان امتیاز کرنے والا۔

'وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ' یعنی اللہ تعالیٰ نے تم کو اس لیے یہ اذن دیا کہ ان عہد شکنوں اور غداروں کو رسوا کرے اور یہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ انھوں نے جو درخت بڑے ارمانوں سے لگائے وہ ان کے سامنے کاٹے جا رہے ہیں لیکن وہ اتنے بے بس ہیں کہ چوں بھی نہیں کر سکتے۔ لفظ 'فاسق' یہاں غدار اور عہد شکن کے مفہوم میں ہے اور اس مفہوم میں یہ لفظ قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

یہاں معترضوں اور نکتہ چینوں کو خطاب نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعتراض ایک بالکل نامعقول اعتراض تھا جو انھوں نے محض اپنے دل کا بخار نکالنے کے لیے اٹھایا۔ اس وجہ سے وہ لائق خطاب نہ تھے البتہ مسلمانوں کو خطاب کر کے ان کے اس فعل کی تصویب فرما دی تاکہ غداروں کو اس سے رنج بھی پہنچے اور ساتھ ہی منافقوں کو بھی تنبیہ ہو جائے کہ وہ اس کو وسوسہ اندازی کا ذریعہ نہ بنائیں۔

رہا یہ سوال کہ مسلمان بحالتِ جنگ دشمنوں کے باغوں اور کھیتوں کو اجاڑ سکتے ہیں یا نہیں تو یہ کوئی اہم سوال نہیں ہے۔ اگر جنگ کی ضرورت داعی ہو تو وہ ان کے گھروں کو بھی مسمار کر سکتے ہیں چہ جائیکہ ان کے باغ اور کھیت۔ لیکن جنگ کی ضرورت داعی نہ ہو تو ان کی کسی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی نقصان پہنچانا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے۔

وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۶)

ایک دوسرے سوال کا جواب

یہ دوسرے سوال کا جواب ہے جو بنی نضیر کی متروکہ املاک سے متعلق پیدا ہوا اور جس کو منافقین نے اپنی حرصِ مال کی وجہ سے زیادہ شدت کے ساتھ ہوا دی۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ بھی دشمن سے حاصل شدہ مال ہے اس وجہ سے اس کو بھی مالِ غنیمت کی طرح پانچواں حصہ نکال کر باقی ہر چیز فوجیوں میں تقسیم کر دی جائے۔ اس سے کچھ ہی پہلے جنگِ بدر کے موقع پر ایسا ہی کیا گیا تھا۔ اسی کو سامنے رکھ کر اس کے بارے میں بھی وہی مطالبہ کیا گیا لیکن قرآن نے دونوں صورتوں میں نمایاں فرق ہونے کی وجہ سے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا۔ بدر کے موقع پر مجاہدین کو باقاعدہ جنگ کرنی پڑی تھی جس میں ان کو اپنے اسلحہ اور اونٹ گھوڑے کام میں لانے پڑے جب کہ اس موقع پر اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی بلکہ اللہ کے رسول کے دبدبہ سے مرعوب ہو کر دشمن نے اپنا علاقہ خود خالی کر دیا۔ اس فرق کی وجہ سے اس کے متعلق حکم ہوا کہ اس کی حیثیت مالِ فَے کی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے خود اپنے دشمنوں سے اپنے رسول کو دلوایا ہے چنانچہ یہ کُل کا کُل اللہ و رسول یا بالفاظِ دیگر اسلامی حکومت کی ملکیت ہو گا اور اسلام اور مسلمانوں کی اجتماعی بہبود میں صرف ہو گا۔

مالِ فَے اور اس کا حکم

اسی 'مَآ اَفَآءَ اللّٰہُ' سے اسلامی مالیات میں ایک مستقل اصطلاح مالِ فَے کی پیدا ہو گئی جس سے وہ مال مراد ہوا کرتا ہے جو دشمن سے بغیر جنگ کے حاصل ہوا ہو۔ 'فَے' کے معنی لوٹانے کے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ اس مال کو غاصبوں سے لے کر اس کے حقیقی حق داروں کو لوٹا دیتا ہے۔

'فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ' سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجیوں کو مالِ غنیمت سے جو حصہ دیا جاتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے ذاتی اسلحہ، گھوڑے اور اونٹ جنگ میں استعمال کرنے پڑتے تھے یہاں تک کہ اپنا زادِ راہ بھی ساتھ رکھنا ہوتا تھا۔ اب صورتِ حال بالکل تبدیل ہو گئی ہے اس وجہ سے اس زمانے میں دشمن سے جو کچھ بھی حاصل ہو گا اس کی حیثیت فَے کی ہو گی، خواہ جنگ سے حاصل ہو یا صلح سے۔

'وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'۔ سورۂ مجادلہ کی آیت ۲۱ میں گزر چکا ہے کہ 'کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ' (اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب

رہوں گا اور میرے رسول) اس سنتِ الٰہی کے تحت رسول کے لیے غلبہ ضروری ہے۔ اس غلبہ کے لیے اللہ کا رسول اپنے رب کے سوا کسی اور کی مدد کا محتاج نہیں ہے اور اس کا رب ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ چاہے تو اس کو دشمنوں کے بڑے سے بڑے ملک پر بغیر کسی فوج ہی کے غالب کر دے۔ اہل ایمان سے اگر وہ مدد کا طالب ہوتا ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ ان کی مدد کا محتاج ہے بلکہ اس سے ایک مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ ان کے لیے حصولِ سعادت کی راہ کھلے اور دوسرا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخلص اور منافق میں امتیاز ہو جائے۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۚ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۷)

مالِ غنیمت اور مالِ فے کے درمیان فرق واضح کرنے کے بعد یہ مالِ فے کا مصرف بتا دیا کہ یہ کُل کا کُل اللہ، رسول، رسول کے متعلقین، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہوگا۔ یعنی اس میں جنگ کرنے والوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہاں جو مصارف بیان ہوئے ہیں وہ سب سورۂ انفال میں اموالِ غنیمت کے سلسلہ میں زیر بحث آ چکے ہیں۔ اس وجہ سے یہاں ہم صرف خاص خاص باتوں ہی کی طرف توجہ دلائیں گے۔ تفصیل کے طالب تفسیر سورۂ انفال کی مراجعت کریں۔

'لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ' میں جہاں تک اللہ تعالیٰ کا تعلق ہے، وہ کسی مال و متاع کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے نام کا حصہ درحقیقت اس کے بندوں ہی کی طرف لوٹتا ہے اور اسلامی حکومت امین کی حیثیت سے اس کو مستحقین اور مسلمانوں کی اجتماعی بہبود کے کاموں میں صرف کرتی ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حصہ اس میں بحیثیت رسول کے نہیں بلکہ بحیثیت اسلامی حکومت کے سربراہ کے ہے۔ رسول کی حیثیت سے آپ کی کفالت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے خود اپنے اوپر لی تھی جس کی تصریح خود قرآن میں ہے البتہ جب اسلامی حکومت وجود میں آئی اور اس کے فرائض کا بوجھ بھی آپ کے کندھوں پر پڑا تو ضروری ہوا کہ سرکاری خزانے سے آپ کو بھی اپنی ضروریات کے مطابق لینے کا حق ہو۔ آپ کا یہ حق چونکہ بحیثیت سربراہ حکومت کے تھا اس وجہ سے آپ کی وفات کے بعد یہ آپ کے خلیفہ کی طرف لوٹ گیا۔ اس کی نوعیت کسی ذاتی ملکیت کی نہیں تھی کہ آپ کے بعد اس کی وراثت کا سوال پیدا ہو۔ حضرات انبیاء علیہم السلام دین کی وراثت چھوڑتے ہیں، اموال و املاک کی وراثت نہیں چھوڑتے۔

'وَلِذِى الْقُرْبٰى' سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اقرباء مراد ہیں جن کی کفالت کی

آپ پر ذمہ داری تھی ۔ یہ چیز درحقیقت آپ کی ذاتی ضرورت ہی کا ایک حصہ تھی ۔ اس کی نوعیت بھی کسی ذاتی جائداد کی نہیں تھی کہ آپ کے بعد یہ وراثت کی حیثیت سے آپ کے خاندان کی طرف لوٹے ۔ جس طرح اسلام پر کسی خاص خاندان کا اجارہ نہیں ہے اسی طرح اسلام کی حکومت یا اس کے بیت المال کے کسی حصہ پر بھی کبھی کسی خاندان کا اجارہ نہ ہوا نہ ہو سکتا ۔ اس قسم کے خیالات یہودیوں کے زیر اثر مفسدین کے ایک گروہ نے مسلمانوں کے اندر پھیلائے لیکن ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقرباء کے بعد معاً یتامیٰ ، مساکین اور مسافروں کے حق کا ذکر اسلامی نظام میں ان کے مرتبہ و مقام کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق کا ذکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قرابت داروں کے حق کے ساتھ فرمایا ہے ۔ اسلامی حکومت کی اوّلین ذمہ داری ان لوگوں کی کفالت و سرپرستی ہے جو معاشرہ کے اندر بے وسیلہ ہیں ، اس کے دوسرے فرائض کا درجہ اس کے بعد آتا ہے ۔ اگر حکومت اس مقدم ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسری ضرورتوں پر بیت المال کی آمدنی خرچ کرتی ہے تو ہر چند وہ ضرورتیں رفاہی اور تمدنی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھنے والی ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اصل حق داروں کے حقوق میں خیانت کی مجرم ہے ۔ اور اس امر کے جواز کی تو کوئی گنجائش ہی نہیں ہے کہ کوئی اسلامی حکومت سرکاری خزانے کا ایک پیسہ بھی فضول قسم کی نمائشوں اور عیاشیوں پر صرف کرے ۔ جو حکومت ایسا کرتی ہے وہ اسلامی حکومت نہیں بلکہ شیطانی حکومت ہے ۔ اسی قسم کی حکومتوں کی بدولت اس دنیا پر وہ آفت نازل ہوئی جس کو اشتراکیت کہتے ہیں ، جس نے انفرادی ملکیت کے تصور ہی کو سرے سے ایک جرم بلکہ تمام جرائم کی اصل قرار دے دیا ۔ اور اس جرم کے استیصال کے لیے دنیا میں خون کی ندیاں بہا دیں ۔

'کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ' 'دُوۡلَۃً' کے معنی گردش کے ہیں ۔ 'دالت الایام' کے معنی ہوں گے 'دار الزمان' زمانہ نے گردش کی ۔ اسی سے 'مداولت' ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے : 'وَتِلۡکَ الۡاَیَّامُ نُدَاوِلُہَا بَیۡنَ النَّاسِ' (آل عمران - ۳ : ۱۴۰) (اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں) ۔ مطلب یہ ہے کہ غرباء و یتامیٰ اور بے وسیلہ لوگوں کا حق اس لیے سرکاری بیت المال میں محفوظ کر دیا ہے کہ دولت صرف مال داروں ہی کے درمیان نہ گردش کرتی رہے بلکہ اس کو غریبوں تک پہنچنے کی بھی راہ ملے ۔

اس سے اسلامی اقتصادیات کا یہ اصول واضح ہوا کہ اسلام یہ نہیں پسند کرتا کہ دولت کسی خاص طبقہ کے اندر مرتکز ہو کر رہ جائے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اس کا بہاؤ ان طبقات کی طرف بھی ہو جو اپنی خلقی کمزوریوں یا فقدانِ وسائل کے سبب سے اس کے حصول کی جدوجہد میں پورا حصہ نہیں لے سکتے ۔ اس مقصد کے لیے اس نے افراد کو زیادہ سے زیادہ انفاق پر ابھارا ہے اور ان کے اس آزادانہ انفاق کو ان کی روحانی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا ہے اور قانون کے ذریعہ سے بھی ہر صاحب مال کے مال میں سے ایک

حصہ غریبوں کے حق کی حیثیت سے الگ کر کے حکومت کی تحویل میں دے دیا ہے۔

وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۚ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ یہ آخر میں تہدید و وعید ہے کہ رسول جو کچھ دے وہ لے لو اور جس چیز سے روکے اس سے رک جاؤ، کسی بات کو اعتراض و نکتہ چینی اور نجویٰ و سرگوشی کا بہانہ نہ بناؤ۔ اللہ سے برابر ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ بڑی ہی سخت سزا دینے والا ہے۔ — معترضین کو تنبیہ

یہ تہدید و وعید دلیل ہے کہ جن سوالوں کے جواب یہاں دیے گئے ہیں وہ منافقین کی طرف سے اٹھائے گئے تھے اور ان کے اٹھانے سے مقصود مسئلہ کی تحقیق نہیں بلکہ، ان کی عادت کے مطابق، اعتراض و نکتہ چینی تھا۔ اگر سوال محض تحقیقِ حق کے لیے مخلص مسلمانوں کی طرف سے ہوتا تو اس تہدید کا یہاں کوئی موقع نہیں تھا۔

یہاں رسول کا یہ درجہ جو واضح فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ وہ دے وہ لے لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ، اگرچہ اس کا ایک خاص محل ہے لیکن اس سے جو حکم مستنبط ہوتا ہے وہ بالکل عام ہوگا یعنی زندگی کے ہر معاملے میں رسول کے ہر حکم و نہی کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے گی اس لیے کہ رسول کی حیثیت، جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے ایک واجب الاطاعت ہادی کی ہوتی ہے۔ فرمایا ہے، 'وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ' (النساء - ۴ : ۶۴) (اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے) گویا اس ٹکڑے کے دو مفہوم ہوں گے۔ ایک خاص، دوسرا عام۔ اپنے خاص مفہوم کے پہلو سے یہ اپنے سابق مضمون سے مرلوط ہوگا اور اپنے عام مفہوم کے اعتبار سے اس کی حیثیت اسلامی شریعت کے ایک ہمہ گیر اصول کی ہوگی۔ — ایک حکم خاص سے ایک کلیہ کا استنباط

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ (۸)

اموالِ فے کا عام مصرف بتانے کے بعد یہ اس کے ایک خاص مصرف کی طرف اشارہ فرمایا جو وقت کا سب سے زیادہ اہمیت رکھنے والا مصرف اور تمام مسلمانوں کی یکساں توجہ کا مستحق تھا۔ یعنی مہاجرین کی امداد جو اس وقت ہر طرف سے اپنے گھروں سے اجڑ اکھڑ کر مدینہ آ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کو از سر نو بسانے اور ان کی معاشی زندگی کو پھر سے متحرک کرنے کی ذمہ داری اس چھوٹے سے اسلامی معاشرہ ہی پر عائد ہوتی تھی جو ابھی نیا نیا مدینہ کی سرزمین میں ابھر رہا تھا۔ یہ صورت بھی مقتضی تھی کہ اموالِ فے کو حکومت کی تحویل میں دیا جائے تاکہ اس طرح کے ملی مسائل کے حل کے لیے اس کے پاس وسائل موجود رہیں۔ — اموالِ فے کا ایک ہنگامی مصرف

ان مہاجرین کی تعریف میں فرمایا کہ یہ لوگ اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے مجبور کر کے نکالے گئے ہیں اور انھوں نے اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب اور اللہ اور اس کے رسول کی نصرت کے مقصد — مہاجرین کی تعریف

سے اپنی املاک سے یہ محرومی اور اپنے گھر در سے یہ مہجوری برداشت کی ہے اس وجہ سے یہ مستحق ہیں کہ ان کے دینی بھائی پوری فراخ دلی اور سیر چشمی سے ان کی مدد کریں۔ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سے اشارہ اس ایمانی زادِ راہ کی طرف ہے جس کے اعتماد پر یہ مہاجرین اپنے گھروں اور اپنی املاک سے بغیر اس بات کی پروا کیے اٹھ کھڑے ہوئے کہ کیا کھائیں گے اور کہاں سر چھپائیں گے۔ اور یَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ سے اس مقصد کی طرف اشارہ ہے جس مقصدِ عزیز کے لیے یہ بازی انھوں نے کھیلی۔ یعنی انھوں نے یہ چاہا کہ وہ اللہ کے رسول کے ہم رکاب رہیں تاکہ ہر قدم پر اللہ اور اس کے رسول کی مدد کے لیے سر بکف رہ سکیں۔

اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ فرمایا کہ یہی لوگ درحقیقت اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں کہ انھوں نے اللہ کی رضا طلبی اور رسول کی نصرت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا نہ کہ یہ منافقین جو مدعی تو ہیں ایمان کے لیکن اللہ کی راہ میں معمولی چوٹ کھانے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ بس یہ چاہتے ہیں کہ گھر بیٹھے بٹھائے انھیں لقمۂ تر ہاتھ آتا رہے۔ ان منافقین ہی کے بارے میں آگے اسی سورہ کی آیت ۱۱ میں فرمایا ہے کہ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں)۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹)

انصار اور مہاجرین اوّلین کی سیر چشمی کی تحسین

یہ انصار و مہاجرین اوّلین کی سیر چشمی اور ان کی فراخ دلی کی تعریف ہے کہ اس بات سے ان کے دل تنگ نہیں ہو رہے ہیں کہ مہاجروں کے قافلے پر قافلے ان کے غنائم و فَے میں حصہ بٹانے کے لیے چلے آ رہے ہیں بلکہ وہ بڑی فراخ دلی سے ان کا خیر مقدم کر رہے ہیں اور ان کی جو مدد کی جا رہی ہے اس سے اپنے دلوں میں کوئی رشک و حسد محسوس کرنے کے بجائے وہ اپنے اوپر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انھیں خود ضرورت لاحق ہو۔

عربیت کا ایک ضابطہ

'تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح 'عَلَفْتُهَا تِبْنًا وَّمَاءً' (میں نے اس کو چارہ کھلایا اور پانی پلایا) یا 'زَجَّجْنَ الْحَوَاجِبَ وَالْعُيُوْنَا'، یا 'مُتَقَلِّدًا سَيْفًا وَّرُمْحًا' وغیرہ مختلف ترکیبیں عربی میں معروف ہیں۔ اس طرح کی ترکیبوں میں ایک فعل، جو دوسرے مفعول سے مناسبت رکھنے والا ہو، محذوف ہوتا ہے جو قرینہ سے سمجھ لیا جاتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ تینوں مثالوں میں ایک ایک فعل محذوف ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی ایک فعل 'الایمان' سے مناسبت رکھنے والا محذوف ہے۔ اگر یہاں 'اَحْكَمُوْا' یا اس کے ہم معنی کوئی فعل محذوف مانئے تو پوری عبارت یوں ہوگی، 'تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَاَحْكَمُوا الْاِيْمَانَ' یعنی جنھوں نے پہلے سے گھر ٹھکانا

بھی بنا رکھا ہے اور اپنے ایمان کو بھی مضبوط کر رکھا ہے۔

اس کے اوّلین مصداق تو ظاہر ہے کہ انصار ہی ہوں گے اس لیے کہ وہ پہلے سے اپنے گھر در بھی رکھتے تھے اور ایمان کی نعمت سے بھی متمتّع تھے لیکن میرے نزدیک اس میں وہ مہاجرین اوّلین بھی شامل ہیں جو پہلے ہی ہجرت کر کے مدینہ پہنچ چکے تھے اور وہاں اللہ نے ان کے لیے قیام و معاش کی قابلِ اطمینان صورت بھی پیدا کر دی تھی۔ اس طرف ذہن 'مِنْ قَبْلِهِمْ' کے الفاظ سے جاتا ہے۔ اس لیے کہ مہاجرین اوّلین ہی کا یہ درجہ ہے کہ انھوں نے مہاجرین متاخرین کے مقابل میں ایمان اور ہجرت دونوں میں سبقت کی۔ جہاں تک انصار کا تعلق ہے ان کو گھر در والے ہونے کے معاملے میں تو تقدّم ضرور حاصل تھا لیکن ایمان کے معاملہ میں یہ کہنا صحیح نہیں ہو سکتا کہ ان کو تمام مہاجرین کے مقابل میں تقدم حاصل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بعد کے مہاجرین کے مقابل میں ان کو بحیثیتِ مجموعی تقدّم حاصل تھا۔ ہاں انصار کے ساتھ اگر مہاجرین اوّلین کو بھی شامل کر لیجیے تب ان کے اوپر 'الَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ' کے الفاظ ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ دونوں مل کر بعد والوں کے مقابل میں باعتبارِ سکونتِ مدینہ بھی مقدّم ہیں اور باعتبارِ قبولِ اسلام بھی۔

فرمایا کہ یہ لوگ نئے آنے والے مہاجرین سے محبت رکھتے اور پوری فراخ دلی سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ ان کے دل اس بات سے تنگ نہیں ہو رہے ہیں کہ مہاجرین کے قافلے پر قافلے چلے آ رہے ہیں اور جو مال انھیں ملنا چاہیے تھا وہ سب ان پر صرف ہو رہا ہے یا اب وہ بھی اس میں حصہ دار بن جائیں گے بلکہ وہ نہایت سیر چشمی کے ساتھ اپنی ضروریات پر ان کی ضرورت کو ترجیح دے رہے ہیں۔

ان کی اس تعریف سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ اہلِ ایمان کو اسی طرح باہمدگر ہمدرد، فیاض اور ایثار کرنے والا ہونا چاہیے۔ یہ گویا ایک آئینہ رکھا گیا ہے ان منافقین کے سامنے جنھوں نے بنی نضیر کے چھوڑے ہوئے اموال سے متعلق یہ مطالبہ پیش کیا کہ اس کو مالِ غنیمت کی طرح لوگوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے۔ اس آئینہ میں انھیں دکھایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے دوسرے بھائی کے لیے اس طرح فیاض ہوتا ہے تاکہ انھیں اپنی خود غرضی پر کچھ شرم آئے۔

'وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ' یہ ان انصار و مہاجرین کے لیے فلاح کی بشارت بھی ہے اور نفسِ انسانی کی ایک بہت خطرناک بیماری سے آگاہی بھی۔ 'شُحّ' کے معنی حرص و طمع اور لالچ کے ہیں۔ نفس کی طرف اس کی نسبت سے یہ بات تو نکلتی ہے کہ یہ نفس کے دواعی میں سے ایک داعیہ ہے لیکن ساتھ ہی اس سے بچتے رہنے کے لیے جو آگاہی دی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطرناک داعیہ ہے۔ اگر اس کو آدمی قابو میں نہ رکھ سکے تو یہ چیز اس کی آخرت کو برباد کر دیتی ہے۔ اس ٹکڑے میں منافقین کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ اگر انھوں نے اس کے علاج کی فکر نہ کی تو

وہ ابدی خسران سے دوچار ہوں گے۔ ہم نے اس کے اسی خطرناک پہلو کو واضح کرنے کے لیے اس کا ترجمہ خود غرضی کیا ہے۔ ایک حدیث میں اس کی وضاحت یوں آئی ہے: 'ایاکم والشح فانہ اہلک من کان قبلکم امرھم بالظلم فظلموا وامرھم بالفجور ففجروا وامرھم بالقطیعۃ فقطعوا' (شح خود غرضی) سے بچو! یہی چیز ہے جس نے تم سے پہلے کی قوموں کو تباہ کیا، اس نے ان کو ظلم کی راہ سجھائی تو انھوں نے ظلم کیے، اس نے ان کو فسق و فجور کا حکم دیا تو انھوں نے فسق و فجور کا ارتکاب کیا، اس نے ان کو قطع رحم پر ابھارا تو انھوں نے قطع رحم کیا)۔

ایک سوال اور اس کا جواب

ایک اہم سوال اس آیت کے موقع و محل سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہاں یہ کیا بات بتانے کے لیے وارد ہوئی ہے؟ ہمارے مفسرین کا خیال تو یہ ہے کہ اوپر کی آیت میں جس طرح یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اموالِ فے میں مہاجرین کا حصہ ہے اسی طرح اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اس میں انصار کا بھی حصہ ہے، لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آتی۔ مہاجرین کے ذکر کی ضرورت تو اس وجہ سے تھی کہ ان کے سبب سے اس وقت حکومت ایک ایسی صورت حال سے دوچار تھی جو متقضی ہوئی کہ حکومت کے پاس ایسے وسائل موجود رہیں کہ وہ اس طرح کی نازک صورت حال سے عہدہ برآ ہو سکے۔ گویا ان کا ذکر اموالِ فے کے حکومت کی ملک میں دینے کی ایک دلیل کے طور پر آیا۔ اس ذیل میں انصار کے ذکر کی کیا ضرورت تھی؟ یہ شبہ تو کسی کے ذہن میں تھا نہیں کہ انصار اس مال میں حق دار نہیں ہیں۔ جب تمام یتامیٰ، فقراء اور مساکین کا حق اس میں بیان ہوا تو ظاہر ہے کہ انصار کے فقراء و مساکین بھی اس میں حق دار ٹھہرے۔ پھر انصار کے خاص طور پر ذکر کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی اور وہ بھی 'وَالَّذِیْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِیْمَانَ' کی صفت کے ساتھ، جو ان کی احتیاج کو نہیں بلکہ ان کے مستغنی ہونے کو ظاہر کرتی ہے؟

ہمارے نزدیک مفسرین نے اس آیت کا موقع و محل بالکل نہیں سمجھا ہے۔ اس آیت کو اس بحث سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ انصار اموالِ فے میں حصہ دار ہیں یا نہیں۔ نہ کسی کے ذہن میں یہ سوال تھا، نہ اس کے پیدا ہونے کی کوئی وجہ تھی اور نہ اس کے جواب کا کوئی فائدہ تھا۔ یہاں جو بات بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ انصار اور مہاجرین اوّلین (جو پہلے سے گھر در والے اور ایمان سے بہرہ مند ہیں) اپنی طرف ہجرت کر کے آنے والے بھائیوں کو منافقین کی طرح اپنے لیے کوئی معاشی خطرہ نہیں سمجھتے بلکہ ان کا محبت سے خیر مقدم کرتے اور ان کے لیے ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں اور یہی رویہ ایمانی اخوت کا حقیقی تقاضا ہے۔ جو ہر سچے مسلمان کو اختیار کرنا چاہیے۔

وَالَّذِیْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۱۰)

مہاجرین متاخرین کی تحسین

انصار اور مہاجرین اوّلین کا رویہ بیان کرنے کے بعد یہ مہاجرین متاخرین کا رویہ بیان فرمایا جا رہا ہے کہ ان کے دلوں میں بھی اپنے ان سابق الایمان اور سابق الہجرت بھائیوں کے لیے بڑا اخلاص اور بڑی

محبت ہے۔ ان کو یہ حسد نہیں ہے کہ انھوں نے پہلے پہنچ کر تمام میسّر وسائل و اسباب پر قبضہ جما لیا اور گھر در والے بن گئے جب کہ یہ ابھی ہر چیز سے محروم ہیں بلکہ یہ نہایت اخلاص کے ساتھ اپنے اور اپنے ان بھائیوں کے لیے دعا کر رہے ہیں کہ اے ہمارے رب، ہم کو بھی بخش اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی بخش جن کو ایمان و ہجرت میں ہم پر سبقت کی سعادت حاصل ہوئی اور اے ہمارے رب، ہمارے دلوں کے اندر ہمارے باایمان بھائیوں کے خلاف کوئی کدورت نہ پیدا ہونے دے۔ اے ہمارے رب، تو نہایت شفیق و مہربان ہے۔

'وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' میں ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ اپنے مقابل میں ان کے بہتر حالات دیکھ کر شیطان ہمارے دلوں میں کوئی کینہ و حسد کا جذبہ پیدا کرے۔ بلکہ تو اپنی شفقت و عنایت سے ان کے حق میں ہمارے دلوں کو مہر و محبت سے معمور رکھنا۔ یہاں منافقین کے دلوں کے اس روگ پر نظر ہے جو اوپر 'شُحّ' کے لفظ سے بیان ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اصحابِ صدق و صفا کے دل اس قسم کے امراض سے بالکل پاک صاف ہیں۔

۴۔ آگے آیات ۱۱-۱۷ کا مضمون

بنو نضیر کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی معلوم ہوتا ہے ان یہود دوست منافقین کی آنکھیں نہیں کھلیں۔ انھوں نے اس کے بعد بنو قریظہ کی پیٹھ ٹھونکنی شروع کر دی۔ یہود کی یہی ایک شاخ بنو نضیر کے بعد مدینہ کے قرب میں باقی رہ گئی تھی۔ قدرتی طور پر بنو نضیر کے واقعہ کے بعد ان کو اندیشہ ہو گیا ہو گا کہ اب شاید جلد ہی ان کی بھی باری آنے والی ہے۔ ممکن ہے اپنے ہمدردوں سے انھوں نے سازباز بھی شروع کر دی ہو۔ منافقین نے ان کی ہمت بندھائی کہ آپ لوگ ہراساں نہ ہوں۔ بنو نضیر کی طرح اگر آپ لوگ بھی نکالے گئے تو ہم بھی آپ لوگوں کا ساتھ دیں گے اور آپ کے بارے میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کی کسی بات کی ہرگز کوئی پروا نہیں کریں گے اور اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ کے ساتھ سربکف ہو کر لڑیں گے۔ قرآن نے مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ یہ بالکل بزدل اور جھوٹے ہیں۔ نہ یہ جلاوطنی میں ساتھ دینے والے ہیں نہ جنگ میں۔ اور اگر جنگ میں انھوں نے ان کا ساتھ دیا تو منہ کی کھائیں گے اور پھر کبھی ان کو منہ دکھانا نصیب نہ ہو گا۔ ساتھ ہی بنو قریظہ کو تنبیہ کر دیا کہ اگر وہ ان کے چکمے میں آئے تو ان کا حشر بھی وہی ہو گا جو بنو نضیر کا ہوا اور یہ شیطان کی طرح یہ کہہ کر الگ ہو جائیں گے کہ 'اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ' (الحشر - ۵۹: ۱۶) (میں تم سے بری ہوں، میں اللہ، عالم کے خداوند سے ڈرتا ہوں) ـــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ١١-١٧

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ نَافَقُوا يَقُولُونَ لِإِخْوَانِهِمُ الَّذِينَ كَفَرُوا
مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَئِنْ أُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا
نُطِيعُ فِيكُمْ أَحَدًا أَبَدًا وَإِنْ قُوتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ
وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ﴿١١﴾ لَئِنْ أُخْرِجُوا لَا يَخْرُجُونَ
مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوتِلُوا لَا يَنْصُرُونَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَصَرُوهُمْ
لَيُوَلُّنَّ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ﴿١٢﴾ لَأَنْتُمْ أَشَدُّ رَهْبَةً
فِي صُدُورِهِمْ مِنَ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٣﴾
لَا يُقَاتِلُونَكُمْ جَمِيعًا إِلَّا فِي قُرًى مُحَصَّنَةٍ أَوْ مِنْ وَرَاءِ
جُدُرٍ ۚ بَأْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيدٌ ۚ تَحْسَبُهُمْ جَمِيعًا وَ
قُلُوبُهُمْ شَتَّىٰ ۚ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٤﴾ كَمَثَلِ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيبًا ذَاقُوا وَبَالَ أَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٥﴾ كَمَثَلِ الشَّيْطَانِ إِذْ قَالَ لِلْإِنْسَانِ
اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ إِنِّي بَرِيءٌ مِنْكَ إِنِّي أَخَافُ
اللَّهَ رَبَّ الْعَالَمِينَ ﴿١٦﴾ فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ
خَالِدَيْنِ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ ﴿١٧﴾ ع ٢ ٥

ترجمۂ آیات ١١-١٧

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو نفاق میں مبتلا ہیں وہ اپنے ان بھائیوں سے جنھوں نے اہل کتاب میں سے کفر کیا ہے، کہتے ہیں کہ اگر آپ لوگ نکالے جاؤ گے تو ہم بھی لازماً آپ لوگوں کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ لوگوں کے بارے میں ہم

کسی کی بھی بات نہیں مانیں گے اور اگر آپ لوگوں سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور آپ لوگوں کی مدد کریں گے! اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر ان کی مدد بھی کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے پھر ان کی کوئی مدد نہیں ہوگی۔ ۱۱-۱۲

اللہ کے بالمقابل تمہاری دہشت ان کے دلوں میں زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں ہیں۔ یہ تم سے کبھی اکٹھے ہو کر میدان میں نہیں لڑیں گے بلکہ قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے لڑیں گے۔ ان کے درمیان شدید مخاصمت ہے۔ تم ان کو متحد گمان کر رہے ہو حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ ۱۳-۱۴

(جن کو یہ شہ دے رہے ہیں) ان کا وہی حال ہوگا جو ان لوگوں کا ہوا جو ان سے کچھ ہی پہلے اپنے کیے کا وبال چکھ چکے ہیں اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب بھی ہے۔ (اور یہ شہ دینے والے) شیطان کے مانند ہیں جو انسان سے کہتا ہے کہ کفر کر، پھر جب وہ کفر کر بیٹھتا ہے تو اس وقت وہ کہتا ہے کہ میں تجھ سے بری ہوں، میں اللہ ربّ العٰلمین سے ڈرتا ہوں۔ پس انجام کار دونوں ہی دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے بن کر پڑیں گے۔ اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا بدلہ یہی ہے۔ ۱۵-۱۷

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ نَافَقُوْا یَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ

لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۱۱)

منافقین کا سازباز بنو قریظہ سے

'اَلَمْ تَرَ' کا خطاب یہاں اظہارِ تعجب کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ذرا ان مدعیانِ ایمان کو تو دیکھو، ایک طرف ایمان کا دعویٰ ہے دوسری طرف ان اہل کتاب سے، جنھوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت و رسالت کا انکار کیا ہے، محبت کی پینگیں بھی بڑھائی جا رہی ہیں۔

'لِاِخْوَانِهِمْ' کے لفظ سے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جن منافقین کا ذکر ہے یہ یہودیوں ہی کے اندر سے آئے ہوئے تھے۔ اپنے مصالح کی خاطر یہ یہودیوں سے تو نکل آئے لیکن یہودیت ان کے اندر سے نہیں نکلی تھی۔ اپنے سیاسی و معاشی مفادات کے حد تک یہ مسلمانوں کے ساتھ تھے باقی ان کی اصل ہمدردی اپنے بھائیوں ہی کے لیے تھی۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ منافقین میں زیادہ تعداد انہی افراد کی تھی جو پہلے یہودی تھے اور انہی کا رویہ ان سورتوں میں زیر بحث ہے۔ عربوں میں سے جو لوگ اسلام لائے ان میں منافق بہت کم تھے اور ان کے نفاق کی نوعیت بھی مختلف تھی۔ آگے سورۂ ممتحنہ میں اس گروہ کا رویہ زیر بحث آئے گا۔

'اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ'، بنی یہود کے جس گروہ کی طرف اشارہ ہے اس کے تعین میں لوگوں کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے لیکن میں اس بات پر مطمئن ہوں کہ یہ اشارہ یہود بنی قریظہ کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مدینہ کے جوار میں یہود کے تین ہی بڑے قبیلے آباد تھے: بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ بنو قینقاع کا تصہ پہلے ہی پاک ہو چکا تھا۔ بنو نضیر کا حشر اسی سورہ میں اوپر بیان ہوا۔ اس کے بعد صرف بنو قریظہ بچ رہے تھے جو مدینہ سے کچھ فاصلہ پر آباد تھے اس وجہ سے منافقین کے جس سازباز کا ذکر ہے وہ انہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ ان کا خاتمہ غزوۂ خندق کے معاً بعد ہوا ہے جس کی تفصیل سورۂ احزاب میں گزر چکی ہے۔

'لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ'۔ ان منافقین نے ان کو اطمینان دلانا شروع کیا کہ اگر آپ لوگوں کو بھی بنو نضیر کی طرح یہاں سے نکالنے کی کوشش کی گئی تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکل جائیں گے اور آپ لوگوں کے معاملے میں ہم کسی کے حکم یا مشورہ کی ہرگز کوئی پروا نہ کریں گے۔ اور اگر جنگ کی نوبت آئی تو ہم آپ لوگوں کی مدد کریں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنو قریظہ کو یہ اندیشہ تھا کہ اب جلد ہی ان کی باری بھی آنے والی ہے اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان منافقین کے وعدوں پر ان کو کچھ زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ وہ بنو نضیر کے معاملے میں اندازہ کر چکے تھے کہ یہ صرف زبان کے غازی ہیں۔ چنانچہ منافقین کو بڑی تاکید و توثیق کے ساتھ ان کو اپنے عہد پر مطمئن کرنے کی کوشش کرنی پڑی۔ یہاں تک کہ یہ اطمینان بھی انھوں نے دلایا کہ وہ اس معاملے میں کسی کی پروا

نہیں کریں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ اشارہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمیں اپنے اس عہد کی خاطر ان لوگوں سے قطعِ تعلق بھی کر لینا پڑا تو ہم یہ بھی کر گزریں گے۔

وَاللّٰهُ یَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ۔ جس قسم و تاکید کے ساتھ ان منافقین نے بنو قریظہ کو اپنی حمایت کا یقین دلایا اسی تاکید و توثیق کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹا قرار دیا۔ وَاللّٰهُ یَشْهَدُ کے الفاظ، ہم واضح کر چکے ہیں، کہ قسم کے مفہوم میں آتے ہیں۔

لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا یَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ ۚ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا یَنْصُرُوْنَهُمْ ۚ وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَیُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ (۱۲)

منافقین کی تردید

یہ قرآن نے ان کے ایک ایک قول و قرار کی تکذیب کر دی کہ وقت آنے پر یہ اپنی ایک بات میں بھی سچے ثابت نہیں ہوں گے۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کا ساتھ نہیں دیں گے، اگر ان پر حملہ ہوا تو یہ ان کی حمایت میں لڑنے والے نہیں ہیں اور اگر اٹھے تو منہ کی کھائیں گے اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ وقت پر کوئی بھی ان کے کام نہ آیا۔ ان کے عبرت انگیز انجام کی تفصیل سورۂ احزاب کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

وقت پر بنو قریظہ کا کسی نے ساتھ نہ دیا

یہاں بالاجمال اتنی بات یاد رکھیے کہ بنو نضیر کی طرح انھوں نے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امن و صلح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ غزوۂ خندق کے موقع پر مشہور یہودی حیّی بن اخطب نے ان کو نقضِ عہد پر ابھارا۔ اس نے ان کو سمجھایا کہ اس وقت قریش اور غطفان اپنی پوری جمعیت کے ساتھ مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں، اگر تم بھی میدان میں آ جاؤ تو بس سمجھو کہ مسلمانوں کا خاتمہ ہے۔ اس کے چکمے میں آ کر بنو قریظہ بھی معاہدہ توڑ کر حملہ آوروں میں شریک ہو گئے۔ غزوۂ خندق کا جو انجام ہوا وہ معلوم ہے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی حضورؐ نے بنو قریظہ کا رخ کیا اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت کسی نے بھی ان کا ساتھ نہیں دیا بالآخر انھیں مجبور ہو کر اپنی قسمت کا فیصلہ حضرت سعد بن معاذؓ کے ہاتھ میں دینا پڑا۔ اس فیصلہ کی تفصیل سورۂ احزاب میں گزر چکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت سعدؓ کے ہاتھوں ان کی جڑ ہی کاٹ دی۔

ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ۔ یعنی پھر ان کے لیے امید کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ یہ اللہ کی فیصلہ کن پکڑ ہو گی اور جو لوگ اللہ کی پکڑ میں آ جاتے ہیں ان کو پھر کوئی بھی سہارا نہیں دے سکتا۔

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ (۱۳)

جو اللہ سے نہیں ڈرتے وہ بندوں سے ڈرتے ہیں

یعنی تمہارے مقابل میں یہ اپنے ان بھائیوں کی نصرت کے لیے اس وجہ سے نہیں اٹھیں گے کہ اللہ سے زیادہ تمہاری دہشت ان کے دلوں میں سمائی ہوئی ہے۔ اللہ کی مخالفت اور نافرمانی تو یہ سرًّا بھی کرتے ہیں اور علانیۃً بھی لیکن تمہارے مقابل میں اٹھنے کا حوصلہ یہ کبھی کرنے والے نہیں ہیں۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ۔ یعنی یہ بات ہے تو عجیب سی کہ یہ خدا سے ڈھیٹ اور تم سے

دہشت زدہ ہیں لیکن جن کی مت ماری جاتی ہے ان کا یہی حال ہوتا ہے کہ وہ صاحب تازیانہ سے نہیں بلکہ صرف تازیانہ سے ڈرتے ہیں۔ اگر ان کے اندر ذرا بھی عقل و ایمان کی رمق ہوتی تو یہ سوچ سکتے تھے کہ جب وہ اپنے اصل مالک کو اپنے اوپر غضب ناک بنا چکے ہیں تو اس کے دربانوں اور نوکروں سے چھپ کر کتنے دن اپنے کو بچا سکیں گے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ عقل اور فطرت کے بدیہی حقائق کے سمجھنے سے دل اس وقت محروم ہوتا ہے جب بدیہیات کی خلاف ورزی کے جرم میں اللہ تعالیٰ اس پر مہر کر دیا کرتا ہے۔ چنانچہ منافقین ہی کے باب میں ارشاد ہوا ہے کہ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ (المنٰفقون - ۶۳: ۳) (یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ پہلے ایمان لائے پھر انھوں نے کفر کیا پس ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی، پس وہ سمجھنے سے رہ گئے)۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ؕ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ (۱۴)

یعنی ان بزدلوں کی ان گیدڑ بھبکیوں کو ذرا اہمیت نہ دو۔ ان میں اتنا جیوٹ نہیں ہے کہ یہ کبھی میدان میں نکل کر، منظم فوج کشی کی صورت میں، تم سے نبرد آزمائی کا حوصلہ کر سکیں۔ میدان میں نکلنا تو درکنار، ان پر اگر حملہ بھی ہوا تو یہ باہر نکل کر مدافعت کا حوصلہ نہیں کریں گے بلکہ بستیوں میں قلعہ بند ہو کر یا گھروں میں محصور ہو کر، دیواروں کی اوٹ ہی سے، اپنے کو بچانے کی کوشش کریں گے۔ یہ امر واضح رہے کہ قلعہ بند یا محصور ہو کر اول تو صرف دفاعی جنگ ہی لڑی جا سکتی ہے، حملہ آورانہ جنگ کا اس صورت میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ثانیاً دفاعی پہلو سے بھی سب سے زیادہ کمزور جنگ یہی ہے۔ صرف مجبوری کی حالت ہی میں یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہود کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ یہ مسلمانوں کے خلاف قریش اور ان کے حلیفوں کو ابھارنے کے معاملے میں تو بڑے شاطر رہے ہیں لیکن یہ کبھی کھل کر میدان میں نہیں آئے اور جب مسلمانوں نے ان پر کبھی حملہ کیا تو انھوں نے ہمیشہ قلعہ بند اور محصور رہ کر مدافعت کی کوشش کی اور اس میں ناکامی بلکہ ذلت سے دوچار ہوئے۔

بزدلوں کی اصل کمزوری

بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ؕ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تم سے کھلے میدان میں مقابلہ کا حوصلہ تو جب ہو کہ ان کے دل آپس میں جڑے ہوئے ہوں۔ جہاں تک اسلام دشمنی کا تعلق ہے اس میں تو یہ بے شک متحد ہیں جس سے آدمی کو دھوکا ہوتا ہے کہ ان کے اندر متحد رہے لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مخالفتِ اسلام کے منفی مقصد کے سوا ہر معاملے میں ان کے دلوں کے اندر ایک دوسرے کے خلاف شدید بغض و عناد ہے۔ یہود کی مختلف شاخوں کے اندر بھی عداوت جاگزیں ہے اور قریش و قبائلِ مشرکین کے ساتھ بھی ان کی دوستی بالکل نمائشی محض اسلام کی مخالفت کی حد تک ہے۔ ایسے بے ثبات اور نمائشی اتحاد میں اتنا دم داعیہ کہاں کہ وہ کھلے میدان میں

ان لوگوں کے مقابل میں پابر جا رہ سکے جن کے دلوں کو اللہ کے ایمان نے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا ہے۔

'ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ' یہ ان کی بیماری کے اصل سبب کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ عقل سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔ یعنی حقائق پر غور کرنے، سنجیدگی سے ان کا موازنہ کرنے اور پھر پورے عزم و ثبات سے ان کا مواجہہ کرنے کی جگہ انھوں نے اپنی باگ اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے اور جب کوئی قوم عقل کی جگہ اپنی خواہشوں کو امام بنا لیتی ہے تو وہ اسی طرح کے انتشارِ فکر میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتی ہے۔

'كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۱۵)

بنو نضیر کے انجام کی مثال

یہ مثال دی ہے ان لوگوں کے انجام کی جن کو یہ منافقین ابھار رہے تھے کہ اگر آپ لوگ نکالے گئے تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکل جائیں گے اور اگر آپ لوگوں پر حملہ ہوا تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ فرمایا کہ اگر یہ لوگ اِن کی بھڑی میں آکر کوئی غلط قدم اٹھا بیٹھے تو یاد رکھیں کہ ان کا انجام بھی وہی ہو گا جو ان لوگوں کا ہو چکا ہے جو ابھی جلدی ہی اپنی شرارت کا مزا چکھ چکے ہیں۔

'اَلَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ' سے عام طور پر لوگوں نے قریش کو مراد لیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ اشارہ غزوۂ بدر کی طرف ہے کہ جس طرح بدر میں قریش کو منہ کی کھانی پڑی اسی طرح یہ لوگ بھی منہ کی کھائیں گے۔

یہ اشارہ اگرچہ قریش کی طرف بھی ہو سکتا ہے، بلکہ بنو قینقاع کی طرف بھی ہو سکتا ہے، جیسا کہ ابن کثیرؒ نے سمجھا ہے، لیکن میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ان آیات میں اس سازش کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جو بنو نضیر کی جلاوطنی کے بعد منافقین نے بنو قریظہ کے ساتھ کرنی شروع کی تھی، اس وجہ سے میرے نزدیک یہ اشارہ بنو نضیر کے انجام کی طرف ہے۔ اس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ بنو نضیر کی مثال بالکل تازہ تھی، جیسا کہ 'قَرِيْبًا' کے الفاظ سے واضح ہے۔ دوسری یہ ہے کہ یہود کے کسی گروہ کے لیے سب سے زیادہ مؤثر مثال یہود ہی کے کسی گروہ کی ہو سکتی تھی۔

'وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ' یعنی دنیا میں تو وہ اس طرح کے کسی انجام سے دوچار ہوں گے اور آخرت میں ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ بنو قریظہ دنیا میں بھی بنو نضیر کی نسبت کہیں زیادہ سخت انجام سے دوچار ہوئے اور آخرت میں ان کے سامنے جو کچھ آنے والا ہے اس کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ ۚ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۶)

منافقین کی مثال شیطان سے

یہ بنو قریظہ کو ابھارنے والے منافقین کی مثال بیان ہوئی ہے کہ یہ کہتے تو ہیں کہ آپ لوگ نکالے گئے

تو ہم بھی آپ کے ساتھ نکلیں گے اور اگر آپ لوگوں پر حملہ ہوا تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے اور اس معاملے میں ہرگز کسی کا کوئی دباؤ نہیں قبول کریں گے لیکن یہ شیطان کے بھائی ہیں اور اسی کا رویہ اختیار کریں گے۔ جس طرح وہ انسان کو خدا کی نافرمانی کی راہ سجھاتا ہے اور جب آدمی اس کے چکمے میں آ کر کوئی جرم کر بیٹھتا ہے تو وہ ناصح بن کر اس کو ملامت کرتا اور اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح یہ منافقین بھی آج تو ان لوگوں کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں لیکن جب یہ کوئی اقدام کر بیٹھیں گے اور اس کا انجام بد ان کے سامنے آئے گا تو پیٹھ ٹھونکنے والے شیاطین دم دبا کر بھاگیں گے اور ان کے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنے پر ہرگز تیار نہیں ہوں گے۔

غزوۂ بدر میں یہود کی شرارت

سورۂ انفال آیت ۴۸ میں بسلسلۂ واقعات غزوۂ بدر، بیان ہوا ہے کہ جب قریش اور مسلمانوں کی فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو پہلے تو شیطان نے کفار کو شہ دی کہ شاباش، بھڑ جاؤ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ (لوگوں میں کسی کی تاب نہیں کہ آج تم پر غالب آسکے، میں تمھاری پشت پر ہوں) لیکن جب دونوں فوجیں بھڑ گئیں اور فرشتوں کی کمک سے میدانِ جنگ کا نقشہ بالکل بدلا ہوا نظر آیا تو اس نے فوراً پینترا بدل کر پکارا کہ إِنِّي بَرِيءٌ مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (میں تمھارے اس اقدام کی ذمہ داری سے بری ہوں، میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ سخت پاداش والا ہے)۔

ہم نے سورۂ انفال کی تفسیر میں واضح کیا ہے کہ بدر کی جنگ یہود کی سازش سے پیش آئی تھی۔ انھی نے قریش کو ابھارا اور اس کا سارا نقشہ بنا کر ان کو دیا اور اپنی مدد کا بھی ان کو اطمینان دلایا لیکن جب اصل وقت آیا تو یہ شیطان کی طرح ان سے بری الذمہ ہو گئے۔

شیطان لیڈروں کا معروف طریقہ

قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ قیامت کے دن جب مجرمین اپنے جرم کی ذمہ داری اپنے شیطان لیڈروں پر ڈالنی چاہیں گے تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہماری پیروی کی۔ ہمیں تمھارے اوپر کوئی اختیار حاصل نہیں تھا کہ ہم تمھارے جرموں کے ذمہ دار ہوں۔ تم نے جو کچھ کیا خود کیا، اب اس کا خمیازہ بھگتو۔

اس دنیا میں بھی شیطان کے ایجنٹوں کا طریقہ[1] کار یہی ہے کہ وہ جرائم پر لوگوں کو ابھار تو دیتے ہیں لیکن جب ان کے نتائج سامنے آتے ہیں تو ان کی ذمہ داری سے اپنے کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَا أَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيهَا ۚ وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الظَّالِمِينَ (۱۷)

یعنی جرم کر گزرنے کے بعد اس طرح اپنے کو بچانے اور دوسرے کو متّہم کرنے کی جو کوشش کی جاتی ہے اس کا فائدہ کسی فریق کو بھی نہیں پہنچتا بلکہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنّم میں پڑتے اور اپنی جانوں پر

---

[1] قَالَ، مختلف معنوں میں آتا ہے مثلاً کہنا، سمجھانا، اشارہ کرنا، دعوت دینا ابھارنا اور کسی اقدام پر آمادہ کرنا۔

ظلم ڈھانے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔

۶- آگے آیات ۱۸-۲۴ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں خطاب اگرچہ لفظاً عام مسلمانوں سے ہے لیکن روئے سخن خاص طور پر منافقین ہی کی طرف ہے۔ ان کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ ہر شخص کے لیے سب سے زیادہ سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کل جو روزِ حساب آنے والا ہے اس کے لیے اس نے کیا کیا اور کیا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر شخص کے ہر قول و فعل سے اچھی طرح باخبر ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کے ایک ایک عمل کا بدلہ دے گا۔ ساتھ ہی ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ یہود کی طرح اللہ کو بھلا نہ بیٹھو۔ جو لوگ اللہ کو بھلا بیٹھتے ہیں وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ وہ خود اپنے ہی خیر و شر سے بالکل اندھے بن کے رہ جاتے ہیں۔ یاد رکھو کہ اہل دوزخ اور اہل جنت کے درمیان جو فرق ہوگا وہ کوئی معمولی فرق نہیں ہوگا کہ اس کو سہل انگاری سے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ یہ بہت بڑا فرق ہوگا۔ فوز و فلاح صرف اہلِ جنت کو حاصل ہوگی۔ دوسروں کے لیے ابدی خسران کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

پھر ان کو یہ آگاہی بھی دے دی گئی ہے کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی ہے کہ لوگ اللہ کے آگے کوئی عذر پیش کر سکیں۔ یہ قرآن، جو سنایا جا رہا ہے، ایسی چیز ہے کہ اگر یہ پہاڑ پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی، اپنی تمام سختی و صلابت کے باوجود، خشیتِ الٰہی سے شق ہو جاتا۔ جن کے دل اس سے متاثر نہیں ہو رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ یہ قرآن کا قصور نہیں ہے بلکہ یہ خود ان کے دلوں کی قساوت ہے کہ وہ اس سے پسیج نہیں رہے ہیں۔ اس طرح کے قسی القلب کسی چیز سے بھی متاثر ہونے والے نہیں ہیں۔

آخر میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا آئینہ لوگوں کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے حاضر و مستقبل، اپنے خیر و شر، اپنے عقائد و اعمال اور اپنے مآل و انجام کا جائزہ لیں اور اپنے ظاہر و باطن کو اپنے رب کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنائیں اور سنواریں ورنہ وہ اپنے وجود کو اپنے لیے لعنت بنا لیں گے ــــ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۸-۲۴ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ خَبِيرٌۢ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٨﴾ وَلَا تَكُونُوا۟ كَٱلَّذِينَ نَسُوا۟ ٱللَّهَ فَأَنسَىٰهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ

الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ
اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ
عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ ؕ وَ
تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱﴾ هُوَ اللّٰهُ
الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ
الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ
الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ
سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ
الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾ ع ۳ ۶

ترجمۂ آیات ۱۸ - ۲۴

اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو اور چاہیے کہ ہر نفس اچھی طرح جائزہ لے رکھے اس کا جو اس نے کل کے لیے کیا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جو اللہ کو بھول بیٹھے تو اللہ نے ان کو خود ان کی جانوں سے غافل کر دیا۔ یہی لوگ اصلی نافرمان ہیں۔ ۱۸-۱۹

دوزخ میں پڑنے والے اور جنت میں جانے والے یکساں نہیں ہوں گے۔ جنت والے ہی کامیاب ہونے والے بنیں گے۔ ۲۰

اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم دیکھتے کہ وہ خشیتِ الٰہی سے پست

اور پاش پاش ہو جاتا اور یہ مثالیں ہم لوگوں کے لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ سوچیں۔ ۲۱

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ رحمان و رحیم ہے۔ ۲۲

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زور آور، صاحب کبریائی۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ ۲۳

وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا۔ اسی کے لیے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اسی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ غالب و حکیم ہے۔ ۲۴

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۸)

روزِ حساب کی یاد دہانی

خطاب، باعتبارِ الفاظ، اگرچہ عام مسلمانوں سے ہے لیکن موقع و محل بتا رہا ہے کہ روئے سخن اصلاً ان منافقین ہی کی طرف ہے جن کی کمزوریاں اس سورہ میں شروع سے زیر بحث ہیں۔ ان کو آخر میں گویا اُس حقیقت الحقائق کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے جس سے غفلت نفس کی تمام بیماریوں کی جڑ اور جس کی یادداشت ہی انسان کی تمام عقلی و روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ فرمایا کہ اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، تمہارے ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اپنے رب سے ڈرتے اور اپنے اعمال کا برابر جائزہ لیتے رہو کہ کل جو روزِ حساب آنے والا ہے اس کے لیے تم نے کیا تیاری کی ہے۔ 'ڈرتے رہو' کی تاکید اس لیے فرمائی کہ کوئی اس غلط فہمی میں نہ پڑا رہے کہ یہ دنیا کوئی کھیل تماشا ہے جو یوں ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ یوں ہی نہیں ختم ہو گا بلکہ اس کے بعد جزا و سزا بھی ہے جو لازمی ہے۔ روزِ قیامت کو لفظ 'غد' سے تعبیر فرمایا ہے جس سے مقصود اس کے قرب اور اس کی قطعیت

کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے میں دفع الوقتی سے کام نہ لو کہ ابھی بہت دن پڑے ہیں، جب وقت قریب آجائے گا تو دیکھ لیں گے۔ وہ دن دُور نہیں ہے۔ جس طرح آج کے بعد کل ہے اسی طرح اس کو بھی آیا ہی سمجھو۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ'۔ معاملہ کی اہمیت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے 'اِتَّقُوا اللّٰهَ' کو پھر دہرایا اور اس کے بعد اس حقیقت کی یاددہانی فرمائی کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ خدا تمھارے کسی عمل سے بے خبر ہے۔ وہ تمھارے ایک ایک قول و فعل سے واقف ہے اس وجہ سے سلامتی اسی میں ہے کہ جو کچھ کرو یہ پیشِ نظر رکھ کر کرو کہ تمھارا یہ عمل خدا کے علم میں رہے گا اور ایک دن تمھیں اس کی جزا یا سزا ملنی ہے۔

'وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۱۹)'

فرمایا کہ ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنھوں نے خدا کو بھلا دیا تو خدا نے ان کو خود ان کے انجام سے غافل کر دیا۔ 'کَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ' سے اشارہ یہود کی طرف ہے۔ یہود ہی ان منافقین کے مرشد تھے۔ قرآن نے ان کو آگاہ فرمایا کہ ان لوگوں کی طرح اگر تم بھی خدا کو بھلا بیٹھے تو یاد رکھو کہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑو گے بلکہ اپنے ہی کو تباہ کرو گے۔

جو خدا کو بھلا دیتے ہیں وہ خود اپنے کو بھلا دیتے ہیں

'فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ' میں ایک بڑی اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ جو لوگ خدا کو بھلا دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے خیر و شر اور اپنی عاقبت سے بالکل بے پروا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کی ساری قدر و قیمت اور اس کا سارا شرف و جمال اس حقیقت کے سمجھنے پر منحصر ہے کہ خالق نے اس کو محض چند روزہ عیشِ دنیا کے لیے نہیں بنایا ہے بلکہ اس لیے بنایا ہے کہ انسان اس کو خدا کے احکام کے تحت گزار کر اپنے کو ابدی بادشاہی کا سزاوار بنائے۔ یہ معراج ظاہر ہے کہ اسی کو حاصل ہوگی جو ہمیشہ اس حقیقت کو یاد رکھے کہ یہ زندگی اس کو اتفاقیہ نہیں مل گئی ہے بلکہ ایک بخشنے والے کی بخشی ہوئی ہے اور اس نے ایک خاص مقصد سے یہ اس کو بخشی ہے۔ اگر اس مقصد کے تحت ہی اس کو گزارو گا تب تو یہ عظیم ابدی نعمت ہے اور اگر اس مقصد کو بھلا بیٹھا تو یہ آپ سے آپ ایک ابدی لعنت بن جائے گی۔

'اُولٰٓئِکَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ'۔ فرمایا کہ خدا کے اصل نافرمان یہی لوگ ہیں۔ انھوں نے خدا کو بھلایا تو خدا کے ساتھ اپنی زندگی کے تعلق کی نوعیت بھی بھول بیٹھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ خدا کے بالکل ہی نافرمان بن گئے۔

اس سے خدا کی یاد کی حقیقت بھی واضح ہوئی کہ اس کی اصل روح یہ ہے کہ آدمی اس تعلق کی نوعیت کو ہمیشہ اپنے سامنے مستحضر رکھے جو اس کے اور اس کے رب کے مابین ہے۔ اسی کے استحضار سے

یہ یاد زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ یاد کچھ نتیجہ خیز نہیں ہوتی بلکہ یہ بالکل رسمی سی چیز بن کے رہ جاتی ہے جس کا ہونا نہ ہونا دونوں یکساں ہوتا ہے۔

لَا یَسْتَوِیْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ (۲۰)

ایک نہایت اہم حقیقت

یہ ایک اور نہایت اہم حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے جس کو پیشِ نظر رکھنا زندگی کی حقیقی قدر و قیمت سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔ وہ یہ کہ اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کے درمیان جو فرق ہوگا وہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو اہمیت نہ دی جائے۔ آج خواہشاتِ نفس سے مغلوب ہو کر اگر کوئی جنت اور دوزخ کے تفاوت کو محسوس نہیں کر رہا ہے تو اس کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دونوں میں صرف ڈگری کا فرق نہیں ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں اہلِ دوزخ کی زندگی پر بھی قناعت کی جا سکے۔ بلکہ دونوں کے درمیان ابدی نعمت اور ابدی زحمت کا فرق ہوگا۔ فوز و فلاح صرف اہلِ جنت کے لیے خاص ہوگی۔ اہلِ دوزخ کے لیے لعنت اور عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۲۱)

ایک بلیغ تمثیل

یہ ان منافقین کو زجر و ملامت ہے کہ جہاں تک تعلیم و تذکیر اور اتمامِ حجّت کا تعلق ہے اللہ نے تمہارے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ یہ قرآن ایسی چیز ہے کہ اگر پہاڑ جیسی سخت اور بے حس چیز پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی خشیتِ الٰہی سے سرنگندہ اور پاش پاش ہو جاتا لیکن تم ایسے سنگ دل اور ٹھس ہو کہ تمہارے دل ذرا بھی اس سے متاثر نہیں ہو رہے ہیں۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ فرمایا کہ یہ تمثیلیں ہم اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ لوگ اپنے حال پر غور کریں کہ اگر ایسی مؤثر چیز بھی ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے تو اس میں قصور اس شے کا نہیں بلکہ صرف ان کے دلوں کی قساوت کا ہے اور پھر وہ اس معاملے پر بھی غور کریں کہ جب ان کے دلوں کی قساوت اس درجہ بڑھ گئی ہے تو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنّت کے مطابق ان کے دلوں پر بھی اسی طرح مہر کر دے جس طرح اس نے یہود کے دلوں پر کر دی۔

یہ مضمون، مختلف اسلوبوں سے، قرآن کے دوسرے مقامات میں بھی بیان ہوا ہے۔ ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں تاکہ اس کا اصل رخ نگاہوں کے سامنے آ جائے۔ سورۂ بقرہ میں یہود کے متعلق فرمایا ہے:

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ	پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو کر پتھر کے
ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ	مانند بن گئے بلکہ اس سے بھی سخت۔ اور پتھروں
قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ	میں سے تو بعض ایسے بھی ہیں جن سے نہریں

لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ (البقرۃ - ۲ : ۷۴)

پھوٹ پڑتی ہیں اور بعض ایسے ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ کی خشیت سے گر پڑتے ہیں اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے غافل نہیں ہے۔

اسی طرح سورۂ حدید میں انہی منافقین سے متعلق فرمایا ہے جن سے یہاں بحث ہے:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (الحدید - ۵۷ : ۱۶)

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے ابھی وقت نہیں آیا کہ اللہ کی یاددہانی اور جو حق نازل ہوا ہے اس کے آگے ان کے دل جھک پڑیں اور وہ ان لوگوں کی طرح ہو کے نہ رہ جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تو ان پر ایک مدت گزر گئی اور ان کے دل سخت ہو کے رہ گئے اور ان میں بہتیرے نافرمان ہیں۔

استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے بعض اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس آیت کو اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا (الاحزاب - ۳۳ : ۷۲) (اور ہم نے اپنی امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈرے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ بے شک وہ ظلم کرنے والا اور جذبات سے مغلوب ہو جانے والا ہے) کی روشنی میں لیتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسی کے ایک پہلو کی وضاحت اس کی روشنی میں بھی ہوتی ہے لیکن البقرۃ اور الحدید کی مذکورہ بالا آیات سے اس کا ہر پہلو واضح ہو جاتا ہے۔

قرآن نے اس کو تمثیل سے تعبیر فرمایا ہے۔ تمثیل میں مبالغہ یا تخییل کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا بلکہ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایک معنوی حقیقت ایک مادی پیرایۂ بیان میں متمثل ہو کر سامنے آگئی یا نہیں۔ اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ یہ تمثیل ایک نہایت ہی اعلیٰ اور بلیغ تمثیل ہے۔
'لَرَاَيْتَهٗ' میں خطاب عام بھی ہو سکتا ہے لیکن اس کا مخاطب اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیے تو اس آیت کے اندر حضورؐ کے لیے بہت بڑی تسلی بھی ہے کہ اگر تمھاری دعوت سے یہ لوگ متاثر نہیں ہو رہے ہیں تو اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔ جو قرآن تم ان کو سنا رہے ہو یہ تو وہ چیز ہے

کہ اگر کسی پہاڑ پر بھی، تارا جاتا تو وہ بھی اللہ کی خشیت سے سرنگوں اور دونیم ہو جاتا لیکن ان لوگوں کے دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں کہ وہ اس سے کوئی اثر نہیں لے رہے ہیں۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (۲۲)

صفاتِ الٰہی کا حوالہ

اوپر کی آیت میں جب اللہ تعالیٰ کی خشیت کا ذکر آیا تو اس آیت میں اور آگے کی آیات میں اس کے وہ اسمائے حسنیٰ بیان کر دیے گئے جن کی حیثیت بنیادی اسما کی ہے تاکہ مومنین، کفار اور منافقین سب کو معلوم ہو جائے کہ جس رب سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے وہ کن اوصاف کا مالک ہے! انھیں کس طرح اس سے ڈرنا چاہیے، کس قدر اس سے محبت کرنی چاہیے، کس طرح اس سے امید کرنی چاہیے، کس طرح اس پر بھروسہ کرنا چاہیے اور کس طرح اسی کے لیے جینا اور اسی کی راہ میں مرنا چاہیے۔

فلسفۂ دین کی یہ حقیقت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کرتے آ رہے ہیں کہ تمام دین و شریعت کی بنیاد درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے مقتضیات ہی پر ہے۔ قرآن میں 'اَلْحَمْدُ' سے لے کر 'وَالنَّاس' تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ تمام تر صفاتِ الٰہی کے مظاہر و انوار اور ان کے تقاضوں ہی کا بیان ہے۔ انہی سے دین کا فلسفہ وجود میں آیا ہے اور انہی سے دین کے مظاہر و اشکال بھی ظہور پذیر ہوئے ہیں اس وجہ سے ان کا سمجھنا ضروری ہے لیکن ان کو سمجھنے کے لیے پورے قرآن کو سمجھنا ضروری ہے۔ یہاں ہم بالاجمال صرف ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کریں گے جن سے ان صفات کے ابتدائی تقاضوں کے سمجھنے میں مدد ملے۔

'هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ'۔ سب سے پہلے اپنی الوہیت کی یاددہانی فرمائی اور ساتھ ہی اس بات کی کہ اس کے سوا کوئی اور معبود نہیں ہے اس وجہ سے امید و بیم دونوں حالتوں میں بندوں کو اسی سے رجوع کرنا چاہیے، اس کے سوا کوئی اور حق دار نہیں ہے کہ اس کو معبود مانا جائے یا اس کی پرستش کی جائے یا اس کو مرجع سمجھ کر اس سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔

'عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ'۔ وہ غائب و حاضر دونوں کو جاننے والا ہے۔ لفظ 'غیب' یہاں بندوں کے لحاظ سے استعمال ہوا ہے ورنہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز شہادت (حاضر) کے حکم میں داخل ہے۔ اس صفت کے اندر امید و بیم دونوں کے پہلو ہیں۔ بیم کا پہلو یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی کرتا ہے، خواہ سرًّا یا علانیۃً، وہ اللہ کے علم میں ہے اور جب سب کچھ اس کے علم میں ہے تو وہ لازمًا ایک ایک چیز سے متعلق بازپرس کرے گا۔ پھر نہ تو کوئی اپنے کسی قول و فعل کو چھپا سکے گا اور نہ اس کا کوئی سفارشی خدا کے سامنے اس کے باب میں کوئی غلط بیانی کر سکے گا۔ امید کا پہلو اس میں یہ ہے کہ جب اس کا رب اس کے ہر غائب و حاضر سے واقف ہے تو اس کو اس پر پورا بھروسہ رکھنا

چاہیے اور اپنی ہر درخواست اسی کے آگے پیش کرنی چاہیے۔

هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ۔ رَحْمٰن اور رَحِيْم کے فرق پر آیت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔ صفت رَحْمٰن کے اندر رحمت کے جوش کا اور رَحِيْم کے اندر رحمت کی پائداری کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان صفات کے اندر بھی غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ امید و بیم دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ امید کا پہلو تو واضح ہے کہ جب خدا رحمان بھی ہے اور رحیم بھی تو اس سے کسی ظلم یا ناانصافی کا کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت پیش آئے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کرے گا رحمت ہی کے لیے کیا ہے اور رحمت ہی کے لیے کرے گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ بیم کا پہلو اس میں یہ ہے کہ جب خدا رحمان اور رحیم ہے تو وہ کسی کے ظلم کو گوارا نہیں کرے گا بلکہ ہر شخص کے ظلم کا لازماً بدلہ لے گا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس نے قرآن میں جگہ جگہ قیامت کو اپنی صفت رحمت ہی پر مبنی کیا ہے کہ یہ اس کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ قیامت لائے تاکہ ہر ایک کے ساتھ پورا پورا انصاف کرے۔ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۚ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (الانعام - ۶:۱۲)

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۚ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۲۳)

اس آیت میں پہلے تو اسی ٹکڑے کا اعادہ ہے جو اوپر والی آیت میں گزرا جس سے معلوم ہوا کہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات یہاں سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ مدنظر ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خدا کی صفات کے باب میں ساری گمراہی شرک ہی سے پیدا ہوتی ہے اور جب ان صفات ہی پر، جیسا کہ ہم نے اوپر عرض کیا، تمام دین و شریعت کی بنیاد ہے، تو ضروری ہوا کہ اس بنیاد میں کجی کے ہر امکان کا سدباب کر دیا جائے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے آٹھ اسماء اتصال کے ساتھ بیان ہوئے ہیں یعنی ان کے درمیان کوئی حرفِ عطف نہیں ہے۔ ہم عربیت کے اس قاعدے کی وضاحت اس کے محل میں کر چکے ہیں کہ جب صفات اس طرح بغیر حرفِ عطف کے آئیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ تمام صفات موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔

اَلْمَلِكُ۔ یعنی وہ بادشاہ ہے۔ اسی نے یہ دنیا پیدا کی ہے اور وہی بلا شرکتِ غیرے اس کا مالک اور حکمران ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے اسی حق کی بنا پر اپنے رسول بھیجے تاکہ وہ اس کے بندوں کو اس کے احکام سے آگاہ کریں اور بندے ان کی تعمیل کر کے اپنے بادشاہِ حقیقی کی خوشنودی حاصل کریں۔

اَلْقُدُّوْسُ۔ وہ ہر عیب، ہر نقص اور ہر برائی و خرابی سے بالکل پاک و منزہ ہے اس وجہ سے اس نے اپنے بندوں کو پاکیزہ بنانے کے لیے کتاب اتاری اور رسول بھیجے تاکہ بندے پاکیزہ بن کر اس کا قرب

حاصل کرنے کے اہل بن سکیں۔ سورۂ جمعہ میں ملک اور قدوس دونوں صفتوں کا حوالہ دے کر ان کا مقتضیٰ واضح فرما دیا ہے۔ پہلے اپنی صفات کا حوالہ ان الفاظ میں دیا: اَلْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ (۱) اس کے بعد اپنی ان صفات کا مقتضیٰ اس طرح واضح فرمایا: هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲) (وہی ہے جس نے اٹھایا امیّوں میں ایک رسول انہی میں سے جو اس کی آیتوں کی تلاوت اور ان کا تزکیہ کرتا ہے) غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ رسول اور کتاب تو اس نے اس لیے بھیجے کہ وہ بادشاہ ہے، اس کے بادشاہ ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنی رعیّت کے پاس اپنے سفیر بھی بھیجے اور اپنے احکام بھی اور اپنے بندوں کا تزکیہ اس وجہ سے اس نے چاہا کہ وہ قدوس اور پاک ہے۔ وہ یہ نہیں پسند کر سکتا کہ اس کے بندے گناہوں میں آلودہ رہیں۔ آگے 'عزیز' اور 'حکیم' کی صفتوں کے تقاضے بھی بیان ہوئے ہیں جن کی وضاحت ان کے محل میں ان شاء اللہ آئے گی۔

'اَلسَّلٰمُ' کے معنی سلامتی، سکھ اور چین کے ہیں۔ کسی کو سلامتی کی دعا دینی ہو تو ہم یہی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن میں لیلۃ القدر کے متعلق فرمایا ہے: سَلٰمٌ ۛهِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ (القدر - ۹۷: ۵) (اس میں سلامتی ہی سلامتی ہے، وہ طلوع فجر تک ہے) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے ہر آفت اور ہر خطرے سے امان اور سپر ہے۔ بندہ جب اپنے کو اس کی پناہ میں دے دیتا ہے تو وہ سکھ اور چین پاتا ہے۔ اس کی اسی صفت کا فیض ہے کہ اس کی یاد دلوں کو سکینت و طمانیت بخشتی ہے۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد - ۱۳: ۲۸) (سن لو کہ اللہ ہی کی یاد سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے)۔

'اَلْمُؤْمِنُ' کے معنی ہیں امان دینے والا یعنی شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے حملوں سے بچنے کے لیے جب بندہ اس کی پناہ ڈھونڈتا ہے تو وہ اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ یہ پناہ اس کے سوا اور کہیں بھی بندے کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ شیطان کی رسائی خدا کے دامن کے سوا ہر جگہ ہے۔

'اَلْمُهَيْمِنُ' کے معنی خلیل اور ابو عبیدہ کے نزدیک نگران کے ہیں۔ ابن الانباری کے نزدیک القائم علی الناس یعنی لوگوں کے محافظ کے ہیں۔ امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کے معنی معتمد اور وکیل کے ہیں۔ میرے نزدیک ان معانی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جو محافظ و نگران ہوتا ہے وہی درحقیقت معتمد اور وکیل ہوتا ہے۔ قرآن بھی 'مُهَيْمِن' ہے اس لیے کہ تمام آسمانی صحیفوں کے لیے قابلِ اعتماد کسوٹی وہی ہے۔

'اَلْعَزِيْزُ' کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر رسائی سے بالاتر اور دسترس سے مافوق ہونے کا مفہوم بھی ہے اور غالب و قوی ہونے کا بھی یعنی اس پر کوئی حاوی نہیں ہو سکتا،

وہ سب کو شکست دے سکتا ہے۔

'اَلْجَبَّارُ' کے معنی زور آور اور تگڑے کے ہیں۔ عربی میں یہ لفظ کھجور کے ان درختوں کے لیے بھی آتا ہے جو غیر معمولی طور پر اونچے ہوں۔ قرآن میں یہ ان زور آوروں کے لیے بھی آیا ہے جن سے ڈر کر بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کی تھی کہ اِنَّ فِیْهَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْهَا (المآئدۃ ۵ : ۲۲) (اس بستی میں بڑے ہی زور آور اور تگڑے لوگ ہیں، جب تک وہ اس میں ہیں، ہم اس میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں کر سکتے)۔ یہ صفت ان تمام تصوراتِ الوہیت کی نفی کرتی ہے جن میں ساری اہمیت دیویوں کو دی گئی ہے۔

'اَلْمُتَکَبِّرُ' کے معنی ہیں اپنی بڑائی اور برتری کا احساس رکھنے والا۔ یہ احساس اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے اندر ہو تو باطل ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی کوئی ایسی بڑائی حاصل نہیں ہے جو اس کی ذاتی ہو بلکہ جس کو بھی کوئی بڑائی حاصل ہے وہ اللہ ہی کی بخشی ہوئی ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے لیے 'تکبّر' زیبا اور برحق ہے اس لیے کہ اس کی بڑائی ذاتی اور ازلی و ابدی ہے۔ اس کے اس احساس ہی کا یہ اثر ہے کہ وہ اپنی خدائی اور بادشاہی میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ کے اس شعور کی تعبیر دوسرے آسمانی صحیفوں میں یوں کی گئی ہے کہ 'تمہارا خداوند خدا غیور ہے، جس طرح تم یہ گوارا نہیں کرتے کہ تمہاری بیوی کسی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ بھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کا بندہ کسی غیر کی بندگی کرے'۔ میرے نزدیک قرآن نے جو مضمون لفظ 'متکبّر' سے ادا کیا ہے دوسرے آسمانی صحیفوں میں وہی مضمون 'غیور' سے ادا کیا گیا ہے۔

'سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ' یعنی کہاں اللہ تعالیٰ کی یہ صفاتِ جمال و کمال اور کہاں ان مشرکوں کے یہ فرضی دیوی دیوتا! دونوں میں کیا نسبت!! جو خدا ان صفات سے متّصف ہے، وہ اس سے ارفع ہے کہ اس کے ساتھ اس طرح کی چیزوں کا جوڑ ملایا جائے۔ اگر اس طرح کا کوئی جوڑ اس کے ساتھ ملایا جائے گا تو اس کی دوسری بنیادی صفات اس کو قبول کرنے سے اِبا کریں گی اور اگر زبردستی اس کو چپکانے کی کوشش کی گئی تو اس کی صفات میں بے ربطی پیدا ہو جائے گی۔

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۲۴)

یعنی یہ اللہ ہی ہے جو ہر چیز کے وجود کے تمام مراحل کو طے کراتا ہے۔ وہی ہر چیز کا خاکہ تیار کرتا ہے، وہی پھر اس کو وجود بخشتا ہے پھر وہی اس کی صورت گری کرتا اور نوک پلک سنوارتا ہے۔ ان میں سے کسی مرحلہ میں نہ وہ کسی سے طالبِ مدد ہوتا نہ کوئی اس کا ہاتھ بٹاتا یا بٹا سکتا ہے تو آخر کوئی دوسرا اس کا کسی چیز میں بھی شریک کس طرح بن جائے گا! ہر وجود کے اندر یہی تین اوّلین

مرحلے پیش آتے ہیں۔ پہلا مرحلہ اس کے ڈیزائن کا ہوتا ہے جس کے لیے عربی میں لفظ 'خلق' ہے۔ دوسرا مرحلہ اس کو وجود میں لانے کا ہے اس کے لیے لفظ 'بدء' ہے۔ تیسرا مرحلہ اس کی نوک پلک سنوارنے کا ہے اس کے لیے لفظ 'تصویر' ہے۔ اگر ہر شے کے یہ تینوں مرحلے اللہ طے کرتا ہے تو وہی ہر ایک کی تسبیح اور بندگی کا حق دار ہے۔

'لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى' یعنی یہ تو چند بنیادی صفات ہیں جو بیان ہوئی ہیں، ان کے علاوہ جتنی بھی اچھی صفتیں ہیں ان سب کا حقیقی موصوف وہی ہے۔ لفظ 'اسماء' یہاں صفات کے معنی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے جتنے بھی نام ہیں وہ سب اس کی کسی نہ کسی صفت ہی کو تعبیر کرتے ہیں۔

'يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ' چونکہ ہر چیز کے وجود کے تمام مراحل اللہ تعالیٰ ہی نے طے کرائے ہیں اس وجہ سے آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہے۔ انسان اگر اختیار سے بہرہ مند ہونے کے سبب سے اس سے اعراض کرتا ہے تو یہ اس کی حق ناشناسی اور سرکشی ہے۔ اس کے لیے بھی صحیح رویّہ یہی ہے کہ وہ اپنے رب ہی کی تسبیح و بندگی کرے، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائے۔

'وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' یہ آخر میں اپنی ان صفات کی پھر یاد دہانی کرا دی جن سے سورہ کا آغاز فرمایا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ عزیز ہے اس وجہ سے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو انسان بھی اسی طرح مجبورانہ اپنے رب کی بندگی اور تسبیح کرتا جس طرح ساری کائنات کر رہی ہے لیکن وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس نے یہ چاہا کہ وہ انسان کو اختیار دے کر آزمائے کہ وہ یہ شرف پا کر اپنے رب کا حق پہچانتا ہے یا شیطان کا مرید بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد
۲- فروری ۱۹۷۸ء
۲۳- صفر ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

٦٠

الممتحنة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

پچھلی سورتوں میں منافقین کو اہل کتاب، بالخصوص یہود، سے قطعِ تعلق کا حکم دیا گیا ہے اور یہ منافقین تھے بھی، جیسا کہ ہم اشارہ کر چکے ہیں، بیشتر اہل کتاب ہی میں سے۔ اس سورہ میں مشرکین مکّہ سے قطعِ تعلق کا حکم دیا گیا ہے اور خطاب خاص طور پر ان لوگوں سے ہے جو اسلام میں داخل بھی تھے اور دین کی خاطر انھوں نے ہجرت بھی کی تھی لیکن اہل مکّہ سے رشتہ و برادری کے جو تعلقات تھے اس کی زنجیریں ابھی انھوں نے نہیں توڑی تھیں اس وجہ سے امتحان کے مواقع پر ان سے ایسی کمزوریاں صادر ہو جاتیں جو ایمان و اخلاص کے منافی ہوتیں۔ گویا نفاق کی بیخ کنی یا تطہیرِ مومنین جو تمام مسبّحات کا مشترک مضمون ہے وہی مضمون اس سورہ کا بھی ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ اس میں روئے سخن ان مسلمانوں کی طرف ہے جنھوں نے ہجرت تو کی لیکن ہجرت کی اصل ابراہیمی حقیقت ابھی ان پر اچھی طرح واضح نہیں ہوئی تھی۔ ان کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسوۂ حسنہ کی یاد دہانی فرمائی گئی ہے کہ اگر ہجرت کی برکات سے متمتّع ہونا چاہتے ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح اپنے سابق ماحول سے ہر قسم کا تعلق منقطع کر کے کلیۃً اللہ اور رسول سے وابستہ ہو جاؤ۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۳) جو کمزور مسلمان ہجرت کے بعد مشرکینِ مکّہ سے خفیہ روابطِ مودّت قائم رکھے ہوئے تھے ان کو تنبیہ کہ جنھوں نے تم کو اور رسولؐ کو تمھارے گھروں سے اس جرم میں نکالا ہے کہ تم اللہ پر ایمان لائے ان سے محبت کی پینگیں نہ بڑھاؤ۔ تم تو ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ اگر ان کا قابو تم پر چل جائے تو ان کی پوری کوشش یہ ہو گی کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ تم کو مرتد کر کے چھوڑیں۔ یاد رکھو کہ اپنے عزیزانہ تعلقات کی پاسداری میں اللہ اور رسولؐ سے بے وفائی کرو گے تو قیامت کے دن یہ رشتے تمھارے کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن تمام رشتے ناتے ختم ہو جائیں گے۔

(۴-۷) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعۂ ہجرت کی یاد دہانی اور اس سے سبق حاصل کرنے کی ہدایت کہ وہ اپنی پوری قوم سے اپنی ابدی بیزاری کا اعلان کر کے اٹھے کہ جب تک تم لوگ اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ گے اس وقت تک میرا تمھارے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ اسی ضمن میں اس دعائے ابراہیمی کی تلقین جو انھوں نے ہجرت کی آزمائشوں میں ثابت قدمی کے لیے فرمائی اور اس امر کی بشارت کہ کیا عجب کہ جن لوگوں سے تم کو آج قطعِ علائق کا حکم دیا جا رہا ہے وہ کل اسلام سے مشرف ہو کر تم سے گلے ملیں۔

(۸-۹) اس امر کی وضاحت کہ ممانعت ان لوگوں کے ساتھ دوستی بڑھانے کی کی جا رہی ہے جنھوں نے تمھارے ساتھ جنگ کی ہے اور رسول کو اور تم کو تمھارے گھروں سے نکلنے پر مجبور کیا ہے۔ ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنے کی ممانعت نہیں کی جا رہی ہے جنھوں نے اس طرح کی کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔

(۱۰-۱۱) ان عورتوں کے باب میں جو مکہ سے ہجرت کر کے آئیں یہ ہدایت کہ مجرد اس بنا پر کہ وہ آ گئی ہیں، ان کو اپنے اندر شامل نہ کر لیا جائے بلکہ ان کے ایمان و اسلام کی تحقیق کی جائے۔ جب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ فی الواقع انھوں نے اسلام ہی کی خاطر ہجرت کی ہے تب ان کو اپنے اندر شامل کیا جائے۔ اسی طرح جو مشرکات مسلمانوں کے عقد میں ہیں، ان کو بھی اپنے عقد میں باندھے رکھنا جائز نہیں ہے بلکہ وہ آزاد کر دی جائیں اور آپس میں مہروں کا تبادلہ کر لیا جائے۔

(۱۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کہ آپ کے پاس جو عورتیں اسلام کی خاطر آئیں اور خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عہد کریں، ان سے بیعت لے لیا کریں۔

(۱۳) آخر میں مسلمانوں کو تنبیہ کہ نہ یہود سے دوستی بڑھاؤ نہ کفار سے۔ ان دونوں کا حشر ایک ہی ہے۔ ان کی بنیادیں بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں۔

سُوْرَةُ الْمُمْتَحِنَةِ (٦٠)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيات: ١٣

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ آيات
تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ ١-٧
يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ
كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖ
تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَاۤ اَخْفَيْتُمْ وَمَاۤ اَعْلَنْتُمْ ؕ
وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (١) اِنْ
يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْۤا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ
وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (٢) ؕ لَنْ تَنْفَعَكُمْ
اَرْحَامُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ ۚۛ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚۛ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ١٦ معانقة السابغ الوقف على القيمة ١٢
بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (٣) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْۤ
اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ
وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا
وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ

وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ
لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَیْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَیْكَ اَنَبْنَا
وَاِلَیْكَ الْمَصِیْرُ ۝۴ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا
وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝۵ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ
فِیْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ یَرْجُوا اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ ؕ
وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝۶ عَسَی اللّٰهُ اَنْ ع
یَّجْعَلَ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ عَادَیْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ؕ
وَاللّٰهُ قَدِیْرٌ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝۷

ترجمۂ آیات ۱-۷

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ، تم ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ انھوں نے اس حق کا انکار کیا جو تمھارے پاس آیا، وہ رسول کو اور تم کو اس بنا پر جلا وطن کرتے ہیں کہ تم اللہ، اپنے خداوند پر، ایمان لائے! —— اگر تم میری راہ میں جہاد اور میری رضا جوئی کو نکلتے ہو، ان سے رازدارانہ نامہ و پیام کرتے ہوئے، درآں حالیکہ میں جانتا ہوں جو تم چھپاتے اور جو ظاہر کرتے ہو، اور جو تم میں سے ایسا کرتے ہیں وہ راہِ راست سے بھٹک گئے۔ ۱

اگر وہ تم کو پا جائیں تو وہ تمھارے دشمن بن جائیں گے اور تم پر دست درازی بھی کریں گے اور زبان درازی بھی اور چاہیں گے کہ تم کافر ہو جاؤ۔ ۲

تمھارے رشتے ناتے اور تمھارے آل و اولاد قیامت کے دن تمھارے کچھ بھی

کام آنے والے نہیں بنیں گے۔ اس دن اللہ تمھارے درمیان جدائی ڈال دے گا۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے۔ ۳

تمھارے لیے بہترین نمونہ تو ابراہیم اور اس کے ساتھیوں میں ہے جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور ان سے، جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بالکل بری ہیں۔ ہم نے تمھارا انکار کیا اور ہمارے اور تمھارے مابین ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بیزاری آشکارا ہو گئی تا آنکہ تم اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر ایمان لاؤ۔ مگر ابراہیم کی اپنے باپ سے اتنی بات کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا اگرچہ میں آپ کے لیے اللہ کی طرف سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتا ـــــ اے ہمارے رب، ہم نے تیرے اوپر بھروسہ کیا اور تیری طرف رجوع ہوئے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔ اے ہمارے رب، ہم کو ان لوگوں کا تختۂ مشق نہ بننے دینا جنھوں نے کفر کیا ہے اور اے ہمارے رب، ہم کو بخش، بے شک تو عزیز و حکیم ہے۔ ۴-۵

بے شک تمھارے لیے ان لوگوں کے اندر بہترین نمونہ ہے۔ ان کے واسطے جو خدا اور آخرت کے متوقع ہیں۔ اور جو اعراض کریں گے تو یاد رکھیں کہ اللہ بے نیاز اور اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔ ٦

توقع ہے کہ اللہ تمھارے اور ان لوگوں کے درمیان جن سے تم نے دشمنی کی، دوستی پیدا کر دے۔ اللہ قدرت والا اور غفور رحیم ہے۔ ۷

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ

بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ ؕ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۖ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۖ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ (۱)

مصلحت پرست مسلمان کو تنبیہ

خطاب اگرچہ باعتبار الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن انہی مسلمانوں کی طرف ہے جو ہجرت کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد بھی مشرکین مکہ کے ساتھ اپنے سابق خاندانی اور عزیزانہ تعلقات کا لحاظ باقی رکھے ہوئے تھے۔ جب تک مشرکین سے عام جنگ کا حکم نہیں ہوا اس وقت تک تو ان کی اس کمزوری پر پردہ پڑا رہا لیکن جب ان کے عام تعاقب کا حکم ہوگیا تو ان کی یہ کمزوری ظاہر ہونے لگی۔ یہ لوگ اپنے خاندان اور قبیلہ والوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے بھی جھجکتے تھے اور قریش کے لیڈروں کو خوش رکھنے کے بھی خواہش مند تھے کہ وہ ان کے عزیزوں کے درپے آزار نہ ہو جائیں۔ اگرچہ ان کی یہ روش نفاق سے زیادہ مصلحت پرستی پر مبنی تھی۔ ان کا گمان تھا کہ اگر انھوں نے اپنے ان مشرک عزیزوں سے اچھے تعلقات باقی رکھے تو ان کے رویے سے متاثر ہو کر وہ ایک دن سچے مسلمان بن جائیں گے۔ لیکن قرآن نے اس مصلحت کو ایمان کے منافی قرار دیا اور ان پر واضح فرمایا کہ جس ایمان کے تم مدعی ہو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان لوگوں سے رشتۂ موالات نہ رکھو جو اللہ کے بھی دشمن ہیں اور تمھارے بھی۔

لفظ 'عَدُوّ' واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ 'فَعُوْل' کے وزن پر ہے اور عربی میں یہ وزن دونوں کے لیے یکساں ہے بلکہ اس میں مذکر و مؤنث کا بھی امتیاز نہیں ہے۔

'تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ ۚ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ'۔ یہ اوپر والی بات ہی کی وضاحت ہے کہ تم تو ان سے موالات و محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کے بھی دشمن ہیں اور تمھارے بھی۔ ان کی یہ دشمنی اس سے واضح ہے کہ جو دین تمھارے پاس آیا اس کا بھی انھوں نے انکار کیا اور رسول کو اور تم کو اس جرم میں جلاوطن کرنے کے درپے ہیں کہ تم اللہ پر جو تمھارا رب ہے ایمان کیوں لائے۔

'تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ' اسی طرح کا اسلوب بیان ہے جس طرح 'وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ' (البقرۃ - ۲: ۱۹۵) ہے۔ اس طرح کے کام نامہ و پیام اور وسائل و وسائط سے انجام پاتے ہیں اس وجہ سے تعبیر مطلب کے لیے یہ اسلوب نہایت موزوں ہے۔ ہم نے اسلوب کی معنویت ملحوظ رکھنے کے لیے ترجمہ 'محبت کی پینگیں بڑھانا' کیا ہے۔

'یُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِیَّاکُمْ' میں حال کا صیغہ صورتِ حال کو نگاہوں کے سامنے کر دینے کے لیے ہے تاکہ ان لوگوں کو غیرت دلائی جائے جو ایسے بے درد لوگوں سے موالات کے خواہش مند تھے جنھوں نے رسول اور ان کے ساتھیوں کو ان کے وطن سے جلا وطن کیا۔ فرمایا کہ اگر اس کے باوجود تم ان سے دوستی کی پینگیں بڑھاتے ہو تو اپنے ایمان و اسلام کا جائزہ لو اس لیے کہ ان کا سارا غصہ تو اسی بات پر ہے کہ تم اللہ پر، جو تمھارا رب ہے، ایمان لائے! 'رَبِّکُمْ' یہاں دلیل کے محل میں ہے کہ اللہ ہی جب رب ہے تو وہی ایمان کا حق دار ہوا۔ اگر تم اس پر ایمان لائے تو تم نے اصل حق دار کا حق پہچانا لیکن تمھاری یہی حق شناسی ان کے غضب کا سبب بن گئی ہے۔

'اَنْ تُؤْمِنُوْا' کے اسلوب کی وضاحت ہم جگہ جگہ کرتے آ رہے ہیں کہ 'اَنْ' سے پہلے بعض اوقات مضاف محذوف ہو جایا کرتا ہے۔ اگر اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس الزام یا اس گناہ پر تمھیں نکال رہے ہیں کہ تم اللہ پر، جو تمھارا پروردگار ہے، ایمان کیوں لائے؟ گویا تمھاری سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑی حق شناسی ان کے نزدیک تمھارا سب سے بڑا گناہ بن گئی ہے۔

'اِنْ کُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِیْ سَبِیْلِیْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِیْ تُسِرُّوْنَ اِلَیْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ ط وَمَنْ یَّفْعَلْهُ مِنْکُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ'۔

اس ٹکڑے کی نحوی تالیف مفسرین پر اچھی طرح واضح نہیں ہوئی اس وجہ سے وہ اس کا مطلب واضح نہ کر سکے۔ پہلے اس کی تالیفِ نحوی سمجھ لیجیے، پھر ہم اس کا مطلب واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ (ایک اسلوب کی وضاحت)

مفسرین نے عام طور پر یہاں 'شرط' کا جواب محذوف مانا ہے اور قرینہ سے اس کو معین کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے نزدیک یہاں 'اِنْ کُنْتُمْ' اور 'وَمَنْ یَّفْعَلْهُ' دونوں شرطوں کا جواب ایک ہی یعنی 'فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ' ہے۔ 'تُسِرُّوْنَ'، ضمیرِ خطاب سے حال واقع ہوا ہے اور 'وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَیْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ' جملہ معترضہ کے محل میں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری راہ میں جہاد اور رضا طلبی کے لیے اس حال میں نکلے کہ تم اپنے دلوں میں اللہ و رسول کے دشمنوں کے ساتھ موالات کی خواہش چھپائے ہوئے ہو، درآنحالیکہ میں تمھارے باطن اور ظاہر دونوں کو جانتا ہوں، تو یاد رکھو کہ جو تم میں سے ایسا کریں گے وہ سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔

سیدھی راہ سے بھٹک جانے کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد اور اس کی رضا طلبی اور اللہ و رسول کے دشمنوں کے ساتھ دوستی، دو بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ یہ دونوں بیک وقت کسی کے دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر اللہ ظاہر و باطن دونوں سے آگاہ نہ ہوتا تب تو اس کو دھوکا دیا جا سکتا تھا لیکن جب وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے اچھی طرح آگاہ ہے تو اس کو کس طرح دھوکا دیا (اللہ کی رضا طلبی اور اس کے دشمنوں سے موالات ایک جگہ نہیں جمع ہو سکتیں)

جا سکتا ہے! جو لوگ اس طرح کی دو متضاد خواہشیں اپنے دلوں میں رکھ کے نکل رہے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ خدا کی راہ میں نہیں بلکہ شیطان کی راہ میں نکل کھڑے ہوئے ہیں۔ ع

ایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

شانِ نزول سے متعلق ایک نکتہ

اس آیت کے تحت مفسرین نے حضرت حاطب بن بلتعہؓ کا ایک واقعہ بطور شانِ نزول، نقل کیا ہے۔ شانِ نزول سے متعلق ہم مقدمۂ کتاب میں استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی رائے نقل کر چکے ہیں کہ سلف جب کسی آیت کے تعلق سے کوئی واقعہ بطور شانِ نزول نقل کرتے ہیں تو اس کا مطلب لازماً یہی نہیں ہوا کرتا کہ بعینہٖ وہی واقعہ آیت کے نزول کا سبب ہے بلکہ اس سے ان کا مقصود صرف یہ رہنمائی دینا ہوتا ہے کہ اس آیت میں اس طرح کے واقعات کے لیے بھی حکم موجود ہے۔ اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہیں ہے بلکہ ایک خاص قسم کی صورتِ حال کی طرف اشارہ ہے۔ جس کمزوری کی طرف آیت میں اشارہ ہے بعض لوگوں کے اندر اس کا پایا جانا کچھ عجیب بھی نہیں ہے بلکہ یہ عام بشری کمزوری کا نتیجہ یا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، مصلحتِ خیر پر بھی مبنی ہو سکتی ہے اور یہاں یہی پہلو، جیسا کہ آگے کی آیات سے واضح ہوگا، قرینِ عقل ہے۔ لیکن مصالح کا اصل جاننے والا خدائے علیم و حکیم ہی ہے۔ بسا اوقات آدمی نیک نیتی سے ایک رائے قائم کرتا ہے لیکن اس میں اس کے نفس کی کوئی کمزوری بھی چھپی ہو سکتی ہے جس تک اس کی نظر نہیں پہنچتی۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کی کمزوریوں پر متنبہ فرمایا ہے تاکہ اس امت کے ہراول دستہ کا ہر عمل بعد والوں کے لیے نمونہ ہو۔

اِنْ يَّثْقَفُوْكُمْ يَكُوْنُوْا لَكُمْ اَعْدَآءً وَّيَبْسُطُوْٓا اِلَيْكُمْ اَيْدِيَهُمْ وَاَلْسِنَتَهُمْ بِالسُّوْٓءِ وَوَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ (۲)

کفار کے عناد کا حال

یعنی تم تو ان سے دوستی کے خواہشمند ہو لیکن ان کے دلوں میں تمھارے خلاف ایسا عناد بھرا ہوا ہے کہ اگر وہ تم پر کہیں قابو پا گئے تو نہ دست درازی سے باز رہیں گے نہ زبان درازی سے بلکہ ان کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ تمھیں مرتد کر کے چھوڑیں۔ یہی بات سورۂ توبہ میں اس طرح بیان ہوئی ہے: وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً (التوبۃ - ۹ : ۸) (اگر وہ تم پر قابو پا گئے تو پھر تمھارے معاملہ میں نہ وہ قرابت کا پاس کریں گے نہ کسی عہد کا) مطلب یہ ہے کہ تمھارے ساتھ ان کی دشمنی من حیث الجماعت ہے اور اس میں وہ اتنے سخت ہیں کہ کسی رشتہ و قرابت یا کسی عہد و پیمان کا لحاظ کرنے والے نہیں ہیں تو ان سے کسی نیکی کی توقع نہ رکھو بلکہ تمھارے لیے بھی صحیح رویہ یہی ہے کہ ان سے موالات کی ہر خواہش سے دست بردار ہو جاؤ۔

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ

وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ (۳)

قیامت میں رشتے کام نہیں آئیں گے

'ارحام' یہاں 'قرابات' یعنی رشتے ناتے کے مفہوم میں ہے۔ یہ تنبیہ ہے کہ جو لوگ دینی تقاضوں کے مقابل میں اپنے رشتوں ناتوں کو زیادہ اہمیت دیں گے وہ یاد رکھیں کہ یہ چیزیں قیامت میں کام آنے والی نہیں ہیں۔ اس دن اللہ تعالیٰ اس طرح کے تمام رشتہ داروں کے درمیان جدائی ڈال دے گا۔ اس دن کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:

وَلَا یَسْـَٔلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا ۝ یُّبَصَّرُوْنَھُمْ ۭ یَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ یَفْتَدِیْ مِنْ عَذَابِ یَوْمِىِٕذٍۭ بِبَنِیْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیْهِ ۙ وَفَصِیْلَتِهِ الَّتِیْ تُــْٔوِیْهِ ۙ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۙ ثُمَّ یُنْجِیْهِ ۙ (المعارج - ۷۰: ۱۰-۱۴)

اور اس دن کوئی دوست کسی دوست کا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم کی تمنا یہ ہوگی کاش! اس دن کے عذاب سے وہ اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس خاندان کو جو اس کی پناہ گاہ رہا ہے اور تمام اہلِ زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچالے۔

یہی حقیقت سورۂ عبس میں یوں واضح فرمائی گئی ہے:

یَوْمَ یَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِیْهِ ۙ وَاُمِّهٖ وَاَبِیْهِ ۙ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِیْهِ ۭ (عبس - ۸۰: ۳۴-۳۶)

اس دن کو یاد رکھو جس دن آدمی اپنے بھائی، اپنے ماں باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔

اسی قسم کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہی تنبیہ سورۂ توبہ میں یوں فرمائی گئی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَکُمْ وَاِخْوَانَکُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْکُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ ۭ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ مِّنْکُمْ فَاُولٰٓىِٕکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ کفر کو ایمان پر ترجیح دیتے ہیں اور جو تم میں سے ان کو دوست بنائیں گے تو وہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ کہہ دو، اگر تمھارے باپ، تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی، تمھاری بیویاں، تمھارا خاندان، تمھارا وہ مال جو تم نے کمایا، وہ کاروبار جس کی کساد بازاری کا تمھیں اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمھیں پسند ہیں۔ تمھارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں

فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (التوبة - ۹: ۲۳-۲۴)

جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرے گا۔

آیت زیر بحث میں 'یَوْمَ الْقِيٰمَةِ' اس خوبصورتی سے بیچ میں آیا ہے کہ وہ آگے اور پیچھے آنے والے دونوں فعلوں کا ظرف بن گیا ہے۔

'وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ' یہ ایک دوسری تنبیہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہو کہ جو کچھ تم چھپا کر کرنے کی کوشش کر رہے ہو یہ اللہ سے بھی چھپا رہے گا۔ اللہ سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں رہتی۔ تمھارا ہر عمل اس کی نگاہوں میں ہے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰۗؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۡ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاۗءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ۭ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (۴)

اسوۂ ابراہیمی کی پیروی کی تلقین

فرمایا کہ اس معاملے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے تمھیں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے جدِّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی زندگی میں تمھارے لیے بہترین قابلِ تقلید نمونہ پہلے سے موجود ہے۔ 'قَدْ كَانَتْ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے بلکہ پہلے سے تمھارے سامنے ہے۔ یہ امر واضح رہے کہ اہلِ عرب کو اس بات پر ناز تھا کہ وہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد ہیں۔ انھیں ان کی ہجرت اور قربانی کی روایات کا بھی علم تھا۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے ان پر گرد و غبار کی تہیں بھی جم گئی تھیں اور بدعات نے ان کے بعض پہلوؤں کو مسخ بھی کر دیا تھا تاہم یہ بات نہیں تھی کہ وہ ان سے بالکل ہی ناآشنا ہوں، جیسا کہ بعض مورخین نے گمان کیا ہے۔

'وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ' سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ہجرت فرمائی ہے تو تنہا نہیں ہجرت فرمائی ہے بلکہ ان کی قوم کے کچھ لوگ جو ان پر ایمان لائے تھے، اس ہجرت میں ان کے ہم رکاب تھے۔

حضرت ابراہیمؑ کا اعلانِ براءت

'اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ ..... الاٰية' یہ اس اعلانِ براءت کا حوالہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم کے سامنے کیا۔ انھوں نے ڈنکے کی چوٹ ان کو سنایا کہ ہم تم سے اور تمھارے ان تمام معبودوں سے، جن کو اللہ کے سوا تم پوجتے ہو، بالکل بری ہوئے۔ تمھارے مسلک و مذہب کا ہم نے انکار کیا اور اس اعلانِ براءت کے بعد ہمارے اور تمھارے درمیان دشمنی اور نفرت اس وقت تک کے لیے

آشکارا ہو گئی جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ۔

وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ۔ یعنی اب تک تو ہم نے تمہارے ساتھ اس لیے رعایت برتی کہ تمھیں دین کی دعوت پہنچا دیں لیکن اب جب کہ تم پر حجت قائم ہو چکی ہے اور تم اپنی ضلالت پر اڑے ہوئے ہو، ہم تم سے اعلانِ براءت کر کے الگ ہو رہے ہیں۔ اب تمہارے ساتھ ہمارا تعلق کھلم کھلا عداوت ہی کا رہے گا الّا آنکہ تم اپنے شرک سے تائب ہو کر توحید کی دعوت قبول کر لو۔

إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ۔ عام طور پر ہمارے مفسرین نے سمجھا ہے کہ یہ اسوۂ حسنہ سے استثناء ہے لیکن ہمارے نزدیک یہ اعلانِ براءت سے استثناء ہے۔ یعنی اس کھلم کھلا اعلان براءت میں اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے ساتھ کوئی رعایت برتی تو صرف یہ کہ اپنے باپ سے انھوں نے یہ وعدہ کر لیا کہ میں آپ کے لیے اپنے رب سے مغفرت کی دعا کروں گا اگرچہ میں خدا کی طرف سے آپ کے معاملہ میں کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ یعنی ہو گا تو وہی جو اللہ تعالیٰ چاہے گا تاہم میں دعا کروں گا۔

اس رعایت کی وجہ، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات میں تصریح ہے، یہ تھی کہ وہ نہایت دردمند اور بردبار تھے، انھوں نے خیال فرمایا کہ اگر وہ اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں تو یہ چیز اس اعلان براءت کے منافی نہیں ہو گی جو وہ اپنی پوری قوم سے کر رہے ہیں بلکہ یہ اس برّ و احسان کا مقتضٰی ہے جو ہر بیٹے پر اس کے والدین کا ایک واجبی حق ہے۔ اس وقت تک ان کو یہ اندازہ بھی پورا پورا نہیں تھا کہ دین کے ساتھ باپ کی دشمنی کس درجے کی ہے۔ انھوں نے خیال فرمایا کہ باپ کا سارا غصہ اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے زعم کے مطابق اپنے بیٹے کو ایک گمراہی سے بچانا چاہتا ہے لیکن جب ان پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ان کا باپ اللہ کے دین کا کٹر دشمن ہے تو انھوں نے اس سے کلیۃً اعلانِ براءت کر دیا۔

وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وعدۂ مغفرت کے ساتھ ہی توحید کی اصل حقیقت بھی واضح فرما دی کہ مجھے جو اختیار حاصل ہے صرف اتنا ہی ہے کہ میں تمہارے لیے مغفرت کی دعا کروں۔ رہا تمھارا بخشا جانا یا نہ بخشا جانا تو یہ کلیۃً اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے۔ اس معاملے میں مجھے کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ امر بیان واضح رہے کہ کسی کے لیے استغفار اس کے حق میں ایک قسم کی سفارش ہے۔ اس سفارش کے معاملے میں جب حضرت ابراہیم خلیل اللہ جیسے جلیل القدر پیغمبر اپنی اس بے اختیاری کا اظہار فرماتے ہیں تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ۔ اس دعا کا تعلق اعلانِ براءت سے ہے۔ بیچ میں إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ کا ٹکڑا جملۂ معترضہ کے طور پر آ گیا تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی وہ دعا نقل ہوئی ہے جو اس نازک موقع پر حضرت ابراہیم اور ان کے ساتھیوں نے کی ہے۔ دوسرے مقامات میں

مرحلہ ہجرت کی دعا

ہم اس حقیقت کی وضاحت کر چکے ہیں کہ اعلانِ براءت کے بعد لازماً پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کے لیے ہجرت کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ یہ مرحلہ نہایت کٹھن ہوتا ہے۔ اپنی پوری قوم سے ابدی دشمنی اور بیزاری کا اعلان کر کے الگ ہو جانا کوئی سہل بازی نہیں ہے اس وجہ سے ہر رسول نے اپنی ہجرت کے وقت اپنا اور اپنے ساتھیوں کا معاملہ اپنے رب کے حوالے کیا ہے۔ ہجرت کے وقت اسی طرح کی دعا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی فرمائی اور اسی طرح کی دعا ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے۔ یہ دعا اس حقیقت کو ظاہر کرتی ہے کہ بندے کا نیک سے نیک ارادہ بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی سے انجام پاتا ہے اس وجہ سے ہر قدم اسی کی مدد کے بھروسے پر اٹھانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کی آزمائشوں میں وہی سرخ رو ہوتے ہیں جن کے دل ہر وقت اس کی طرف جھکے رہتے ہیں اور جن کے اندر یہ یقین راسخ ہوتا ہے کہ بالآخران کو ایک دن اپنے رب ہی کی طرف پلٹنا ہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۵)

یہ بھی اسی دعا کا حصہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔ 'فِتْنَةً' یہاں ہدفِ فتنہ کے معنی میں ہے اور اس سے مراد کفار کی وہ اذیتیں ہیں جو مسلمانوں کو وہ پہنچا سکتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو تیری توحید کی غیرت و حمیت میں ان مشرکوں سے اعلانِ براءت و عداوت کر دیا۔ اب ان کی طرف سے جو کچھ پیش آئے ہم اس کے لیے سینہ سپر ہیں۔ لیکن ہمارا بھروسہ تیری مدد پر ہے۔ ان کو اتنی ڈھیل نہ دینا کہ وہ ہم کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنا لیں۔

'وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا'۔ اے ہمارے رب ہماری کمزوریوں اور ہمارے گناہوں کو بخش۔ ہمارے گناہ اس بات کا سبب نہ بن جائیں کہ ہمارے دشمن ہمیں کمزور پا کر اپنی ستم رانیوں کا ہدف بنا لیں۔ اس فقرے میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ہمیں کوئی آزمائش پیش آئی تو وہ ہمارے اپنے ہی اعمال کی پاداش میں پیش آئے گی اور تیرے اختیار میں سب کچھ ہے۔ تو ہمارے گناہوں کو بخش دے تو ہم ان کے وبال سے بچ جائیں گے۔

'اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'۔ یہ کامل تفویض کا کلمہ ہے۔ تو ہر چیز پر غالب ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔ کوئی تیرا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ ساتھ ہی تو حکیم بھی ہے۔ تیرا ہر کام حکمت پر مبنی ہوتا ہے اس وجہ سے ہم اپنا معاملہ کلیتہً تیرے حوالے کرتے ہیں۔ تو جو کرے گا اسی میں خیر اور اسی میں حکمت و مصلحت ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۶)

ایک برمحل تنبیہ

یہ 'قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ' سے بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اس اعلانِ براءت و عداوت میں نمونہ تو بے شک نہایت بہترین

ہے لیکن ان کے اس اسوہ کی پیروی کرنا ہر بوالہوس کا کام نہیں ہے۔ اس کا حوصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اللہ کی نصرت کی امید بھی رکھتے ہوں اور آخرت کے ظہور کے بھی متوقع ہوں۔ جن کے اندر یہ دونوں باتیں راسخ نہ ہوں وہ یہ بازی نہیں کھیل سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے گھر در، اموال واملاک، وطن اور قوم ہر چیز سے دست بردار ہو کر اٹھ کھڑے ہونا صرف انہی کے لیے ممکن ہے جو اپنے اس اقدام میں ہر قدم پر خدا کی نصرت کے متوقع ہوں اور جن کا اصل بھروسہ اس دنیا کے مال ومتاع پر نہیں بلکہ آخرت کے فضل وانعام پر ہو۔

اس آیت سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آ گئی کہ ہجرت کی راہ میں اصل زادِ راہ کیا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جن لوگوں سے اس مرحلے میں کمزوریاں صادر ہو رہی تھیں ان کی کمزوریوں کی تہ میں کیا چیز چھپی ہوئی تھی۔

'وَمَنۡ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ'۔ یہ ان لوگوں کو تنبیہ ہے کہ فلاح کا راستہ یہی ہے کہ تم ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اسوہ کی پیروی کرو ورنہ یاد رکھو کہ جو اس سے اعراض کریں گے اللہ کو ان کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اللہ کسی کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہ سب سے مستغنی اور خود اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔ اس کی خدائی دوسروں کے بل پر نہیں بلکہ خود اس کے اپنے بل پر قائم و دائم ہے۔

عَسَی اللّٰہُ اَنۡ یَّجۡعَلَ بَیۡنَکُمۡ وَبَیۡنَ الَّذِیۡنَ عَادَیۡتُمۡ مِّنۡہُمۡ مَّوَدَّۃً ؕ وَاللّٰہُ قَدِیۡرٌ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ (۷)

ایک عظیم بشارت

یہ ایک بہت بڑی بشارت ہے کہ آج اگر تم جی کڑا کر کے اپنے ان اقرباء سے اپنی دشمنی کا اعلان کر دو گے تو یہ نہ خیال کرو کہ یہ دشمنی ہمیشہ دشمنی ہی رہے گی بلکہ امکان اس کا بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دشمنی کو محبت سے بدل دے اور جن سے آج تمہیں عداوت کرنی پڑ رہی ہے وہ ایمان و اسلام کی توفیق سے بہرہ مند ہو کر تم سے گلے ملیں۔

'وَاللّٰہُ قَدِیۡرٌ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ'۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہ چاہے تو جانی دشمنوں کو جگری دوست بنا دے۔ اور اللہ غفور رحیم ہے۔ وہ لوگوں کو عذاب میں ڈالنے کے بہانے نہیں ڈھونڈتا بلکہ مغفرت و رحمت سے نوازنے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ اس کے کٹر سے کٹر دشمنوں سے متعلق بھی یہ گمان نہیں رکھنا چاہیے کہ وہ ہمیشہ دشمن ہی رہیں گے، کیا عجب اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے لیے بھی توفیقِ خیر کی راہ کھول دے۔

یہاں 'غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ' کی صفت کے حوالے میں بشارت کا یہ پہلو بھی ہے کہ اب تک جو لوگ اللہ کے ان دشمنوں سے خفیہ روابط رکھتے ہیں اس تنبیہ کے بعد اگر وہ چوکنے ہو گئے اور اپنی روش کی انھوں نے اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ ان کی ان کمزوریوں کو معاف کر دے گا۔

ہجرت کا ایک نفسیاتی پہلو

اس آیت میں اہل مکہ کے قبولِ ایمان کی جو بشارت ہے اس کی ایک خاص نفسیاتی وجہ بھی ہے جو

یہاں ملحوظ رکھنے کی ہے۔ وہ یہ کہ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کے بہت سے بھائی بہن، عزیز قریب محض دین کی خاطر اپنے گھر در، اپنے اہل و عیال اور اپنا سب کچھ چھوڑ کر ان سے جدا ہو رہے ہیں درآنحالیکہ یہ لوگ ہر اعتبار سے ان کے اندر کے بہترین اشخاص تھے تو وہ سوچنے لگ گئے کہ اس دعوت کا مقابلہ ظلم و تعدی سے کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ ہمیں خود اپنے رویّے کا جائزہ لینا چاہیے۔ شاید اسی کتاب میں یا اپنے کسی اور مضمون میں ہم نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ جیسے عظیم شخص کو جس چیز نے سب سے پہلے اسلام کی طرف مائل کیا وہ کچھ مظلوم مردوں اور عورتوں کی حبشہ کی طرف ہجرت ہے۔ ہجرت کا یہ اثر ہر حسّاس مرد اور عورت پر پڑنا لازمی تھا چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہجرت کے بعد قبولِ اسلام کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ اس عمل کو اپنی فطری رفتار پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مہاجرین میں سے کوئی گروہ اہلِ مکّہ کے آگے اپنی کمزوری کا اظہار نہ کرتا۔ اگر ان کی طرف سے کسی کمزوری کا اظہار ہوتا تو اہلِ مکّہ یہ خیال کرتے کہ مسلمان ہجرت تو کر گئے لیکن اب وہ اپنے اقدام پر پچھتا رہے ہیں اور ہم سے دوستانہ و نیازمندانہ روابط قائم کرنے کے خواہش مند ہیں۔ یہ چیز ان کے اندر بھی اسلام کے احساس کو دبا دیتی اور مکّہ میں گھرے ہوئے دوسرے مظلوم مسلمانوں کے حوصلے بھی پست کر دیتی۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کمزوری پر شدّت سے گرفت کی اور لوگوں کو متنبّہ کیا کہ دین کے دشمنوں کے ساتھ دوستانہ روابط نہ بڑھاؤ۔ آج اگر کفر میں لتھڑے ہوئے لوگوں کو سینے سے لگاؤ گے تو یہ تمھارے لیے موجبِ ہلاکت ہوں گے۔ البتہ اگر ان سے دشمنی پر جمے رہے تو توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو مسلمان بنا کر تمھارا دوست بنائے۔ چنانچہ یہ بشارت اللہ تعالیٰ نے پوری کر دی اور فتحِ مکّہ کے وقت خلق نے یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا (النصر - ۱۱۰: ۲) کا منظر اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔

۲- آگے آیات ۸-۹ کا مضمون

آگے اس بات کی وضاحت فرما دی کہ ممانعت جس چیز کی کی جا رہی ہے وہ ان لوگوں سے موالات اور دوستی بڑھانے کی ہے جنھوں نے مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا ہے یا نکالنے والوں کی مدد کی ہے۔ جن لوگوں نے اس طرح کی کوئی زیادتی نہیں کی ہے ان کے ساتھ احسان اور انصاف کرنے کی ممانعت نہیں کی جا رہی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیتیں بعد میں اس وقت نازل ہوئی ہیں جب مذکورہ بالا حکم کی تعمیل میں کفّار کے ساتھ مسلمانوں کا رویّہ غیر معتدل ہو گیا ہے حالانکہ اس طرح کی کوئی بات فرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اوپر کی آیات میں خطاب، جیسا کہ واضح ہوا، ان لوگوں سے ہے جو اہلِ مکّہ سے اپنے روابط قائم رکھنے کے خواہشمند تھے ان کو ایک ہی ساتھ یہ دونوں باتیں بتائی جا سکتی تھیں کہ دین

کے گرد دشمنوں کے ساتھ دوستی بڑھانا تو اس ایمان کے منافی ہے جس کے تم مدعی ہو البتہ جن لوگوں کا رویہ جارحانہ نہیں ہے ان کے ساتھ اگر احسان و عدل کرو تو یہی تمھارے شایان شان ہے۔ آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۸-۹

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ﴿۸﴾ اِنَّمَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰۤی اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹﴾

ترجمۂ آیات ۸-۹

اللہ تمھیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جنھوں نے دین کے معاملے میں نہ تم سے جنگ کی ہے اور نہ تم کو تمھارے گھروں سے نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ ۸

اللہ بس ان لوگوں سے تم کو موالات کرنے سے روکتا ہے جنھوں نے تمھارے ساتھ دین کے معاملے میں جنگ کی ہے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے نکالنے میں مدد کی ہے۔ اور جو اس طرح کے لوگوں سے دوستی کریں گے تو وہ اپنے ہی اوپر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔ ۹

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ (۸)

ممانعت کے حدود کی تعیین

'بِرّ' کی تحقیق سورۂ بقرہ کی آیت ۴۴ کی تفسیر کے تحت گزر چکی ہے[1]۔ اس کے معنی صلۂ رحم، احسان

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد اول، صفحات: ۱۴۳-۱۴۴

اور ادائے حقوق کے ہیں۔ اقساط کے معنی عدل و انصاف کرنے کے ہیں۔ یعنی جس کا جو حق واجب ہے وہ پورا پورا ادا کیا جائے، اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔

فرمایا کہ تمہیں یہ حکم جو دیا گیا ہے کہ لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ (۱) (میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ) تو اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ تم ان کفار کے ساتھ احسان اور عدل بھی نہ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں نہ تم سے جنگ کی اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔ ممانعت جس چیز کی جا رہی ہے وہ، جیسا کہ آگے والی آیت میں تصریح آ رہی ہے، موالات کی ہے نہ کہ عدل و احسان کی اور یہ ممانعت بھی تمام کفار کے حق میں نہیں بلکہ صرف ان کے حق میں ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی اور تم کو جلاوطن کیا۔

'دین' کی قید سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ یہاں زیر بحث وہ نزاعات نہیں ہیں جو خاندانی و قومی مفادات کے تصادم سے آپس میں پیدا ہو جایا کرتی ہیں بلکہ صرف وہ جنگ مراد ہے جو محض دین کی مخالفت میں کفار نے برپا کی اور جس سے مقصود ان کا لوگوں کو اللہ واحد کی بندگی سے روکنا تھا۔ دین تمام اہل ایمان کی مشترک متاع ہے اور اسی پر ان کی نجات و فلاح کا انحصار ہے اس وجہ سے کوئی مسلمان دین کے دشمنوں کے ساتھ دوستی رکھتا ہے تو وہ اپنے دعوائے ایمان میں جھوٹا ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ: یہ انصاف کرنے والوں کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اوپر جب 'بِرّ' اور 'قسط' دو چیزوں کا ذکر آیا ہے تو مناسب تھا کہ یہاں دونوں نیکیوں کے کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی، صرف عدل کرنے والوں ہی کی محبوبیت کا ذکر کیوں آیا؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ صلۂ رحم وغیرہ کے قسم کی نیکیاں نفس پر اتنی بھاری نہیں ہیں جتنی عدل و انصاف کے قسم کی نیکیاں ہیں، بالخصوص جب کہ ان کا تعلق کفار سے ہو۔ کمزوروں کو سہارا دے دینا، محتاجوں کی مدد کر دینا اور اپنے کافر ماں باپ کے ساتھ صلۂ رحم کر دینا زیادہ مشکل کام نہیں ہیں۔ انسانی فطرت کے اندر ان کے لیے نہایت قوی محرکات موجود ہیں لیکن عدل و انصاف کا حق ادا کرنا اور وہ بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان لوگوں کو اپنی محبوبیت کا خاص مقام بخشا جو یہ بازی کھیلیں گے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ قیام عدل و قسط اس امت کی بعثت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔ جو لوگ دوست اور دشمن دونوں کے ساتھ یکساں انصاف کریں گے وہی اس امت کے گل سرسبد ہیں اور وہی اللہ کو محبوب ہیں۔ یہ حق ادا کیے بغیر دوسری نیکیاں بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اِنَّمَا يَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓى اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۹)

روکا کن سے اور کس چیز سے گیا ہے؟

یہ صراحت کے ساتھ بتا دیا کہ اللہ تم کو کن لوگوں سے روکتا ہے اور خاص طور پر کس چیز سے روکا ہے فرمایا کہ روک ان لوگوں سے رہا ہے جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ کی ہے اور تم کو تمھارے گھروں سے نکالا ہے یا تمھارے نکالنے میں تمھارے دشمنوں کی مدد کی ہے اور روک جس چیز سے رہا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ان کو اپنا دوست بناؤ۔ دوست بنانے سے مقصود ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم ملت کے مفاد سے قطع نظر کر کے کسی معاملے میں اپنا دستِ تعاون اس غرض سے ان کو پیش کرو کہ وہ تمھاری کوئی ذاتی غرض پوری کرنے کا ذریعہ بنیں۔

اس آیت پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس میں جو حصر ہے اس کا زور اَنْ تَوَلَّوْهُمْ پر ہے یعنی ممنوع جو چیز ہے وہ 'تولی' یعنی ان کفار کو دوست اور کارساز بنانا ہے نہ کہ ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنا۔ نیکی ایک یک طرفہ عمل ہے۔ اس کا انحصار اس شخص کے رویہ پر نہیں ہوتا جس کے ساتھ نیکی کی جاتی ہے۔ ایک شخص حاجتمند ہے تو ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ہم اس کی مدد کریں، خواہ وہ کافر ہو یا مسلمان۔ اور ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس سے نہ کسی شکریہ کے طالب ہوں نہ کسی صلہ کے 'لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا' (الدھر - ۷۶ : ۹)۔ یہاں تک کہ اگر کسی سبب سے اس کے خلاف ہمارے دل میں عداوت بھی ہو جب بھی ہمارے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ ہم اس کے ساتھ نیکی کریں۔ اس طرح کی نیکی کا ہم کو، جیسا کہ قرآن و حدیث میں تصریح ہے، زیادہ ثواب ملے گا۔

رہا عدل و قسط کا معاملہ تو اس کی بنیاد قانون، معاہدے اور معروف پر ہوتی ہے۔ اس میں کافر و مومن یا دوست و دشمن کے امتیاز کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ قانون اور معاہدے کا جو تقاضا ہو گا وہ بہر حال پورا کرنا ہو گا اس سے بحث نہیں کہ معاملہ دوست کا ہے یا دشمن کا۔ آگے کفار قریش کے ساتھ چند تنازعات کا فیصلہ آ رہا ہے اور اس میں آپ دیکھیں گے کہ کس طرح قرآن نے بے لاگ فیصلہ کیا ہے اور اسی بے لاگ فیصلہ پر عمل کرنے کی مسلمانوں کو تاکید فرمائی ہے۔

'وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ' یعنی اس تنبیہ کے بعد بھی جو مسلمان ان کافروں سے موالات کریں گے وہ یاد رکھیں کہ نہ وہ خدا کا کچھ بگاڑیں گے نہ اسلام کا بلکہ وہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

۴۔ آگے آیات ۱۰-۱۳ کا مضمون

آگے اسی 'لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ' والی ہدایت کی روشنی میں، جو پہلی آیت میں مذکور ہوئی، پہلے مسلمانوں کو یہ ہدایت فرمائی گئی کہ مکہ سے جو عورتیں ہجرت کر کے آئیں، ان کے ایمان و اسلام کی تحقیق کی جائے، مجرد اس بنیاد پر ان کو اپنے اندر شامل نہ کر لیا جائے کہ وہ ان کے پاس آ گئی ہیں

اور ان کے اندر شامل ہونا چاہتی ہیں۔ ہاں، تحقیق سے ثابت ہو جائے کہ ان کی ہجرت فی الواقع دین ہی کی خاطر ہے تب ان کو شامل کیا جائے ورنہ واپس کر دیا جائے۔ اسی طرح مہاجرین میں سے جن کی بیویاں مکہ میں ہیں اور وہ کافرہ ہیں ان کو اپنے عقدِ نکاح میں باندھے رکھنا مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ ان کو آزاد کر دینا چاہیے کہ وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں اور ان کے مہروں کا آپس میں تبادلہ کر لیا جائے۔

دوسری ہدایت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے کہ جو عورتیں بیعت کے لیے آئیں ان سے اسلامی زندگی کے تمام معروفات پر عمل کرنے کی بیعت لی جائے۔ اگر یہ ذمہ داری اٹھانے کا وہ عہد کریں تب ان سے بیعت لی جائے ورنہ نہ لی جائے۔ اسلامی معاشرہ ہر قسم کے لوگوں کی بھرتی کے لیے نہیں ہے۔ اس میں شامل ہونے کا استحقاق صرف انہی کو حاصل ہے جو ایمان و اسلام کے مطالبات پورے کرنے کا عہد کریں۔

معاہدۂ حدیبیہ سے متعلق ایک اہم نزاع کا فیصلہ

یہ ہدایتیں اصلاً تو یہ بتانے کے لیے دی گئی ہیں کہ اسلام کے ساتھ غیر اسلام کا جوڑ خلافِ عقل و فطرت ہے جس کی جانچ پرکھ تعلقات کے ہر گوشے میں ہونی چاہیے تاکہ نفاق کی کوئی آلائش کہیں باقی نہ رہنے پائے۔ جس طرح مسلمانوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ و رسول کے مخالفوں سے مودّت رکھیں اسی طرح یہ بات بھی ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ مشرکات کے ساتھ کوئی رشتۂ مناکحت رکھیں۔ اگر اب تک اس طرح کا کوئی تعلق قائم رہا ہے تو اب وقت آگیا ہے کہ وہ کاٹ دیا جائے لیکن یہی مسئلہ مقتضی ہوا کہ یہاں ایک نزاع کا فیصلہ بھی کر دیا جائے جو معاہدۂ حدیبیہ سے متعلق قریش اور مسلمانوں میں شروع ہی سے چلی آرہی تھی اور اس دور میں اس نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ اس کا فیصلہ کرنا ناگزیر ہو گیا تھا۔

یاد ہوگا، معاہدۂ حدیبیہ میں ایک اہم دفعہ اس مضمون کی تھی کہ قریش میں سے کوئی شخص مسلمانوں سے جا ملے گا تو اگرچہ وہ اسلام پر ہو لیکن مسلمان اس کو واپس کرنے کے پابند ہوں گے اس کے برعکس کوئی مسلمان اگر قریش سے آملے گا تو وہ اس کو واپس کرنے کے پابند نہ ہوں گے۔ اس دفعہ کے الفاظ کے بارے میں اگرچہ راویوں کے درمیان اختلاف ہے لیکن عروہ، ضحاک، عبدالرحمٰن بن زید، زہری، مقاتل بن حیّان اور سدّی سے جو روایت ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: على انه لا ياتيك منا احد وان كان على دينك الا رددته الينا (یعنی اس شرط پر صلح کی جاتی ہے کہ ہم میں سے (قریش میں سے) کوئی، خواہ وہ آپ کے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے) دین ہی پر ہو، اگر آپ کے پاس چلا جائے گا تو آپ اس کو لازماً واپس کریں گے۔

اس دفعہ کو مسلمانوں نے مردوں کی حد تک تو قبول کر لیا، چنانچہ اسی کی تعمیل میں حضرت ابو جندلؓ نہایت جذبات انگیز حالات میں عین اس وقت واپس کیے گئے جب کہ معاہدہ کی سیاہی ابھی خشک بھی نہیں ہوئی تھی، لیکن عورتوں کے باب میں مسلمانوں نے ان الفاظ کو واضح نہیں تسلیم کیا اور جو شخص بھی عربی زبان سے واقف ہے وہ اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ یہ الفاظ عورتوں کی واپسی کے بارے میں

واضح ہیں بھی نہیں۔

معاہدے کے الفاظ جو اوپر نقل ہوئے ہیں اس میں 'احد' کا لفظ اپنے اندر اگرچہ عموم کا مفہوم رکھتا ہے لیکن غور سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ بعد میں جتنی ضمیریں اور فعل بھی آئے ہیں سب مذکر ہیں، ایسی صورت میں ایک شخص یہ تو کہہ سکتا ہے کہ 'احد' کے عموم میں عورتیں بھی داخل ہیں لیکن کوئی عاقل یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مردوں کی طرح عورتوں کے باب میں یہ الفاظ قطعی ہیں بلکہ اس کے برعکس یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اگر فریقین کا منشا یہ ہوتا کہ عورتوں پر بھی یہ دفعہ قطعی طور پر حاوی ہو تو 'احد' کے بعد 'ذکر کان او انثی' یا اس کے ہم معنی کوئی تصریح ضرور بڑھائی جاتی۔ لیکن جب اس طرح کی کوئی تصریح نہیں بڑھائی گئی درآنحالیکہ معاہدہ کا مزاج اس کا مقتضی تھا تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ معاہدہ کے وقت فریقین کے ذہن میں عورتوں کا مسئلہ نہیں تھا۔

اس اجمال نے قدرتی طور پر مسلمانوں اور قریش کے درمیان ایک قضیہ کی صورت اختیار کر لی اور یہ قضیہ، معلوم ہوتا ہے اس سورہ کے زمانۂ نزول میں زیادہ اہمیت حاصل کر گیا اس لیے کہ بہت سی عورتیں بھی ہجرت کر کے مدینہ پہنچیں اور ضروری ہوا کہ مسلمان اس باب میں کوئی قطعی پالیسی اختیار کریں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایک قطعی فیصلہ صادر فرمایا اور ساتھ ہی یہ تصریح بھی فرما دی کہ 'ذٰلِکُمْ حُکْمُ اللّٰہِ ط یَحْکُمُ بَیْنَکُمْ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ حَکِیْمٌ' (یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمہارے درمیان کر رہا ہے۔ اور اللہ علیم و حکیم ہے)۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے:

آیات ۱۰-۱۳ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ
فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اللَّهُ أَعْلَمُ بِإِيمَانِهِنَّ ۖ فَإِنْ عَلِمْتُمُوهُنَّ
مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَا هُنَّ حِلٌّ لَهُمْ وَلَا
هُمْ يَحِلُّونَ لَهُنَّ ۖ وَآتُوهُمْ مَا أَنْفَقُوا ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ أَنْ
تَنْكِحُوهُنَّ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۚ وَلَا تُمْسِكُوا بِعِصَمِ
الْكَوَافِرِ وَاسْأَلُوا مَا أَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْأَلُوا مَا أَنْفَقُوا ۚ ذَٰلِكُمْ
حُكْمُ اللَّهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (١٠) وَإِنْ فَاتَكُمْ
شَيْءٌ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَآتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ

اَزْوَاجُهُم مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْٓ اَنْتُم بِهٖ
مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱﴾ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ یُبَایِعْنَكَ
عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَیْـًٔا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ وَلَا
یَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ بِبُهْتَانٍ یَّفْتَرِیْنَهٗ بَیْنَ
اَیْدِیْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا یَعْصِیْنَكَ فِیْ مَعْرُوْفٍ فَبَایِعْهُنَّ
وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَدْ یَئِسُوْا مِنَ
الْاٰخِرَةِ كَمَا یَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ ﴿۱۳﴾ ع النصف ۲ ۸

ترجمۂ آیات ۱۰-۱۳

اے ایمان والو! جب تمھارے پاس مسلمان عورتیں ہجرت کرکے آئیں تو ان کی تحقیق کرو، یوں اللہ تو ان کے ایمان سے اچھی طرح واقف ہی ہے، پس اگر تم ان کو مومنہ پاؤ تو ان کو کفّار کی طرف نہ لوٹاؤ، نہ وہ عورتیں ان کے لیے جائز ہیں اور نہ وہ ان عورتوں کے لیے جائز ہیں۔ اور انھوں نے جو کچھ خرچ کیا ہو وہ ان کو ادا کر دو اور تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم ان سے نکاح کر لو بشرطیکہ ان کے مہر ان کو ادا کرو۔ اور کافرہ عورتوں کی عصمتوں پر قابض نہ رہو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا اس کا مطالبہ کرو اور وہ بھی مطالبہ کریں اس کا جو انھوں نے خرچ کیا ہے۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے جو وہ تمھارے درمیان کر رہا ہے اور اللہ علم و حکمت والا ہے۔ ۱۰

اور اگر تمھاری بیویوں کے مہر میں سے کچھ کافروں کی طرف رہ جائے تو جب تمھیں موقع ہاتھ آ جائے تو جن کی بیویاں گئی ہیں ان کو ادا کر دو جو کچھ انھوں نے خرچ

کیا ہے اور اس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ ۱۱

اے پیغمبر، جب تمہارے پاس مومنہ عورتیں اس بات پر بیعت کے لیے آئیں کہ وہ کسی چیز کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں گی اور نہ وہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری کی مرتکب ہوں گی اور نہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے متعلق کوئی بہتان تراشیں گی اور نہ کسی امرِ معروف میں تمہاری نافرمانی کریں گی تو ان سے بیعت لے لو اور اُن کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو، بے شک اللہ غفور رّحیم ہے۔ ۱۲

اے ایمان والو، ان لوگوں سے دوستی نہ کرو جن پر اللہ کا غضب ہوا۔ وہ آخرت سے ناامید ہوئے جس طرح کفّار قبر والوں سے نااُمید ہوئے۔ ۱۳

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ
اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ
لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۭ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ
وَسْـَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔــلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۭ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (١٠)

مکہ سے ہجرت کر کے آنے والی عورتوں سے متعلق تحقیق کی ہدایت

مسلمانوں کو ہدایت فرمائی گئی کہ جو مسلمان عورتیں دارالکفر سے ہجرت کر کے تمہارے پاس آئیں ان کو کفّار کی طرف واپس کرنے کی ذمہ داری تو، جیسا کہ اوپر تمہیدی بحث میں اشارہ گزرا، تم پر نہیں ہے لیکن ان کے کفر و ایمان کی تحقیق کیے بغیر لوں ہی اپنے گھروں میں ان کو مفت کا مال سمجھ کر ڈال لینا بھی جائز نہیں ہے بلکہ ضروری ہے کہ جو عورتیں آئیں ان کے باب میں اچھی طرح تحقیق کر لی جائے کہ فی الواقع ان کی ہجرت اسلام ہی کے لیے ہے یا کوئی اور غرض ان کے اس نقلِ مکان کا سبب

ہوئی ہے۔ اگر تحقیق سے اطمینان ہو جائے کہ ان کی ہجرت اسلام ہی کے لیے ہے تب تو ان کو واپس کرنا جائز نہیں ہے، لیکن یہ اطمینان وہ نہ دلا سکیں تو پھر ان کو رد کرنا بھی جائز نہیں ہے اس لیے کہ اسلامی معاشرہ طیبوں اور طیبات کا معاشرہ ہے، خبیثوں اور خبیثات کا معاشرہ نہیں ہے۔

اس امتحان و تحقیق کی نوعیت حضرت ابن عباسؓ کی ایک روایت سے واضح ہوتی ہے جو اس طرح نقل ہوئی ہے:

سئل ابن عباس کیف کان امتحان رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) النساء قال کان یمتحنھن باللہ ماخرجت من بغض الزوج وباللہ ماخرجت رغبۃ عن ارض الی ارض وباللہ ماخرجت التماس دنیا وباللہ ماخرجت الا حبا للہ ورسولہ۔	ابن عباسؓ سے سوال کیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں کی تحقیق کس طرح فرماتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ آپ قسم لیتے تھے کہ خدا کی قسم وہ شوہر سے بیزار ہو کر نہیں نکلی ہیں، خدا کی قسم محض جگہ کی تبدیلی کے شوق میں نہیں نکلی ہیں، خدا کی قسم کوئی اور دنیوی غرض بھی اس نکلنے کا محرک نہیں ہوئی ہے، خدا کی قسم وہ محض اللہ اور اس کے رسول کی محبت میں نکلی ہیں۔

'اَللّٰہُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِہِنَّ' یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم قسم اور دوسرے قرائن و حالات سے جس حد تک تحقیق کر سکتے ہو کرنے کی کوشش کرو۔ رہی اصل حقیقت تو وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ اگر کوشش کے باوجود تم صحیح نتیجہ تک نہ پہنچ سکے تو عنداللہ تم معذور ہو اور اگر انھوں نے تم کو دھوکا دیا تو یاد رکھیں کہ اللہ ان کے ایمان و کفر سے اچھی طرح آگاہ ہے۔

'فَاِنْ عَلِمْتُمُوْہُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْہُنَّ اِلَی الْکُفَّارِ' یعنی معتبر ذرائع تحقیق سے اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ وہ مومنہ ہیں تو ان کو کفار کے حوالہ نہ کرو، اس لیے کہ نہ وہ کفار کے لیے جائز ہیں اور نہ کفار ان کے لیے جائز ہیں بلکہ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے حرام ہیں۔

منصفانہ فیصلہ — اس حکم سے قرآن نے اس نزاع کا فیصلہ کر دیا جو معاہدۂ حدیبیہ کی دفعہ کے بارے میں پیدا ہو گئی تھی اور غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ فیصلہ نہایت ہی منصفانہ ہے۔ اگر قرآن کا فیصلہ یہ بھی ہوتا کہ از روئے معاہدہ کسی عورت کی بھی واپسی کے مسلمان پابند نہیں ہیں تو یہ بھی بے جا نہ ہوتا۔ یہ محض الفاظ سے فائدہ اٹھانے والی بات ہوتی۔ قرآن نے صرف الفاظ سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ایک ایسا فیصلہ کیا جس کی ایک نہایت محکم عقلی و اخلاقی بنیاد ہے۔ یعنی ان عورتوں کو تو واپس کر دینے کی ہدایت فرمائی جن کی ہجرت اللہ و رسول کے لیے نہیں بلکہ کسی حقیر دنیوی مقصد کے لیے ہو

البتہ جن کا مومنہ ہونا ثابت ہو جائے ان کو واپس کرنے کی اجازت نہیں دی ۔ یہ ایک ایسی اصولی بات ہے جس کا کوئی عاقل انکار نہیں کر سکتا ۔ انسان اپنی ایک عقلی و اخلاقی ہستی رکھتا ہے اس وجہ سے یہ اس کے اوپر صریح ظلم ہے کہ اس کو کسی ایسے معاشرے کے ساتھ بندھے رہنے پر مجبور کیا جائے جس کے اندر اس کا یہ اخلاقی و عقلی تشخص محفوظ نہ رہ سکے ۔ بالخصوص عورتیں جنس ضعیف ہونے کے سبب سے اور بھی حق دار ہیں کہ ان کا تحفظ کیا جائے ۔

وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۔ یہ ایک اور منصفانہ بات کی ہدایت فرمائی کہ جو مومنہ روکی گئی ہے اگر وہ کسی کافر کی زوجیت میں رہی ہے تو مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے شوہر نے جو مہر اس کو ادا کیا ہے وہ مسلمانوں کی طرف سے اس کو واپس کر دیا جائے ۔ اس کے واپس کیے جانے کی عملی شکل یہی ہوگی کہ اس کی واپسی کا ذمہ دار بیت المال ہوگا ۔ مَّآ اَنْفَقُوْا کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن میاں بیوی کی جدائی کی صورت میں مہر ہی زیر بحث آتا ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ وہی مراد ہے ۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَیْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۔ یعنی ان مراحل کے طے ہو جانے کے بعد اگر کوئی مسلمان ان سے نکاح کرنا چاہے تو وہ بے تکلف کر سکتا ہے ۔ بشرطیکہ وہ مہر ادا کرے ۔ یعنی جو مہر سابق شوہر کو دیا گیا ہے اس کے علاوہ عورت کو بھی اس کا مہر دینا ہوگا جو نکاح کرنے والا ادا کرے گا ۔

لَا جُنَاحَ کے الفاظ اس امر کے اظہار کے لیے ہیں کہ جو عورت اس طرح دار الاسلام میں آ کر اسلامی معاشرہ میں شامل ہو گئی اس کے ساتھ نکاح میں یہ چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی کہ وہ دار الکفر میں کسی کے نکاح میں رہی ہے یا اس کے ماں باپ یا دوسرے ۔ ولیاء ہیں جن کی اجازت کی ضرورت ہے ۔ اب وہ اپنے کافر شوہر اور کافر اقرباء کی جملہ پابندیوں سے آزاد اور اسلامی شریعت کے حدود کے اندر اپنی مرضی کی آپ مالک ہو گی ۔

ایک اور نیا فیاضانہ قدم

وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ۔ عِصَم جمع ہے عِصْمَۃ کی ۔ یہ اسی سلسلہ میں اسلام نے ایک اور قدم بھی نہایت فیاضانہ اور بالکل یک طرفہ اٹھایا کہ مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ تم میں سے جن کی بیویاں دار الکفر میں ہیں اور وہ اپنے کفر پر قائم ہیں ان کی عصمتوں کے مالک نہ بنے رہو بلکہ ان کو اپنے نکاح کی قید سے آزاد کر دو ، وہ جس سے چاہیں نکاح کر لیں ۔

وَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْیَسْـَٔلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۔ اس اعلان کے بعد گویا معاملہ کی شکل یہ ہوئی کہ جو عورتیں مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس آ گئی ہیں ان کا نکاح ان کے کافر شوہروں کے ساتھ ختم اور جو عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں تھیں لیکن وہ دار الکفر ہی میں رہ گئیں اور کفر ہی پر قائم ہیں ان کے نکاح مسلمانوں کے ساتھ کالعدم ۔ رہا ان کے مہروں کا معاملہ تو ان کا مبادلہ اجتماعی طور پر کر لیا جائے ۔

مسلمانوں نے جو مہر اپنی کافر بیویوں کو دیے وہ کفّار مسلمانوں کو واپس کر دیں اور کفّار نے جو مہر اپنی ان بیویوں کو دیے جو مسلمان ہو گئیں ان کے مہر مسلمان کفّار کو واپس کریں۔

ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۖ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ یہ آخر میں واضح فرمادیا کہ یہ اس نزاع کا فیصلہ ہے جو عورتوں کی واپسی سے متعلق، معاہدۂ حدیبیہ کی تشریح میں، تمہارے اور قریش کے درمیان ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن نے قریش کے اس مطالبہ کو تو تسلیم نہیں کیا کہ معاہدہ کی رُو سے مسلمانوں پر ان عورتوں کی واپسی لازمی ہے جو ہجرت کر کے ان کے پاس جائیں البتہ اس نزاع کا ایک معقول، مبنی بر انصاف اور جامع فیصلہ ایسا کر دیا جس سے اس وقت کی ایک بہت بڑی اجتماعی الجھن بھی دور ہو گئی اور آئندہ ابھرنے والے بعض جھگڑوں کا بھی سدّباب ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہے اس وجہ سے بندوں کو چاہیے کہ اس کے فیصلوں پر اعتماد کریں۔

وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (۱۱)

عَاقَبْتُمْ کے معنی ہیں کہ صادفت العقبیٰ لکم یعنی پھر تمہاری باری آگئی یا تمھیں موقع مل گیا۔

بدلے کی ایک منصفانہ شکل

مطلب یہ ہوا کہ اگر کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ کفار کی طرف سے وَاسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْئَلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا کے اصول کی خلاف ورزی ہو، وہ کسی ایسی عورت کا مہر واپس نہ کریں جو اس کے مسلمان شوہر نے اس کو دیا، تو اس صورت میں مسلمانوں کو حق ہوگا کہ اگر ان کو کسی عورت کا مہر کفار کو ادا کرنا ہے تو ان کو ادا کرنے کے بجائے اپنے اس بھائی کو ادا کر دیں جس کی چلی جانے والی بیوی کا مہر واپس نہیں ہوا۔ یہ گویا بدلہ لینے کی ایک منصفانہ اور مبنی بر عدل کارروائی ہوئی جس کی اجازت اس لیے دی گئی کہ ایک فریق نے ناانصافی کی راہ اختیار کی۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ۔ یہ اس اجازت سے فائدہ اٹھانے میں خاص احتیاط کی تاکید فرمائی کہ دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرنے میں اپنے اس اللہ سے ڈرتے رہو جس پر ایمان لائے ہو۔ بلا کسی وجہ معقول کے نہ کوئی انتقامی اقدام کرنے کے بہانے ڈھونڈے جائیں نہ اپنے واجبی حق سے زیادہ کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۲)

عام عورتوں سے متعلق ایک احتیاطی ہدایت

اور جس طرح مہاجرات کے امتحان کی ہدایت فرمائی اسی طرح اس آیت میں یہ ہدایت فرمائی کہ جو عورتیں اسلام میں داخل ہونے کے لیے آئیں وہ بھی یوں ہی داخل نہ کرلی جائیں بلکہ ان سے اسلام کے تمام معروفات کی پابندی کے ساتھ ساتھ خاص طور پر ان برائیوں سے بچتے رہنے کا اقرار لیا جائے جو جاہلی معاشرے میں عام رہی ہیں تاکہ اسلامی معاشرہ میں ان برائیوں کے جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔

یہاں یہ امر واضح رہے کہ یہ ہدایت اس زمانے میں فرمائی گئی ہے جب مردوں کی طرح عورتوں کے بھی ہجوم کے ہجوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیعت کے لیے آنے لگے ہیں اور ان میں بہت سی عورتیں ان طبقات سے تعلق رکھنے والی بھی ہوتیں جن کا اخلاقی معیار زمانۂ جاہلیت میں بہت پست تھا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ ان کو برائیوں سے بچتے رہنے کی خاص طور پر تاکید کی جائے تاکہ جس نئے معاشرے میں وہ داخل ہو رہی ہیں اس کی خصوصیات سے ان کو آگاہی ہو اور وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا ارادہ کر کے اس میں داخل ہوں۔ یہاں ان سے جن برائیوں سے بچنے کا اقرار لینے کی ہدایت فرمائی گئی ہے وہ یہ ہیں:

'عَلٰٓی اَنۡ لَّا یُشۡرِکۡنَ بِاللّٰہِ شَیۡـًٔا' یہ کہ وہ کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ تمام دین کی بنیاد توحیدِ خالص پر ہے اس وجہ سے سب سے پہلے شرک سے اجتناب کا اقرار لینے کی ہدایت فرمائی۔ ایک متوسط درجہ کے ذہن کے لیے توحید تک پہنچنے کا آسان راستہ شرک کی نفی ہی کی راہ سے کھلتا ہے۔ اگر شرک سے اجتناب کا شعور نہ ہو تو بہت سے لوگ شرک کی تمام آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے بھی یہ زعم رکھتے ہیں کہ وہ توحیدِ خالص پر ہیں۔

'وَلَا یَسۡرِقۡنَ' دوسری چیز یہ ہے کہ چوری نہ کریں یعنی جس طرح خدا کے حقوق میں کسی قسم کا غلط تصرف ناجائز ہے اسی طرح بندوں کے مال میں بھی بے جا تصرف ناجائز ہے۔

'وَلَا یَزۡنِیۡنَ' تیسری چیز یہ ہے کہ زنا کی مرتکب نہ ہوں۔ زنا اور شرک کی مشابہت کی طرف اس کتاب میں جگہ جگہ ہم اشارے کرتے آ رہے ہیں۔ یہاں اعادے کی ضرورت نہیں ہے۔

'وَلَا یَقۡتُلۡنَ اَوۡلَادَہُنَّ' چوتھی چیز یہ ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی۔ زمانۂ جاہلیت میں قتلِ اولاد کا ارتکاب مشرکانہ توہمات کے تحت بھی ہوتا تھا، اندیشۂ فقر اور بے جا غیرت کے تحت بھی۔ اس زمانے میں اس کے دوسرے محرکات بھی پیدا ہو گئے ہیں جو معروف ہیں۔ یہ ممانعت ان سب پر حاوی ہے۔

'وَلَا یَاۡتِیۡنَ بِبُہۡتَانٍ یَّفۡتَرِیۡنَہٗ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِنَّ وَاَرۡجُلِہِنَّ' پانچویں چیز یہ ہے کہ کسی کے متعلق، خواہ مرد ہو یا عورت، کوئی ایسا بہتان نہ تراشیں جس کا تعلق ان کے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے متعلق ہو۔

'بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِنَّ وَاَرۡجُلِہِنَّ' سے اشارہ میرے نزدیک جنسی اعضاء کی طرف ہے۔ یہ اعضاء ہاتھوں

اور پاؤں کے درمیان ہی ہوتے ہیں۔ ان کی طرف اشارہ کے لیے یہ ایک شائستہ اسلوبِ بیان ہے۔ اس میں پردہ پوشی کے ساتھ پورا احاطہ بھی ہے۔ نہایت مہذب اسلوب سے ان تمام تہمتوں کی طرف اشارہ ہو گیا ہے جو جنسی نوعیت کی ہو سکتی ہیں، مثلاً زنا، تقبیل اور ملامست وغیرہ۔

بہتان لگانا، کسی قسم کا بھی ہو، نہایت سنگین برائی ہے لیکن جس بہتان کا تعلق جنسی امور سے ہو اس کی سنگینی دوچند بلکہ دہ چند ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس طرح کا بہتان اس شخص کی (خواہ مرد ہو یا عورت) حیثیتِ عُرفی پر نہایت خطرناک حملہ ہے جس پر بہتان لگایا گیا ہے۔ اس سے معاشرے کے اندر بسا اوقات ایسے فتنے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کو دبانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ بہتان کوئی مرد لگائے یا کوئی عورت، دونوں ہی کے لیے گناہ ہے اور شریعت میں دونوں ہی کے لیے اس کو جرم قرار دیا گیا ہے لیکن یہاں خاص طور پر عورتوں کو اس سے روکا گیا ہے اس لیے کہ عورتوں کا بہتان اور وہ بھی جنسی نوعیت کا ایک ایسا خطرناک وار ہے جس کا دفاع نہایت مشکل ہے۔

عام طور پر ہمارے مفسرین نے اس ٹکڑے کا یہ مطلب لیا ہے کہ کوئی عورت کسی غیر مرد کے حمل کو اپنے شوہر سے منسوب نہ کرے لیکن اس کو اس قدر محدود کر دینے کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ میں نے اس کے الفاظ کی روشنی میں اس کی وسیع تاویل کی ہے جس کے اندر وہ ساری باتیں آجاتی ہیں جو اس کے تحت آسکتی ہیں۔

وَلَا یَعۡصِیۡنَکَ فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ۔ چھٹی چیز یہ ہے کہ کسی معروف کی تعمیل میں وہ تمھاری نافرمانی نہیں کریں گی۔ 'معروف' یہاں 'منکر' کے مقابل میں ہے۔ اوپر جن جن باتوں کا حوالہ ہے ان سب کا تعلق منکرات کے باب سے ہے، ان میں معروفات یعنی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور عدل و احسان کے قسم کی چیزوں میں سے کسی چیز کا بھی ذکر نہیں آیا ہے۔ اس کی وجہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہ ہے کہ یہ ان عورتوں کی بیعت کا ذکر ہے جو فتحِ مکہ کے دور میں بکثرت اسلام میں داخل ہو رہی تھیں اور جن کے اندر زمانۂ جاہلیت میں یہ برائیاں پائی جاتی تھیں جن کا یہاں ذکر ہے۔ یہ خاص صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ منکرات سے بچتے رہنے کا تو ان سے صراحت و تفصیل کے ساتھ اقرار کرایا جائے اور معروفات سے متعلق آخر میں ایک جامع اقرار لے لیا جائے کہ شریعت کے معروفات میں سے کسی معروف کی تعمیل میں وہ پیغمبر کی نافرمانی نہیں کریں گی۔ شریعت کے معروفات معلوم و مشہور ہیں اس وجہ سے ان کی تفصیل کی ضرورت یہاں نہیں تھی۔

ایک غلط فہمی — بعض لوگوں نے 'فِیۡ مَعۡرُوۡفٍ' کے الفاظ یہاں قید و شرط کے مفہوم میں لیے ہیں اور اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اسلام میں پیغمبر کی اطاعت بھی معروف کی قید سے مقیّد و مشروط ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد! ہمارے نزدیک یہ نکتہ محض ایک نکتۂ بارد ہے۔ پیغمبر نہ کسی منکر کا حکم دیتا ہے نہ

دے سکتا ہے۔ وہ دین کے معاملے میں وہی بات کہتا ہے جو معروف ہوتی ہے اس لیے کہ وہ خدا کی حفاظت میں ہوتا ہے اور اس کی حیثیت حق و باطل کے امتیاز کے لیے ایک کسوٹی کی ہوتی ہے اس وجہ سے اس کے ہر حکم کی اطاعت لازمۂ ایمان ہے۔ جب وہ خود معروف و منکر کے امتیاز کی کسوٹی ہوا تو کسی دوسرے کے لیے اس کی کسی بات کو معروف کے خلاف قرار دینے کے کیا معنی! پیغمبر کے ہاتھ پر بیعت کرنے میں صرف 'تا بہ حدِ استطاعت'، کی قید ہو سکتی ہے اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ بیعت کرنے والوں کو خود یاد دہانی فرما کر یہ قید لگوا دیتے تھے لیکن اس کی اطاعت کے معروف کی قید سے مقید ہونے کی بات بالکل بے معنی ہے۔ البتہ پیغمبرؐ کے خلفاء و امراء کے ہاتھ پر جو بیعت ہوگی وہ 'اطاعت فی المعروف' کی قید سے مشروط ہوگی اس لیے کہ ان سے امکان ہے کہ وہ کوئی ایسا حکم دے بیٹھیں جو معروف کے خلاف ہو۔ چنانچہ رسول کے بعد کسی کی بھی مطلق اطاعت کا عہد کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔

عورتوں سے بیعت لینے کے طریقہ کی وضاحت روایات میں موجود ہے۔ اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں جو حدیثوں میں بیان ہوئی ہیں، البتہ یہ بات مسلّم ہے کہ عورتوں سے بیعت لینے میں حضورؐ نے ان کے ہاتھ کبھی اپنے ہاتھ میں نہیں لیے۔

'فَبَایِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ط اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ'۔ فرمایا کہ جو عورتیں ان تمام منکرات سے بچتے رہنے اور دین کے تمام معروفات کی پابندی کا اقرار کریں ان سے بیعت لو اور ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگو کہ اس سے پہلے ان سے جو غلطیاں صادر ہوئی ہیں وہ ان سے درگزر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے، وہ ان پر رحم فرمائے گا۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ قَدْ یَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا یَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ (۱۳)

آخر میں ابتدائی مضمون کا اعادہ

اس آخری آیت میں اس مضمون کی پھر یاد دہانی ہے جس سے سورہ کا آغاز ہوا ہے۔ قرآن میں ایسی مثالیں بہت ہیں کہ جس مضمون سے سورہ کا آغاز ہوتا ہے اسی پر اس کا اختتام بھی ہوتا ہے۔ یہ چیز قرآن میں نظم کی ایک بہت بڑی شہادت ہے۔

پہلی آیت میں فرمایا ہے: 'یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّیْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِیَآءَ' (اے ایمان والو، میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ) اللہ اور اہل ایمان کے دشمن یہود بھی تھے اور مشرکین قریش بھی، اس سورہ (الممتحنۃ) سے پہلے جو مسبّحات سورتیں گزری ہیں ان میں زیادہ تر یہود کی سازشوں اور ان کے ساتھیوں کا رویّہ زیر بحث آیا ہے اور مسلمانوں کو ان سے دور رہنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ اب اس کی آخری آیت میں دونوں دشمنوں کو جمع کر کے مسلمانوں کو

متنبہ فرمایا کہ نہ ان یہود کی دوستی تمھارے لیے کسی خیر کا باعث ہو سکتی نہ کفار کی۔ یہ دونوں ہی اپنے عقیدے اور عمل کے اعتبار سے ایک ہی سطح کے اور ایک ہی انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ جو ان کا ساتھی بنے گا اس کا حشر بھی وہی ہوگا جو ان کا ہونے والا ہے۔

'قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ' سے ظاہر ہے کہ یہود ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ صفت کی حیثیت سے قرآن میں یہ الفاظ یہود ہی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ پہلی ہی سورہ میں ان کے لیے 'مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ' کی صفت آئی ہے۔

'قَدْ يَئِسُوا مِنَ الْاٰخِرَةِ' یعنی اگرچہ زبان سے یہ آخرت کا اقرار کرتے ہیں لیکن ان کی دنیا پرستی، ان کی ہوس زر اور موت سے ان کا فرار گواہ ہیں کہ یہ آخرت کی توقع نہیں رکھتے۔ اگر یہ آخرت کی توقع رکھتے ہوتے تو یہ ان حرکتوں کے مرتکب نہ ہوتے جن کے مرتکب ہوئے اور اللہ تعالیٰ کی شدید تنبیہات کے بعد بھی ان سے باز نہ آئے۔

'كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ' یعنی جس طرح کفار اب ان مُردوں کے جی اٹھنے سے مایوس ہیں جو قبروں میں پہنچ چکے اور کہتے ہیں کہ 'ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ' (قٓ - ۵۰: ۳) (کیا جب ہم مر جائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے تو دوبارہ زندہ کیے جائیں گے، یہ لوٹایا جانا تو نہایت مستبعد ہے) اسی طرح یہ یہود بھی آخرت سے مایوس ہیں۔ آخرت کے معاملے میں دونوں ایک ہی سطح پر ہیں۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ قرآن نے جگہ جگہ یہود اور کفار کی مشابہت نمایاں فرمائی ہے تاکہ جو مسلمان اہل کتاب ہونے کی بنا پر ان سے کسی حسن ظن میں مبتلا تھے ان کی غلط فہمی رفع ہو اور ان پر واضح ہو جائے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے بدتر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ۔

رحمان آباد

۴- مارچ ۱۹۷۸ء

۲۲- ربیع الاول ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۶۱

الصّف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور اس کا خطاب

اس سورہ میں خطاب ان مسلمانوں سے ہے جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چرا رہے تھے۔ ان کو متنبہ فرمایا ہے کہ اگر عہدِ اطاعت میں داخل ہو چکنے کے بعد تمھاری روش یہی رہی تو یاد رکھو کہ تمھارا بھی وہی حال ہو گا جو یہود کا ہوا۔ انھوں نے اطاعت کا عہد کر چکنے کے بعد قدم قدم پر اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ اس کج روی کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل اس طرح کج کر دیے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہدایت سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آخری نبی کی بشارت لے کر آئے اور نہایت کھلے ہوئے معجزات دکھائے تو انھوں نے سارے معجزات کو جادو قرار دیا اور ان کو جھٹلا دیا اور اب وہ اسلام کی مخالفت کے درپے ہیں حالانکہ اسلام، ان کے اور مشرکین دونوں کے علی الرغم، اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب آ کے رہے گا۔

اس کے بعد اس صحیح روش کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جو مسلمانوں کو اختیار کرنی چاہیے اور جو اس عہد کا لازمی تقاضا ہے جو اللہ کے رسول سے انھوں نے کیا ہے۔ ساتھ ہی ان کو اس فتحِ عظیم کی بشارت دی ہے جو مستقبل قریب میں حاصل ہونے والی ہے اگر وہ اس عہد پر مضبوطی سے قائم رہے۔

آخر میں ان کے سامنے ان لوگوں کا نمونہ رکھا ہے جنھوں نے حق کی طرف سبقت اور اس کی تائید و رفاقت کی نہایت اعلیٰ مثال قائم کی اور دعوت دی ہے کہ پیروی کے قابل نمونہ ان کا ہے نہ کہ یہود کا جو ہمیشہ کے لیے اللہ کی ہدایت سے محروم ہوئے۔

ب۔ سابق سورتوں سے تعلق

غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ جس طرح پچھلی مدنی سورتوں میں منافقین کا کردار زیرِ بحث رہا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی انہی کے ایک گروہ کا کردار زیرِ بحث ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ پچھلی سورتوں میں جن منافقین سے بحث ہے وہ اپنے نفس کی داخلی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ خارجی بندھنوں میں گرفتار تھے لیکن اس سورہ اور اس کے بعد کی مدنی سورتوں میں ان منافقین سے بحث ہے جن کی کمزوریاں بیشتر داخلی ہیں۔ مثلاً اس سورہ میں اور اس کے بعد سورۂ جمعہ میں، جو اس کے مثنیٰ کی حیثیت رکھتی ہے، حبِ مال و جان کی بیماری

کی نشان دہی کی گئی ہے اور اس کو ان کے نفاق کا سبب بتایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ان کے علاج کی تدابیر کی نشان دہی بھی فرمائی گئی ہے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) سورہ کی تمہید جس میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے باوجود اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چرا رہے تھے۔ ان کو آگاہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ روش زیادہ مبغوض ہے کہ آدمی وفاداری کا عہد کر چکنے کے بعد اس سے فرار اختیار کرے۔ اس کو محبوب وہ بندے ہیں جو اس کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کی خاطر جب وقت آئے ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح صف بستہ ہو کر سرگرم پیکار ہوں۔

(۵-۹) ایمان و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد سے جی چراتے ہیں وہ درحقیقت یہود کے نقش قدم کے پیرو ہیں۔ وہ اسی انجام سے دوچار ہوں گے جس سے یہود ہوئے۔ انھوں نے اپنے نبی کے ساتھ یہی روش اختیار کی۔ اطاعت کا عہد بڑے جوش و خروش سے کرتے لیکن جب امتحان کا وقت آتا تو بالکل پھسڈی ثابت ہوتے۔ ان کے اس رویّہ کا شکوہ حضرت موسیٰؑ نے بڑے سوز و درد کے ساتھ کیا لیکن وہ اس روش سے باز نہ آئے۔ اس کج روی کی سزا اللہ تعالیٰ نے، اپنی سنت کے مطابق، ان کو یہ دی کہ ان کے دل کج کر دیے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہدایت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ چنانچہ ان کی یہی کج روی حضرت عیسیٰؑ کے معاملے میں بھی ظاہر ہوئی۔ آپ کا ظہور تورات کی پیشین گوئیوں کے مطابق ہوا۔ آپ نے نہایت شاندار معجزے دکھائے اور دنیا کے آخری ہادی کے ظہور کی نہایت واضح الفاظ میں بشارت دی لیکن یہود کے دل اس قدر کج ہو چکے تھے کہ انھوں نے آپ کے سارے معجزات کو جادو کا کرشمہ بتایا اور آپ کی تکذیب کر دی اور اب اپنے جھوٹ اور افترا کے بل پر اسلام کی مخالفت کر رہے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ ساری خاکبازی لاحاصل ہے۔ اسلام اللہ کا نور ہے اس کو یہ اپنے مونہوں کی پھونک سے نہیں بجھا سکتے۔ وہ ان کے اور مشرکین دونوں کے علی الرغم تمام دینوں پر غالب آ کر رہے گا۔

(۱۰-۱۳) کمزور مسلمانوں کو صحیح راہ اختیار کرنے کی تلقین کہ اب یہ تذبذب اور منافقت کی روش چھوڑو۔ اللہ اور اس کے رسول پر سچا اور پکا ایمان لاؤ۔ دین کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرو۔ فوز و فلاح کی راہ یہی ہے بشرطیکہ سمجھو۔ اگر یہ راہ اختیار کرو گے تو آخرت کی فلاح بھی حاصل ہو گی جو اصل کامیابی ہے اور اس دنیا میں بھی اللہ کی اس نصرت اور اس عنقریب ظاہر ہونے والی فتح سے سرفراز ہو گے جس کی تمنا رکھتے ہو۔

(۱۴) آخر میں حضرت عیسیٰؑ کے حواریین کی پیروی کی دعوت ہے۔ ابتدا میں یہود کی تقلید سے روکا ہے۔ یہ آخر میں ان حق پرستوں کی پیروی پر ابھارا ہے جن کی سبقت الی الخیر سے اس نصرتِ دین کی راہ کھلی جو بالآخر اہلِ ایمان کے غلبہ پر منتہی ہوئی۔

سُوْرَةُ الصَّفِّ (۶۱)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيَات: ۱۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اٰيات ۱-۹
سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ① يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ② كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ③ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ④ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ⑤ وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗۤ اَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑥ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰۤى اِلَى الْاِسْلَامِ ۖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ⑦ يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ

الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ
الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ﴿۹﴾ ع ۱ ۹

ترجمۂ آیات ۱ - ۹

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور وہی غالب و حکیم ہے۔ ۱

اے ایمان والو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو جو کرتے نہیں! اللہ کے نزدیک یہ بات زیادہ غصہ کی ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔ اللہ تو محبوب ان لوگوں کو رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صف بستہ ہو کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ ۲-۴

اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے ہم قومو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچاتے ہو حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں تمھارے پاس اللہ کا رسول ہو کر آیا ہوں تو جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے ان کے دل کج کر دیے اور اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کیا کرتا۔ ۵

اور یاد کرو جب کہ کہا عیسیٰ بن مریم نے، اے بنی اسرائیل! میں تمھاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں، مصداق ہوں تورات کی ان پیشین گوئیوں کا جو مجھ سے پہلے سے موجود ہیں اور خوش خبری دینے والا ہوں ایک رسول کی جو میرے بعد آئے گا، اس کا نام احمد ہوگا، تو جب وہ آیا ان کے پاس کھلی نشانیوں کے ساتھ تو انھوں نے کہا کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔ ۶

اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ تہمت باندھے درآنحالیکہ اس کو اسلام کی طرف بلایا جا رہا ہو! اور اللہ ظالموں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ وہ چاہتے ہیں

کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا ان کافروں کے علی الرغم۔ وہی ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو غالب کرے تمام دینوں پر اگرچہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔ ۷-۹

۱- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱)

آیت تسبیح کا آگے کے مضمون سے ربط — یہ آیت تشویق و تحریض کے محل میں بھی ہو سکتی ہے اور اظہار بے نیازی کے محل میں بھی۔ آگے جہاد سے جان چرانے والے منافقین کو ان کی بدعہدی و بزدلی پر ملامت کی گئی ہے۔ اس مضمون سے یہ آیت اپنے مذکورہ دونوں پہلوؤں سے ربط رکھتی ہے۔ اگر تشویق و ترغیب کے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو مطلب یہ ہو گا کہ جس خدا کی تسبیح و بندگی میں اس کائنات کی ہر چیز سرگرم ہے، جو ہر چیز پر غالب اور جس کے ہر کام میں حکمت ہے اس کی راہ میں جہاد سے اگر کوئی جان چرائے تو اس پر حیف ہے!

بے نیازی کے پہلو سے نگاہ ڈالیے تو مطلب یہ ہو گا کہ جب اس کائنات کی ہر چیز اللہ کی تسبیح و بندگی میں لگی ہوئی ہے اور حقیقی غالب و حکیم وہی ہے تو اس کو اس بات کی کیا پروا ہو سکتی ہے کہ کچھ بزدل اس کی راہ میں جہاد سے جان چراتے پھرتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اس سورہ میں 'سَبَّحَ' آیا ہے اور اگلی سورہ میں 'يُسَبِّحُ' ہے۔ ان دونوں اسلوبوں میں یہ فرق ہے کہ ماضی بیانِ واقعہ اور بیانِ حقیقت کے لیے آتا ہے اور مضارع تصویر حال اور استمرار کا فائدہ بھی دیتا ہے۔

'اَلْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ' کی دو صفتوں کا بغیر حرفِ عطف کے بیان اس بات کی دلیل ہے کہ یہ دونوں صفتیں موصوف میں بیک وقت پائی جاتی ہیں۔ یعنی وہ بیک وقت ہر چیز پر غالب و قادر بھی ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت و مصلحت بھی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جو ذات ان صفات سے موصوف ہے اس سے بڑھ کر بھروسہ کے قابل اور کس کی ذات ہو سکتی ہے! بدقسمت ہیں وہ جو ایسی ذات پر بھی بھروسہ نہ کریں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۲-۳)

زبان کے غازیوں کو تنبیہ — خطاب اگرچہ باعتبارِ الفاظ عام ہے لیکن روئے سخن انہی کی طرف ہے جو ایمان و اسلام اور

انفاق و جہاد کے دعوے تو بڑی بلند آہنگی سے کرتے لیکن جب آزمائش کا وقت آتا تو بالکل بزدل ثابت ہوتے۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم اس بات کا دعویٰ ہی کیوں کرتے ہو جو پورا کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے! اگر تمھارا گمان یہ ہے کہ اس زبانی جہاد سے تم کوئی سعادت کی کمائی کر رہے ہو تو یہ خیال بالکل غلط ہے۔ تمھارا یہ رویّہ اللہ کے نزدیک تمھارے لیے موجبِ سعادت نہیں بلکہ مزید غضب کا باعث ہے کہ تم زبان سے تو بڑے غازی ہو لیکن عمل کے اعتبار سے بالکل صفر۔

آدمی کے قول و قرار کی ساری قدر و قیمت اس کی وفاداری و راستبازی میں ہے۔ ایک شخص ایک طالبِ مدد کو پہلے ہی مرحلے میں اگر صاف جواب دے دیتا ہے کہ وہ اس کی مدد نہیں کرے گا تو گو اس کا انکار، اگر وہ مدد کی اہلیت رکھتا ہے، فتوت، ہمدردی اور اسلامی اخوّت کے منافی اور اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ فعل ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ اللہ کے نزدیک مبغوض وہ ہو گا جس نے ایک ضرورت مند کو مدد کا اطمینان تو بڑی فراخ دلی سے دلایا لیکن جب وعدہ پورا کرنے کا وقت آیا تو اس کو دھوکا دیا۔

یہ رویّہ یوں تو ہر شکل میں مکروہ و مبغوض ہے لیکن معاملہ ایک نبی اور اس پر ایمان کے مدّعیوں کا ہو تو اس کی سنگینی اور بڑھ جائے گی۔ جو لوگ ایک نبی کی دعوت قبول نہیں کرتے وہ اللہ کے غضب کے سزاوار ہوتے ہیں اور ان کو سزاوار ہونا چاہیے لیکن ان سے بھی زیادہ اللہ کے غضب کے سزاوار وہ ہیں جو مانے کو تو اس کی ہر بات مان لیں لیکن عمل کسی بات پر بھی نہ کریں یا صرف ان باتوں پر کریں جو ان کے نفس کی خواہشوں کے موافق ہوں اور جب کوئی اہم مرحلہ پیش آئے تو اس وقت چھپتے پھریں۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا رویّہ کھلے ہوئے دشمنوں کے مقابل میں دین کے لیے زیادہ خطرناک ہے اس لیے کہ انھوں نے اپنے کو دوست ظاہر کر کے دین کی دشمنی کی اور اس کی فوج میں بھرتی ہو کر اس کے ساتھ غدّاری کے مرتکب ہوئے۔

ان کے زیادہ معتوبِ الٰہی ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جب ایک مرتبہ انھوں نے دین کو مان لیا تو گویا انھوں نے اس امر کا اعتراف کر لیا کہ یہ چیز ان کے دل کو اپیل کرنے والی اور ان کی سمجھ میں آنے والی ہے۔ اس پہلو سے ان کا معاملہ ان لوگوں سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے جو اس کے مخالف اس بنا پر ہوں کہ ابھی بات ان کی سمجھ میں سرے سے آئی ہی نہ ہو۔ کسی بات کا سمجھ میں نہ آنا بہرحال ایک عذر ہے جس کی بنا پر ایک شخص رعایت کا مستحق قرار پاتا ہے لیکن جو لوگ سمجھ چکنے کا اعتراف کر چکے ہوں اگر وہ اس کے عملی تقاضوں سے گریز اختیار کریں تو اس کا سبب صرف ان کی اخلاقی کمزوری ہی ہو سکتی ہے جو کسی کے لیے بھی کوئی عذر نہیں بن سکتی بلکہ یہ بہر شکل ایک برائی ہے جو اللہ کے غضب اور اس کی نفرت ہی کی موجب ہو گی۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ (۴)

منافقین کی اصلی کمزوری

یہ ان منافقین کی اس کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے جس پر یہ نکیر فرمائی گئی ہے۔ معلوم ہوا کہ ان کی

خاص کمزوری یہ تھی کہ اپنی وفاداری و جاں نثاری کی دھونس جمانے کے لیے وہ جہاد کے ولولہ کا اظہار تو بہت کرتے لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو چھپتے پھرتے تھے۔ سورۂ نساء میں ان کی کمزوری کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلَوٰةَ وَآتُوا الزَّكَوٰةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ (النسآء - ۴ : ۷۷)

تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ روکو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ دو (تو وہ جنگ کے لیے جلدی مچاتے تھے) لیکن جب جنگ ان کے اوپر فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈر رہا ہے جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

سورۂ توبہ میں انہی لوگوں کو ان الفاظ میں ملامت فرمائی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ (التوبۃ - ۹ : ۳۸)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تمھیں حکم دیا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھو تو تم زمین پر ڈھیلے پڑتے ہو۔

ان لوگوں کی بزدلی کا حال یہ تھا کہ اگر بارے باندھے جنگ کے لیے نکلتے بھی تو صف بستہ اور سینہ سپر ہو کر لڑنے کا حوصلہ نہ کرتے بلکہ ان کی کوشش برابر یہ ہوتی کہ کسی طرح جنگ کے خطرہ سے اپنے کو محفوظ رکھیں۔ سورۂ توبہ میں ان کی اس بزدلی کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے:

لَوْ يَجِدُونَ مَلْجَأً أَوْ مَغَارَاتٍ أَوْ مُدَّخَلًا لَّوَلَّوْا إِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُونَ ○ (التوبۃ - ۹ : ۵۷)

اگر وہ پا جائیں کوئی پناہ گاہ، یا غار یا کوئی گھس بیٹھنے کی جگہ تو وہ رسی تڑا کر اسی کی طرف بھاگیں گے۔

ان لوگوں کی انہی کمزوریوں کو سامنے رکھ کر فرمایا کہ تم نے محض زبانی جمع خرچ سے اللہ کو خوش کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے یہ اس کو خوش کرنے کے بجائے اس کے قہر و غضب میں مزید اضافے کا موجب ہوگا۔ اللہ ان لوگوں کو کبھی پسند کرنے والا نہیں ہے جو ڈینگیں تو بہت ماریں لیکن قربانی کا کوئی حوصلہ اپنے اندر نہ رکھتے ہوں۔ وہ محبوب انہی لوگوں کو رکھتا ہے جو میدانِ جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔

'بُنْيَانٌ' عمارت کو کہتے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد دیوار ہے۔ دیوار کی ایک اینٹ بھی اگر اپنی جگہ سے کھسک جائے تو پھر پوری دیوار کو اکھاڑ پھینکنا آسان ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے

سورۂ انفال میں تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص منظم فوج کشی کی صورت میں صف سے اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگتا ہے تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹتا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے: 'فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ' (الانفال - ۸: ۱۶) (تو وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹا، اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت ہی برا ٹھکانا ہے)۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ؕ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۵)

منافقین کی روش کی مثال

منافقین کی اس روش کے انجام کو مثال سے واضح فرمایا ہے کہ یہی روش یہود کی رہی ہے۔ وہ جہاد کے لیے جوش و جذبہ کا اظہار تو بہت کرتے لیکن جب امتحان کا وقت آتا تو ڈگ ڈال دیتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب انھیں فلسطینیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو وہ یہ جواب دے کر بیٹھ رہے کہ یہ بڑے زور آور لوگ ہیں، ہم ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں، آپ اپنے رب کے ساتھ جا کر ان سے لڑو، ہم تو جب تک وہ اس شہر کو خالی نہیں کریں گے اس میں داخل ہونے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

ان کی یہی روش اس جنگ کے معاملے میں بھی رہی جس کا ذکر سورۂ بقرہ میں ہوا ہے کہ جہاد کے لیے قائد کا انتخاب تو انھوں نے حضرت سموئیلؑ سے بڑے جوش و خروش سے کرایا لیکن جب قائد کا انتخاب ہو گیا تو اس کی قیادت میں جنگ سے انھوں نے انکار کر دیا۔

تورات کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ایک موقع بھی ایسا نہیں گزرا ہے جب انھوں نے پوری خوش دلی سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اطاعت کی ہو۔ ان کی اس روش پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بار بار نہایت دل سوزی کے ساتھ اپنے غم و غصہ کا اظہار بھی فرمایا ہے اور نہایت سخت الفاظ میں ان کو ملامت بھی کی ہے لیکن آخر وقت تک ان کی روش میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ ان کے دل کی سختی بڑھتی ہی گئی۔

'يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ'۔ یہ حضرت موسیٰؑ کے انہی شکووں کا حوالہ ہے جو اپنی قوم کی بدعہدیوں اور نافرمانیوں پر انھوں نے بار بار کیے ہیں اور جن سے تورات بھری پڑی ہے۔ یہود کو حضرت موسیٰؑ کی نبوت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ انھیں اچھی طرح علم تھا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اس کے باوجود محض اپنی پست ہمتی، دنیا طلبی اور دناءت کے سبب سے، یہ جانتے ہوئے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، ان کی برابر نافرمانی کرتے رہے۔

'فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ'۔ یہ وہ سزا ہے جو اللہ تعالیٰ نے، اپنی سنت کے مطابق، ان کو دی کہ بار بار کی تنبیہ و تذکیر کے بعد بھی انھوں نے اپنے دل کے رخ کو سیدھا نہیں کیا تو اللہ نے

ان کے دل کو اسی رخ پر کج کر دیا جس کو انھوں نے اپنے لیے پسند کیا۔ انسانی طبیعت کا یہ خاصہ ہے کہ آدمی اسے جس رخ پر لگائیے اسی رخ پر لگ جاتی ہے۔ اگر اس کو آپ عقل و فطرت کے خلاف کسی غلط رخ پر موڑیں گے تو وہ شروع شروع میں اس پر مڑنے سے اِبا کرے گی لیکن آپ اسے موڑنے پر بضد رہیں گے تو بالآخر اسی سانچہ پر وہ ڈھل جائے گی۔

ہدایت و ضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی

ہدایت و ضلالت کے معاملے میں انسان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اس کی طبیعت کے اسی اصول کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو ہدایت پر مجبور کرتا نہ ضلالت پر۔ اس نے انسان کے اندر نیکی اور بدی کا شعور دے کر اسے آزادی بخشی ہے کہ چاہے وہ نیکی کی راہ اختیار کرے یا بدی کی۔ اگر وہ نیکی کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس کو اس کی توفیق ارزانی فرماتا ہے اور اگر وہ بدی کی راہ پر جانا چاہتا ہے تو وہ اس کو اس کی ڈھیل بھی دے دیتا ہے، اگر چاہتا ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ نہیں ہے کہ کوئی پسند تو کرے ضلالت لیکن وہ اس کے اندر زبردستی ہدایت ٹھونسے۔ ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اس کی قدر کرتا اور اس کا طالب بنتا ہے۔

یہ ان منافقین کو، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، تنبیہ فرمائی گئی ہے کہ تم بھی یہود کی اسی روش کی پیروی کرو گے تو تمہارے دل بھی اسی طرح کج کر دیے جائیں گے جس طرح ان کے دل کج کر دیے گئے۔ پھر تم ہمیشہ غلط رخ ہی پر چلو گے، صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے۔

وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ۭ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (۶)

دل کی کجی کے اثرات جو بعد میں ظاہر ہوئے۔

اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ یہ ان کے دل کی ہی کجی کا اثر ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے بھی محروم رہے اور جس آخری رسول کی بشارت آنجنابؑ نے دی اس کی تکذیب کے لیے بھی آج رات دن خاکبازی میں مصروف ہیں حالانکہ ان کی تمام مخالفتوں کے علی الرغم اللہ کا یہ نور کامل ہو کر رہے گا، نہ یہ اس کا کچھ بگاڑ سکیں گے نہ مشرکینِ قریش۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ ان کے ذکر سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل نے جو سلوک کیا اور اس کی پاداش میں ان پر جو لعنت ہوئی، اس کا اثر بد ان پر آخر تک مسلط رہا یہاں تک کہ اسی کے نتیجہ میں انھوں نے حضرت مسیحؑ کی بھی تکذیب کی اور اب اسلام کی جو مخالفت کر رہے ہیں یہ بھی اسی کا اثر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بیماری ایسی جان لیوا ہے کہ ایک مرتبہ لگ گئی تو پھر اس سے جان چھڑانا ناممکن ہے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ اس کی چھوت نہ

لگنے دی جائے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ'۔ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی رسالت کی دلیل کے طور پر فرمائی کہ میرے ظہور سے ان پیشین گوئیوں کی تصدیق ہوئی ہے جو میرے باب میں تورات کے صحیفوں میں موجود ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں سب سے زیادہ واضح بشارت ان کے پیش رو حضرت یحییٰؑ نے دی۔ انھوں نے اپنا خاص مشن ہی یہ بتایا کہ وہ اپنے بعد آنے والے کی خوش خبری دینے آئے ہیں۔ اپنی اسی بشارت کے ضمن میں انھوں نے ان پیشین گوئیوں کا بھی حوالہ دیا جو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں پہلے سے موجود تھیں اور جن کی بنا پر لوگوں کو ایک نبی کی بعثت کا انتظار تھا۔ یہ ساری چیزیں اپنے محل میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں اعادے کی گنجائش نہیں ہے۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا'
کا صحیح مفہوم

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ' کے لغوی مفہوم پر اس کے محل میں مفصل بحث ہو چکی ہے۔ جو لوگ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ 'میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں'، انھوں نے نہ تو اس کلام کا موقع و محل سمجھا ہے نہ 'مُصَدِّقًا' کا صحیح لغوی مفہوم وہ متعین کر سکے ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے یہ بات اپنے کو مومن بالتوراۃ ظاہر کرنے کے لیے نہیں فرمائی ہے بلکہ، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اپنی نبوت و رسالت کی دلیل کے طور پر فرمائی ہے اور قرآن میں جہاں بھی یہ لفظ آیا ہے اسی سیاق میں آیا ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ بات بالکل لاحاصل ہے کہ میں تورات کی تصدیق کرنے والا ہوں۔ اگر انھوں نے تورات کی تصدیق فرمائی تو اس سے جو بات ثابت ہوئی وہ صرف یہ ہے کہ وہ تورات پر ایمان رکھتے تھے لیکن اس سے ان کی نبوت و رسالت کس طرح ثابت ہو جائے گی؟ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھیے کہ تورات کے ہر حصہ کی تصدیق نہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمائی ہے نہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بلکہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اس کی تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے اور قرآن نے بھی۔ بلکہ قرآن نے تو اس کے اچھی طرح بخیے ادھیڑے ہیں۔

آنحضرتؐ کے باب
میں حضرت مسیحؑ
کی پیشین گوئیوں
کی اہمیت

'وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ'۔ یعنی ساتھ ہی حضرت مسیحؑ نے اپنا مشن بھی بتایا کہ میں ایک رسول کی خوش خبری دینے آیا ہوں جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہو گا۔ جہاں تک اس رسول کی پیشین گوئی کا تعلق ہے وہ تو سیدنا ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے جس کا ذکر اگلی سورہ میں بھی آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بعد حضرت موسیٰؑ نے بھی اس رسول کی خوش خبری دی۔ بعض دوسرے انبیاء سے بھی تورات کے مختلف صحیفوں میں پیشین گوئیاں موجود ہیں اور اہل کتاب ان کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مانیں یا نہ مانیں لیکن ایک غیر جانبدار ذہن یہ ماننے پر مجبور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر وہ منطبق نہیں ہو سکتیں۔ الغرض جہاں تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا تعلق ہے اس میں حضرت مسیح علیہ السلام منفرد نہیں ہیں لیکن

آنجناب کی بشارت تین پہلوؤں سے دوسری سابق بشارتوں سے بالکل مختلف ہے۔

ایک یہ کہ آپ نے اس بشارت کو اپنا ایک ضمنی کام نہیں بلکہ اپنی بعثت کا خاص مقصد اور مشن بتایا ہے۔

دوسرا یہ کہ آپ نے اس کے ظہور کا زمانہ بھی بالکل قطعی طور پر متعین کر دیا ہے۔

تیسرا یہ کہ آپ نے یہ بشارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم گرامی کی تصریح کے ساتھ دی ہے۔

یہ تینوں پہلو خاص اہم ہیں اس وجہ سے ہم بالاختصار ان پر یہاں گفتگو کریں گے۔

انجیل کے انجیل سے موسوم ہونے کی حکمت

پہلی بات یعنی حضرت مسیحؑ کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت پر مامور ہونا ان کے الفاظ مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی سے بھی واضح ہے لیکن اس سے بڑی دلیل خود اس صحیفہ کا نام ہے جو ان پر نازل ہوا۔ لفظ 'انجیل' بلا اختلاف یونانی ہے جس کے معنی مسلّم طور پر 'بشارت' کے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ تمام آسمانی صحیفوں میں یہی صحیفہ خاص طور پر اس لفظ سے کیوں موسوم ہوا؟ عیسائی ممکن ہے نجات سے متعلق اپنے من گھڑت عقیدے کی بنا پر اس کی توجیہ یہ کریں کہ یہ بنی آدم کے لیے نجات کی بشارت ہے، لیکن یہ توجیہ بالکل طفلانہ ہے۔ نجات سے متعلق جو عقیدہ پال نے گھڑا ہے اس کی کوئی الٹی سیدھی دلیل پال کے لایعنی علم کلام میں ہو تو ہو لیکن ان انجیلوں میں اس کی کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی نہیں ہے۔ انبیاء علیہم السلام کا مشن جس طرح بشارت رہا ہے اسی طرح، بلکہ کسی قدر زائد، انذار بھی رہا ہے اور یہ دونوں فرض جس طرح ہر نبی نے انجام دیے اسی طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی انجام دیے۔ انھوں نے ایمان لانے والوں کو فوز و فلاح کی بشارت بھی دی اور کفر کرنے والوں کو دوزخ سے ڈرایا بھی، پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ ان کے صحیفہ کا نام مخصوص طور پر بشارت (انجیل) ہی ہوتا۔ البتہ اس نام سے موسوم ہونے کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا امتیازی وصف اور خاص مشن تھا ہی یہ کہ وہ اپنے بعد آنے والے آخری رسول کی بشارت دیں۔ اس مشن پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور کر کے بھیجے گئے تھے۔

اس وجہ سے ان کے صحیفہ کا نام ہی بشارت (انجیل) ہوا کہ نام ہی سے آپ کے مشن کا اظہار ہو اور یہ نام قیامت کے دن عیسائیوں پر حجت بنے کہ جس کی بشارت دینے پر وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور ہوئے اس پر ایمان لانے سے خود محروم رہے اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی کنواریوں والی تمثیل ان پر صادق آئی کہ رات بھر تو وہ شمعیں جلائے دولہا کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب دولہا کے آنے کا وقت ہوا تو ان کی کپیوں کا تیل ختم ہو گیا اور وہ سو رہیں۔

انجیلوں کا تدبر سے مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ ان کا خاص مضمون آسمانی بادشاہت کی بشارت ہے۔ مختلف اسلوبوں، پیرایوں اور گوناگوں تمثیلوں سے یہی مضمون ان میں بار بار آتا ہے۔ اس آسمانی بادشاہی کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں، اس کے تدریجی نشوونما کا جو تصور دیا گیا ہے، اس میں داخل

ہونے والوں اور اس سے محروم رہنے والوں کے جو اوصاف مذکور ہوئے ہیں اگر ان پر اچھی طرح غور کیجیے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ یہ درحقیقت اس نبوت کی بشارت ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں ظاہر ہوئی اور اس نظامِ صالح کی خوش خبری ہے جس کی برکتیں صحابہؓ کے ہاتھوں زمین پر پھیلیں۔

یہاں اس مسئلہ کی وضاحت کا موقع نہیں ہے ورنہ میں مثالیں دے کر اپنا نقطۂ نظر اچھی طرح واضح کر دیتا۔ تاہم مجھے امید ہے کہ جو لوگ انجیلوں پر اس پہلو سے غور کریں گے وہ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ ان کا اصل مضمون اس آسمانی بادشاہی کی بشارت ہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں سے قائم ہوئی۔

یہ پیشین گوئی تعیینِ زمانہ کے ساتھ ہے

اس پیشین گوئی میں زمانے کے تعیین کی بات بھی اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتی ہے۔ اس سے پہلے جتنی پیشین گوئیاں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا دوسرے انبیاء علیہم السلام کے باب میں وارد ہوئی ان میں سے کسی میں بھی اس تصریح کے ساتھ زمانے کا تعین نہیں ہے بلکہ سب ایک غیر معیّن مستقبل سے تعلق رکھنے والی ہیں۔ لیکن اس پیشین گوئی میں یہ تصریح ہے کہ وہ رسول آپ کے بعد آئے گا اور آپ اس کی بشارت دینے اور اس آنے والے کی راہ صاف کرنے آئے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ سیدنا مسیحؑ کے بعد وہ کون شخصیت اس پوری دنیا میں ظاہر ہوئی ہے جس پر وہ صفات یا وہ تمثیلات منطبق ہو سکیں جو آنجنابؑ نے اس کے باب میں یا اس کے ہاتھوں قائم ہونے والے نظام سے متعلق فرمائی ہیں؟ ضد اور ہٹ دھرمی کی بات اور ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے جواب میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ اگر عیسائی یہ نام نہیں لینا چاہتے تو پھر انھیں انجیلوں سے بھی دست بردار ہو جانا چاہیے۔ آخر وہ کب تک ایک ایسی بشارت دیتے رہیں گے جس کا کوئی مصداق دو ہزار سال میں ظاہر نہیں ہوا۔

نام کی تصریح کے ساتھ بشارت

مسئلہ کا تیسرا پہلو بھی نہایت اہم بلکہ سب سے زیادہ اہم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت نام کی تصریح کے ساتھ دی ہے۔ نام کی صراحت کے ساتھ اس پیشین گوئی کا ظہور میں آنا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ اس میں کسی قسم کا خفا نہ رہے بلکہ ہر چیز اس طرح کھل کر سامنے آ جائے کہ جو لوگ اس کا انکار کریں ان کی ہٹ دھرمی بالکل بے نقاب اور ان پر اللہ کی حجت اچھی طرح قائم ہو جائے۔

ناموں کی تحریف میں اہل کتاب کی جسارت

لیکن ناموں کے اوپر تحریف کرنے والوں نے جو قیامت ڈھائی ہے وہ سب سے زیادہ دردناک ہے۔ انھوں نے یا تو ان ناموں کا حلیہ اس طرح بگاڑا کہ ان کی اصل صورت معلوم کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہ جائے یا ان کا ترجمہ اور پھر ترجمہ در ترجمہ کر کے ان کو حقیقت سے اتنا دور کر دیا کہ ان کی تحقیق کی کاوش جوئے شیر لانے کے مترادف بن گئی۔

اس کی مثال کے لیے ہم "مروہ" اور "بکہ" کو پیش کرتے ہیں۔ یہ دونوں نام تورات میں آئے ہیں۔ مروہ وہ قربان گاہ ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی پیش کی اور بکہ (مکہ) وہ مقام ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور جن کی ذریت سے ایک رسول کی بعثت کی دعا فرمائی۔ چونکہ یہود یہ بات کسی قیمت پر گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ حضرت ابراہیمؑ کا کوئی تعلق مکہ سے ثابت ہو سکے یا یہ کہ قربان ہونے والا فرزند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو قرار دیا جا سکے اس وجہ سے انھوں نے نہایت صفائی کے ساتھ ہر اس نشان کو تورات سے کھرچ کھرچ کر مٹایا جس کو انھوں نے اپنی خواہش کے خلاف پایا۔ چنانچہ "مروہ" کو ان کے علماء اور قاریوں نے زبان کے توڑ مروڑ سے مُورہ، مُوریا، مُریا اور نہ جانے کیا کیا بنایا۔ اسی طرح بکہ کو 'بکاء' بنایا اور پھر اس کو 'وادیٔ بکاء' کا نام دے کر مترجموں نے اس کا ترجمہ 'وادیٔ گریہ' کر دیا حالانکہ بکہ اور مکہ دونوں ایک ہی چیز ہے۔ اس کی تحقیق اس کتاب میں اس کے محل میں گزر چکی ہے۔[1]

ان دو مثالوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تورات اور انجیل میں ان ناموں پر کیا گزری ہے جن کو یہودیوں یا عیسائیوں نے اپنے مقصد کے خلاف پایا ہے۔ خاص طور پر 'احمدؐ' یا 'محمدؐ' تو ایسے نام ہیں کہ ان کا کوئی حرف بھی وہ گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ انجیلوں سے یہ بات تو صاف معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے نام کی تصریح کے ساتھ حضورؐ کی بعثت کی بشارت دی ہے لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عیسائی علماء نے اس نام پر پردہ ڈالنے میں وہ کمالِ فن دکھایا ہے کہ یہود کے سوا کوئی اور اس کمال میں ان کا حریف نہیں ہو سکتا۔

پہلے ہم انجیل یوحنا سے وہ حوالے نقل کرتے ہیں جن میں حضورؐ کی بشارت دی گئی ہے، اس کے بعد ان کے خاص خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلائیں گے۔ سیدنا مسیحؑ فرماتے ہیں:

"اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے ٥ یعنی سچائی کا روح۔" (یوحنا - باب ۱۴ : ۱۶-۱۷)

"لیکن مددگار یعنی روح القدس جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمھیں سب باتیں سکھائے گا اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے وہ سب تمھیں یاد دلائے گا ٥" (یوحنا - باب ۱۴ : ۲۶)

"اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں ٥" (یوحنا - باب ۱۴ : ۳۰)

"لیکن جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمھارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کا

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن - جلد اول، صفحات: ۷۴، ۲۸-۷

روح جو باپ سے صادر ہوتا ہے تو وہ میری گواہی دے گا۔" (یوحنا - باب ۱۵: ۲۶)

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔" (یوحنا - باب ۱۶: ۷)

"مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہیں مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔" (یوحنا - باب ۱۶: ۱۲-۱۳)

یہ حوالے ہم نے انجیل یوحنا سے لیے ہیں جو عیسائیوں کے تمام فرقوں کے نزدیک مسلّم ہے۔ انجیل برنا باس میں حضورؐ کی بشارت آپ کے نام نامی "محمدؐ" کی تصریح کے ساتھ بار بار وارد ہوئی ہے لیکن اس کے حوالے ہم اس لیے نہیں دے رہے ہیں کہ موجودہ عیسائی، جو پال کے پیرو ہیں، اس کو مستند نہیں مانتے۔ مذکورہ بالا حوالوں پر غور کیجیے تو چند باتیں بالکل واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ایسی واضح صفات کے ساتھ دی ہے کہ وہ حضورؐ کے سوا کسی دوسرے پر منطبق نہیں ہو سکتیں۔ مثلاً

"وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔"

"وہی تمہیں سب باتیں سکھائے گا۔"

"دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔"

غور کیجیے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہے جس کو ان صفات کا مصداق قرار دیا جا سکے؟

دوسری یہ کہ ان پیشین گوئیوں کے پیش و عقب میں اگرچہ ایسے بے جوڑ فقرے اور الفاظ گھسانے کی کوشش کی گئی ہے جن سے ان کے مطلب کو خبط کیا جا سکے لیکن اس کوشش میں تحریف کرنے والوں کو کامیابی نہیں ہوئی ہے بلکہ ان فقروں کا بے ربط ہونا بالکل نمایاں ہے۔

تیسری یہ کہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں کوئی معیّن لفظ فرمایا جس کو بعد کے مترجموں اور شارحوں نے اپنی تحریف کا خاص طور پر ہدف بنایا اور اپنا پورا زور لگایا ہے کہ اس کو جس حد تک اس کے صحیح مفہوم سے دور کر سکیں کر دیں۔ کسی نے اس کا ترجمہ 'مددگار' کیا ہے۔ کسی نے 'وکیل'، کسی نے 'شفیع'، کسی نے 'سچائی کی روح'۔ رہا یہ کہ وہ لفظ کیا ہے تو یوحنا میں جو یونانی لفظ استعمال ہوا ہے وہ (PARACLETUS) بتایا جاتا ہے، جس کے معنی بیان کرنے میں وہ موشگافیاں کی گئی ہیں جو اوپر بیان ہوئیں۔ یہ یونانی لفظ ظاہر ہے کہ کسی سریانی لفظ کا ترجمہ ہو گا اس لیے کہ انجیل کی اصل زبان سریانی تھی تو اب اس کی تحقیق کون کرے کہ وہ کیا تھا۔ جب ایک لفظ کو گم

کرنے کی جدوجہد میں صدیوں سے ایک پوری قوم کی توم لگی ہو تو اس کا سراغ لگانا کس کے امکان میں ہے! یہ تو قرآن کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اس کا کچھ سراغ دیا۔ بعض مسلمان مورخین کی تحقیق یہ ہے کہ اصل سُریانی لفظ 'مُنحمنا' ہے جس کے معنی سُریانی میں وہی ہیں جو 'محمّد' اور 'احمد' کے ہیں۔

یہود کی شقاوت

'فَلَمَّا جَآءَهُم بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ' - 'جَآءَ' کے فاعل حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی وہ سابق پیشین گوئیوں کے مصداق اور اپنے بعد آنے والے رسولِ خاتم کے مبشّر بن کر، نہایت کھلے ہوئے معجزات کے ساتھ جب آئے تو یہود کے دل اس طرح کج ہو چکے تھے کہ انھوں نے آپ کے تمام معجزات کو جادو قرار دیا اور آپ کی تکذیب کر دی۔ انجیل میں تصریح ہے کہ یہود نے آپ کے معجزات کو جادو کا کرشمہ بھی قرار دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ جو کچھ دکھاتے ہیں اس میں روح القدس کی تائید کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ ان کو ایک بھوت، بعلزبول کی مدد حاصل ہے۔ بعض لوگوں نے 'جَآءَ' کا فاعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیا ہے لیکن یہ سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے۔

ایک وقتی پہلو

یہاں اس فرق کو بھی ملحوظ رکھیے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کے اندازِ خطاب میں نمایاں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تو بنی اسرائیل کو 'يٰقَوْمِ' سے مخاطب کیا لیکن حضرت مسیح نے ان کو 'يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ' سے مخاطب کیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ قومی تعلق نہ آپ کا بنی اسرائیل سے تھا نہ کسی اور قوم سے، بلکہ آپ عیسیٰ بن مریم تھے۔ قرآن نے خطاب کے ان باریک پہلوؤں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۷)

یہ یہود کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ اپنی جس کجی کے سبب سے انھوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب کی اسی کجی نے اب ان کو اسلام کی مخالفت پر ابھارا ہے۔ فرمایا کہ ان سے بڑھ کر اپنی جان پر ظلم ڈھانے والا کون ہو سکتا ہے جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہو اور وہ اسلام کی مخالفت کے بہانے پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ پر طرح طرح کے جھوٹ گھڑ رہے ہوں۔

یہود کے من گھڑت دعوے

'اِفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ' سے ان باتوں کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے اپنی بزرگی و برتری ثابت کرنے کے لیے اپنی شان میں گھڑ رکھی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ہم ایک برگزیدہ اور خدا کی منظورِ نظر امت ہیں، ہم کسی ایسے نبی کی ہدایت کے محتاج کس طرح ہو سکتے ہیں جو امیوں کے اندر پیدا ہوا ہو؟ نبوت و رسالت کے لیے تو ہمیشہ سے اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اس سے باہر کوئی نبی کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟ اسی ضمن میں یہ بات بھی انھوں نے گھڑ رکھی تھی کہ ہمیں تو یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی ایسے شخص کے دعوائے نبوت کی تصدیق ہی نہ کریں جس کی پیش کی ہوئی قربانی کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ نہ اترے۔ قرآن

نے سورۂ بقرہ میں ان تمام من گھڑت باتوں کی تردید فرمائی کہ یہ سب افترا ہے، اللہ نے کہیں بھی اس طرح کی کوئی بات نہیں کہی ہے۔ انہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہاں فرمایا کہ کتنے محروم القسمت ہیں وہ لوگ جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے اور وہ خود اپنی آنکھوں میں اپنی ہی گھڑی ہوئی خرافات کی دھول جھونک رہے ہیں۔

'وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ'۔ یہ اس سنتِ الٰہی کی طرف پھر اشارہ فرما دیا جو آیت ۵ میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتا جو خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو ان پر یہ احسان فرمایا کہ آنے والے نبی کے باب میں ان کو پہلے سے رہنمائی دی کہ یہ اسے خود بھی پہچانیں اور دوسروں کو بھی پہچنوائیں لیکن جب انھوں نے اس احسان کی یہ قدر کی کہ اللہ کے بتائے ہوئے نشانات خود مٹا رہے ہیں تو ایسے شامت زدوں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (۸)

یہود کی سعیٔ لاحاصل کی تمثیل

یہ اس سعیٔ لاحاصل کی تمثیل ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت کو اپنی من گھڑت باتوں اور اپنی ایجاد کردہ بدعات سے دبانے کی کوشش کرنا ایسا ہی ہے کہ سورج یا چاند کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھانے کی کوشش کی جائے۔ فرمایا کہ ان کی یہ کوشش لاحاصل رہے گی۔ اللہ اپنے اس نور کو کامل کر کے رہے گا۔ یہ بہت جلد ہلال سے بدر بنے گا، اگرچہ یہ چیز کفار پر کتنی گراں گزرے۔

ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ (۹)

غلبۂ اسلام کا واضح اعلان

یہ 'وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ' کی وضاحت ہے کہ اسی خدا نے جس نے اپنے نور کو کامل کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے، اپنی ہدایت اور اپنے دینِ حق کے ساتھ اپنے رسول کو بھیجا ہے کہ اس دین کو اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب کرے، اور یہ بات لازماً ہو کے رہے گی اگرچہ مشرکین کو یہ کتنی ہی ناگوار گزرے، اور وہ اس کے خلاف کتنا ہی زور لگائیں۔

اوپر والی آیت میں 'وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ' فرمایا ہے جو فی الجملہ عام ہے۔ جس میں وہ سب شامل ہیں جو اس دینِ حق اور اس رسولِ برحق کے انکار کرنے والے تھے۔ اس آیت میں 'وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ' کے الفاظ ہیں جو خاص مشرکینِ قریش کے لیے ہیں۔ ان دونوں لفظوں نے مل کر ان تمام مخالف طاقتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جو اس وقت عرب میں اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں۔ گویا ان سب کو چیلنج کیا ہے کہ تمھیں جتنا زور لگانا ہے لگا لو لیکن تم اللہ کے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکو گے۔ اللہ کا قطعی فیصلہ یہی ہے کہ اس رسول کے ذریعہ سے اُس کا دینِ حق اس سرزمین کے تمام ادیان پر غالب آکے رہے گا۔ چنانچہ یہ

بات پوری ہو کر رہی۔ بہت جلد وہ وقت آگیا کہ پورے عرب کے متعلق یہ اعلان ہو گیا کہ اس سرزمین میں دو دین جمع نہیں ہوں گے بلکہ صرف اللہ کے دین ہی کی حکمرانی ہو گی۔ یہی مضمون سورۂ توبہ میں ان الفاظ میں گزر چکا ہے:

يُرِيدُونَ أَن يُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ إِلَّا أَن يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ○ هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ○ (التوبۃ-۹: ۳۲-۳۳)	وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا، ان کافروں کے علی الرغم۔ وہی ہے جس نے بھیجا ہے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کرے، اگرچہ یہ بات مشرکوں کو کتنی ہی بری لگے۔

۲- آگے آیات ۱۰-۱۴ کا مضمون

اوپر کے پیرے میں یہ بتایا ہے کہ اہل ایمان کے لیے یہ روش تو بالکل ہی غلط ہے کہ وہ رسول سے سمع و طاعت کا عہد کریں اور جب اس عہد کی ذمہ داریاں پوری کرنے کا وقت آئے تو جان و مال کی محبت میں پھنس کر اس سے فرار کی کوشش کریں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان کے لیے صحیح روش کیا ہے جس کو اختیار کر کے وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔ آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۰-۱۴ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ⑩ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ⑪ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ⑫ وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ⑬ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا

أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي
إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ ۖ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ
مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ ۖ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا
عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ ﴿١٤﴾ ع ۲ ۵ ۱۰

ترجمۂ آیات ۱۰-۱۴

اے ایمان والو! کیا میں تمھیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمھیں ایک دردناک عذاب سے نجات بخشے! تم ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے۔ یہ تمھارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اللہ تمھارے گناہ بخشے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی اور عمدہ مکانوں میں داخل کرے گا جو ابد کے باغوں میں ہوں گے۔ در اصل بڑی کامیابی یہ ہے! اور ایک اور چیز بھی ہے جس کی تم تمنا رکھتے ہو۔ یعنی اللہ کی نصرت اور عنقریب ظاہر ہونے والی فتح! اور ایمان والوں کو بشارت دے دو! ۱۰-۱۳

اے ایمان والو! تم اللہ کے انصار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے دعوت دی حواریوں کو، کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ کے انصار بنتے ہیں تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا۔ تو ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابل میں مدد کی تو وہ غالب رہے۔ ۱۴

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿١٠﴾

یعنی ایمان لانے اور رسول سے سمع و طاعت کا عہد کر چکنے کے بعد اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تمہارے

اہل ایمان کے لیے کامیاب تجارت

لیے صحیح روش کیا ہے تو آؤ میں تمھیں وہ سودا بتاتا ہوں جو تمھیں ایک دردناک عذاب سے نجات دینے والا بنے گا۔ یہاں جس چیز کو 'تجارۃ' (سودا) سے تعبیر فرمایا ہے اس کی وضاحت آگے آرہی ہے کہ تم اپنی جان اور اپنا مال اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار رہو اور اس کے بدلے میں اللہ کی مغفرت اور اس کی جنت کے حق دار بنو۔ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے جس کو حاصل کرنے کے لیے تمھیں بازی کھیلنی چاہیے۔

اس آیت میں تو اس کا صلہ یہی بتایا ہے کہ دوزخ کے دردناک عذاب سے نجات پاؤ گے لیکن آگے کی آیات میں وضاحت آرہی ہے کہ اس کے صلہ میں تمھیں آخرت کی بھی تمام کامرانیاں حاصل ہوں گی اور اس دنیا میں بھی تمھیں وہ فتح عظیم حاصل ہوگی جس کے تم متمنی ہو۔ یہاں صرف عذاب سے نجات کا ذکر اس وجہ سے فرمایا کہ مومن کا اصل مطلوب یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہے۔ اگر یہ چیز حاصل ہوگئی تو گویا سب کچھ حاصل ہوگیا۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَتُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ہ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۱۱-۱۲)

عربیت کے ایک اسلوب کی وضاحت

عربیت کے اس اسلوب کی طرف جگہ جگہ ہم اشارہ کرتے آرہے ہیں کہ جب امر یا نہی کے اندر موعظت اور ناصحانہ تلقین کا مضمون پیدا کرنا ہو تو ان کو خبریہ اسلوب میں کر دیتے ہیں چنانچہ اس آیت میں 'تُؤْمِنُوْنَ' اور 'تُجَاھِدُوْنَ' بظاہر تو خبر کے اسلوب میں ہیں لیکن یہ معنی میں امر کے ہیں۔ اس اسلوب کا فائدہ یہاں یہ ہوا کہ گویا ان کو نہایت شفقت کے ساتھ یہ بات سمجھائی جا رہی ہے کہ ہم تمھیں نہایت نفع بخش کاروبار بتا رہے ہیں کہ تم اپنا مال اور اپنی جان اللہ کے حوالہ کرو اور اس کے بدلے میں ابدی بادشاہی حاصل کرو۔

'ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یعنی بظاہر تو یہ سودا تمھیں خسارے کا سودا معلوم ہوگا اس لیے کہ تمھیں نسیہ کی خاطر اپنے نقد کی قربانی کرنی پڑے گی لیکن اصل حقیقت تک تمھاری نظر پہنچ جائے تو تم یہ دیکھو گے کہ اپنے چند خزف ریزوں اور عمر فانی کے چند مستعار لمحات کے بدلے میں تم نے دولتِ کونین حاصل کی ہے جس کے لیے کبھی زوال نہیں ہے۔

'ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ'۔ اس دولتِ کونین کی طرف بالاجمال اشارہ کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر سوچو تو تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ سب سے بڑی کامیابی ہے جو تمھیں حاصل ہوئی۔ اپنی حقیر متاع سے اس سے بڑی کوئی اور کامیابی تم حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس نفع بخش کاروبار کا ذکر دوسرے مقام میں یوں آیا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ط (التوبۃ ۹: ۱۱۱)

(اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض میں خرید لیے ہیں)۔

وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ (۱۳)

اس دنیا میں کامیابی اور غلبہ کی بشارت

یہ ایک ایسی کامیابی کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جو ان کو عنقریب اس دنیا میں ظاہر ہونے والی ہے۔ فرمایا کہ ایک اور کامرانی بھی تم کو حاصل ہوگی جو عنقریب ظاہر ہونے والی ہے۔

یہ اشارہ ہمارے نزدیک فتح مکہ کی طرف ہے۔ ہجرت کے بعد سب سے بڑی تمنّا جو ہر مسلمان کے دل میں جاگزیں تھی وہ فتح مکّہ ہی کی تھی۔ اسی پر اسلام کے اصل دشمنوں کی شکست کا انحصار بھی تھا اور یہی غلبۂ حق کی سب سے بڑی شہادت بھی تھی۔ اس وجہ سے ہر مسلمان اپنی تمام جدّ وجہد کے اصل نصب العین کی حیثیت سے اس کا آرزومند تھا۔

فتح مکہ کی بشارت

'فَتْحٌ' کی صفت یہاں 'قَرِيبٌ' آئی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ اس دور میں نازل ہوئی ہے جب فتح مکہ کے ظہور میں زیادہ دیر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ بعض لوگوں نے سورہ کا زمانۂ نزول غزوۂ احد کے لگ بھگ بتایا ہے لیکن یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی۔ سورہ کے زمانۂ نزول کا اندازہ کرنے کے لیے سب سے زیادہ موزوں ماخذ یہی آیت ہو سکتی ہے اور اس سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ یہ فتح مکہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی ہے۔

'وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ'۔ جب زبان پر فتح مکہ کا ذکر آ گیا تو برمحل اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرما دی کہ اب تم مسلمانوں کو بشارت سنا دو کہ یہ مبارک ساعت دور نہیں ہے۔ اس کا ظہور جلد ہی ہونے والا ہے۔ لوگ حوصلہ بلند رکھیں اور اس کا انتظار کریں۔ فتح مکہ کی بشارت مختلف اسلوبوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر وارد ہوئی ہے۔ اگرچہ قطعیت کے ساتھ کہنا تو مشکل ہے لیکن یہ بشارت اس طرح وارد ہوئی ہے کہ گمان ہوتا ہے کہ شاید سب سے پہلی بشارت یہی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ كَمَا قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيِّينَ مَنْ أَنصَارِي إِلَى اللَّهِ ۖ قَالَ الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنصَارُ اللَّهِ ۖ فَآمَنَت طَّائِفَةٌ مِّن بَنِي إِسْرَائِيلَ وَكَفَرَت طَّائِفَةٌ ۖ فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ (۱۴)

حواریوں کا قابلِ تقلید نمونہ

اوپر آیت ۵ میں مسلمانوں کو یہود کی روش کی تقلید سے روکا ہے کہ اگر ان کے نقشِ قدم پر چلو گے تو اسی زیغِ نظر میں مبتلا ہو کر رہو گے جس میں وہ مبتلا ہوئے۔ اب یہ بتایا کہ تمھارے لیے قابلِ تقلید نمونہ حواریین کا ہے جنھوں نے یہود کی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی تکذیب نہیں کی بلکہ جب حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کو اللہ کے لیے اٹھنے کی دعوت دی تو وہ پورے جوشِ دل کے ساتھ اس راہ میں نصرت و رفاقت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اللہ نے بالآخر انہی جاں نثاروں کو غلبۂ حق کا ذریعہ بنایا۔

لفظ 'حواری' عربی میں اہلِ کتاب سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے معنی سرگرم و پرجوش حامی و حمایتی کے ہیں۔ قرآن مجید اور انجیل دونوں سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب یہود کے علماء و فقہاء کے رویّے سے مایوس ہو گئے تو انھوں نے غرباء و عوام اور دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو دعوت دی کہ اے مچھلیوں کو پکڑنے والو آؤ، میں تمھیں آدمیوں کے پکڑنے والا بناؤں۔ بالآخر انہی کے اندر سے ایک مختصر جماعت

تین سو آدمیوں کی، پورے جوش دلی کے ساتھ، دعوت کے کام میں تعاون کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

'مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ' کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تو خدا کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر اللہ کی طرف چل کھڑا ہوا ہوں، تم میں سے جن کے اندر اس راہ میں میری رفاقت کا حوصلہ ہو وہ اٹھے اور میرا ساتھ دے۔ 'حواریین' نے 'نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ' کہہ کر اس دعوت پر لبیک کہی۔

'فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ' قرینہ دلیل ہے کہ یہاں لفظ 'طَآئِفَۃٌ' کی تنکیر ایک جگہ تقلیل کے مفہوم میں ہے اور دوسری جگہ تکثیر کے مفہوم میں۔ یعنی بنی اسرائیل میں سے ایک مختصر گروہ (حواریین کا گروہ) تو ایمان لایا اور ایک بڑا گروہ اپنے کفر پر اڑا رہ گیا لیکن خدا کی تائید اہلِ ایمان کو حاصل ہوئی اور وہ بالآخر اہلِ کفر پر غالب ہو گئے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کی دعوت کی تکذیب کے بعد سے آج تک یہود کو کبھی اقتدار حاصل نہیں ہوا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں وہ رومیوں کے محکوم تھے، پھر قسطنطین کے نصرانیت قبول کر لینے کے بعد سے وہ برابر نصاریٰ کے محکوم رہے اور آج بھی جب کہ بظاہر ان کی ایک آزاد حکومت ہے وہ عیسائیوں ہی کے زیرِ دست ہیں۔

قرآن مجید میں یہ مضمون دوسرے مقام میں اس طرح بیان ہوا ہے:

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِیْسٰی مِنْھُمُ الْکُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ط قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ ج اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَاشْھَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ہ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاکْتُبْنَا مَعَ الشّٰھِدِیْنَ ہ (آل عمران - ۳: ۵۲-۵۳)	پس جب عیسیٰ نے ان کی طرف سے (علمائے یہود کی طرف سے) کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ اللہ کی طرف بڑھنے میں کون میرے مددگار بنتے ہیں! حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار بنتے ہیں۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔

اللہ تعالیٰ کی تائید سے اس سورہ کی تفسیر ان سطور پر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

رحمان آباد

۱۴- مارچ ۱۹۷۸ء

۳- ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

٦٢

الجُمُعة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا- سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

سورۂ صف اور سورۂ جمعہ کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ صرف اسلوب بیان اور نہج استدلال دونوں کے الگ الگ ہیں۔ سابق سورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق حضرت مسیح علیہ السلام کی پیشین گوئی کا حوالہ ہے۔ اس میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی طرف اشارہ ہے۔ بنی اسمٰعیل کو متنبّہ فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے ان کو جس عظیم نعمت سے نوازا ہے اس کی قدر کریں، یہودیوں کی حاسدانہ سازشوں کا شکار ہو کر اپنے کو اس فضلِ عظیم سے محروم نہ کر بیٹھیں۔ اسی ذیل میں مسلمانوں کے ایک گروہ کو ملامت فرمائی ہے کہ اس نے دنیوی کاروبار کے طمع میں جمعہ اور رسول کا احترام ملحوظ نہیں رکھا۔ اگر تجارت کی طمع لوگوں کو جمعہ کے احترام اور رسول کی موعظت سے زیادہ عزیز ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس بیع و شراء کی حقیقت نہیں سمجھی جو وہ اپنے رب سے کر چکے ہیں (جس کا ذکر سابق سورہ میں ہو چکا ہے)، ساتھ ہی اس ناقدری کے انجام سے بھی آگاہ فرمایا ہے کہ یہ روش اختیار کر کے یہود اللہ کی شریعت سے محروم ہو گئے۔ مسلمان فلاح چاہتے ہیں تو ان کی تقلید سے بچیں۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) بنی اسمٰعیل کو یہ یاد دہانی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر جو رسول مبعوث فرمایا ہے وہ تمہارے جدِّ امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا مظہر ہے۔ یہ ایک عظیم فضل ہے جو اللہ نے تم کو جاہلیت کی تاریکی سے نکالنے کے لیے تم پر فرمایا ہے۔ اس نعمتِ عظمیٰ کی قدر کرو۔ یہودیوں کی حاسدانہ سازشوں کے شکار ہو کر ان کی تمنّا بر آنے کا سامان نہ کرو۔

(۵-۸) یہود کے اس دعوے کی تردید کہ وہ اللہ کی برگزیدہ امّت ہیں، ان کے سوا کوئی اور قوم نبوّت و رسالت کے شرف کی حق دار نہیں ہو سکتی۔ ان کی ان نالائقیوں کی طرف اشارہ جن کے سبب سے وہ اللہ کی ہدایت سے محروم اور امامت کے منصب سے معزول ہوئے۔

(۹-۱۱) مسلمانوں کی ایک غلطی پر، جو جمعہ اور پیغمبر کے خطبہ کے احترام کے معاملے میں، کچھ لوگوں سے صادر ہوئی، گرفت۔ اگرچہ یہ غلطی بظاہر معمولی نظر آتی ہے لیکن اس نے ایک بہت بڑی کمزوری کی

نشان دہی کی تھی کہ ابھی مسلمانوں کے ایک گروہ نے دین کی اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ جو شخص اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت و جنّت کے عوض اپنی جان اور اپنے مال کو فروخت کر چکا ہوتا ہے۔ یہ بات اس کے ایمان کے منافی ہے کہ کسی اور دنیوی کاروبار کی طمع اس کو اللہ اور رسول سے بے پروا کر دے۔ یہ یہود کے نقشِ قدم کی پیروی ہے جس سے مسلمانوں کو سابق سورہ میں روکا گیا ہے۔ یہود نے اسی طرح کی غلطی کا ارتکاب سبت کے معاملہ میں کیا تو اللہ نے ان پر لعنت کر دی۔

سُوْرَةُ الْجُمُعَةِ (۶۲)

مَدَنِيَّةٌ ———— آیات : ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۸ يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ
الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿١﴾ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَ
اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿٢﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا
بِهِمْ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿٣﴾ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ
مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿٤﴾ مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا
التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ۗ
بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿٥﴾ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ
اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ
كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٦﴾ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۗ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٧﴾ قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ
مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

ع ۱ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾

ترجمۂ آیات ۱-۸ تسبیح کرتی ہیں آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اس اللہ ہی کی جو بادشاہ، قدوس، عزیز اور حکیم ہے۔ اسی نے اٹھایا ہے امّیوں میں ایک رسول انہی میں سے۔ جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔ اور انہی میں سے اُن دوسروں میں بھی جو ابھی ان میں شامل نہیں اور اللہ غالب و حکیم ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۱-۴

ان لوگوں کی تمثیل جن پر تورات لادی گئی پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ کیا ہی بُری تمثیل ہے اس قوم کی جس نے اللہ کی آیتوں کی تکذیب کی!! اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان سے کہو کہ اے وہ لوگو! جو یہودی ہوئے، اگر تمھارا گمان ہے کہ دوسروں کے مقابل میں تم اللہ کے محبوب ہو تو موت کے طالب بنو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ اور یہ ہرگز اس کے طالب نہ بنیں گے، بوجہ اپنی ان کرتوتوں کے جو وہ کر چکے ہیں! اور اللہ ان ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ان کو بتا دو کہ جس موت سے تم بھاگ رہے ہو وہ تم سے دوچار ہو کر رہے گی پھر تم غائب و حاضر کے جاننے والے کے سامنے حاضر کیے جاؤ گے پس وہ تم کو ان سارے اعمال سے آگاہ کرے گا جو تم کرتے رہے ہو۔ ۵-۸

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يُسَبِّحُ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ﴿١﴾

تمہید

یہ تمہیدی آیت، معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ، پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے۔ سابق سورہ میں صیغہ ماضی 'سَبَّحَ' آیا ہے اس میں 'یُسَبِّحُ' ہے جو تصویرِ حال کا فائدہ دے رہا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی چار صفات بیان ہوئی ہیں۔ 'اَلْمَلِکُ' جس کے معنی بادشاہ کے ہیں۔ 'اَلْقُدُّوْسُ' جس کے معنی ہر نقص و عیب سے پاک کے ہیں۔ 'اَلْعَزِیْزُ' جس کے معنی، جیسا کہ بار بار واضح کیا جا چکا ہے، غالب و مقتدر کے ہیں۔ 'اَلْحَکِیْمُ' وہ ذات جس کے ہر قول و فعل میں حکمت ہے۔ یہ چاروں صفات آگے والی آیت کی تمہید کے طور پر یہاں آئی ہیں۔ ان کی وضاحت آیت کی تفسیر کے تحت ہی مناسب رہے گی۔

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۲)

فرمایا کہ اسی خدا نے جو اس کائنات کا حقیقی بادشاہ ہے امیوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا کہ وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کو پاک کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ تدبر کیجیے تو معلوم ہوگا کہ تمہید کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی جو صفات گنائی ہیں انہی کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے اس رسول کی بعثت ہوئی ہے جس کا یہاں ذکر ہے۔

رسول اللہ صلعم کی بعثت اللہ تعالیٰ کی صفات کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے ہوئی

وہی خلق کا بادشاہِ حقیقی ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا یہ ہوا کہ اس نے اپنی رعیت کو اپنے احکام و ہدایات سے آگاہ کرنے کے لیے اس کی طرف اپنا رسول بھیجا جس کی صفت یہ ہے کہ 'یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ' وہ لوگوں کو اس کی تعلیمات و ہدایات پڑھ کر سنا رہا ہے۔

وہ پاک اور قدوس ہے اس وجہ سے اس نے یہ چاہا کہ وہ اپنے رسول اور اپنی تعلیمات کے ذریعہ سے لوگوں کو پاکیزہ بنائے چنانچہ اس کا رسول لوگوں کو عقائد و اعمال اور اخلاق کی خرابیوں سے پاک کر رہا ہے (یُزَكِّیْهِمْ)۔

پھر وہ 'عزیز' اور 'حکیم' ہے اس وجہ سے اس نے ایسا رسول بھیجا ہے جو اس کے بندوں کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ یہاں لفظ کتاب شریعت اور قانون کے مفہوم میں ہے۔ شریعت اور قانون کا مؤثر نفاذ اسی کی طرف سے ہوتا ہے جو غالب و مقتدر ہو لیکن اللہ تعالیٰ صرف غالب و مقتدر ہی نہیں بلکہ 'حکیم' بھی ہے اس وجہ سے وہ اپنے رسول کے ذریعہ سے جس قانون کی تعلیم دے رہا ہے وہ مجرد اس کے زور اقتدار کا مظہر نہیں بلکہ اس کی حکمت اور بندوں کی دنیوی و اخروی مصلحت کا بھی مظہر ہے۔

یہ آیت بنی اسمٰعیل پر امتنان اور اظہارِ فضل و احسان کے محل میں ہے اس وجہ سے یہاں ان کے لیے لفظ 'اُمِّیّٖنَ' بطور ایک وصفِ امتیازی کے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ پر اس کے محل میں بحث ہو چکی ہے لیکن اتنی بات کی یاددہانی یہاں بھی ضروری ہے کہ یہ اصطلاح اگرچہ اہل کتاب بالخصوص یہود کی وضع کردہ

تھی جس میں ان کے اندر مذہبی پندار کی جھلک بھی تھی اور اہلِ عرب کے لیے ان کا جذبۂ تحقیر بھی نمایاں تھا، لیکن بنی اسمٰعیل چونکہ کتاب و شریعت سے ناآشنا تھے اس وجہ سے بغیر کسی احساسِ کہتری کے انھوں نے اس لقب کو اپنے لیے خود بھی اختیار کر لیا۔ پھر جب قرآن نے ان کے لیے اور ان کی طرف مبعوث ہونے والے رسول کے لیے اس لفظ کو بطور ایک وصفِ امتیازی کے ذکر فرمایا تو اس کا رتبہ اتنا بلند ہو گیا کہ اہلِ عرب کے لیے اس نے گویا ایک تشریفِ آسمانی کی حیثیت حاصل کر لی جس سے قدرت کی یہ شان ظاہر ہوئی کہ جن کو ان پڑھ اور گنوار کہہ کر حقیر ٹھہرایا گیا وہ تمام عالم کی تعلیم و تہذیب پر مامور ہوئے اور جن کو اپنے حاملِ کتاب و شریعت ہونے پر ناز تھا وہ کَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا 'چار پائے بروکتابے چند' کے مصداق قرار پائے۔

یہاں یہ لفظ عربوں کے جذبۂ شکر گزاری کو ابھارنے کے لیے استعمال ہوا ہے کہ انھیں اپنے رب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے ان پر نظرِ کرم فرمائی۔ ان کی اصلاح و تربیت اور ان کو کتاب و حکمت سے بہرہ مند کرنے کے لیے انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرمایا اور جاہلیت کی اس تاریکی سے ان کو نکالا جس میں وہ اپنی امیّت کے سبب سے اب تک گھرے ہوئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو یہ نعمت مل گئی ہے وہ اس کو حرزِ جاں بنائیں اور کوشش کریں کہ دوسرے بھی اس کی قدر کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ناقدری کے سبب سے وہ اس سے محروم ہو کر رہ جائیں اور حاسدوں کا مقصد پورا ہو جائے۔

یہاں نبیِ امّی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو صفات مذکور ہوئی ہیں ان پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم مفصل بحث کر چکے ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے تاکہ آپ کی بعثت کے مقاصد سے متعلق جو غلط فہمیاں منکرینِ حدیث نے پھیلائی ہیں وہ دور ہو جائیں۔ بنی اسمٰعیل کے اندر، بعینہٖ انہی صفات کے پیغمبر اٹھائے جانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی۔ سورۂ بقرہ میں یہ دعا یوں مذکور ہے:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ	اے ہمارے رب! اور تو بھیج ان کے اندر ایک
يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ	رسول انہی میں سے جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ	سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے
أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (البقرۃ - ۲ : ۱۲۹)	اور ان کو پاک کرے۔ بے شک تو غالب و حکیم ہے۔

آنحضرتؐ دعائے ابراہیمی کے مظہر ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح یہ پیغمبر اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہیں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا کے بھی مظہر ہیں جو آپ نے اولادِ اسمٰعیل سے متعلق فرمائی تھی۔ گویا گوناگوں صفتیں آپ کے اندر جمع ہیں۔ یہ نویدِ مسیح ہیں اور دعائے ابراہیم ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے مظہر ہیں، اور پھر یہ کہ وہ تمھارے ہی اندر کے ایک فرد ہیں۔ تمھارے اور ان کے درمیان اجنبیت و غیریت کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے۔ تمھیں حقیر ٹھہرانے والے تمھیں یہ طعنہ نہیں دے سکتے کہ تمھیں ان کے یا کسی اور کے واسطہ سے روشنی ملی بلکہ اللہ نے تمام خلق پر تم کو سر بلند کیا کہ تمھارے ذریعہ سے سارے جہان میں اجالا کرنے کا سامان کیا۔

آنحضرتؐ کی بعثت تمام خلق کی طرف ہے

یہ امر یہاں واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اگرچہ امیوں کے اندر ہوئی لیکن آپ کی دعوت تمام خلق کے لیے ہے۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اتنی بات یاد رکھیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دو بعثتوں کے ساتھ مبعوث ہوئے: ایک بعثتِ خاص، دوسری بعثتِ عام۔ آپ کی بعثتِ خاص بنی اسمٰعیل کی طرف ہوئی اور اس بعثت کے فرائض کی تکمیل حضورؐ نے بذاتِ خود فرمائی۔ آپ کی بعثتِ عام، جو تمام خلق کی طرف ہوئی، اس کے فرائض انجام دینے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو 'شہداء اللہ فی الارض' کے منصب پر سرفراز فرمایا جو تا قیامت تک کے لیے اس فرض کی انجام دہی پر مامور ہے۔ 'شہداء اللہ فی الارض' کے ہراول دستہ کی حیثیت چونکہ امیوں ہی کو حاصل ہوئی اس وجہ سے یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ جو امی تھے اللہ تعالیٰ نے انہی کے واسطہ سے تمام خلق کو روشنی دکھائی۔

'وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ'۔ یہ امیوں کے جذبۂ شکر و سپاس کو ابھارنے کے لیے اس تاریکی کی طرف توجہ دلائی ہے جو ماضی میں ان پر چھائی رہی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ جاہلیت کی اس گھٹاٹوپ تاریکی کا خیال کریں جس میں وہ گرفتار رہ چکے ہیں تب انھیں اپنے رب کے فضل و احسان کا کچھ اندازہ ہوگا کہ اس نے ان کو کس چاہِ ظلمت سے نکالا اور کس آسمانِ رفعت و عزت پر پہنچایا!

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳)

اُن امیوں کو باندازِ لطیف دعوت جو ابھی اسلام سے محروم تھے

اس کا عطف 'اُمِّیّٖنَ' پر ہے۔ یعنی جن امیوں کے اندر اس رسول کی بعثت ہوئی ہے انہی میں سے وہ دوسرے بھی ہیں جو ابھی ان میں شامل نہیں ہوئے ہیں۔ یہ اشارہ ان بنی اسمٰعیل کی طرف ہے جنھوں نے ابھی اسلام قبول نہیں کیا تھا۔ اس سے یہ بات نکلی کہ اوپر اگرچہ لفظ 'اُمِّیّٖنَ' عام استعمال ہوا ہے لیکن اس سے مراد صرف وہ بنی اسمٰعیل ہیں جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ چنانچہ آیت کا آخری ٹکڑا 'وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ' اس پر دلیل بھی ہے۔ اب اس آیت میں نہایت خوب صورت اور بلیغ اسلوب سے بنی اسمٰعیل کے ان لوگوں کو بھی دعوت دے دی جو ابھی اسلام سے بیگانہ تھے۔ لفظ 'مِنْهُمْ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا کہ انہی امیوں میں سے جن کے لیے یہ آسمانی نعمت اتری ہے، کچھ دوسرے بھی ہیں لیکن ابھی وہ اس سے بدکے ہوئے ہیں۔ گویا نہایت لطیف اسلوب سے ان کو دعوت دی گئی کہ جن کے لیے یہ خوانِ نعمت بچھایا گیا ہے اور جو سب سے پہلے مدعو ہیں، حیف ہے اگر وہ اس سے محروم رہیں۔

'لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ' (ابھی وہ ان سے ملے نہیں ہیں) کے الفاظ کے اندر یہ بشارت بھی مضمر ہے کہ گو ابھی وہ ملے نہیں لیکن عنقریب مل جائیں گے۔ گویا یہ مستقبل قریب میں ان کے قبولِ اسلام کی اسی طرح کی بشارت ہے جس طرح کی بشارت سورۂ ممتحنہ کی آیت ۷ میں گزر چکی ہے۔

ہدایت کے باب میں سنتِ الٰہی

'وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ایمان و ہدایت کے باب میں اس نے اختیار فرمائی ہے۔ وہ چاہے تو ساری خلق کو ہدایت بخش دے، وہ عزیز و غالب ہے،

لیکن وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے وہ ہدایت سے انہی کو سرفراز فرماتا ہے جو اس کی حکمت کے تحت سزاوار ہوتے ہیں۔ سورۂ دہر میں اس حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے: وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ط (الدھر ۷۶: ۳۰-۳۱) (اور تمہارا چاہنا کچھ نہیں مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ بے شک اللہ ہی علم و حکمت والا ہے۔ وہی اپنی رحمت میں جس کو چاہے گا داخل کرے گا)۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۴)

یہود کے حسد پر تعریض

یہ اسی فضل عظیم کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیوں پر فرمایا اور جس کا اوپر ذکر ہوا۔ ارشاد ہوا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے۔ اس پر کسی کا اجارہ نہیں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کے لیے انتخاب فرماتا ہے اور اس کا یہ چاہنا اس کی اپنی حکمت پر مبنی ہوتا ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہود کو اس پر حسد ہے تو وہ جتنا حسد کرنا چاہیں کر لیں۔ اس سے وہ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ کسی دوسرے کا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ خدا نے امیوں کو اپنی چیز دی ہے، کسی دوسرے کی نہیں دی ہے کہ وہ اس پر غصہ کا اظہار کرے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ط بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۵)

یہود کے پندار پر ضرب

یہ یہود کے پندار پر ضرب لگائی ہے کہ اگر وہ اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ کتاب و شریعت کے حامل وہی ہو سکتے ہیں، کوئی دوسرا اس شرف میں ان کا حریف نہیں ہو سکتا، تو یہ گھمنڈ اب وہ اپنے دماغ سے نکال دیں۔ اب ان کی مثال اس گدھے کی ہے جو کتابوں کا بوجھ تو اٹھائے ہوئے ہے لیکن اسے کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔

'حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا' یعنی اس میں تو شبہ نہیں کہ ایک زمانے میں ان کے اوپر تورات کا بوجھ لادا گیا لیکن ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ہے کہ انھوں نے اس بارگراں کو اٹھایا نہیں۔ اس نہ اٹھانے کی وضاحت 'كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' کے الفاظ سے فرما دی گئی کہ تورات کی تعلیمات اور اس کے احکام پر ان کا ایمان باقی نہیں رہا، عملاً انھوں نے ان کی تکذیب کر دی۔ ظاہر ہے کہ جب ان کتابوں کے احکام کی انھوں نے تکذیب کر دی تو ان کے اجر سے تو وہ محروم ہو گئے، صرف ان کا وزر اور گناہ ان کے سر باقی رہا اور وہ اس مثل کے مصداق ہیں کہ چارپائے برو کتابے چند۔

'حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ' میں لفظ 'حُمِّلُوْا' نہایت بلیغ ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس تورات کے حامل ہونے پر آج ان کو ناز ہے وہ انہوں نے اس وقت بھی شوق و رغبت سے نہیں قبول کی تھی جس وقت انھیں عطا ہوئی تھی بلکہ وہ گویا ان پر زبردستی لادی گئی تھی۔ اس زبردستی لادنے کی پوری تفصیل

سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے کہ تورات کے ایک ایک حکم کو قبول کرنے میں یہود نے کس کس طرح اپنی ضد و مکابرت کا مظاہرہ کیا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس سوز و غم کے ساتھ ان کی اس حالت پر ماتم کیا ہے۔ اس کی طرف سرسری اشارہ سورۂ صف ۶۱ کی آیت ۵ میں بھی ہے۔

'بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' فرمایا کہ جن کی مثال اتنی مکروہ ہے ان کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنے تقدس و تقرب الٰہی کے زعم میں مبتلا ہوں اور یہ سمجھ بیٹھیں کہ ان کے ہوتے خدا کسی دوسرے کو کتاب و شریعت کا حامل نہیں بنا سکتا!

جو کتاب پر عامل نہیں وہ اس کا حامل بھی نہیں

'كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ' کے الفاظ سے اوپر کے الفاظ 'ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا' کی وضاحت ہو گئی کہ تورات کے نہ اٹھانے کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے اس کے احکام کی اپنے عمل سے تکذیب کر دی۔ زبان سے تو دعویٰ ہے کہ وہ اس کے حامل ہیں لیکن جب اس پر عامل نہیں تو اس کے حامل کیسے ہوئے؟

'وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ' یہ ٹکڑا بعینہٖ سورۂ صف کی آیت ۷ میں بھی گزر چکا ہے۔ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ان کی بداعمالیوں کے سبب سے ان پر لعنت ہو چکی ہے اور اللہ نے ان کے دلوں پر، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں تفصیل گزر چکی ہے، مہر کر دی ہے، اس وجہ سے اب ان کو ہدایت نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے ہیں۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ ان کو تورات دی گئی تو اس کی انھوں نے تکذیب کر دی اور اب اسی تورات کے حامل ہونے کے زعم میں اللہ کے آخری رسول کی تکذیب کر رہے ہیں کہ بھلا ان کے ہوتے کسی اور قوم کے اندر کوئی رسول کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟ فرمایا کہ ایسے بدبختوں کو خدا ہدایت نہیں دیا کرتا۔ اس طرح کے لوگ ہمیشہ اسی طرح ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۶)

یہود کے پندار پر ایک اور ضرب

یہ ان کے اسی پندار پر ایک اور ضرب لگائی کہ اگر تمھارا زعم یہ ہے کہ تم خدا کے محبوب ہو تو اس محبت و محبوبیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ تمھارے اندر خدا کی راہ میں جان دینے کا شوق و ولولہ ہو۔ محب کو سب سے زیادہ آرزو محبوب کی ملاقات کی ہوتی ہے۔ وہ اس چیز سے جان نہیں چراتا جو محبوب سے ملاقات کی راہ کھولے لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ موت کا مقابلہ کرنے میں تم سے زیادہ بزدل کوئی نہیں۔ سورۂ صف کی آیات ۲-۵ میں ان کے حال پر جو تبصرہ فرمایا گیا ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ سورۂ حشر میں بنو قریظہ اور ان کے حلیفوں کی بزدلی کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی گئی ہے:

لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ	ان کے سینوں میں تمھارا ڈر اللہ کے
صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ	خوف سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ لَا	کہ یہ سمجھ رکھنے والے لوگ نہیں۔ یہ کبھی تم سے

يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ ۭ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ ۭ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ۝ (الحشر - ۵۹ : ۱۳-۱۴)

کھلے میدان میں لڑنے کا حوصلہ نہیں کر سکتے۔ لڑیں گے تو قلعہ بند بستیوں میں یا دیواروں کی اوٹ سے۔ ان کے اپنے اندر شدید مخاصمت ہے۔ تم ان کو متحد گمان کر رہے ہو، حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقل سے کام لینے والے لوگ نہیں ہیں۔

سورۂ بقرہ میں یہی مضمون نسبۃً تفصیل سے اس طرح بیان ہوا ہے:

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰي حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ (البقرۃ - ۲: ۹۵-۹۶)

کہہ دو، اگر دار آخرت کی تمام نعمتیں اللہ کے پاس دوسروں کے مقابل میں، تمہارا ہی حق ہیں تو موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو۔ اور یہ کبھی بھی موت کی تمنا نہیں کریں گے اپنی ان کرتوتوں کے سبب سے جو انھوں نے کی ہیں اور اللہ ان ظالموں سے اچھی طرح باخبر ہے۔ اور تم ان کو زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہاں تک کہ یہ مشرکوں سے بھی زیادہ زندگی کے حریص ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی تمنا ہے کہ ہزار سال جیے۔

مِنْ دُوْنِ النَّاسِ سے بنی اسمٰعیل کی طرف اشارہ ہے

آیت زیر بحث میں 'مِنْ دُوْنِ النَّاسِ' کے الفاظ اگرچہ عام ہیں لیکن یہاں اشارہ خاص طور پر بنی اسمٰعیل ہی کی طرف ہے۔ تورات کی پیشین گوئیوں اور نسلی رقابت کی بنا پر یہود کو سب سے زیادہ پرخاش انہی سے تھی۔ اس پرخاش کی پوری سرگزشت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ یہ پرخاش تھی تو شروع ہی سے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد، جب انھوں نے تاڑ لیا کہ وہ خطرہ سر پر آگیا جس سے وہ اندیشہ ناک تھے تو یہ آگ پوری طرح بھڑک اٹھی۔

یہود کی بزدلی پر ان کی پوری تاریخ گواہ ہے

قرآن نے یہاں یہود کی جس بزدلی پر طنز کیا ہے اگرچہ وہ اس کے جواب میں بے حیائی سے کہہ سکتے تھے کہ ہم موت سے ڈرنے والے لوگ نہیں ہیں لیکن آدمی سے اپنا باطن مخفی نہیں ہوتا۔ انھیں محسوس ہوا کہ قرآن نے ان کی نہایت دکھتی رگ پکڑی ہے۔ چنانچہ انھوں نے خاموشی ہی میں سلامتی دیکھی۔ وہ ایک ایسی بات کی تردید کس طرح کر سکتے تھے جس کی شہادت ان کی ماضی کی تاریخ بھی دے رہی تھی اور حاضر کے واقعات بھی جس کے گواہ تھے۔

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ (۷)

یہ ان کی بزدلی کے سبب کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس چیز نے ان کو موت سے اتنا خائف کر رکھا ہے یہ ان کے اعمال ہیں۔ یہ نبیوں کے قاتل ہیں، یہ تورات کے محرف ہیں، اللہ کی امانتوں میں خیانت کرنے والے ہیں اور انھوں نے ان تمام نشاناتِ ہدایت کو مٹایا ہے جن کو خلق کے سامنے اجاگر کرنے پر یہ مامور ہوئے تھے تو اب یہ کیا منہ لے کے اپنے رب کے سامنے جائیں گے! لیکن ان کو بہرحال اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور وہ ان ظالموں سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ہر ایک کو اس کے کیے کی بھرپور سزا دے گا۔

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ (۸)

اوپر 'وَاللّٰہُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ' میں جو تہدید مضمر تھی وہ اس آیت میں اچھی طرح کھل گئی ہے۔ فرمایا کہ موت سے بھاگتے ہو تو بھاگو، لیکن تم اس سے بھاگ کے کہاں جاؤ گے؟ وہ تمھیں پکڑ ہی لے گی۔ پھر تم اپنی تمام بداعمالیوں کے ساتھ اپنے اس خدا کے سامنے پیش کیے جاؤ گے جو تمام غائب و حاضر کا جاننے والا ہے۔ نہ اس سے تمھارا کوئی فعل مخفی ہے، نہ کوئی چیز تم اس سے چھپا سکو گے۔ وہ تمھارا سارا کچا چٹھا تمھارے سامنے رکھ دے گا اور تمھیں اپنے ہر جرم کی سزا بھگتنی پڑے گی۔

۲- آگے آیات ۹-۱۱ کا مضمون

آگے مسلمانوں کی ایک غلطی پر گرفت فرمائی جو نمازِ جمعہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کے معاملے میں ایک جماعت سے صادر ہوئی۔ کوئی تجارتی قافلہ مدینہ میں داخل ہوا اس کی خبر سن کر کچھ لوگ عین اس وقت مسجد سے اٹھ کر چلے گئے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ اگرچہ یہ فعل کچھ خام تربیت لوگوں ہی سے صادر ہوا لیکن اس سے جماعت کی بعض ایسی کمزوریوں کی نشان دہی ہوئی جن کی اصلاح ضروری تھی۔

ایک کمزوری تو یہ ظاہر ہوئی کہ معلوم ہوا کہ ابھی بہتوں کے اندر اس فضلِ عظیم کا کما حقہٗ شعور نہیں پیدا ہوا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں امیوں پر فرمایا ہے۔ دوسری یہ کہ ابھی لوگوں نے اس بیع و شرا کی حقیقت اچھی طرح نہیں سمجھی ہے جس کا ذکر سورۂ صف کی آیات ۱۰-۱۳ میں ہوا ہے کہ جو لوگ رسول سے سمع و طاعت کا عہد کر چکے ہیں وہ اللہ کی مغفرت اور اس کی جنت کے عوض اپنی جان اور اپنے مال اللہ کے ہاتھ فروخت کر چکے ہیں۔ ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی اور بیع و شرا کو اتنی اہمیت دیں کہ اس کے شوق میں اللہ کے رسول کو خطبہ دیتا ہوا چھوڑ کر مسجد سے چل کھڑے ہوں۔

تیسری یہ کہ معلوم ہوا کہ ابھی لوگوں نے جمعہ کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کیا ہے۔ یہ دن مسلمانوں کے لیے بنی اسرائیل کے یوم السبت سے مشابہ ہے۔ بنی اسرائیل نے طمع دنیا اور حرص مال کا شکار ہو کر یوم سبت کی حرمت کو بٹہ لگایا تو اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر کے ان کی شکلیں مسخ کر دیں۔ اگر انھی کی طرح مسلمان اس تجارت کی ہوس میں جمعہ کی حرمت کو بٹہ لگائیں گے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے غضب سے محفوظ رہیں۔

یہ باتیں خاص اہمیت رکھنے والی ہیں اور ان سے اس فضل عظیم کی نہایت کھلی ہوئی ناقدری ہوئی جو یہود کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے امیوں پر فرمایا اور جس کا نہایت اہتمام سے اس سورہ میں ذکر ہوا ہے۔ اس وجہ سے ان لوگوں کو سرزنش کی گئی جو ان کے مرتکب ہوئے۔ —— اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۹-۱۱

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ
فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ⑨ فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ⑩ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَۨا انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ
قَاۗىِٕمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۭ
ع ۲ / ۱۲ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ⑪

ترجمۂ آیات ۹-۱۱

اے ایمان والو، جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف مستعدی سے چل کھڑے ہو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل کے طالب بنو اور اللہ کو زیادہ یاد رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ اور لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ کوئی تجارت یا دلچسپی کی چیز دیکھ پاتے ہیں تو اس کی طرف ٹوٹ پڑتے

ہیں اور تم کو کھڑے چھوڑ دیتے ہیں۔ کہہ دو، جو اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے کہیں بہتر ہے۔ اور اللہ بہترین روزی دینے والا ہے۔ ۹-۱۱

۲- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۹)

خطاب کا ایک حکیمانہ انداز

خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن انہی لوگوں کی طرف ہے جن کی کمزوری پر نکیر فرمائی گئی ہے۔ عام خطاب کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ رسوائی کا احساس نہیں کرتے جن کا رویّہ زیر بحث ہوتا ہے بلکہ ان کے اندر سلامت روی ہوتی ہے تو وہ اس پردہ پوشی کو متکلم کی کریم النفسی پر محمول کرتے اور نصیحت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اگر تعیّن کے ساتھ نام لے کر ان کو سرزنش کی جائے تو اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر ضد اور انانیت کا جذبہ ابھرے۔

جمعہ دو
اذان جمعہ

'لِلصَّلٰوةِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ' میں 'مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَةِ' کے الفاظ 'صلٰوۃ' کی وضاحت کے لیے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ یہاں زیر بحث خاص طور پر جمعہ کی نماز ہے۔ یہ جمعہ کی نماز ہی وہ چیز ہے جو جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے ممتاز کرتی ہے۔

یہاں جس اذان کا ذکر ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہی اذان مراد ہو سکتی ہے جو خطبۂ جمعہ سے پہلے دی جاتی ہے۔ روایات سے بلا اختلاف ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور شیخین رضی اللہ عنہما کے عہد مبارک میں جمعہ کی اذان ایک ہی تھی جو خطبہ سے پہلے دی جاتی تھی۔ ایک اذان کا اضافہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں کیا جب مدینہ منورہ کی آبادی زیادہ ہو گئی۔ یہ مدینہ کے بازار میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان سے دی جاتی۔ اگرچہ یہ اذان سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کا اضافہ ہے لیکن اس اضافے کو امت کے تمام اخیار نے، بلا کسی نکیر کے، قبول کیا۔

'فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ'۔ 'سعی' کے معنی صرف دوڑنے کے نہیں آتے بلکہ یہ لفظ اصلاً کسی کام کو مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ، چوکس و چوبند ہو کر، کرنے کے لیے آتا ہے۔ غلام آقا کی پکار سن کر جب مستعدی سے اس کی طرف لپکتا ہے تو یہ سعی ہے۔ فرمایا کہ جب یہ اذان سنو تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔

خطبہ اور نماز جمعہ

'ذِكْرِ اللّٰهِ' یہاں خطبہ اور نماز دونوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے۔ نماز کا 'ذکر' ہونا تو واضح

ہے، قرآن میں جگہ جگہ نماز کو ذکر ہی سے تعبیر کیا گیا ہے، رہا جمعہ کا خطبہ تو وہ درحقیقت نماز ہی کا حصہ ہے۔ جمعہ کی نماز ظہر کی نماز کے قائم مقام ہے جس کی چار رکعتیں جمعہ کے دن تخفیف ہو کر دو رہ جاتی ہیں اور ان کی جگہ خطبہ کی شکل میں اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ 'ذِكْرِ اللّٰهِ' امام حاضرینِ مسجد کو مخاطب کر کے کرتا ہے اس وجہ سے وہ ساری باتیں اس کے دائرہ میں آتی ہیں جو مسلمانوں کی صلاح و فلاح سے متعلق اور جن کے لیے وقت کے حالات مقتضی ہوں۔ اس کو چند رسمی دعاؤں کی شکل میں محدود کر دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

خطبہ اور نماز کا اہتمام و التزام

'وَذَرُوا الْبَيْعَ'۔ لفظ 'بیع' اصلاً تو بیچنے کے معنی میں ہے لیکن یہ اپنے عام استعمال میں خرید و فروخت دونوں ہی کے لیے آتا ہے۔ اگرچہ یہاں ذکر 'بیع' ہی کے چھوڑنے کا ہے لیکن جب 'بیع' کے چھوڑنے کا ذکر ہوا جو نسبتاً زیادہ مرغوب ہے تو 'خرید' کا چھوڑنا تو بدرجۂ اولیٰ مطلوب ہو گا۔ مقصود یہ بتانا ہے کہ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر نماز کی طرف لپکو۔ 'بَيْع' کے ذکر کی وجہ صرف یہ ہے کہ جو واقعہ مسلمانوں کے لیے آزمائش کا سبب ہوا اور جس پر یہاں تنبیہ فرمائی گئی ہے، وہ بیع و شراء ہی سے متعلق تھا۔

'ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ'۔ یعنی بظاہر تو یہ حکم تم میں سے بعضوں پر گراں گزرے گا' تم اپنے کاروبار کا نقصان محسوس کرو گے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے یہی طریقہ تمہارے لیے موجب خیر و برکت ہے۔ رزق و فضل سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر اس کی خوشنودی کے لیے تم کوئی نقصان گوارا کرو گے تو ابدی زندگی میں اس کا اجر اپنے رب کے پاس محفوظ کر لو گے اور ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں بھی وہ ایسی شکلیں پیدا کر دے کہ تمہارے ہر نقصان کی تلافی ہو جائے۔ 'اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ' یعنی تمہیں اپنے نفع نقصان کا اندازہ اس دنیا کی محدود زندگی کو سامنے رکھ کر نہیں کرنا چاہیے بلکہ آخرت کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ لیکن آخرت ایسی چیز ہے کہ اس کو سمجھنا چاہو گے تب ہی سمجھو گے۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (۱۰)

یہود کے احترامِ سبت کے بالمقابل جمعہ کی پابندی آسان ہے

یعنی یہ پابندی صرف اتنی ہی دیر کے لیے ہے کہ نماز سے فارغ ہو جاؤ۔ اس کے بعد تمہیں اجازت ہے کہ تم جہاں چاہو جاؤ اور جس شکل میں چاہو اللہ کے رزق و فضل کے طالب بنو۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اتنے قلیل وقت کی پابندی بھی تم اپنے رب کی خوشنودی کے لیے گوارا نہیں کر سکتے تو پھر تمہارا ایمان و اسلام کیا ہے! یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ یہود پر سبت کے احترام کی پابندی پورے دن کے لیے تھی۔ لیکن اس امت پر جمعہ کے احترام کی پابندی صرف اذان سے لے کر ختمِ نماز تک کے لیے عائد کی گئی ہے، باقی پورے دن میں اسی طرح آزادی ہے جس طرح دوسرے دنوں میں ہے۔

'وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'۔ یعنی تمہارے لیے رزق و فضل کی جدوجہد پر کوئی پابندی نہیں ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر اس جدوجہد میں دنیا ہی مطمح نظر نہیں ہے، آخرت کی فلاح

بھی مطلوب ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر قدم پر اللہ کو یاد رکھو۔ یہی یاد تمھیں شیطان کے فریبوں اور فتنوں سے بچائے گی ورنہ شیطان تمھیں اس طرح اندھا بنا دے گا کہ تم حرام و حلال کے امتیاز سے، عاری ہو کر اس دنیا کے کتے بن کر رہ جاؤ گے اور پھر جہنم ہی کے ایندھن بنو گے۔

وَإِذَا رَأَوْا تِجَارَةً أَوْ لَهْوًا انفَضُّوا إِلَيْهَا وَتَرَكُوكَ قَائِمًا ۚ قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ (۱۱)

واقعہ جو اس تنبیہ کا سبب ہوا

یہ آخر میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو مذکورہ بالا تنبیہات و تعلیمات کے نزول کا سبب ہوا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ باہر کا کوئی تجارتی قافلہ عین خطبۂ جمعہ کے وقت، مدینہ میں داخل ہوا۔ اس نے اعلان و اشتہار کے لیے، رواج کے مطابق، اپنے ڈھول اور دف جو بجائے تو کچھ لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطبہ دیتے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح کے قافلے اس زمانے میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ ضروری چیزوں کی خرید و فروخت انہی کے ذریعہ سے ہوتی اس وجہ سے لوگوں کو ان کا انتظار رہتا اور جب وہ آتے تو ہر شخص اپنی ضرورت کی چیزیں حاصل کرنے اور اپنا مال فروخت کرنے کے لیے ایک دوسرے پر سبقت کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ فعل جن لوگوں سے صادر ہوا ظاہر ہے کہ ان پر اسلامی تربیت کا رنگ ابھی اچھی طرح چڑھا نہیں تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ خطبۂ جمعہ کی اہمیت سے بھی اچھی طرح واقف نہیں تھے۔ ان کے نزدیک اہمیت صرف نماز ہی کی تھی۔ انھوں نے خیال کیا ہو گا کہ نماز سے پہلے پہلے قافلہ کو دیکھ کر واپس آ جائیں گے۔ بہرحال ان سے جو غلطی ہوئی اس سے امت کو یہ فائدہ پہنچا کہ جمعہ، خطبۂ جمعہ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایسی ہدایات نازل ہو گئیں جو اس سے پہلے نازل نہیں ہوئی تھیں۔

آیت میں بات اگرچہ عام صیغہ سے فرمائی گئی ہے لیکن یہ امر واضح ہے کہ یہ فعل، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، صادر کچھ ناتربیت یافتہ لوگوں ہی سے ہوا۔ قرآن کا عام اندازِ موعظت یہی ہے کہ وہ تعین کے ساتھ ملامت کرنے کے بجائے عام الفاظ ہی میں تنبیہ کرتا ہے تاکہ جماعت کا ہر شخص اس سے فائدہ اٹھائے اور کسی خاص گروہ کو اس سے رسوائی کا احساس نہ ہو۔

'وَتَرَكُوكَ قَائِمًا' سے اس واقعہ کی سنگینی کا ایک خاص پہلو یہ واضح ہوتا ہے کہ خطبہ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے تھے۔ حضورؐ کے خطبہ کو اس طرح چھوڑ کر چل دینے میں سوءِ ادب اور دین کی ناقدری کے جو پہلو مضمر ہیں وہ نہایت اہم ہیں۔ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اختیار کی، جس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کے دل، جیسا کہ سورۂ صف میں بیان ہوا ہے، کج کر دیے۔ اس وجہ سے قرآن نے ان پر پہلے ہی مرحلہ میں گرفت فرمائی۔

'قُلْ مَا عِندَ اللَّهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ التِّجَارَةِ ۚ وَاللَّهُ خَيْرُ الرَّازِقِينَ' فرمایا کہ اللہ کے

پاس مخلص اہلِ ایمان کے لیے جو اجرِ عظیم ہے اس کے طالب ہو۔ وہ اس دنیا کے لہو و لعب اور اس کی تجارت سے کہیں بہتر ہے۔ اگر اس دنیا کا بڑے سے بڑا نقصان کر کے بھی تم نے خدا اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کر لی تو اپنے خزف ریزوں کے عوض ابدی بادشاہی کے مالک بن جاؤ گے اور اگر خدا و رسول کو ناراض کر کے تم نے ساری دنیا کی دولت بھی سمیٹ لی تو آخر کتنے دنوں کے لیے۔ پس دانشمندی کا تقاضا یہی ہے کہ دنیا کے پیچھے مت بھاگو بلکہ جو چیز اللہ کے پاس ہے اس کے طالب ہو۔ اللہ بہترین روزی دینے والا ہے۔ وہ وہاں سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان بھی نہیں ہوتا اور ایسا رزق دیتا ہے جو ہر اعتبار سے رزقِ کریم ہوتا ہے۔

'لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ' اور 'خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ' میں عربیت کے جو اسلوب ہیں ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔

۴۔ جمعہ، خطبۂ جمعہ اور مقامِ نبوت سے متعلق قرآن کے چند اشارات

اگرچہ آیات کے تحت ان سے مستنبط ہونے والی اہم باتوں کی طرف ہم توجہ دلاتے آ رہے ہیں لیکن چند باتیں مزید توجہ کی مستحق ہیں۔

رسول کی تعلیم اللہ کی تعلیم ہے

ایک یہ کہ جمعہ کی نماز، اس کی اذان اور اس کے خطبہ سے متعلق یہاں مسلمانوں کو جو ہدایات دی گئی ہیں اور ان کی ایک غلطی پر جس طرح تنبیہ فرمائی گئی ہے اس کا انداز شاہد ہے کہ جمعہ کے قیام سے متعلق ساری باتیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام پائی ہیں، حالانکہ قرآن میں کہیں بھی جمعہ کا کوئی ذکر نہ اس سے پہلے آیا ہے نہ اس کے بعد ہے بلکہ روایات سے ثابت ہے کہ اس کے قیام کا اہتمام ہجرت کے بعد مدینہ پہنچ کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور لوگوں کو آپ ہی نے اس کے احکام و آداب کی تعلیم دی۔ پھر جب لوگوں سے اس کے آداب ملحوظ رکھنے میں کچھ کوتاہی ہوئی تو اس پر قرآن نے اس طرح گرفت فرمائی گویا براہِ راست اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے احکام و آداب کی خلاف ورزی ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کے دیے ہوئے احکام بعینہٖ اللہ تعالیٰ کے احکام ہیں، ان کا ذکر قرآن میں ہو یا نہ ہو۔ رسول کی طرف ان کی نسبت کی تحقیق تو ضروری ہے لیکن نسبت ثابت ہے تو ان کا انکار خود اللہ تعالیٰ کے احکام کا انکار ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود

خطبۂ جمعہ نمازِ جمعہ کا ضروری رکن ہے

دوسری یہ کہ خطبۂ جمعہ، نمازِ جمعہ کا ایک ضروری رکن ہے۔ اس سے بے پروائی یا اس کی ناقدری کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے۔ اس خطبہ ہی کے لیے نمازِ جمعہ کی رکعتیں چار کی جگہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، صرف دو رکھی گئی ہیں اور دو رکعتوں کی جگہ خطبہ کو دی گئی ہے جو دو رکعتوں ہی کی طرح دو حصوں میں منقسم ہوتا ہے۔ پھر نماز ہی کی طرح خطبہ بھی، قرآن کی تصریح کے مطابق، ذکر اللہ ہے، یعنی خطبہ اور نماز دونوں کی روح ایک ہی بتائی گئی ہے۔ بس اتنا فرق ہے کہ نماز میں امام اور مقتدی سب اللہ کی طرف

متوجہ ہو کر ذکرِ الٰہی کرتے ہیں اور خطبہ میں امام لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر اللہ کی تذکیر کرتا ہے۔ اس زمانے میں یہ عجیب معکوسیت ہے کہ اصل خطبۂ جمعہ چند معروف دعائیہ کلمات تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اور ائمہ حضرات اپنا سارا زورِ خطابت ان لمبی لمبی تقریروں پر صرف فرماتے ہیں جو وہ اصل خطبہ سے پہلے کرتے ہیں۔ ان تقریروں میں ذکرِ اللہ بہت کم اور دوسری غیر ضروری باتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں اور نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ سامعین یا تو اونگھتے ہیں یا سوتے ہیں اور جو سننے کی کوشش کرتے ہیں وہ طولِ بیان سے تھک جاتے ہیں۔

ایک افسوسناک صورتِ حال

بہت سے لوگ ان لمبی تقریروں سے بچنے کے لیے مسجد میں اس وقت پہنچتے ہیں جب وہ خطبہ شروع ہوتا ہے جو ہے تو اصلی لیکن اس زمانے میں وہ بالکل ایک رسمی چیز بن کر رہ گیا ہے۔ یہ صورتِ حال نہایت افسوس ناک ہے۔ ضروری ہے کہ اصل خطبہ کی اہمیت بحال کی جائے۔ اس کا طریقہ یہی ہے کہ لمبی لمبی تقریروں کی جگہ امام صاحبان اصل خطبہ ہی میں ضروری باتوں کی تذکیر کریں۔ خطبہ جامع، مختصر اور پُرحکمت ہو تاکہ لوگ دل چسپی سے سنیں اور مستفید ہوں۔ لوگوں کو تاکید کی جائے کہ خطبہ سننے کے لیے وہ ٹھیک وقت پر پہنچیں اور اس سے غفلت کے ان عواقب سے لوگوں کو آگاہ کیا جائے جو اوپر بیان ہوئے ہیں۔

جمعہ کے روز مسلمان کے لیے پسندیدہ روش

تیسری یہ کہ قرآن کے اسلوبِ بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ مسلمان کے لیے پسندیدہ روش، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ہے کہ جمعہ سے پہلے کا وقت وہ جمعہ کی تیاریوں میں صرف کرے۔ کوئی اور مصروفیت، بلا کسی شدید ضرورت کے، وہ ایسی نہ پیدا کرے جو اس تیاری میں مانع یا مخل ہو۔ یہ بات یوں نکلتی ہے کہ فرمایا ہے کہ، جب نماز ختم ہو جائے تب زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے رزق و فضل کے طالب بنو۔ ان الفاظ کے اندر یہ مضمون مضمر ہے کہ جمعہ کے دن کاروباری مصروفیت کے لیے موزوں وقت جمعہ سے پہلے کا نہیں بلکہ جمعہ کی نماز کے بعد ہی کا ہے بالخصوص اس طرح کی کاروباری مصروفیت جس کے لیے لوگوں کو بستی سے نکل کر زمین میں پھیلنے پر مجبور ہونا پڑے اور اندیشہ ہو کہ جمعہ کے لیے جو اجتماع مطلوب ہے اس انتشار سے اس کو نقصان پہنچے گا۔ ایک عام آدمی کو ہفتہ میں ایک دن ایسا ضرور ملنا چاہیے جس دن وہ حجامت بنوائے، کپڑے دھوئے، غسل کرے۔ ان کاموں کے لیے موزوں ترین دن جمعہ ہی کا ہو سکتا ہے اس لیے کہ یہ باتیں اس کے آداب میں سے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ ہدایت فرمائی کہ جمعہ کے دن دوسری معاشی و کاروباری سرگرمیاں اگر ضروری ہوں تو جمعہ کے بعد ہی شروع ہوں۔ یہی طریقہ ہمارے سلفِ صالحین کا رہا ہے اور یہی طریقہ آج بھی ان حلقوں میں پسندیدہ ہے جن میں اسلامی شعائر اور اسلامی تہذیب کا شعور زندہ ہے۔

جمعہ سے متعلق جو باتیں براہِ راست قرآن مجید سے مستنبط ہوتی ہیں، ہم نے اپنے طریقہ کے مطابق

اپنی بحث اپنی حد تک محدود رکھی ہے۔ دوسرے مسائل جن کا تعلق فقہ سے ہے، ہم نے ان سے تعرض نہیں کیا ہے۔ ان سطور پر اللہ تعالیٰ کی توفیق و رہنمائی سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

لاہور

۲۵۔ مارچ ۱۹۷۸ء

۱۴۔ ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

٦٣

المنٰفِقُون

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

یہ سورہ، سابق سورہ ـــــ الجمعۃ ـــــ کے تکملہ اور تتمّہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ سورۂ جمعہ کے آخر میں ان لوگوں کی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے جو مدّعی تو تھے ایمان کے لیکن اپنے دنیوی منافع اور کاروباری مصالح کے پھندوں میں اس طرح گرفتار رہتے کہ کوئی تجارتی قافلہ آجاتا تو اس کی خبر پاتے ہی پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خطبہ دیتے چھوڑ کر اس کی طرف بھاگ کھڑے ہوتے۔ اس سورہ میں منافقین کے کردار سے بحث کی ہے کہ یہ ایمان کا کوئی مطالبہ پورا کرنے کا حوصلہ تو رکھتے نہیں لیکن یہ خواہش رکھتے ہیں کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نظر میں ان کا بھرم قائم رہے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ قسمیں کھا کھا کر پیغمبر کو یقین دلاتے ہیں کہ وہ آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں لیکن اللہ بھی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ان کے اعمال گواہ ہیں کہ یہ نہ اللہ پر ایمان رکھتے نہ رسول پر۔ یہ اپنی قسموں کو بطور ڈھال استعمال کر رہے ہیں اور ان کی آڑ میں اپنے نفاق کو چھپاتے ہیں۔ انھوں نے ایمان کی راہ میں جو قدم اٹھایا وہ مال و جان کی محبت میں پھنس کر واپس لے لیا اس وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے اور اب وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے ہیں۔

(ب) سورہ کے مطالب کی ترتیب

سورہ کے مطالب کی ترتیب بالکل واضح ہے۔ اس کے پہلے رکوع میں جو آٹھ آیات پر مشتمل ہے، منافقین کے کردار سے بحث ہے جس میں ان کی اصل بیماری یہ بتائی گئی ہے کہ یہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں۔ دوسرے رکوع میں صرف تین آیتیں ہیں جن میں مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ وہ مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر اللہ کی یاد سے غافل نہ ہوں۔ اگر آج انھوں نے اللہ کی راہ میں انفاق کر کے اپنے مال سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا تو مہلتِ حیات گزر جانے کے بعد اپنی محرومی پر پچھتائیں گے اور یہ پچھتانا بالکل بے سود ہوگا۔ گویا پہلے رکوع میں مرض نفاق کے اصل سبب کی نشان دہی کی گئی ہے اور دوسرے میں اس سے مسلمانوں کو بچنے کی تاکید ہے۔

سُوْرَةُ الْمُنٰفِقِيْنَ (۶۳)

مَدَنِيَّةٌ ــــــــــــــــــــ آيات: ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ آیات
يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱﴾ ۱-۱۱
اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ
سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا
فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿۳﴾ وَاِذَا رَاَيْتَهُمْ
تُعْجِبُكَ اَجْسَامُهُمْ ؕ وَاِنْ يَّقُوْلُوْا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ؕ كَاَنَّهُمْ
خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ؕ يَحْسَبُوْنَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ؕ هُمُ الْعَدُوُّ
فَاحْذَرْهُمْ ؕ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۫ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ﴿۴﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
تَعَالَوْا يَسْتَغْفِرْ لَكُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ وَرَاَيْتَهُمْ
يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۵﴾ سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ
لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۶﴾ هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا
عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ؕ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ﴿٧﴾ يَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ
اِلَى الْمَدِيْنَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْهَا الْاَذَلَّ ۭ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ
وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٨﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ　ع ۱ / ۸ / ۱۳
اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ
يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿٩﴾ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا
رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ
رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ
الصّٰلِحِيْنَ ﴿١٠﴾ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَاۗءَ اَجَلُهَا ۭ وَاللّٰهُ
خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١١﴾　ع ۲ / ۳ / ۱۴

ترجمۂ آیات ۱ - ۱۱

جب منافق تمھارے پاس آتے ہیں، کہتے ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں کہ بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ بے شک تم اس کے رسول ہو اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور وہ اللہ کی راہ سے رک گئے ہیں۔ بے شک نہایت ہی برا ہے جو یہ کر رہے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ پہلے ایمان لائے، پھر انھوں نے کفر کیا تو ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی پس یہ سمجھنے سے عاری ہو گئے۔ ۱-۳

اور جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کے جسم تمھیں اچھے لگتے ہیں اور اگر وہ بات کرتے ہیں تو تم ان کی بات سنتے ہو لیکن ان کی مثال ایسی ہے گویا وہ لکڑی کے کندے ہوں جنھیں دیوار سے ٹیک لگا دی گئی ہو۔ وہ ہر خطرہ اپنے ہی اوپر سمجھتے

ہیں۔ اصلی دشمن وہی ہیں، پس ان سے بچ کے رہو۔ اللہ ان کو غارت کرے! کس طرح ان کی عقل الٹ گئی ہے! ۴

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ، اللہ کا رسول تمہارے لیے استغفار کرے تو وہ اپنے سر مٹکاتے ہیں اور تم ان کو دیکھتے ہو کہ وہ غرور کے ساتھ اعراض کرتے ہیں۔ ان کے لیے یکساں ہے، تم ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو، اللہ ان کو ہرگز معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ نافرمانوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔ ۵-۶

یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ ان لوگوں پر تم لوگ اپنے مال خرچ نہ کرو جو رسول اللہ کے ساتھ ہیں تاکہ وہ منتشر ہو جائیں۔ اور اللہ ہی کے ہیں آسمانوں اور زمین کے خزانے لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹے مدینہ کو تو جو غالب ہیں وہ وہاں سے ان کو نکال چھوڑیں گے جو بالکل بے حیثیت ہیں۔ حالانکہ غلبہ اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لیے ہے لیکن یہ منافقین نہیں جانتے۔ ۷-۸

اے ایمان والو، اللہ کی یاد سے تمھیں غافل نہ کرنے پاویں تمہارے مال اور نہ تمہاری اولاد اور جو ایسا کریں گے تو یاد رکھیں کہ وہی لوگ گھاٹے میں پڑے اور ہم نے جو کچھ تمھیں بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ آدھمکے تم میں سے کسی کی موت، پھر وہ حسرت سے کہے کہ اے رب! تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا اور ہوں نیکوکاروں میں سے بنتا! اور اللہ ہرگز کسی جان کو ڈھیل دینے والا نہیں جب کہ اس کی مقررہ مدت آپہنچے گی اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۹-۱۱

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۘ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ (۱)

پختہ کار منافقین کا کردار

ایک گروہ کے منافقانہ طرزِ عمل کی طرف اشارہ پچھلی سورہ میں بھی ہوا ہے لیکن وہاں بات عام صیغہ سے درپردہ فرمائی گئی تھی، اس سورہ میں پردہ بالکل اٹھا دیا گیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس میں ان منافقین کا کردار زیرِ بحث ہے جو نفاق میں اتنے پختہ ہو چکے تھے کہ ان سے کسی اصلاح کی توقع باقی نہیں رہی تھی چنانچہ ان کے بارے میں آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا بھی ہے کہ ان کے لیے تم مغفرت مانگو بھی تو اللہ ان کی مغفرت کرنے والا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے مقام میں یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے مغفرت مانگو جب بھی اللہ ان کی مغفرت فرمانے والا نہیں ہے۔

فرمایا کہ یہ منافقین جب تمہارے پاس (پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس) آتے ہیں تو قسم کھا کر اقرار کرتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں لیکن اللہ بھی قسم کھا کر کہتا ہے کہ یہ منافقین بالکل جھوٹے ہیں۔

ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ عربی میں 'نَشْهَدُ' اور 'وَاللّٰهُ يَشْهَدُ' کے الفاظ قسم کے مفہوم کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی منافقین قسمیں کھا کھا کر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مومن و مسلم ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ ان کو قسمیں کھانے کی ضرورت اس وجہ سے پیش آتی کہ ان کی پیہم غلطیوں نے ان کو اس قدر ساقط الاعتبار بنا دیا تھا کہ وہ خود بھی محسوس کرنے لگے تھے کہ جب تک قسم کھا کے وہ بات نہیں کہیں گے کوئی اس کو باور نہیں کرے گا۔ جس آدمی کو اپنے عمل پر اعتماد ہوتا ہے وہ بے ضرورت قسم نہیں کھاتا لیکن جس کو اپنے عمل پر بھروسہ نہ ہو اس کا واحد سہارا قسم ہی ہوتی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زیادہ قسم کھانے والے کی صفت قرآن میں 'مَهِيْن' آئی ہے اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ 'وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ' (القلم - ۶۸:۱۰) (اور تم زیادہ قسمیں کھانے والے ذلیل کی بات پر کان نہ دھرو)۔

'وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ' یہ فقرہ غایت درجہ بلیغ اور برمحل ہے۔ فرمایا کہ جہاں تک تمہارے رسول ہونے کا تعلق ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو ان کی شہادت کی محتاج نہیں ہے۔ اللہ کو خوب علم ہے کہ تم اس کے رسول ہو۔ لیکن اللہ یہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین اپنی اس شہادت میں جھوٹے ہیں۔

اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲)

قسم کو سپر بنانے والوں کا انجام

لیکن انھوں نے تمھاری گرفت سے محفوظ رہنے کے لیے اپنی قسموں کو ڈھال بنایا ہے کہ ان کی سازشوں اور شرارتوں کے سبب سے، جو وہ اسلام کے خلاف برابر کر رہے ہیں، تمھیں ان کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو، وہ اسلام کے برابر مخلص سمجھے جاتے رہیں۔ سورۂ مجادلہ آیت ۱۴ میں ان منافقین ہی کی یہ سازش بیان ہوئی ہے کہ انھوں نے خدا کی مغضوب قوم یہود سے دوستی گانٹھ رکھی ہے۔ ایک طرف اپنی قسموں کے ذریعہ سے انھیں اطمینان دلا رکھا ہے کہ ہم آپ لوگوں کے ساتھ ہیں، دوسری طرف مسلمانوں کو بھی قسم کھا کر اطمینان دلاتے ہیں کہ ہم تو آپ لوگوں کے ساتھی ہیں۔ اس کے بعد معمولی تغیر الفاظ کے ساتھ یہی آیت وہاں بھی آئی ہے۔ فرمایا ہے:

اِتَّخَذُوْٓا اَیْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (المجادلۃ - ۵۸ : ۱۶)

انھوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے پس وہ اللہ کی راہ سے رک گئے اور ان کے لیے ایک ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

یعنی اس سپر کی آڑ میں وہ بزعم خود اپنے کو یہود سے بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں اور مسلمانوں سے بھی اور اس طرح انھوں نے اللہ کی راہ میں جو قدم اٹھایا تھا وہ روک لیا ہے لیکن یہ پناہ گاہ زیادہ عرصہ تک ان کی حفاظت نہ کر سکے گی بلکہ بہت جلد ان کو ایک ذلیل کرنے والے عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

'فَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ' لفظ 'صَدَّ' لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ لازم کے مفہوم میں ہے۔ یعنی پہلے اسلام کی طرف انھوں نے قدم بڑھایا لیکن قسموں کی آڑ میں اب رک گئے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ جب مجرد قسموں کے بل پر بھی اپنی اسلامیت کی دھونس جمائی جا سکتی ہے اور مسلمانوں کو دھوکا دیا جا سکتا ہے تو اس سے آگے بڑھ کر اپنے لیے خطرات کو کیوں دعوت دی جائے۔

فرمایا کہ 'اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ' وہ اس کو بڑی دانشمندانہ سیاست سمجھ رہے ہیں لیکن یہ دانشمندانہ سیاست نہیں بلکہ نہایت ہی احمقانہ چال ہے جس کے نہایت مہلک نتائج ان کے آگے آئیں گے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا یَفْقَهُوْنَ (۳)

فرمایا کہ یہ راہ انھوں نے اس وجہ سے اختیار کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے جس کے سبب سے وہ فکر سلیم کی نعمت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس مہر کے لگنے کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کی راہ اختیار کر لی۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جن کو وہ ایک مرتبہ اسلام کی روشنی دکھا دیتا ہے اگر وہ اس کی قدر کرتے ہیں تو ان کی روشنی میں اضافہ کرتا ہے اور اگر قدر نہیں کرتے بلکہ مڑ مڑ کر پیچھے ہی کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی وہ روشنی بھی سلب ہو جاتی ہے اور ان کے دل پر مہر بھی کر دی جاتی ہے۔ جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ پھر وہ صحیح سوچنے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ یہود کے دلوں پر جو مہر لگی اس کے وجوہ اور اثرات کی تفصیل سورۂ بقرہ میں بیان ہوئی ہے۔ اس پر ایک

نظر ڈال لیجیے۔ انہی لوگوں کے بارے میں حضرت مسیح نے فرمایا کہ ان سے وہ بھی لے لیا جاتا ہے جو ان کے پاس ہوتا ہے۔

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ۖ كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ۚ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ۚ قَاتَلَهُمُ اللَّهُ ۖ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ (۴)

منافقین کے ظاہر اور باطن کی تصویر

یہ ان منافقین کی تصویر ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ چند چھوٹے چھوٹے جملوں میں ان کے ظاہر اور باطن دونوں کی اس طرح تصویر کھینچ دی گئی ہے کہ کوئی پہلو بھی مخفی نہیں رہ گیا ہے۔ اوپر کے دو فقروں میں ان کے ظاہر کی تصویر ہے۔ بعد کے دو فقروں میں ان کے باطن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے ہوشیار رہنے کی تاکید اور ساتھ ہی ان کی حالت پر اظہارِ افسوس ہے۔

'وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ' فرمایا کہ جب تم ان کو دیکھتے ہو تو ان کے پلے ہوئے جسم اور ان کی پالش کی ہوئی شکلیں تمھیں دل کش معلوم ہوتی ہیں۔ یہ امر واضح رہے کہ ان منافقین کے مالی حالات اچھے تھے۔ اوّل تو انھوں نے حرام و حلال، ہر راستہ سے، دولت اکٹھی کر رکھی تھی۔ دوسرے یہ انتہا درجہ کے بخیل تھے، اپنے ذاتی آرام و عیش کے سوا کسی دوسرے دینی و اجتماعی کام پر کوڑی بھی خرچ کرنے کے روادار نہ تھے۔ ان کی اس رفاہیت کا اثر ان کے جسموں اور ان کی شکلوں میں نمایاں تھا۔ ان کا سردار مشہور منافق عبداللہ بن اُبی بڑا دولت مند تھا۔ اس کے جتھے کے دوسرے آدمی بھی خوش حال تھے۔

'وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ' یعنی یہ بڑے چرب زبان بھی ہیں۔ جب باتیں کرتے ہیں تو اسلام کی حمیت و حمایت میں اس طرح تقریر کرتے ہیں کہ مخاطب کا دل موہ لیتے ہیں اور وہ ان کی باتیں سننے لگتا ہے۔ اوپر ذکر آیا ہے کہ یہ لوگ اللہ و رسول کو اپنی وفاداری کا یقین اپنی قسموں اور جادو بیانی سے دلاتے ہیں۔ سورۂ محمد میں ان کی یہ خصوصیت بھی بیان ہوئی ہے کہ یہ زبان سے جوشِ جہاد کا اظہار بہت کرتے ہیں لیکن جب جہاد کا حکم دے دیا گیا تو چھپنے لگے۔ ان منافقین کو چونکہ اندازہ تھا کہ ان کی بزدلی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ظاہر ہے اور عام مسلمانوں پر بھی اس وجہ سے جب بھی یہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو کوشش کرتے کہ اپنے زورِ خطابت سے حضورؐ کو یہ باور کرا دیں کہ وہ اسلام کے فدائی اور اس کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے ہیں۔ حضورؐ اگرچہ زبان کے ان غازیوں سے اچھی طرح واقف تھے لیکن کریم النفسی کے سبب سے آپؐ ان کی باتیں سن لیتے جس سے ان کو اطمینان ہو جاتا کہ ان کی جادو بیانی کارگر ہو گئی۔

'كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ' یہ ان کے باطن پر عکس ڈالا گیا ہے کہ ہر چند ان کے جسم اور ان کی شکلیں دل کش ہیں لیکن ان کے جسموں کے اندر جو دل ہیں وہ مردہ ہیں۔ ان پر، جیسا کہ اوپر والی

والی آیت میں فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ہے۔ اس روحانی اور قلبی لعنت کے سبب سے تمہاری مجلس میں ان کی مثال بالکل ایسی ہوتی ہے کہ گویا لکڑی کے کھوکھلے کندے ہوں جنھیں لباس پہنا کر دیواروں سے ٹیک لگا دی گئی ہو۔

یَحۡسَبُوۡنَ کُلَّ صَیۡحَۃٍ عَلَیۡہِمۡ۔ 'صَیۡحَۃٌ' کے لغوی معنی تو چیخ کے ہیں لیکن یہ خطرہ کے معنی میں بھی آتا ہے اور یہاں اسی معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ لوگ اپنی طلاقتِ لسانی سے تمھیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ یہ بڑے بہادر اور اسلام کی راہ میں ہر قربانی کے لیے تیار ہیں لیکن یہ پرلے سرے کے بزدل ہیں۔ کہیں بھی کوئی خطرہ نمودار ہو یہ اپنی بزدلی کے سبب سے خیال کرتے ہیں کہ ہو نہ ہو یہ بجلی انہی پر گرنے والی ہے۔ جن کی بزدلی کا یہ حال ہے ان سے اس وقت کیا توقع کی جا سکتی ہے جب فی الواقع انھیں کسی حقیقی خطرے کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔

ہُمُ الۡعَدُوُّ فَاحۡذَرۡہُمۡ۔ یعنی یہ تو اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے تمہاری نظروں میں دوسروں کو مشکوک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اسلام کے اصلی دشمن درحقیقت یہی ہیں۔ ان سے ہر وقت چوکنے رہو۔ یہ بات یہاں ملحوظ رہے کہ ان منافقین کی ایک چال یہ بھی تھی کہ یہ جن جرائم کا ارتکاب خود کرتے ان کا الزام دوسرے بے گناہ مسلمانوں کے سر تھوپتے تاکہ حضورؐ کے سامنے یہ بے گناہ بنے رہیں۔

قٰتَلَہُمُ اللّٰہُ ۫ اَنّٰی یُؤۡفَکُوۡنَ۔ یہ ان کو زجر و ملامت بھی ہے اور ان کے حال پر اظہارِ افسوس بھی۔ فرمایا کہ اللہ ان کو غارت کرے! یہ کس طرح اندھے کر دیے گئے ہیں کہ ان کا ہر قدم الٹا ہی پڑ رہا ہے۔

ان منافقین کے اس کردار کی تصویر قرآن میں جگہ جگہ کھینچی گئی ہے۔ ہم بخیالِ اختصار صرف ایک مثال سورۂ بقرہ سے پیش کرتے ہیں:

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ یُّعۡجِبُکَ قَوۡلُہٗ فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیُشۡہِدُ اللّٰہَ عَلٰی مَا فِیۡ قَلۡبِہٖ ۙ وَہُوَ اَلَدُّ الۡخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الۡاَرۡضِ لِیُفۡسِدَ فِیۡہَا وَیُہۡلِکَ الۡحَرۡثَ وَالنَّسۡلَ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الۡفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِیۡلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتۡہُ الۡعِزَّۃُ بِالۡاِثۡمِ فَحَسۡبُہٗ جَہَنَّمُ ؕ وَلَبِئۡسَ الۡمِہَادُ (البقرۃ - ۲: ۲۰۴ - ۲۰۶)	اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جن کی بات دنیا کی زندگی کے باب میں تمھیں دل کش لگتی ہے اور وہ اپنے دل کے حال پر اللہ کو گواہ ٹھہراتے ہیں حالانکہ وہ بدترین دشمن ہیں اور جب وہ تمہارے پاس سے ہٹتے ہیں تو ان کی ساری بھاگ دوڑ زمین میں اس لیے ہوتی ہے کہ اس میں فساد برپا کریں اور مال و جان کو تباہ کریں۔ اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا اور جب ان کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈرو تو عزت کا خیال ان کو گناہ میں گرفتار کر لیتا ہے تو ان کے لیے جہنم کافی ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

وَاِذَا قِیۡلَ لَہُمۡ تَعَالَوۡا یَسۡتَغۡفِرۡ لَکُمۡ رَسُوۡلُ اللّٰہِ لَوَّوۡا رُءُوۡسَہُمۡ وَرَاَیۡتَہُمۡ

يَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ (۵)

جھوٹی عزتِ نفس

یہ وہی بات ذرا مختلف الفاظ میں بیان ہوئی ہے جو سورۂ بقرہ کی مندرجہ بالا آیت میں 'وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ' کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سازشوں اور شرارتوں کے نوٹس میں آنے کے بعد جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہو کر توبہ کرو تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے لیے استغفار کریں اور آپ کا استغفار اللہ کے ہاں تمہارے لیے سفارش بنے تو اکڑتے اور اپنے سر مٹکاتے ہیں اور نہایت غرور کے ساتھ اس سے اعراض کرتے ہیں۔

ان کے مغرورانہ اعراض کا اظہار ان کے جوارح سے جس طرح ہوتا ہے اس کی تعبیر 'لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ' کے الفاظ سے کی گئی ہے اور یہ بلیغ ترین تعبیر ہے۔ باطن میں اس کا جو اثر مترتب ہوتا ہے اس کو 'یَصُدُّوْنَ وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ' کے الفاظ سے بیان فرمایا گیا ہے۔ گویا ان کا ظاہر و باطن دونوں سامنے کر دیا گیا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ جن لوگوں کے اندر اخلاقی جرأت نہیں ہوتی وہ اپنے گناہوں کے ظاہر ہو جانے کے بعد بھی ان کا اعتراف یا ان پر اظہارِ ندامت نہیں کرتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ایک بار اعترافِ جرم کر لیا تو ہمیشہ کے لیے بھرم ختم ہو جائے گا۔ ان کی یہ کمزوری ان کو ان کے گناہوں کے ساتھ باندھے رکھتی ہے۔ اسی چیز کو سورۂ بقرہ والی آیت میں 'اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَهُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ۭ لَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (۶)

گناہوں پر اصرار کرنے والوں کو اللہ مغفرت سے محروم کر دیتا ہے

ان کے اس غرور و اعراض کی سزا ان کو یہ ملی کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ان کے بارے میں یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ تم ان کے لیے مغفرت مانگو یا نہ مانگو، اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو اپنی ہدایت سے نہیں نوازتا جو نافرمانی پر اصرار کرتے ہیں۔ وہ ہدایت صرف انہی کو دیا کرتا ہے جو اپنے گناہوں پر شرمسار ہو کر اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ سورۂ نساء میں یہ مضمون اس طرح بیان ہوا ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا (النساء: ۴-۶۴)

اور اگر وہ، جب کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، تمہارے پاس آتے اور اللہ سے مغفرت مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے مغفرت مانگتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے والا مہربان پاتے۔

جو لوگ اللہ اور رسول سے اکڑتے ہیں سورۂ توبہ میں ان کے بارے میں یہ فیصلہ فرمایا:

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط (التوبۃ ۹: ۸۰)

ان کے لیے مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ستر بار بھی ان کے لیے مغفرت چاہو گے تو بھی اللہ ان کو معاف کرنے والا نہیں ہے۔

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا ط وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ (۷)

اللہ تعالیٰ کے غضب کا سبب

یہ سبب بتایا ہے کہ یہ لوگ اللہ کے اس غضب کے مستحق کیوں ٹھہرے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کے لیے ستر بار مغفرت مانگیں جب بھی اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمانے والا نہیں ہے۔ ارشاد ہوا کہ یہی لوگ ہیں جو لوگوں کو روکتے ہیں کہ رسول اللہ کے ساتھیوں پر خرچ نہ کرو تاکہ یہ منتشر ہو جائیں۔

روایات میں آتا ہے کہ ۶ھ میں غزوۂ بنی مصطلق کے موقع پر، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس چشمہ پر پڑاؤ ڈالا وہاں پانی کے بارے میں ایک غریب مہاجر اور ایک انصاری میں جھگڑا ہو گیا۔ مہاجر نے انصاری کے تھپڑ مار دی۔ انصاری نے انصار کی دہائی دی اور مہاجر نے مہاجرین کی۔ دونوں طرف کے آدمی تلواریں سونت سونت کر اکٹھے ہو گئے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سے بات زیادہ بڑھنے نہ پائی، لیکن عبداللہ بن اُبیّ نے جو اس طرح کے مواقع کی ہمیشہ گھات میں رہتا، موقع سے فائدہ اٹھا کر مہاجرین کے خلاف انصار کے جذبات بھڑکانے کے لیے نہایت زہر آلود فقرے کہے۔ اس نے کہا کہ "یہ ہمارے گھر میں پناہ پا کر اب ہمیں پر غرّانے لگے ہیں۔ سچ کہا ہے جس نے کہا ہے کہ کتے کو موٹا کرو بالآخر تمہی کو کاٹے گا۔ خدا کی قسم! اب ہم پلٹے تو جو باعزت ہیں وہ رذیلوں کو وہاں سے نکال کے رہیں گے۔"

انصار کے جو آدمی اس دوران میں اس کے اردگرد جمع ہو گئے تھے ان کو مخاطب کر کے اس نے کہا: "یہ تمہاری اپنی غلطی کا خمیازہ ہے جو تمہیں بھگتنا پڑ رہا ہے۔ تم نے اپنے گھر میں ان کو اتارا اور اپنے مال میں ان کو حصہ دار بنایا۔ خدا کی قسم! اگر تم ان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو یہ کب کے یہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے ہوتے۔"

آیت میں اس کے انہی فقروں میں سے بعض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ جن کے دلوں کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف یہ بغض و حسد بھرا ہوا ہے اللہ تعالیٰ ان کو کیسے معاف کر سکتا ہے!

عبداللہ بن ابی کے طعنوں کا جواب

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ یہ عبداللہ بن ابی کی بات کا جواب ہے کہ یہ منافق سمجھتا ہے کہ اگر وہ اور اس کے ساتھی مہاجرین کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیں گے تو ان کا کوئی سہارا باقی نہیں رہ جائے گا حالانکہ آسمانوں اور زمین کے سارے خزانے اللہ ہی کے قبضہ میں ہیں۔ وہی جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور جن سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے لیکن ان منافقوں کے لیے

پر چونکہ مہر لگ چکی ہے اس وجہ سے یہ اس حقیقت کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔

يَقُولُونَ لَئِن رَّجَعْنَا إِلَى الْمَدِينَةِ لَيُخْرِجَنَّ الْأَعَزُّ مِنْهَا الْأَذَلَّ ۚ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ (۸)

یہ عبداللہ بن اُبی کے اس دوسرے زہر آلود فقرے کی طرف اشارہ ہے جس کا حوالہ اوپر گزر چکا ہے۔ اس نے انصار کو مہاجرین کے خلاف اکسانے کے لیے یہ بھی کہا کہ اب مدینہ واپس ہوتے ہی پہلا کام یہ کرنا ہے کہ جو عزت و اقتدار والے ہیں (یعنی انصار) وہ ان لوگوں کو مدینہ سے نکال باہر کریں گے جو ذلیل ہیں۔ یہ اشارہ اس کا مہاجرین کی طرف تھا۔ یعنی اس نے وہی جاہلی نعرہ لگایا جو اہلِ عرب کا شعار تھا کہ اس سرزمین پر ہم ہمیشہ عزت و اقتدار والے رہے ہیں اور یہ ہمارا ہی حق ہے۔ ہم یہ کس طرح گوارا کر سکتے ہیں کہ جو ہمارے ہاں پناہ لینے آئے وہ ہمارے آدمیوں کو طمانچے لگائیں!

'وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَعْلَمُونَ' یہ اس نعرۂ جاہلی کا جواب ہے کہ عزت تو اللہ، اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے لیے ہے اور سنتِ الٰہی کے مطابق اب اس کے ظہور کا وقت آ گیا ہے لیکن یہ منافقین اس کو نہیں جانتے۔ اس سنت کا حوالہ سورۂ مجادلہ میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت
وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ ۝	کر رہے ہیں ذلیل ہونے والے وہی بنیں گے۔
كَتَبَ اللَّهُ لَأَغْلِبَنَّ أَنَا وَرُسُلِي ۚ	اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا
إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ۝	اور میرے رسول، بے شک اللہ قوی اور غالب
(المجادلة - ۵۸: ۲۰-۲۱)	ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ (۹)

مسلمانوں کو تنبیہ

یہ آخر میں مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی کہ تم ان منافقوں کی روش کی تقلید نہ کرنا۔ ان کو مال و اولاد کی محبت نے خدا سے غافل کر دیا ہے۔ اب ان کے اندر آخرت کے لیے کچھ کرنے کا حوصلہ باقی نہیں رہا۔ اگر تم بھی انہی کی طرح مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر خدا اور آخرت کو بھول بیٹھے تو یاد رکھو کہ اصل نامرادی و محرومی یہی ہے۔ جو لوگ اللہ کو بھلا بیٹھتے ہیں وہ خود اپنے انجام کو بھلا بیٹھتے ہیں اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ سورۂ مجادلہ میں منافقین کے بارے میں فرمایا ہے: اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ فَأَنسَاهُمْ ذِكْرَ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ ۚ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ

الْخٰسِرُوْنَ' (المجادلۃ - ۵۸: ۱۹) (ان پر شیطان نے تابو پا لیا ہے پس ان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہی لوگ شیطان کی پارٹی ہیں اور سن لو کہ شیطان کی پارٹی ہی بالآخر نامراد ہونے والی ہے)۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۰)

یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کو زندہ رکھنے، مال و اولاد کے فتنہ سے بچنے اور نفاق کے حملے سے محفوظ رہنے کا طریقہ بتایا ہے کہ جو رزق اللہ نے تمھیں بخشا ہے ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی موت سے پہلے پہلے اس میں آخرت کے لیے جو کمائی کرنی ہے کر لے۔ ایسا نہ ہو کہ موت آ دھمکے تب وہ حسرت کے ساتھ کہے کہ اے رب! تو نے مجھے کچھ اور مہلت کیوں نہ دی کہ میں صدقہ کرتا۔ اگر ایسا کر سکتا تو میں بھی صالحین کے زمرہ میں ہوتا!

سورۂ توبہ میں منافقین کے کردار کا یہ پہلو خاص طور پر نمایاں ہوا ہے کہ وہ بخل کے سبب سے اپنی مٹھیاں بھینچے رہتے ہیں۔ جب یہ غریب تھے تو ہر جگہ یہ اپنے اس شوق اور اس تمنا کا اظہار کرتے تھے کہ اگر اللہ نے ہمارے حالات بھی سدھار دیے تو ہم اللہ کی راہ میں خوب خرچ کریں گے اور دین کی بڑی بڑی خدمتیں کر کے صالحین میں اپنا نام روشن کریں گے لیکن جب اللہ نے اپنے فضل سے ان کی تمنا پوری کر دی تو منہ پھیر کر چل دیے۔ اس بخل کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں کے اندر نفاق کی جڑ جما دی اور صدقہ کر کے صالحین میں سے بننے کا جو موقع خدا نے انھیں عطا کیا تھا وہ اس سے محروم ہو گئے۔ فرمایا ہے:

وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰىنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ۔ (التوبۃ - ۹: ۷۵-۷۷)	اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنھوں نے عہد کیا کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل سے نوازا تو ہم خوب صدقہ کریں گے اور صالحین میں سے ہوں گے۔ تو جب اللہ نے ان کو اپنے فضل میں سے عطا فرمایا وہ اس میں بخیل بن بیٹھے اور برگشتہ ہو کر منہ پھیر لیا تو اس کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں میں نفاق جما دیا۔

سورۂ حدید کی تفسیر سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ انفاق سے پہلو تہی کرنے والے اس دنیا ہی میں نفاق سے آلودہ ہو کر مومنین صالحین سے ممیز نہیں ہو جاتے بلکہ آخرت میں بھی وہ اس کے نتائج سے اس طرح دوچار ہوں گے کہ صورت حال ان کے لیے حسرت کا باعث ہو گی۔ دنیا میں صدقہ کرنے والے مردوں اور عورتوں کو اللہ تعالیٰ وہاں صالحین کے اس زمرہ کے ساتھ اٹھائے گا جس میں صدیقین اور شہدا

ہوں گے اور نور جن کا ہم رکاب ہو کر جنت کی طرف رہنمائی کرے گا۔ منافق مرد اور عورتیں اس نور سے حصہ نہ پا سکیں گے۔ ان کے اور صالحین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی۔ وہاں ان پر واضح کر دیا جائے گا کہ صالحین کے زمرہ میں شامل ہونے کی شرط انفاق اور صدقہ تھا جس سے دنیا میں انھوں نے گریز کیا۔

اس آیت میں 'اَكُنْ' جو مضارع کی ساکن شکل ہے، کا عطف بظاہر 'فَاَصَّدَّقَ' پر ہے جو منصوب ہے لیکن ہمارے نزدیک اصل میں 'اَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ' شرط محذوف کا جواب ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو مطلب یہ ہوگا کہ اگر میں یہ صدقہ کر سکتا تو نیکوکاروں میں سے بنتا۔ 'فَاَصَّدَّقَ' کی صورت میں چونکہ اس شرط کا قرینہ واضح تھا اس وجہ سے اسے حذف کر دیا گیا۔

وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (۱۱)

یعنی جب موت کی گھڑی سر پر آ جائے گی تو اس قسم کی حسرت، حسرت ہی رہے گی۔ اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ زندگی کی فرصت گزر جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی کو مہلت نہیں دیا کرتا اور اللہ تعالیٰ کو یہ بھی پتہ ہے کہ آج انفاق اور نیکی کی زندگی بسر کرنے کا جو عہد تم کر رہے ہو یہ بالکل بے حقیقت ہے۔ اگر تمھیں مزید مہلت بھی ملی تو تم وہی کرو گے جو اب تک کرتے رہے ہو۔

ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر بتوفیقِ ایزدی تمام ہوئی۔ فَلِلّٰہ الحمد ولہ المنۃ۔

لاہور

۳۰- مارچ ۱۹۷۸ء

۱۹- ربیع الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

٦٤

التّغابن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ـــــ المنافقون ـــــ اس تنبیہ پر ختم ہوئی ہے کہ مال و اولاد کی محبت میں پھنس کر اللہ کی یاد اور اس کے حقوق سے غافل نہ ہونا بلکہ جو رزق و فضل اس نے بخشا ہے اس میں آخرت کے لیے کمائی کر لو۔ ورنہ جب موت کی گھڑی آ جائے گی تو غفلت کرنے والے حسرت سے کہیں گے کہ کاش اللہ تعالیٰ ان کو تھوڑی سی مہلت دیتا تو وہ اپنا مال اس کی راہ میں خرچ کر کے کچھ نیکی کی کمائی کر لیتے لیکن ان کی یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی۔ گزرا ہوا وقت پھر واپس نہیں آتا۔ اس سورہ میں اسی مضمون کو عمود کی حیثیت سے لیا ہے اور یہ واضح فرمایا ہے کہ اس دنیا کی زندگی ہی کل زندگی نہیں ہے بلکہ اصل زندگی آخرت کی ہے جو شدنی ہے اور یہ فیصلہ وہیں ہونا ہے کہ اس دنیا میں آ کر کون ہارا اور کون جیتا تو جو آخرت کی فوزِ عظیم حاصل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو اس پر واجب ہے کہ وہ اللہ و رسول کی رضا جوئی کی راہ میں ہر قربانی کے لیے تیار رہے اور اس معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت اور کسی ناصح کی نصیحت کی پروا نہ کرے۔ بسا اوقات آدمی کے بیوی بچے اس راہ میں مزاحم ہوتے ہیں اور ان کی محبت بہتوں کو پست حوصلہ کر دیتی ہے۔ جو شخص اپنے ایمان کو سلامت رکھنا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس راہ میں رکاوٹ بننے والے بیوی بچوں کو بھی اپنے لیے فتنہ سمجھے اور ان سے بچ کے رہے۔ اگرچہ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ رکھے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۴) اللہ نے انسان کو اس دنیا میں بے غایت و بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ انسان کی تخلیق میں قدرت کا جو اہتمام نمایاں ہے وہ خود اس بات پر شاہد ہے کہ اس کے لیے جزا و سزا کا ایک دن مقرر ہے اور اللہ جو سارے جہان کا خالق و مالک ہے وہ ہر ایک کے ہر قول و فعل سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔

(۵-۷) تاریخ سے اس بات کی شہادت کہ جن قوموں نے رسولوں کے انذارِ قیامت کی تکذیب کی اور ان کے نہایت واضح دلائل اس غرور کی بنا پر رد کر دیے کہ کسی بشر کو رسول ماننا انھوں نے اپنی توہین خیال کیا، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہلاک کر دیا۔ وہ اس دنیا میں بھی کیفرِ کردار کو پہنچیں اور آخرت میں بھی ان کے

لیے دردناک عذاب ہے۔

(۸-۱۰) اللہ اور رسول اور قرآن پر ایمان لانے کی دعوت اور اس دن کے لیے تیار رہنے کی ہدایت جو ہار جیت کے فیصلہ کا اصلی دن ہو گا جس دن ایمان اور عمل صالح والوں کو اللہ تعالیٰ جنت کی فوزِ عظیم سے سرفراز فرمائے گا اور جنھوں نے کفر اور تکذیب کا ارتکاب کیا ہو گا ان کو ہمیشہ کے لیے دوزخ کے عذاب میں جھونک دے گا۔

(۱۱-۱۳) دنیا میں جو مصیبتیں بھی پیش آتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اذن سے پیش آتی ہیں۔ اہل ایمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ان سے ڈر کر اللہ اور رسول کی اطاعت سے منہ موڑ لیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اللہ پر بھروسہ رکھیں کہ وہ ان کی مدد فرمائے گا۔ اگر مصائب سے مرعوب ہو کر اللہ و رسول سے اعراض کریں گے تو اس کا خمیازہ وہ بھگتیں گے۔ رسول کا کام پہنچا دینا تھا، وہ اس نے کر دیا۔ اب ذمہ داری لوگوں کی اپنی ہے۔

(۱۴-۱۵) مسلمانوں کو یہ تنبیہ کہ آدمی کے بیوی بچے بسا اوقات اس کے لیے فتنہ بن جاتے ہیں۔ ان کی محبت میں پھنس کر وہ دین کے تقاضے پورے کرنے کا حوصلہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ ہر شخص اس امر پر نگاہ رکھے کہ ان کی محبت یا ان کی خواہشیں دین کی راہ میں اس کے لیے زنجیر پا نہ بننے پائیں اگرچہ ان کے ساتھ معاملہ عفو و درگزر ہی کا رکھے۔

(۱۶-۱۸) اللہ و رسول کی تا مقدور اطاعت کی دعوت اور دین کی راہ میں فراخ دلانہ انفاق کی ترغیب۔ ان لوگوں کو ابدی فوز و فلاح کی بشارت جو اپنے آپ کو حرص و بخالت کی بیماری سے محفوظ رکھیں گے۔ جو لوگ اللہ کو قرض دیں گے، اللہ ان کے دیے ہوئے قرض کو قدردانی کے ساتھ قبول کرے گا۔ اس کو مضاعف کر کے ان کو لوٹائے گا۔ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ وہ غائب و حاضر سب کا جاننے والا ہے۔ وہ کسی کی نیکی سے بے خبر نہیں ہے، اگرچہ وہ کتنی ہی پوشیدہ طور پر کی جائے۔

سُوْرَةُ التَّغَابُن (۶۴)

مَدَنِيَّةٌ ______ آیات: ۱۸

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ
۱-۱۸ الْحَمْدُ ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ
فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲﴾ خَلَقَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ
الْمَصِيْرُ ﴿۳﴾ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ
وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۭ وَاللهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۴﴾ اَلَمْ يَاْتِكُمْ
نَبَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۫ فَذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ
عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۵﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهٗ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
فَقَالُوْٓا اَبَشَرٌ يَّهْدُوْنَنَا ۫ فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللهُ ۭ
وَاللهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ﴿۶﴾ زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ
قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ
عَلَى اللهِ يَسِيْرٌ ﴿۷﴾ فَاٰمِنُوْا بِاللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِيْٓ
اَنْزَلْنَا ۭ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۸﴾ يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ

الْجَمْعِ ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ ۗ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا
يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا
الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۗ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿٩﴾ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۗ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿١٠﴾ ع مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَمَنْ ع ۱۵
يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿١١﴾ وَاَطِيْعُوا
اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا
الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿١٢﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ
الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿١٣﴾ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ
عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٤﴾ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۗ
وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٥﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا
وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ۗ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٦﴾ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ
لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿١٧﴾ لا عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿١٨﴾ ع ع ۲ ۸ ۱۶

ترجمۂ آیات ۱-۱۸ اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔ اسی کی
بادشاہی ہے اور وہی سزاوارِ شکر ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱

وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا تو کوئی تم میں کافر ہے اور کوئی مومن۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اللہ کی نظر میں ہے۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو غایت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس نے تمھاری صورت گری کی تو اس نے تمھاری صورتیں اچھی بنائیں اور اسی کی طرف لوٹنا ہوگا۔ وہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور وہ جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو اور جو ظاہر کرتے ہو۔ اور اللہ باخبر ہے سینوں کے بھیدوں سے بھی۔ ۲۔۴

کیا تمھیں ان لوگوں کا احوال نہیں پہنچا جنھوں نے اس سے پہلے کفر کیا! تو انھوں نے اپنے کیے کا وبال چکھا اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ یہ اس سبب سے کہ ان کے پاس ان کے رسول واضح نشانیوں کے ساتھ آتے رہے تو انھوں نے کہا کہ کیا بشر ہماری رہنمائی کریں گے! پس انھوں نے کفر کیا اور منہ موڑا اور اللہ ان سے بے پروا ہو گیا اور اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۵۔۶

جن لوگوں نے کفر کیا انھوں نے دعویٰ کیا کہ وہ ہرگز مرنے کے بعد اٹھائے نہیں جانے کے۔ کہہ دو، ہاں میرے رب کی قسم! تم ضرور اٹھائے جاؤ گے، پھر تم کو بتایا جائے گا جو کچھ تم نے کیا ہوگا۔ اور یہ کام اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ تو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر اور اس نور پر جو ہم نے نازل کیا ہے اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔ ۷۔۸

اس دن کو یاد رکھو جب اللہ اکٹھے کیے جانے کے دن کے لیے تم کو اکٹھا کرے گا۔ وہی دن درحقیقت ہار جیت کا دن ہوگا۔ اور جو ایمان لائے اور جنھوں نے

عمل صالح کیے ہوں گے اللہ ان کے گناہوں کو جھاڑ دے گا اور ان کو ایسے باغوں میں
داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے
بڑی کامیابی درحقیقت یہ ہے! اور جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی
لوگ دوزخ والے ہوں گے، اس میں ہمیشہ رہیں گے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہو گا۔ ۹-۱۰

جو مصیبت بھی آتی ہے اللہ کے اذن سے آتی ہے۔ اور جو اللہ پر ایمان رکھتا
ہے اللہ اس کے دل کی رہنمائی کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ اور اللہ
کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ پس اگر تم اعراض کرو گے تو ہمارے رسول
پر صرف واضح طور پر پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، اس کے سوا
کوئی معبود نہیں ہے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ بھروسہ کریں اہل ایمان۔ ۱۱-۱۲

اے ایمان والو! تمھاری بیویوں اور تمھاری اولاد میں سے بعض تمھارے لیے
دشمن ہیں تو ان سے بچ کے رہو اور اگر تم معاف کرو گے، درگزر کرو گے اور بخشو گے تو
اللہ غفور رّحیم ہے۔ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھارے لیے امتحان ہیں اور
اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔ تو اللہ سے ڈرتے رہو جہاں تک ہو سکے اور سنو
اور مانو اور خرچ کرو اپنی بھلائی کے لیے۔ اور جو حرصِ نفس کی بیماری سے محفوظ رکھے
گئے وہی فلاح پانے والے ہوں گے۔ اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو گے تو وہ اس کو تمھارے
لیے مضاعف کرے گا اور تمھیں بخشے گا اور اللہ قدر دان اور بردبار ہے۔ جاننے
والا ہے غائب و حاضر کا۔ عزیز و حکیم ہے۔ ۱۴-۱۸

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ ۡ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱)

یہ پوری کائنات خدا ہی کی بندگی کی دعوت دے رہی ہے

یہ آیت الفاظ کے معمولی ردو بدل کے ساتھ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز اللہ ہی کی تسبیح کرتی اور اپنے عمل سے انسانوں کو یہ درس دے رہی ہے کہ اس کائنات کی بادشاہی تنہا اللہ ہی کی ہے اور شکر کا سزاوار وہی ہے، نہ اس کی بادشاہی میں اس کا کوئی شریک و سہیم ہے اور نہ بندوں کے شکر کا اس کے سوا کوئی دوسرا حق دار ہے۔

خدا کا کوئی شریک نہیں

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ' اور یہ بات بھی واضح ہے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اپنے کسی کام میں، خواہ کتنا ہی بڑا ہو، کسی کی مدد کا محتاج نہیں ہے اس وجہ سے کسی کو اس کا شریک ٹھہرانا ایک بالکل بے معنی بات ہے۔ اس نے نہ دنیا کے پیدا کرنے میں کسی کی مدد حاصل کی اور نہ اس کے انتظام و انصرام میں وہ کسی کا محتاج ہوا بلکہ اس نے سب کچھ تنہا اپنے بل بوتے پر کیا ہے اور جس طرح پہلے کیا ہے اسی طرح آئندہ بھی کرتا رہے گا۔ اس وجہ سے بندوں کے اعتماد کے لیے وہ تنہا کافی ہے۔ ان کو چاہیے کہ اسی پر بھروسہ کریں اور اس کی بندگی میں کسی دوسرے کو شریک نہ کریں۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲)

ان کے لیے اپنے اختیار کے سوء استعمال کی سزا بھگتنا لازمی ہے

یعنی اسی خدا نے، جس کی تسبیح تمام کائنات کر رہی ہے، تم کو بھی پیدا کیا ہے اس وجہ سے حق تو یہ تھا کہ تم بھی اسی کی تسبیح کرتے جس کی تسبیح آسمان کے تمام ستارے، فضا کے تمام پرندے اور زمین کے تمام شجر و حجر کر رہے ہیں لیکن تم کو خدا نے اختیار بخشا ہے اس وجہ سے تم میں کافر بھی ہیں اور مومن بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے اور وہ ہر ایک کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق ہی معاملہ کرے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی نگاہوں میں کفر اور ایمان دونوں یکساں ہیں۔

یہ بات بالبداہت خدا کے عدل اور اس کی حکمت کے خلاف ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ (۳)

جزاء و سزا اہتمام ربوبیت کا لازمی تقاضا ہے

یہ اوپر والی بات کی دلیل بیان ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا ایک مقصدِ حق کے ساتھ پیدا کی ہے اس مقصدِ حق کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے بعد لازماً ایک ایسا دن آئے جس میں حق پسند بندوں کو ان کی حق پسندی کا صلہ ملے اور جن کی زندگی اس مقصدِ حق کے خلاف گزری ہو وہ اس کی سزا بھگتیں۔

'وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ' یہ اس اہتمام کی طرف توجہ دلائی ہے جو ان کی خلقت میں خالق نے ملحوظ رکھا ہے۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ انسان کی تخلیق بہترین سانچہ پر ہوئی ہے۔ چنانچہ سورۂ تین

میں فرمایا ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (۴) (اور ہم نے انسان کو بہترین سانچہ پر بنایا ہے)۔ انسان کے ظاہر و باطن کی تشکیل جس طرح ہوئی ہے اور اس میں جو قوتیں اور قابلیتیں ودیعت کی گئی ہیں وہ صاف اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ اس دنیا کی تمام مخلوقات میں مقصود کی حیثیت اسی کو حاصل ہے۔ وہی سرتاج اور گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے باقی دوسری ساری چیزیں بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی کی خدمت اور نفع رسانی کے لیے ہیں۔

انسان کے لیے یہ اہتمام و انتظام اور اس کا نہایت اعلیٰ ظاہری و باطنی صلاحیتوں سے مسلح ہونا اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کو خالق نے بے مقصد و عبث نہیں پیدا کیا ہے کہ بس وہ کھائے پیے اور ایک دن ختم ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو وہ سارا اہتمام بالکل بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے جو قدرت نے اس کی تخلیق اور اس کے قیام و بقا پر صرف کیا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے جگہ جگہ انسان کو یہ یاد دہانی کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری ربوبیت کے لیے جو اہتمام فرمایا، تمہارے لیے جو پاکیزہ خوانِ کرم بچھایا اور شکل و صورت کے اعتبار سے اپنی تمام مخلوقات میں جو امتیاز تم کو بخشا اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ایک دن تم اس کے سامنے حاضر کیے جاؤ اور تم سے تمہارے رب کی بخشی ہوئی نعمتوں سے متعلق سوال ہو۔

اَللّٰهُ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ (المؤمن - ۴۰: ۶۴)

اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو مستقر اور آسمان کو چھت بنایا اور تمہاری صورت گری کی تو تمہاری صورتیں اچھی بنائیں اور تمہیں پاکیزہ چیزوں کا رزق بخشا۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اچھی صورتوں کے ساتھ پاکیزہ رزق اور عالی شان مکان کا یہ اہتمام اس بات کی بدیہی دلیل ہے کہ تم اپنے رب کے آگے مسئول ہو۔

اسی دلیل کی بنیاد پر ان لوگوں کو دھمکی بھی دی گئی ہے جو آخرت اور جزا و سزا کے قائل نہیں تھے۔ فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ ۝ الَّذِي خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِي أَيِّ صُورَةٍ مَّا شَاءَ رَكَّبَكَ ۝ (الانفطار - ۸۲: ۶ - ۸)

اے انسان، تجھ کو تیرے اس ربِ کریم کے باب میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے جس نے تیرا نقشہ بنایا، پھر تیرے جوڑ بند ٹھیک کیے پس تجھے متوازن کیا اور جس صورت پر چاہا تجھے ترکیب دے دیا۔

اس آیت میں اس اہتمام کی وضاحت بھی ہو گئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے میں فرمایا ہے اور ساتھ ہی اس سے جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اس کی طرف بھی نہایت تہدید آمیز انداز میں اشارہ ہو گیا ہے۔

'وَاِلَیۡہِ الۡمَصِیۡرُ' ۔ یعنی جس خدا نے ایک عظیم غایت کو پیشِ نظر رکھ کر یہ دنیا پیدا کی ہے اور اس اہتمام کے ساتھ تمھیں اس میں وجود بخشا ہے لازم ہے کہ تم ایک دن اسی کی طرف جزاء و سزا کے لیے لوٹائے جاؤ۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ سارا اہتمام بالکل بے معنی ہو کے رہ جائے گا۔

یَعۡلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَیَعۡلَمُ مَا تُسِرُّوۡنَ وَمَا تُعۡلِنُوۡنَ ؕ وَاللّٰہُ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ (۴)

کوئی بات اللہ تعالیٰ کے علم سے باہر نہیں ہے

یعنی اس مغالطہ میں نہ رہو کہ بھلا اللہ تعالیٰ کو ساری دنیا کے تمام خفیہ و علانیہ اعمال کی خبر کہاں ہو گی کہ وہ سب کا حساب کرنے بیٹھے گا اور سب کو جزا یا سزا دے گا! آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب سے واقف ہے اور تم کوئی کام خواہ پوشیدہ طور پر کرو یا علانیہ وہ تمھارے ہر قول و فعل کو جانتا ہے بلکہ جو کچھ تمھارے سینوں میں چھپا ہوا ہوتا ہے وہ اس سے بھی باخبر رہتا ہے۔

اَلَمۡ یَاۡتِکُمۡ نَبَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَبۡلُ ۫ فَذَاقُوۡا وَبَالَ اَمۡرِہِمۡ وَلَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (۵)

مکافاتِ عمل کی شہادت تاریخ سے

فرمایا کہ کیا اس ملک کی پچھلی قوموں کی تاریخ تمھارے علم میں نہیں آئی کہ انھوں نے کفر کیا تو اس کفر کا وبال انھیں اس دنیا میں بھی چکھنا پڑا اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے؟ یہ اشارہ عاد، ثمود، اہلِ مدین اور قومِ لوط وغیرہ کی طرف ہے جن کی سرگزشتیں تفصیل سے، پچھلی سورتوں میں سنائی بھی گئی ہیں اور قریش ان سے فی الجملہ واقف بھی ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض قوموں کی بستیوں کے کھنڈروں پر سے ان کو گزرنے کے مواقع بھی ملتے رہتے تھے۔ ان کی تاریخ کی طرف اشارہ کر کے متنبہ فرمایا کہ یہ واقعات دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا کے خیر و شر سے غیر متعلق نہیں ہے بلکہ اس کی اصلاح کے لیے اس نے برابر اپنے رسول بھیجے ہیں اور جب قوموں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے تو اس نے ان کو سزا بھی نہایت عبرت انگیز دی۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے قانونِ مجازات کی یہ مثالیں اپنی آنکھوں سے اس زمین میں دیکھتے ہو تو اس بات کو کیوں بعید سمجھتے ہو کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ساری دنیا کا انصاف کرے اور اس دن اس کے کامل عدل اور اس کی کامل رحمت کا ظہور ہو!

ذٰلِکَ بِاَنَّہٗ کَانَتۡ تَّاۡتِیۡہِمۡ رُسُلُہُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ فَقَالُوۡۤا اَبَشَرٌ یَّہۡدُوۡنَنَا ۫ فَکَفَرُوۡا وَتَوَلَّوۡا وَّاسۡتَغۡنَی اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیۡدٌ (۶)

رسولوں کی تکذیب کے لیے منکرین کا بہانہ

یہ سبب بتایا ہے کہ یہ قومیں کیوں خدا کے عذاب کی گرفت میں آئیں؟ فرمایا کہ اللہ کے رسول ان کی ہدایت کے لیے نہایت واضح نشانیوں اور دلائل کے ساتھ آئے لیکن یہ اپنی سرکشی کے سبب سے ان کو خاطر میں نہ لائیں۔ انھوں نے یہ بہانہ تراشا کہ اگر اللہ کو ہماری ہدایت کے لیے کوئی رسول بھیجنا ہی ہوتا تو وہ کسی برتر مخلوق کو رسول بنا کر بھیجتا۔ ہمارے ہی جیسے انسانوں کو رسول بنا کر بھیجنے کے کیا معنی؟

کیا ہم ایسے حقیر ہیں کہ ہمارے ہی جیسے انسان ہمیں ہدایت دینے والے بنیں گے! مطلب یہ ہے کہ اگر انسان ہی ہمیں ہدایت دے سکتے ہیں تو ہم کیا برے ہیں! ہم خود ہی اپنے کو ہدایت دے لیں گے، دوسروں کا بارِ احسان ہم کیوں اٹھائیں!

منکرین کے باب میں سنتِ الٰہی

'فَكَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَى اللّٰهُ'۔ یعنی اس طرح کے اعتراضات اور بہانے پیدا کر کے انھوں نے رسول کا انکار اور دعوتِ حق سے اعراض کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ بھی ان سے بے پروا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ہدایت سے بہرہ یاب کرنے کے لیے اہتمام کرتا ہے لیکن جب لوگ اس کی ناقدری کرتے ہیں تو وہ ان سے بے پروا ہو کر ان کو چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس ناقدری کا انجام دیکھیں۔

'وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ'۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو لوگوں کی ہدایت مطلوب ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ اس میں اس کا کوئی نفع ہے۔ وہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت سے بالکل بے نیاز اور خود اپنی ذات میں ستودہ صفات اور کامل ہے۔ وہ ہدایت کا انتظام کرتا ہے تو محض اس وجہ سے کرتا ہے کہ لوگوں کی فلاح اسی میں ہے لیکن جب وہ اس کی قدر نہیں کرتے تو وہ اس کو زبردستی لوگوں کے اوپر نہیں لادتا۔

زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا ۭ قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۭ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (۷)

توڑ جواب

یعنی ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ مرنے کے بعد ہرگز نہیں اٹھائے جائیں گے اس وجہ سے وہ نبیؐ کی دعوت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

'قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ'۔ فرمایا کہ جس زور و تاکید کے ساتھ یہ لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا انکار کر رہے ہیں اسی زور و تاکید کے ساتھ، بقیدِ قسم، تم ان کو جواب دو کہ ہاں میرے رب کی قسم، تم ضرور اٹھائے جاؤ گے!

قسم کے اندر دلیل کا پہلو

اگرچہ اس فقرے میں دلیل کا پہلو نمایاں نہیں ہے، بلکہ دعوے کا جواب بظاہر دعوے ہی سے دے دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات منکرین کے بے دلیل دعوے کے جواب میں کہلائی گئی ہے لیکن 'وَرَبِّيْ' کی قسم میں دلیل کا بھی ایک لطیف پہلو مضمر ہے۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیّت، جس کی شانیں اس کائنات کے ہر گوشہ میں نمایاں ہیں، اس بات کو واجب کرتی ہے کہ وہ نیکوکار اور بدکار دونوں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا بلکہ لازماً وہ نیکوں کو ان کی نیکی کا صلہ دے گا اور بدوں کو ان کی بدی کی سزا۔ اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ وہ مرنے کے بعد لوگوں کو اٹھائے، ان کا حساب کرے اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو جزا یا سزا دے۔

'وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر قیاس کر کے اس کام کو ناممکن یا مشکل

نہ سمجھو۔ دوسروں کے لیے تو یہ کام بے شک ناممکن ہے۔ ان کا علم بھی نہایت محدود ہے اور ان کی قدرت بھی نہایت محدود ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے یہ نہایت آسان ہے۔ وہ غیر محدود علم اور غیر محدود قدرت کا مالک ہے۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا ط وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ (۸)

دعوتِ ایمان باندازِ تنبیہ

یہ باندازِ تنبیہ دعوتِ ایمان ہے۔ یعنی اس قسم کے بہانے پیدا کر کے رسول کی تکذیب نہ کرو بلکہ اللہ اور اس کے رسول پر اور اس روشنی پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل فرمائی ہے۔ "روشنی" سے مراد ظاہر ہے کہ قرآن مجید ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حق و باطل کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لیے نازل فرمایا۔ یہ امر واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو روشنی اہل کتاب کو ہدایت و ضلالت میں امتیاز کے لیے عطا فرمائی تھی وہ انھوں نے، جیسا کہ پچھلی سورتوں میں تفصیل گزر چکی ہے، ضائع کر دی تھی، جس کے سبب سے ان کے لیے حق و باطل میں امتیاز ناممکن ہو گیا تھا لیکن جب اس نے از سرِ نو خلق کی رہنمائی کے لیے اپنی روشنی، اپنی کامل صورت میں، اتاری تو اس کی قدر کرنے کے بجائے انھوں نے پورا زور لگایا کہ اس کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں، نہ خود اس سے فائدہ اٹھائیں نہ دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیں:

یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ (الصف - ۶۱: ۸)

(یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے مونہوں کی پھونک سے بجھا دیں اور اس کا فیصلہ یہ ہے کہ ان کافروں کے علی الرغم وہ اپنے نور کو کامل کر کے رہے گا)۔

وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ یعنی اس مغالطے میں نہ رہو کہ اللہ تمھارے اعمال سے بے خبر ہے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ سب اس کے علم میں ہے اور ایک دن وہ سب تمھارے سامنے آ کے رہے گا۔

یَوْمَ یَجْمَعُکُمْ لِیَوْمِ الْجَمْعِ ذٰلِکَ یَوْمُ التَّغَابُنِ ط وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ وَیَعْمَلْ صَالِحًا یُّکَفِّرْ عَنْہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُدْخِلْہُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ (۹-۱۰)

سلامتی کی راہ

یعنی بجائے اس کے کہ اپنے کو اس مغالطے میں مبتلا رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھیں مرنے کے بعد زندہ نہیں کر سکتا، سلامتی اس بات میں ہے کہ اس دن کو برابر یاد رکھو جس دن اللہ تعالیٰ تمھیں اکٹھا کیے جانے کے دن کے لیے اکٹھا کرے گا یعنی اس دن کے لیے اکٹھا کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی اسکیم میں طے شدہ ہے، جس کے دلائل آفاق و انفس میں موجود ہیں، جس کی شہادت تمام نبیوں اور رسولوں اور تمام آسمانی صحیفوں نے دی ہے، جس کا واقع ہونا اس دنیا کے بامقصد و باغایت ہونے کے لیے ضروری ہے اور جو واقع نہ ہو تو یہ دنیا بالکل عبث، بے حکمت ایک کھلنڈرے کا کھیل بن کے رہ جاتی ہے۔

دوسرے مقام میں فرمایا ہے: ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُودٌ (ھود-۱۱: ۱۰۳) (وہ دن ہے جس کے لیے لوگ جمع کیے جائیں گے اور وہ حاضری کا دن ہوگا)۔ دوسری جگہ فرمایا ہے: قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ۝ لَمَجْمُوْعُوْنَ ۝ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ (الواقعۃ-۵۶: ۴۹-۵۰) (کہہ دو، تمام اگلے اور پچھلے ایک معین دن کے وقت مقرر پر حاضر کیے جائیں گے)۔ ان آیات میں ایک مقررہ وقت پر تمام اگلوں پچھلوں کے جمع کیے جانے پر جو زور ہے وہ ان نادانوں کے استبعاد کو رفع کرنے کے لیے ہے جو سمجھتے ہیں کہ بھلا اتنی بے شمار مخلوقات کو خشکی و تری، دریاؤں اور پہاڑوں کے کونے کونے سے کون جمع کر سکتا ہے! فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک دن اس جمع کے لیے مقرر کر رکھا ہے اور یہ بات لازماً ہو کے رہے گی۔ شکوک میں رہنے کے بجائے اس کے لیے تیاری کرو اور اس کو برابر یاد رکھو۔

ہار جیت کا دن

'ذٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ'۔ 'يَوْمُ التَّغَابُنِ' کا ترجمہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ نے 'ہار جیت کا دن' کیا ہے۔ یہ ترجمہ ہمارے نزدیک لفظ کی صحیح روح کے مطابق ہے۔ اس ہار جیت کی وضاحت آگے قرآن نے خود کر دی ہے۔ فرمایا ہے کہ جو ایمان لائیں گے اور نیک عمل کریں گے اللہ تعالیٰ ان کو لغزشوں کے اثرات سے پاک کر کے ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور جن کو یہ چیز حاصل ہوئی ان کو بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے بالکل برعکس ان لوگوں کا حال ہوگا جنھوں نے اللہ کا کفر اور اس کی آیتوں کی تکذیب کی ہوگی۔ یہ لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور نہایت ہی برا ٹھکانا ہوگا۔

مطلب یہ ہے جو لوگ آخرت کے منکر ہیں انھوں نے تو اسی دنیا کو ہار جیت کا میدان سمجھ رکھا ہے۔ جن کو دنیا کی رفاہیتیں حاصل ہو گئیں وہ سمجھ بیٹھے کہ انھوں نے بازی جیت لی اور جن کو نہیں حاصل ہوئیں ان کو ناکام و نامراد سمجھ لیا۔ حالانکہ یہ دنیا دارالانعام نہیں بلکہ دارالامتحان ہے۔ دارالانعام آخرت ہے جس میں بازی وہ لوگ جیتیں گے جو اس دنیا میں ایمان و عمل صالح کی زندگی گزاریں گے اگرچہ اس دنیا کی متاع میں سے انھیں کوئی چیز بھی حاصل نہ ہوئی ہو اور وہ لوگ وہاں بالکل محروم و نامراد ہوں گے جو ایمان و عمل صالح سے محروم اٹھیں گے اگرچہ دنیا میں انھیں قارون کے خزانے حاصل رہے ہوں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ جو لوگ اسی دنیا کو ہار جیت کا میدان سمجھ بیٹھیں گے ان کے لیے یہ بالکل ناممکن ہے کہ وہ اپنے عیش و آرام کو قربان کر کے دوسروں کی خدمت و اعانت کی راہ میں اپنے مال صرف کریں۔ اگر کبھی وہ حوصلہ کرنا بھی چاہیں تو فوراً یہ اندیشہ ان کا حوصلہ پست کر دے گا کہ اگر کل کو کوئی ناگہانی آفت یا مشکل پیش آ گئی تو کیا بنے گا! البتہ جو شخص ہار جیت کا اصل میدان آخرت کو سمجھے گا اس کو اس

طرح کا کوئی اندیشہ پست حوصلہ نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی کوئی دغدغہ دل میں پیدا ہو گا بھی تو وہ اس کو شیطانی دغدغہ سمجھے گا اور بے دھڑک اپنی آخرت کی کامیابی کے لیے اپنے رب کے بھروسہ پر بازی کھیل جائے گا۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ (۱۱)

ایک دوسرے کا علاج

یہ اس دغدغہ کو دور فرمایا ہے جو آخرت کی بازی کھیلنے کی راہ میں مزاحم ہو سکتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ و رسول کی اطاعت اور ان کی رضا طلبی کی راہ میں قدم اٹھاتے ہوئے اس وسوسہ کو کوئی اہمیت نہ دو کہ کل کو کوئی مشکل پیش آگئی تو کیا ہو گا! کوئی مصیبت بھی بندوں پر اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر نہیں آتی۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار کسی ایسے شخص کے لیے ممکن نہیں ہے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو۔ تو بندے کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ جو کام وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں کرے گا وہ اس کے لیے کسی ایسی آزمائش کا سبب نہیں بن سکتا جو اس کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی قوتوں اور صلاحیتوں سے سب سے زیادہ واقف ہے۔ وہ کسی پر اس کی قوت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالے گا۔

وَ مَنۡ یُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰہِ یَہۡدِ قَلۡبَہٗ ؕ وَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ۔ یہ اللہ کی راہ میں آزمائشوں کا مقابلہ کرنے والوں کو تسلی دی گئی ہے کہ اگر تم اپنے ایمان میں مضبوط رہو گے تو کوئی آزمائش تمہیں پست حوصلہ نہیں کر سکے گی بلکہ اللہ تعالیٰ عین وقت پر روح القدس کے ذریعہ سے تمہارے دل کی رہنمائی فرمائے گا۔ تمہارا رب ہر چیز سے باخبر ہے۔ وہ اپنے بندوں کے احوال کو جانتا ہے اور ٹھیک وقت پر ان کی مدد کے لیے غیب سے سامان کرتا ہے۔ یہی بات سیدنا مسیح علیہ السلام نے بھی اپنے شاگردوں کو خطاب کر کے فرمائی ہے کہ جب لوگ تم کو میرے کام پر عدالتوں میں پکڑوائیں تو یہ فکر نہ کرنا کہ کیا کہو گے، میرا خداوند عین وقت پر روح القدس سے تمہاری مدد فرمائے گا۔ سورۂ حدید کی آیت ۲۲ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ (۱۲)

یعنی غلط قسم کے اندیشوں اور اوہام میں مبتلا ہو کر اللہ و رسول کی اطاعت سے جی نہ چراؤ ورنہ یاد رکھو کہ رسول پر صرف یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اللہ کے احکام اور اس کی ہدایات تم کو واضح طور پر پہنچا دے۔ یہ فرض اس نے ادا کر دیا تو وہ اللہ کے ہاں بری الذمہ ہوا۔ تمہارے ایمان کی بابت اس سے پرسش نہیں ہو گی بلکہ تم سے پرسش ہو گی کہ تم نے اس کی دعوت کیوں قبول نہیں کی۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (۱۳)

فرمایا کہ آسمان و زمین میں کوئی اور الٰہ نہیں ہے جس سے کسی ضرر کا اندیشہ یا کسی نفع کی توقع ہو۔ صرف اللہ ہی ہے جو نفع یا ضرر پہنچا سکتا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔ یہی ان کے ایمان کا تقاضا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۱۴)

ایک بہت بڑی آزمائش سے آگاہی

یہ ان آزمائشوں میں سے ایک بہت بڑی آزمائش سے متنبہ فرمایا ہے جو انسان کو اللہ تعالیٰ کے حقوق و فرائض اور اس کی راہ میں انفاقِ جان و مال سے روکنے والی بنتی ہیں، یعنی بیوی بچوں کی محبت یہ محبت ہے تو ایک فطری چیز لیکن ساتھ ہی یہ انسان کے لیے ایک بہت بڑی آزمائش بھی ہے۔ اس محبت میں اور خدا کی محبت میں بسا اوقات تصادم ہوتا ہے۔ اگر آدمی کا علم و ایمان پختہ نہ ہو تو اندیشہ ہوتا ہے کہ اس پر بیوی بچوں کا مفاد اور ان کی محبت اس قدر غالب آجائے کہ وہ خدا کی محبت کو نظر انداز کر بیٹھے درآنحالیکہ یہ چیز اس کے ایمان کو غارت کر دینے والی ہے۔ عرب شعراء جاں بازی اور فیاضی پر ملامت کرنے والیوں کی ملامت کا ذکر بہت کرتے ہیں اور ایک حدیث شریف میں بھی ہے کہ آدمی کے بیوی بچے اس کو سب سے زیادہ بخل و بزدلی پر مجبور کرنے والے ہیں۔ اسی چیز کی طرف اس آیت میں بھی اشارہ ہے کہ آدمی کے اہل و عیال میں سے بعض اس کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ اس کو خدا کے حقوق سے روکنے والے بن جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ یہ کام بظاہر خیر خواہانہ انداز میں کرتے ہیں لیکن یہ چیز انجام کار کے اعتبار سے باعثِ ہلاکت ہے اس وجہ سے وہ درحقیقت وہ کام کرتے ہیں جو دشمن کرتا ہے۔

'اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ' میں حرف 'مِنْ' تبعیض کے لیے ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کے بیوی بچے لازماً ایسے ہی ہوں۔ بہتوں کے بیوی بچے ایسے بھی ہوتے ہیں جو راہِ حق میں مزاحم ہونے کے بجائے معاون ہوتے ہیں لیکن اگر کسی کے اہل و عیال ایسے نہیں ہیں تو اس کو چاہیے کہ وہ ان سے بچ کے رہے کہ وہ اس کے لیے پھندا نہ بننے پائیں۔

'وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ'۔ یہ بچ کے رہنے کی وضاحت ہے کہ تمہارے لیے یہ دیکھنا تو ضروری ہے کہ وہ تم کو اللہ کی راہ سے روکنے والے نہ بنیں لیکن ساتھ ہی یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ حتی الامکان یہ چیز قطع تعلق اور مفارقت پر منتہی نہ ہو بلکہ جس حد تک گنجائش ہو عفو و درگزر اور چشم پوشی سے کام لو اور یہ امید رکھو کہ اللہ غفور رحیم ہے۔ وہ تمہاری کوتاہیوں سے بھی درگزر فرمائے گا اور ان کی کمزوریوں کو بھی معاف کرے گا۔

معلوم ہوا کہ جس کو اس طرح کی آزمائش سے سابقہ پیش آئے اس کے لیے صحیح طریقہ یہ ہے کہ

وہ اپنے آپ کو کسی فتنہ میں پڑنے سے تو بچائے اور اپنے قول و عمل سے اپنے اہل و عیال کی کمزوری کی اصلاح کی کوشش کرے لیکن جب تک کفر و ایمان کا کوئی سوال پیدا نہ ہو اس وقت تک ان سے قطع تعلق نہ اختیار کرے بلکہ عفو و درگزر سے کام لے۔ گویا ان کے ساتھ زندگی تو گزارے لیکن گھل مل کر نہیں بلکہ بچ بچا کر اس طرح کہ خود بھی محفوظ رہے اور ان کی بھی اصلاح ہو۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۱۵)

یہ اسی مضمون کی مزید وضاحت ہے۔ 'فِتْنَةٌ' کے معنی امتحان و آزمائش کے ہیں۔ فرمایا کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد تمھاری آزمائش کے لیے ہیں۔ اللہ نے ان کے ذریعہ سے تمھارا امتحان کیا ہے کہ تم ان کی محبت میں پھنس کر خدا اور اس کے حقوق کو بھول جاتے ہو یا ان کو خدا کی محبت اور اس کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ بناتے ہو۔ اگر پہلی راہ اختیار کرو گے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے امتحان میں تم ناکام رہے۔ اللہ کی محبت پر تم نے مال و اولاد کی محبت کو ترجیح دی حالانکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ہر چیز سے زیادہ اللہ کو محبوب رکھے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ (البقرۃ - ۲ : ۱۶۵) (اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں) اور اگر دوسری راہ اختیار کرو گے تو یہی راہ فوز و فلاح کی راہ ہے۔ یہ راہ اختیار کر کے اس دنیا میں کوئی نقصان بھی اٹھاؤ گے تو اطمینان رکھو کہ اللہ تعالیٰ تمھارے ہر نقصان کی تلافی آخرت میں اجر عظیم سے فرمائے گا۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۶)

فلاح کی راہ — یہ اس سلسلہ کی آخری نصیحت ہے کہ اللہ سے برابر ڈرتے رہو کہ شیطان تمھیں کسی فتنہ میں نہ ڈالنے پائے۔ یہ ڈرنا تا حدِ امکان ہو۔ تمھارے امکان میں جس حد تک ہے اگر اس حد تک تم اللہ سے ڈرتے کی کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ شیطان کو تم پر قابو پانے نہیں دے گا اور نہ مال و اولاد کے کسی فتنہ میں پڑ کر تم اللہ کی راہ سے اتنے دور ہو جاؤ گے کہ تمھارے لیے بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہے گا۔

'وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ'۔ یہ وہی اوپر والی بات مثبت انداز میں فرمائی کہ اللہ اور اس کے رسول کی بات سنو اور مانو اور خدا کی راہ میں جس انفاق کی دعوت دی جا رہی ہے اس پر لبیک کہو۔ اس انفاق کا اصلی نفع اللہ و رسول کو نہیں حاصل ہو گا بلکہ تمہی کو حاصل ہو گا اگر تم خلوص اور فیاضی سے خرچ کرو گے۔

'وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ'۔ 'شُحّ' کے معنی بخل و حرص کے ہیں۔ فرمایا کہ انسان کے نفس کے اندر جو بخل ہے اگر وہ نفس پر غالب آ جائے تو وہ اس کے لیے تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ مبارک ہیں اللہ کے وہ بندے جو اس کے غلبہ سے محفوظ رکھے گئے۔ آخرت میں فلاح پانے

والے وہی بنیں گے!

'شُحَّ' کی اضافت 'نفس' کی طرف اس بات کی دلیل ہے کہ نفسِ انسانی جن داعیات سے مرکب ہے ان میں اس کا بھی ایک مقام ہے لیکن یہ ان دعاوی میں سے ہے جن سے اگر ہوشیار نہ رہا جائے تو یہ شہوت یا غضب کی طرح انسان کو ہلاکت میں ڈال سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کو اتنی ڈھیل نہ دی جائے کہ یہ نفس پر غالب آ کر ایثار و قربانی کے جذبات کو دبا لے۔ اس کا طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ جب یہ جذبہ غالب ہونے لگے تو انسان اس کے علی الرغم انفاق کر کے اس کو دباتا رہے یہاں تک کہ یہ اتنا کمزور ہو جائے کہ نیکی کے اقدامات میں مزاحم نہ ہو سکے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جو لوگ اپنے اس جذبہ کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کوشش میں وہ کامیاب ہوتے ہیں اور جو اس کوشش میں کامیاب ہوئے آخرت کی فلاح کے حق دار وہی ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ اللہ کی رضا جوئی کے اعمال میں انفاق کا درجہ سب سے اونچا ہے بالخصوص وہ انفاق جو آدمی اپنی ذاتی ضروریات کو نظر انداز کر کے کرتا ہے۔ 'يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ' (الحشر - ۵۹ : ۹) (وہ اپنے اوپر ان کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ خود ضرورت مند ہوں)۔

اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ (۱۷)

قرضِ حسن کا موقع و محل اور اس کی حقیقت

یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ہے۔ اوپر جس انفاق کا حکم ہے وہ اللہ کی راہ میں ہر قسم کے انفاق کے لیے ہے خواہ اس کا تعلق صدقات و زکوٰۃ سے ہو یا جہاد سے۔ اس آیت میں خاص طور پر جہاد کے لیے انفاق کی تاکید ہے۔ قرآن میں لفظ 'قرض' عام طور پر جہاد ہی کے انفاق کے لیے آیا ہے اور اس لفظ کے استعمال میں جو اپیل اور بلاغت ہے وہ محتاجِ بیان نہیں ہے۔ سورۂ مزمل میں فرمایا ہے۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (المزمل - ۷۳ : ۲۰)	اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو اچھا قرض۔

اس آیت میں 'وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ' کے بعد 'وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ' سے مراد وہ انفاق ہے جو خاص حالات کے اندر اللہ کی راہ میں مطلوب ہوتا ہے۔

'يُضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ'۔ 'مُضَاعَفَةٌ' کے معنی صرف دونا کرنے کے نہیں آتے ہیں بلکہ یہ مجرد بڑھانے کے مفہوم میں بھی آتا ہے۔ خواہ یہ بڑھانا دوگنا کرنے کی نوعیت کا ہو یا 'اَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً' کی نوعیت کا۔ اس کی تحقیق اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ یہاں یہ اسی مفہوم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تم سے جو قرض مانگتا ہے تو اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہو گئی ہے جس کے سبب سے قرض مانگنے کی نوبت آ گئی ہے۔ اس کا خزانہ بدستور بھرپور ہے۔ یہ قرض وہ اس لیے مانگ رہا ہے کہ تمھارے لیے نفع کمانے کی راہ کھولے کہ تم اس کی راہ میں ایک خرچ کر کے آخرت

میں دس گنا بلکہ سترگنا وصول کرو۔ اس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ یہ قرض 'قرضِ حسن' ہو۔ 'قرضِ حسن' کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ یہ قرض اچھے مال میں سے دیا جائے، خوش دلی اور فیاضی سے دیا جائے اور خود ضرورتمند ہونے کے باوجود دیا جائے۔ جس قرض کے اندر یہ خوبیاں ہوں گی اللہ اس کو کئی گنا بڑھا کر قرض دینے والوں کو واپس بھی کرے گا اور ان کو اپنی مغفرت سے بھی نوازے گا۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کا حوالہ

'وَاللّٰہُ شَکُوْرٌ حَلِیْمٌ'۔ 'شَکُوْرٌ' کے معنی قدردانی کے ساتھ قبول کرنے والے کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیکیوں کا بڑا ہی قدردان اور ان کی بڑی پذیرائی فرمانے والا ہے۔ اگرچہ وہ غنی و حمید ہے، اس کے بندے اس کے حضور میں جو نذرانے پیش کرتے ہیں اسی کے دیے ہوئے مال میں سے پیش کرتے ہیں لیکن وہ ان کو حقیر نہیں خیال کرتا بلکہ وہ ان کو قدر کے ساتھ قبول کرتا اور ان کو پروان چڑھاتا ہے۔ ساتھ ہی وہ 'حَلِیْمٌ' ہے اس وجہ سے اپنے بندوں کے ساتھ نہایت فیاضانہ معاملہ کرتا ہے۔ اگر وہ بڑی برائیوں سے بچنے والے ہوتے ہیں تو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے وہ چشم پوشی فرماتا ہے۔

عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۱۸)

یعنی اللہ تعالیٰ تمام غائب و حاضر کا جاننے والا بھی ہے اور ساتھ ہی عزیز و حکیم بھی ہے۔ اس کی رضا جوئی کے لیے تم جو قربانی بھی کرو گے وہ اس سے مخفی نہیں رہتے گی اور یہ بھی اطمینان رکھو کہ اگر تم اس کا ساتھ دو گے تو وہ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے بلکہ وہ ہر چیز پر غالب اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ اس پر بھروسہ کرنے والے کبھی نامراد نہیں ہوتے اور اس کے حکموں پر عمل کرنے والے کبھی ٹھوکر نہیں کھاتے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللہ الحمد وبیدہ التوفیق۔

رحمان آباد

۱۳ - اپریل ۱۹۷۸ء

۴ - جمادی الاوّل ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

٦٥

الطّلاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق ولاحق سے تعلّق

سابق سورہ ـــــ التغابن ـــــ کی آیات ۱۴-۱۶ میں یہ تنبیہ فرمائی ہے کہ آدمی کے بیوی بچے اس کے لیے بڑی آزمائش ہیں۔ اگر وہ چوکنا نہ رہے تو ان کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے جی چرانے لگتا ہے یہاں تک کہ یہ چیز اس کو بالآخر نفاق میں مبتلا کر دیتی ہے اور اس طرح ان کے ساتھ اس کی دوستی خود اپنے ساتھ دشمنی بن جاتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ ان سے چوکنے رہنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بالکل ہی قطع تعلق کر لے بلکہ تا حدِّ امکان اس طرح عفو و درگزر کا معاملہ رکھے کہ ان کی اصلاح بھی ہو اور اپنے کو ان کے ضرر سے محفوظ بھی رکھ سکے۔

سورۂ تغابن کے بعد دو سورتوں ـــــ الطلاق اور التحریم ـــــ میں اسی نازک مسئلہ کی مزید وضاحت فرمائی اور نفرت و محبت دونوں طرح کے حالات کے اندر صحیح رویہ کے حدود معیّن کر دیے تاکہ کسی بے اعتدالی کی گنجائش نہ باقی رہے۔ سورۂ طلاق میں یہ بتایا ہے کہ اگر بیوی سے کسی سبب سے نفرت پیدا ہو جائے تو اس کے معاملے میں کس طرح حدود الٰہی کی پابندی کا اہتمام کرے اور سورۂ تحریم میں یہ واضح فرمایا ہے کہ محبت میں کس طرح اپنے آپ کو اور ان کو حدودِ الٰہی کا پابند رکھنے کی کوشش کرے۔ میاں بیوی کے رشتہ ہی پر تمام معاشرت کی بنیاد ہے اور ہر شخص کو اس سے سابقہ بھی پیش آتا ہے لیکن اس رشتہ کے نازک حدود و قیود کا اوّل تو سب کو علم نہیں ہوتا اور جن کو ہوتا بھی ہے وہ نفرت یا محبت کی ہلچل میں ان کو ٹھیک ٹھیک ملحوظ رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ کوئی سبب اگر اختلاف یا افتراق کا پیدا ہو گیا ہو تو وہ ایسی نفرت و عداوت کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ شریعت کے تمام حدود و احکام پسِ پشت ڈال دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر تعلقات محبت پر قائم ہیں، جیسا کہ ہونا چاہیے، تو خدا کے حدود و آداب کا احترام اس محبت پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں ہی حالتیں حدودِ الٰہی سے تجاوز اور شریعت سے انحراف کی ہیں جن کا نتیجہ آخرت کی نامرادی ہے اس وجہ سے قرآن نے دو الگ الگ سورتوں میں تفصیل سے بتایا کہ نفرت اور محبت دونوں قسم کے حالات کے اندر

آدمی کا معاملہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مجرّد اندھے بہرے جذبات پر نہیں بلکہ خدا کے حدود پر مبنی ہونا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں سورتیں درحقیقت سورۂ تغابن ہی کے اجمال کی شرح کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان دونوں ہی میں خطاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے اور یہ خطاب بغیر کسی تمہید کے شروع ہو گیا ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ یہ سابق سورہ ہی کا تکملہ و تتمہ ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست خطاب شخصاً نہیں بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس طرح کے خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ اس براہ راست خطاب سے ان احکام کی اہمیت دو چند ہو گئی ہے جو ان سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ یہاں جن خرابیوں کی اصلاح کی گئی ہے وہ جاہلیت کی سوسائٹی میں عام رہی ہیں بلکہ شاید یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو کہ اس تہذیب و تمدن کے دور میں بھی یہ عام ہیں۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ ان کی اصلاح کے احکام براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے دیے جائیں تاکہ لوگوں کے اندر یہ احساس پیدا ہو کہ جب پیغمبرؐ کو بھی ان باتوں کی پابندی کی ہدایت ہے تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورۂ طلاق حسبِ ذیل دو حصوں میں منقسم ہے۔

(۱-۷) اس امر کی وضاحت کہ اگر کسی کو طلاق دینے کی نوبت آئے تو یہ جائز نہیں ہے کہ وہ بیوی کو طلاق کے دو کلمے کہہ کر فوراً گھر سے نکال باہر کرے بلکہ اس کے لیے اللہ کے مقرر کیے ہوئے متعین قاعدے اور ضابطے ہیں جن کی پابندی ہر امیر و غریب کے لیے ضروری ہے۔ جو لوگ اپنی مالی مشکلات کے باوجود اللہ کی رضا کے لیے اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کریں گے اللہ ان کی مشکل آسان کرے گا اور ان کے مال میں برکت دے گا۔ اور جو مال کی محبت میں اللہ کے حدود و قیود توڑیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑیں گے بلکہ اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں گے۔

(۸-۱۲) مسلمانوں کو تنبیہ کہ جن قوموں نے اللہ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی ہے اللہ نے ان کو ہمیشہ نہایت سخت سزا دی ہے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ اللہ نے اس رسول کے ذریعہ سے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان فرمایا ہے کہ ان کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں کھڑا کیا ہے۔ اگر اس روشنی کی وہ قدر کریں گے تو اللہ ان کو جنت کی ابدی نعمتوں سے نوازے گا اور اگر انھوں نے اس کی ناقدری کی تو یاد رکھیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

○

سُوْرَۃُ الطَّلَاقِ (۶۵)

مَدَنِيَّةٌ ——— آیات: ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۱۲ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ
وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ ۚ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ
بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَ
تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ
نَفْسَهٗ ؕ لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا ①
فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ
بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ
لِلّٰهِ ؕ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۬ۙ
وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ② ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ
حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ؕ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ③ وَالّٰٓـِٔيْ
يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ
ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ ۙ وَّالّٰٓـِٔيْ لَمْ يَحِضْنَ ؕ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ

اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ
يُسْرًا (٤) ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗۤ اِلَيْكُمْ ؕ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ
عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا (٥) اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ
سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَآرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ؕ
وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ
فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ
بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗۤ اُخْرٰى ؕ (٦) لِيُنْفِقْ
ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ؕ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ
مِمَّاۤ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ؕ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَاۤ اٰتٰىهَا ؕ سَيَجْعَلُ
اللّٰهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُّسْرًا ؑ (٧) وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ اَمْرِ ع ٢ ١٧
رَبِّهَا وَرُسُلِهٖ فَحَاسَبْنٰهَا حِسَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا
نُّكْرًا (٨) فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (٩)
اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ ۖۚ مع
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۛۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا (١٠) رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا
يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ
اَبَدًا ؕ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (١١) اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ

سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ۭ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ڏ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ⑫

ع ۲ ۵ ۱۸

ترجمۂ آیات ۱-۱۲

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ان کی عدّت کے حساب سے طلاق دو اور عدّت کا شمار رکھو اور اللہ سے، جو تمھارا پروردگار ہے، ڈرتے رہو اور ان کو ان کے گھروں سے نہ نکالو۔ اور نہ وہ خود ہی نکلیں الّا آنکہ وہ کسی کھلی ہوئی بدکاری کی مرتکب ہوں۔ اور یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود ہیں اور جو اللہ کے حدود سے تجاوز کریں گے تو انھوں نے اپنی ہی جان پر ظلم ڈھایا۔ تم نہیں جانتے شاید اللہ اس کے بعد کوئی اور صورت پیدا کر دے۔ ۱

پس جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں تو ان کو یا تو دستور کے مطابق نکاح میں رکھو یا دستور کے مطابق جدا کر دو اور اپنے میں سے دو ثقہ آدمیوں کو گواہ بنا لو۔ اور گواہی کو قائم رکھو اللہ کے لیے۔ یہ نصیحت ان کو کی جاتی ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اللہ سے ڈریں گے تو اللہ ان کے لیے راہ نکالے گا اور ان کو وہاں سے رزق دے گا جہاں سے ان کو گمان بھی نہ ہوگا اور جو اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے تو اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ اللہ اپنے ارادے پورے کر کے رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ ٹھہرا رکھا ہے۔ ۲-۳

اور تمھاری عورتوں میں جو حیض سے مایوس ہو چکی ہوں اگر ان کے باب میں شک ہو تو ان کی عدّت تین مہینے ہے اور اسی طرح ان کی بھی جن کو حیض نہ آیا ہو

اور حمل والیوں کی مدت وضع حمل ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا تو اللہ اس کے لیے اس کے معاملے میں آسانی پیدا کرے گا۔ یہ اللہ کا حکم ہے جو اس نے تمھاری طرف اتارا ہے تو جو اللہ سے ڈرے گا اللہ اس سے اس کے گناہ دور کر دے گا اور اس کے اجر کو بڑھائے گا۔ ۴۔۵

اور ان کو رکھو جس طرح اپنی حیثیت کے مطابق تم رہتے ہو اور ان کو ضیق میں ڈالنے کے لیے ضرر نہ پہنچاؤ اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر خرچ کرو تا آنکہ وہ حمل سے فارغ ہو جائیں۔ پس اگر وہ تمھارے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کو ان کا معاوضہ دو اور دستور کے مطابق ایک قرارداد کر لو۔ اگر تم کوئی زحمت محسوس کرو تو اس کے لیے کوئی اور دودھ پلائے گی۔ چاہیے کہ کشادگی والا اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کرے اور جس کو کم ہی رزق دیا گیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اس کو دیا ہے۔ جتنا جس کو اللہ نے دیا ہے اس سے زیادہ کسی پر وہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اللہ تنگی کے بعد کشادگی بھی پیدا کرے گا۔ ۶۔۷

اور کتنی ہی بستیاں ایسی ہوئی ہیں جنھوں نے اپنے رب کے حکم اور اس کے رسولوں سے سرکشی کی تو ہم نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان کو نہایت ہولناک عذاب دیا تو انھوں نے اپنے کیے کا وبال چکھا اور ان کا انجام نامرادی ہوا۔ اللہ نے ان کے لیے ایک سخت عذاب بھی تیار کر رکھا ہے۔ تو اللہ سے ڈرو، اے عقل والو، اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ نے تمھاری طرف ایک یاد دہانی اتار دی ہے۔ ایک رسول جو تمھیں اللہ کی واضح آیتیں پڑھ کر سناتا ہے تاکہ ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کیے تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالے۔ اور جو ایمان لائیں گے اور عمل صالح کریں گے

ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے۔ اللہ نے ان کو نہایت اچھی روزی دی۔ ۸ - ۱۱

اللہ ہی ہے جس نے بنائے سات آسمان اور انہی کے مانند زمین بھی۔ ان میں اس کے احکام نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اس سے جانو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ نے اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔ ۱۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوۡهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحۡصُوا الۡعِدَّةَ ج وَ اتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمۡ ج لَا تُخۡرِجُوۡهُنَّ مِنۡۢ بُيُوۡتِهِنَّ وَلَا يَخۡرُجۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّاۡتِيۡنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ؕ وَتِلۡكَ حُدُوۡدُ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰهِ فَقَدۡ ظَلَمَ نَفۡسَهٗ ؕ لَا تَدۡرِىۡ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِكَ اَمۡرًا (۱)

نبی صلعم سے خطاب کی اہمیت — تمہید میں ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب شخصاً نہیں بلکہ امت کے وکیل کی حیثیت سے ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ کو خطاب کرنے کے بعد معاً طَلَّقۡتُمُ، میں ضمیر خطاب جمع کی آگئی ہے جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہاں جو احکام دیے جا رہے ہیں وہ ہیں تو تمام مسلمانوں کے لیے البتہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ احکام دینے سے ان کی اہمیت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، بہت بڑھ گئی ہے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر ان کی عظمت کا احساس پیدا ہو کہ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ان باتوں کی پابندی لازمی ہے تو دوسروں پر تو بدرجہا زیادہ ہو گی۔

طلاق کے باب میں حدود الٰہی کا احترام — جاہلیت میں طلاق کا عام طریقہ یہ رہا ہے کہ جس کو بھی بیوی پر کسی سبب سے غصہ آیا وہ نتائج و عواقب کا لحاظ کیے بغیر، ایک ہی سانس میں تین ہی نہیں بلکہ ہزاروں طلاقیں دے ڈالتا اور ساتھ ہی اس کو گھر سے باہر بھی نکال دیتا کہ جب طلاق دے چھوڑی تو اب اپنے گھر میں اس کی ایک وقت کی روٹی کا بھی خرچ کیوں برداشت کرے! اس طرح طلاق دینے میں عورت، مرد، بچوں بلکہ پورے کنبہ کے لیے یہاں تک کہ اس بچہ کے لیے بھی، جو عورت کے پیٹ میں بصورت حمل ہو سکتا ہے، جو مضرتیں ہیں ان پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بحث ہو چکی ہے۔ یہاں انہی مضرتوں کو پیش نظر رکھ کر ہدایت فرمائی کہ غصہ اور نفرت کے جوش میں اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کو نہ بھولو۔ جو

لوگ ایسا کرتے ہیں وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑتے بلکہ خود اپنی ہی جانوں پر ظلم ڈھاتے ہیں۔

'اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ'۔ فرمایا کہ جب کسی کو طلاق دینے کی نوبت آئے تو وہ عدت کے حساب سے طلاق دے اور اس عدت کا اہتمام سے شمار رکھے۔ اس کی وضاحت سورۂ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ وہاں فرمایا ہے: 'اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ' (البقرۃ - ۲ : ۲۲۹) جس سے معلوم ہوا کہ یہ جائز نہیں ہے کہ ایک ہی سانس میں تین یا تین سے زیادہ طلاقیں دے کر بیوی کو جدا کر دے بلکہ دو مہینوں میں، دو طہروں کے اندر، طلاق دے اور پھر تیسرے طہر میں اگر چاہے تو مراجعت کرے اگر اس کو حسن سلوک کے ساتھ بیوی کی طرح رکھنا مقصود ہو، ورنہ دستور کے مطابق رخصت کر دے اگر آخری فیصلہ قطع تعلق ہی کا ہے۔ اس عدت کا شمار میاں اور بیوی دونوں کے لیے ضروری ہے۔ بیوی کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ ان تین مہینوں کے اندر، جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۸ میں بیان ہوا، وہ اس بات کی پابند ہے کہ کسی اور مرد کی زوجیت میں نہیں جا سکتی۔ میاں کے لیے اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس مدت کے اندر اس کو حق حاصل ہے کہ اگر وہ اس کو بیوی کی طرح رکھنا چاہے تو مراجعت کرے۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد اس کا یہ حق ختم ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اس دوران میں اگر معلوم ہوا کہ عورت حاملہ ہے تو اس کی عدت وضعِ حمل تک ممتد ہو جائے گی اور اس دوران میں عورت کے نان نفقہ اور اس کی رہائش کی ساری ذمہ داری مرد پر ہوگی۔

'وَاتَّقُوا اللّٰهَ رَبَّكُمْ' فرمایا کہ اللہ سے، جو تمہارا خداوند ہے، ڈرتے رہو۔ 'ڈرتے رہو' یعنی اس کے مقرر کیے ہوئے ان حدود کی پابندی، اس غصہ کے باوجود کرتے رہو جو تمہارے اندر بیوی کے خلاف پیدا ہو چکا ہے۔ اگر حدود توڑو گے تو یاد رکھو کہ اپنے اس خداوند کے حدود توڑو گے جس کی اطاعت تم پر واجب ہے اور جس کی پکڑ اور جس کے قہر و غضب سے تمہیں کوئی نہ بچا سکے گا۔

طلاق میں عدت کی پابندی کی بعض مصلحتیں

'لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ'۔ اس عدت کے دوران نہ تو تمہیں یہ حق حاصل ہے کہ ان کو ان کے گھروں سے نکالو اور نہ انہی کے لیے جائز ہے کہ وہ وہاں سے اٹھ کھڑی ہوں بلکہ دونوں یکجا ایک ہی گھر میں رہیں تاکہ باہمی سازگاری اور اصلاح احوال کی کوئی گنجائش ہو تو یہ یکجائی اس میں مددگار ہو۔ اللہ تعالیٰ کو میاں بیوی کا رشتہ ٹوٹنا پسند نہیں ہے۔ طلاق ایک مجبوری کا علاج ہے۔ اللہ نے بندوں کی مجبوریوں کے تحت اس کو جائز تو رکھا ہے لیکن یہ 'اکرہ المباحات' یعنی جائز چیزوں میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکروہ ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے بندوں کو اس سے بچانے ہی کے لیے طلاق پر عدت کی شرط عائد کی ہے اور یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ اس مدت میں میاں بیوی دونوں ایک ہی گھر میں رہیں تاکہ دونوں ٹھنڈے دل سے اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ

کر سکیں کہ آخری قدم اٹھانے سے پہلے سازگاری اور اصلاحِ احوال کا کوئی امکان ہے یا نہیں؟

زمانۂ عدت میں شوہر کا گھر بیوی کا بھی گھر ہے

'لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ' میں لفظ 'بُيُوْتِهِنَّ' اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ مرد کو یہ نہیں خیال کرنا چاہیے کہ گھر اسی کا ہے بلکہ یہ گھر جس طرح اس کا ہے اسی طرح زمانۂ عدت میں بیوی کا بھی ہے اس وجہ سے نہ تو مرد کے لیے جائز ہے کہ بیوی کو اس کے گھر سے نکالے اور نہ بیوی کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ برہم ہو کر گھر سے چل کھڑی ہو۔ یہاں نکلنے سے مراد وہ نکلنا نہیں ہے جو معمولاً اپنی چھوٹی موٹی ضروریات کے لیے ہوا کرتا ہے بلکہ وہ نکلنا ہے جو کسی گھر کے خیرباد کہنے کے معنی میں ہوتا ہے۔

ایک مستثنیٰ صورت

'اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ' یعنی اس سے صرف ایک شکل مستثنیٰ ہے وہ یہ کہ مرد نے عورت کو طلاق کسی ایسی حرکت کی بنا پر دی ہو جو 'فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ' کے حکم میں داخل ہو۔ اس سے ظاہر ہے کہ زنا یا اس کے لوازم و مقدمات ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان سے کم درجے کی برائی کے لیے اس لفظ کا استعمال معروف نہیں ہے۔ اگر مرد کی نگاہ عورت کی کسی ایسی حرکت پر پڑی ہے اور اس سے مشتعل ہو کر اس نے طلاق دی ہے تو پھر نہ مرد سے یہ مطالبہ کرنا جائز ہے کہ وہ ایسی عورت کو اپنے گھر میں ڈالے رکھے اور نہ اس سے اس فائدہ کے حاصل ہونے ہی کی توقع ہے جس کے لیے شریعت نے یہ یکجائی ضروری قرار دی ہے۔ کسی باحمیت مرد سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ اس کے دل کے اندر کسی ایسی عورت کے لیے کبھی گنجائش پیدا ہو سکے گی جس کی بے وفائی اس کے علم میں آ چکی ہو۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جن میاں بیوی کے درمیان لعان تک نوبت پہنچ جاتی ہے ان کے درمیان فقہاء جدائی کرا دینے ہی میں بہتری خیال کرتے ہیں اس لیے کہ جو مرد بقید قسم اپنی بیوی کو فاحشہ قرار دے چکا ہر چند اس کے الزام کا قانونی توڑ عورت کی جوابی قسم سے ہو جاتا ہو لیکن اس جوابی قسم سے مرد کے دل کو نہیں بدلا جا سکتا۔ اسی طرح اگر کسی نے اپنی بیوی کو ایسی بنیاد پر طلاق دی ہے جو 'فاحشہ مبینہ' سے تعلق رکھنے والی ہے تو اس سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ اس کا دل کبھی عورت سے صاف ہو سکے گا۔

حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی کا ضرر خلاف ورزی کرنے والوں کو پہنچتا ہے

'وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ' یہ تنبیہ اور نہایت اہم تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ یہ اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں تو جو ان کو لانگنے کی جسارت کرے گا وہ یاد رکھے کہ وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا بلکہ اپنی ہی جان پر ظلم ڈھائے گا۔ اللہ نے جو قیدیں اور پابندیاں بندوں پر عائد کی ہیں کسی اپنے نفع کے لیے نہیں عائد کی ہیں بلکہ بندوں ہی کی بہبود کے لیے عائد کی ہیں۔ جو لوگ ان کو توڑتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ ان کو توڑ کر اپنے ہی شخصی، نوعی، عائلی اور اجتماعی مصالح برباد کرتے ہیں۔

ایک عظیم حکمت

'لَا تَدْرِيْ لَعَلَّ اللّٰهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ اَمْرًا' یہ اس مصلحت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو 'لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْۢ بُيُوْتِهِنَّ وَلَا يَخْرُجْنَ' کی ہدایت میں مضمر ہے۔ فرمایا کہ تم نہیں جانتے، شاید اللہ تعالیٰ اس طرح کوئی ایسی بات پیدا کر دے کہ میاں بیوی میں اختلاف کے بعد ملاپ کی صورت پیدا

ہو جائے۔ یعنی اس یکجائی کے دوران میں میاں اور بیوی دونوں کے اندر اپنے رویّہ کے جائزہ لینے کا احساس ابھرے اور ان کے پھٹے ہوئے دل ایک دوسرے سے از سرِ نو جڑ جائیں اور ان کا اجڑتا گھر پھر آباد ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اللہ تعالیٰ کو یہ بات بہت پسند ہے۔ وہ دلوں کو جڑا ہوا اور گھروں کو آباد دیکھنا پسند کرتا ہے۔ یہ پسند نہیں کرتا کہ میاں بیوی میں ایسی ناچاقی پیدا ہو کر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور صرف وہی جدا نہ ہوں بلکہ ان کے بچے ہوں تو وہ بھی اپنی ماں سے اور ماں بھی اپنے بچوں سے جدا ہو جائے۔

فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ فَارِقُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ وَّاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا (۲-۳)

مرد کو اپنا حق عورت کی ضرر رسانی کے لیے استعمال کرنا جائز نہیں ہے

فرمایا کہ جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں یعنی تیسرے طہر میں داخل ہو جائیں تب ان کے رکھنے یا الگ کر دینے کا آخری فیصلہ کرو۔ اگر ان کو رکھنا ہو تو دستور کے مطابق رکھو جس طرح ایک خدا ترس مسلمان اپنی بیوی کو رکھتا ہے اور جدا کر دینے ہی کا فیصلہ ہو تو یہ بھی شریفوں کے دستور کے مطابق یعنی کچھ دے دلا کر، احسان مروّت کے ساتھ ہو۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۱ میں فرمایا ہے: 'وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا' یعنی اگر ان کو روکو تو یہ مراجعت اس قصد سے نہ ہو کہ وہ تمہارے پنجہ میں اسیر رہیں اور تم ان کو تنگ کر سکو۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص ایسا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے اس لیے کہ اس کو مراجعت کا حق حاصل ہے لیکن یہ حق اگر کوئی عورت کو ضرر پہنچانے اور تنگ کرنے کے لیے استعمال کرے گا تو وہ خدا کے بخشے ہوئے ایک حق کو ایک نہایت ظالمانہ مقصد کے لیے استعمال کرے گا جس کا وبال بہت ہی سخت ہے۔

گواہ اور گواہی کی اہمیت

'وَاَشْهِدُوْا ذَوَيْ عَدْلٍ مِّنْكُمْ وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ' یعنی اس کو بیوی کی حیثیت سے رکھنا ہو تو اور جدا کرنا ہو تو، دونوں صورتوں میں اس پر اپنے اندر سے دو ثقہ مسلمانوں کو گواہ بنا لو تاکہ اس واقعہ کی بنا پر کوئی نزاع پیدا ہونے کا امکان باقی نہ رہے ورنہ اندیشہ ہے کہ فریقین میں سے کسی کی موت پر وراثت وغیرہ کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں۔ اس شہادت کے حکم کو فقہا نے تو عام طور پر استحسان ہی کے درجے میں رکھا ہے، اور ایک اچھے معاشرے میں اگر یہ استحسان ہی کے درجے میں رہے جب بھی کافی ہے، لیکن اس زمانے میں معاشرے کے فساد کے سبب سے جس طرح نکاح کے لیے رجسٹریشن کا طریقہ اختیار کر لیا گیا ہے اسی طرح طلاق کے لیے بھی یہ طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس سے بہت سی نزاعات کا سدِّ باب ہو سکتا ہے۔

'وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ' یہ مسلمانوں کو عام طور پر اور گواہوں کو خاص طور پر تاکید ہے کہ گواہی

کے فرائض کو اللہ کے لیے انجام دو۔ یعنی اول تو گواہی سے حتی الامکان کترانا نہیں چاہیے ثانیاً جب گواہی کی نوبت آئے تو بے رو رعایت اور بے خوف و خطر صرف اللہ کی خاطر گواہی دو۔ یہ بات یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں مسلمانوں کو شُهَدَآءَ اللهِ فِي الْاَرْضِ کے منصب پر سرفراز فرمایا ہے اس وجہ سے مسلمان کسی معاملہ میں کسی شخص یا کسی فریق کا گواہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اللہ کا گواہ ہوتا ہے اور اسی گواہی پر امت کے اندر اس کی حیثیتِ عرفی کا انحصار ہے۔

ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا لازمی تقاضا

ذٰلِكُمْ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ فرمایا کہ یہ تمین باتیں جو اوپر کی آیات میں بتائی گئی ہیں ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کے لازمی نتائج میں سے ہیں۔ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان کے مدعی ہیں ان کو ہدایت کی جاتی ہے کہ ان کو حرزِ جان بنائیں۔ ورنہ یاد رکھیں کہ ان کا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا دعویٰ بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔

حدود الٰہی کی پابندی کرنے والوں کو عظیم بشارت

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ یہ حدود کی پابندی کرنے والوں کو اطمینان دلایا ہے کہ وہ اپنے رب پر بھروسہ رکھیں کہ ان کو کوئی مشکل پیش آئی تو اللہ ان کے لیے راہ نکالے گا۔ وہ اپنے بندوں کا مشکلات کے ذریعہ سے امتحان کرتا ہے۔ جو ان سے پست حوصلہ ہو کر برگشتہ ہو جاتے ہیں خدا بھی ان کو چھوڑ دیتا ہے لیکن جو مشکلات کے علی الرغم خدا کے حدود کا احترام قائم رکھنے کا عزم کر لیتے ہیں اللہ تعالیٰ بالآخر ان کی راہ آسان کر دیتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت ۲۹: ۶۹) (جو موانع کے علی الرغم ہماری راہ پر چلنے کی جد و جہد کریں گے ہم ضرور ان کے لیے اپنی راہیں کھولیں گے)۔

وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ یہ اوپر والی بات ہی کی مزید وضاحت ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ ایک ہی سانس میں تین طلاقیں دے کر بیوی کو گھر سے نکال باہر کرنے کا ایک بڑا محرک، خاص طور پر غربا کے لیے، ان کا معاشی مسئلہ بھی ہوتا ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ جب ایک عورت کو طلاق دے چھوڑی تو اب اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری مفت میں کیوں اٹھائیں! اللہ تعالیٰ نے ان کو اطمینان دلایا ہے کہ اگر تم اللہ کے حدود کے احترام کے لیے یہ بوجھ اٹھاؤ گے تو وہ تمھیں وہاں سے رزق فراہم کرے گا جہاں سے تم کو گمان بھی نہ ہو گا۔ یہ خیال نہ کرو کہ خدا کی رحمت اور اس کی مدد کے راستے اتنے ہی ہیں جتنے تم نے سوچ رکھے ہیں یا جو تم قیاس کر سکتے ہو بلکہ اس کے بے شمار راستے ہیں جن کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کھلتے ہیں۔ اس وقت انسان حیران رہ جاتا ہے کہ اس کے لیے خدا کی مدد اس گوشے سے نمودار ہوئی جدھر سے اس کے نمودار ہونے کا وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ۔ فرمایا کہ اس کے لیے شرط صرف یہ ہے کہ خدا پر پورا بھروسہ رکھو۔ اگر تم خدا پر بھروسہ رکھو گے تو وہ تمھاری دست گیری کے لیے کافی ہے وہ اسباب و وسائل

کا محتاج نہیں ہے۔ اسباب و وسائل سب اس کے تابع ہیں۔ بندے کو یہ اندیشہ نہیں رکھنا چاہیے کہ جن نامساعد حالات میں وہ گھرا ہوا ہے خدا ان کو بدلنے سے قاصر رہ جائے گا۔ جب وہ مدد کرنا چاہے گا تو اس کے ارادے میں کوئی چیز مزاحم نہ ہو سکے گی۔

اللہ کی مدد کے ظہور کے لیے ایک وقت مقرر ہوتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر کر رکھا ہے اسی طرح اس کی نصرت کے ظہور کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ اس کے ظہور میں اگر کچھ دیر ہوتی ہے تو اس سے مقصود بندوں کے صبر کا امتحان ہوتا ہے۔ بندے کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ اللہ نے جو وعدہ کر رکھا ہے وہ ضرور پورا کرے گا۔ اگر اس میں دیر ہوگی تو اتنی ہی ہوگی جتنی اس کے صبر کے امتحان کے لیے ضروری ہے اور یہ امتحان اسی کی بھلائی کے لیے ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان آیات میں جو طریقہ طلاق دینے کا بتایا گیا ہے اگر کوئی شخص اس پر عمل نہیں کرتا بلکہ ایک ہی وقت میں تین یا اس سے زائد طلاقیں دے کر بیوی کو علیحدہ کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس سوال کے جواب میں حنفیہ اور دوسرے ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ دوسرے ائمہ کے نزدیک تو اس طرح طلاق دینے والے کی ایک سے زیادہ طلاقیں ایک ہی کے حکم میں محسوب ہوں گی لیکن حنفیہ کے نزدیک اس طرح طلاق دینے والے کی طلاق تو واقع ہو جائے گی البتہ صحیح طریقہ اختیار نہ کرنے کے سبب سے وہ عنداللہ گنہگار ہوگا۔

ہمارے نزدیک ان دونوں ہی مسلکوں میں تھوڑی تھوڑی کسر ہے جس کی اصلاح، احترام شریعت کے نقطۂ نظر سے، ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص قرآن کی اتنی واضح ہدایات کے باوجود، ایک ہی سانس میں کئی طلاقیں دے ڈالتا ہے اور اس کی اس جسارت پر اس کو کوئی تادیب نہیں ہوتی تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ دین کے ساتھ اس نے جو مذاق کیا اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔ اس کا نوٹس لینا ضروری ہے ورنہ لفظ 'طلاق' ایک بالکل بے معنی لفظ بن کے رہ جاتا ہے حالانکہ شریعت میں نکاح و طلاق کے الفاظ نہایت اہم ہیں جن کو مذاق کے طور پر بھی استعمال کیا جائے تو یہ حقیقت بن جاتے ہیں۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو حنفیہ کا مسلک، احترام شریعت کے نقطۂ نظر سے، زیادہ قرینِ صواب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کی طلاق کو واقع کر دیتے ہیں۔ لیکن ایک خامی اس میں بھی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اس کو کوئی تادیب و تعزیر نہ کی جائے تو مجرد اس بات سے کہ اس طرح طلاق دینے والا عنداللہ گنہگار ہوگا لوگوں کے اندر قرآن کے بتائے ہوئے طریقہ کا صحیح احترام پیدا نہیں کیا جا سکتا اس وجہ سے ضروری ہے کہ اس کی طلاق کو نافذ کرنے کے ساتھ دین کے ساتھ کھیل کرنے کی کوئی سزا بھی اس کو دی جائے تاکہ جو لوگ طلاق دینے کا یہ غلط طریقہ اختیار کرتے

ہیں ان کی حوصلہ شکنی ہو۔

حنفیہ کے اس فتوے کی بنیاد حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک اجتہاد پر ہے اور ہمیں جہاں تک علم ہے ان کا اجتہاد یہ ہے کہ اس طرح طلاق دینے والے کی طلاق نافذ تو کر دینی چاہیے اس لیے کہ اس نے ضائع کیا ہے تو اپنا حقِ رجعت ضائع کیا ہے لیکن ساتھ ہی حدودِ الٰہی کی جو خلاف ورزی اس نے کی ہے اس کی سزا بھی اس کو ملنی چاہیے تاکہ دوسروں کو حدودِ شریعت کی خلاف ورزی کی جرأت نہ ہو۔ یہ اجتہاد نہایت حکیمانہ ہے۔ ہم نے اس کتاب میں فقہی جزئیات پر بحث کے لیے ایک خاص حد مقرر کر لی ہے، اس وجہ سے اشارہ پر کفایت کرتے ہیں۔ اپنے بعض فقہی مقالات میں ہم نے اس پر بحث کی ہے۔

وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآئِکُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ وَّالّٰٓئِیْ لَمْ یَحِضْنَ ۭ وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۭ وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا (۴)

عورتوں کے اختلافِ حالات کے سبب سے ان کی عدت میں فرق

اوپر ان عورتوں کی عدت بتائی ہے جن کو حیض آتا ہے اور جن کی عدت کی حد بندی حیض اور طہر سے ہو سکتی ہے۔ اب یہ ان عورتوں کی عدت بتائی جا رہی ہے جو آئسہ ہو چکی ہوں یا ابھی ان کو حیض آیا ہی نہ ہو یا وہ حاملہ ہوں جس کے سبب سے ان کو حیض نہ آ رہا ہو۔ فرمایا کہ جو آئسہ ہو چکی ہوں یا جن کو ابھی حیض آیا ہی نہ ہو ان کی عدت تو تین مہینے ہے اور حاملہ کی عدت وضعِ حمل ہے۔

اربابِ تاویل کی ایک الجھن اور اس کا حل

آئسہ عورتوں کے ساتھ 'اِنِ ارْتَبْتُمْ' کی جو شرط لگی ہوئی ہے اس کے سبب سے ہمارے اربابِ تاویل کو اس میں بڑا ارتیاب پیش آیا ہے۔ عام طور پر لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر تمھیں ان کی عدت کے بارے میں کوئی شبہ ہو تو ہم تم کو بتاتے ہیں کہ ان کی عدت تین مہینے ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ عورت کو خون تو آتا ہو لیکن یہ متعین نہ ہو رہا ہو کہ یہ حیض ہے یا استحاضہ تو اس کی عدت تین مہینے ہے۔

پہلا قول سعید ابن جبیرؒ سے مروی ہے اور ابن جریرؒ نے اسی کو ترجیح دی ہے لیکن یہ قول کچھ قوی نہیں معلوم ہوتا۔ اگر مقصود محض لوگوں کے سوال کا حوالہ ہے تو اس مضمون کی تعبیر کے لیے موزوں ترین لفظ 'سوال' ہے جو قرآن میں اس طرح کے مواقع میں ہر جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس کے لیے 'اِرْتَبْتُمْ' کا لفظ موزوں نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر سوال ہوتا تو ان تینوں ہی قسم کی عورتوں سے متعلق ہوتا جن کا حکم یہاں بیان ہوا ہے، جیساکہ روایات سے معلوم بھی ہوتا ہے، لیکن 'اِرْتَبْتُمْ' اس طرح استعمال ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آئسہ عورتوں کے ساتھ بطور ایک شرط مذکور ہوا ہے۔

دوسرا قول مجاہدؒ، زہریؒ اور ابن زیدؒ سے مروی ہے۔ اس میں ایک تو یہ بات کھٹکتی ہے کہ اگر یہ مسئلہ ایسی عورتوں کا ہے جن کو خون آتا ہے لیکن یہ شک پیدا ہو رہا ہے کہ یہ حیض ہے یا استحاضہ تو ان کو آئسہ سے تعبیر کرنا موزوں نہیں تھا حالانکہ یہاں ان کے لیے 'وَالّٰٓئِیْ یَئِسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ' کے

الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس آئسہ کے بارے میں اس طرح کا شک نہ ہو اس کے لیے کوئی عدت نہیں ہے۔ وہ طلاق کے معاً بعد الگ ہو جائے گی حالانکہ جہاں تک ہمیں علم ہے غیر مدخولہ آئسہ کے لیے تو کسی عدت کی قید نہیں ہے لیکن جو آئسہ مدخولہ ہے اس کے لیے تین ماہ کی عدت کی قید بہر شکل ہے۔

ان شبہات کے سبب سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ اِنِ ارْتَبْتُمْ کی شرط یہاں آئسہ غیر مدخولہ اور آئسہ مدخولہ کے درمیان امتیاز کے لیے آئی ہے۔ یعنی آئسہ اگر مدخولہ ہے تو آئسہ ہونے کے باوجود اس کا امکان ہے کہ شاید یاس کی حالت عارضی ہو اور پھر امید کی شکل پیدا ہو گئی ہو اور اس کے رحم میں کچھ ہو۔ یہی صورت اس کو بھی پیش آ سکتی ہے جس کو ابھی اگرچہ حیض نہیں آیا ہے لیکن وہ مدخولہ ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر آئسہ غیر مدخولہ اور صغیرہ غیر مدخولہ کے لیے تو کسی عدت کی ضرورت نہیں ہے لیکن آئسہ یا صغیرہ، جس کو حیض نہ آیا ہو، اگر مدخولہ ہوں تو ان کے بارے میں چونکہ شبہ کا امکان ہے اس وجہ سے ان کے لیے عدت ہے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر بات یہی کہنی تھی تو صاف صاف یوں کیوں نہ کہہ دی کہ اگر آئسہ مدخولہ ہو تو اس کی عدت تین مہینے ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بات یوں کہی جاتی تو اس سے عدت کی اصل علت واضح نہ ہوتی جب کہ اس کا واضح ہونا ضروری تھا۔ اس عدت کی اصل علت عورت کا مجرد مدخولہ ہونا نہیں بلکہ یہ اشتباہ ہے کہ ممکن ہے اس کے رحم میں کچھ ہو۔

وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ۔ فرمایا کہ اسی طرح وہ عورتیں جو حاملہ ہوں ان کی عدت وضع حمل ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اس حکم کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۴ میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن بیان ہوئی ہے اور یہاں حاملہ کی عدت وضع حمل بیان ہوئی ہے تو اگر کسی حاملہ مطلقہ کا شوہر انتقال کر جائے تو وہ عدت کے چار مہینے دس دن پورے کرے گی یا وضع حمل کے ساتھ ہی اس کی عدت ختم ہو جائے گی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حاملہ کی عدت مہینوں اور دنوں کے حساب سے مقرر نہیں کی جا سکتی۔ وہ تو بہرحال وضع حمل ہی کے ساتھ منضبط ہوگی۔ یہ چار ماہ دس دن سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے اور کم بھی ہو سکتی ہے۔ اگر زیادہ ہو جائے تو عورت بہرحال اس کو گزارنے کی پابند ہوگی تو جب کم ہو تو عورت کو اس کمی سے فائدہ اٹھانے کا بھی حق ہونا چاہیے۔ گویا یہ دونوں حکم دو الگ الگ حالتوں سے متعلق ہیں اور دونوں اپنے اپنے دائروں میں نافذ العمل رہیں گے۔

حدودِ شریعت کی پابندی کرنے والوں کو اطمینان دہانی

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا۔ وہی بات جو آیت ۲ میں فرمائی ہے معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ یہاں بھی دہرائی ہے۔ احکام کے ساتھ ساتھ یہ تنبیہات اس لیے ضروری ہیں کہ لوگ شریعتِ الٰہی کو بوجھ نہ محسوس کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ان مطلقات کے زمانۂ عدت کے قیام اور

مصارف کا بار بعضوں کی طبیعت پر گراں تو گزرے گا لیکن جو لوگ اللہ سے ڈریں گے اور حتی الامکان اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کو قائم رکھیں گے اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانی پیدا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر جو بوجھ ڈالتا ہے اگر بندے اس کو اٹھانے کا حوصلہ کر لیتے ہیں تو وہ اس کے اٹھانے میں ان کی مدد فرماتا ہے اور جیسا کہ اوپر فرمایا ہے ان کی مدد وہاں سے کرتا ہے جہاں سے ان کو گمان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کے متعلق نہ تو یہ سوءِ ظن ہونا چاہیے کہ وہ اپنے بندوں پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے گا جو ان کی قوتِ برداشت سے زیادہ ہو اور نہ یہ اندیشہ ہونا چاہیے کہ وہ بندے پر بوجھ ڈال کر اس کو تنہا چھوڑ دے گا۔

ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۭ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا (۵)

یہ اوپر والے مضمون ہی کی مزید تاکید ہے کہ یہ اللہ کے احکام ہیں جو اس نے تمہاری طرف اتارے ہیں تو ان کو نہ گراں سمجھو، نہ ان کو حقیر جانو اور نہ یہ گمان کرو کہ وہ تم پر احکام اتار کر خود بے تعلق ہو جائے گا بلکہ وہ تمہاری مدد کرے گا اگر تم ان کو اٹھاؤ گے اور سزا بھی دے گا اگر ان کو پھینکنے کی کوشش کرو گے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا۔ یہ تسلی دی ہے کہ اللہ کے جو بندے اپنی حد تک حدودِ الٰہی کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کرے گا۔ چھوٹی موٹی غلطیاں اور کوتاہیاں جو ان سے صادر ہو جائیں گی ان کو معاف کر دے گا اور ان کے نیکیوں کے اجر کو بڑھائے گا۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ ۭ وَاِنْ كُنَّ اُولَاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوْا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ۚ فَاِنْ اَرْضَعْنَ لَكُمْ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۚ وَاْتَمِرُوْا بَيْنَكُمْ بِمَعْرُوْفٍ ۚ وَاِنْ تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهٗٓ اُخْرٰى (۶)

زمانۂ عدت میں عورتوں کو ساتھ رکھنے کا طریقہ

فرمایا کہ زمانۂ عدت میں ان عورتوں کو ساتھ رکھنے کا طریقہ ایسا نہیں ہونا چاہیے جس سے ان کی خودداری مجروح ہو بلکہ تمہاری آمدنی کے لحاظ سے رہائش کا جو معیار تمہارا ہو وہی معیارِ رہائش ان کے لیے بھی مہیا کرو اور اس دوران میں کسی پہلو سے ان کو تنگ کرنے کی تدبیریں نہ اختیار کرو کہ چند ہی دنوں میں پریشان ہو کر وہ تمہارا گھر چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔

'وجد' کے معنی یافت کے ہیں۔ آدمی کا معیارِ زندگی اس کی آمدنی کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اسی کی ہدایت ان عورتوں کے باب میں فرمائی کہ ان کو اسی معیار پر رکھنا ہوگا جو معیار آدمی کا اپنا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خود تو کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہیں اور بیوی کو نوکروں کے کسی کوارٹر یا گیراج میں ڈال دیں اور بچا کھچا اس کو کھانے کو بھیج دیں۔

وَلَا تُضَاۗرُّوْهُنَّ لِتُضَيِّقُوْا عَلَيْهِنَّ۔ اگر کسی نے دل سے اللہ تعالیٰ کے یہ احکام قبول نہ کیے

ہوں تو وہ ظاہر میں ان کی ناز برداری کرتے ہوئے بھی تنگ کرنے کی ایسی تدبیریں اختیار کر سکتا ہے کہ عورت کے لیے چوبیس گھنٹے بھی اس کے گھر میں گزارنا محال ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو وہ ساری مصلحت یک قلم فوت ہو جائے گی جس کے لیے یہ احکام دیے گئے ہیں اس وجہ سے منفی پہلو سے بھی اس بات کی وضاحت فرما دی کہ اس دوران میں ان کو تنگ کر کے بھگا دینے کی تدبیریں نہ کی جائیں۔

'وَإِنْ كُنَّ أُولَاتِ حَمْلٍ فَأَنفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّىٰ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ'۔ یہ خاص طور پر حاملہ عورتوں کے بارے میں ہدایت فرمائی کہ ان پر اس وقت تک خرچ کرو جب تک وہ حمل سے فارغ نہ ہو جائیں۔ اس خاص اہتمام سے ذکر کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کی مدتِ قیام طویل بھی ہو سکتی ہے اور بعض حالات میں ان کے مصارف کی نوعیت بھی مختلف ہو سکتی ہے۔

بعض احکام درباب رضاعت

'فَإِنْ أَرْضَعْنَ لَكُمْ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ ۖ وَأْتَمِرُوا بَيْنَكُم بِمَعْرُوفٍ'۔ یہ وضعِ حمل کے بعد کا مرحلہ ہے کہ اگر وہ تمہارے بچے کو دودھ پلائیں تو ان کو اس کا معاوضہ دو اور اس معاوضہ سے متعلق باہمی مشورہ سے ایک قرارداد طے کر لو جو وقت کے دستور اور مرد کے معیارِ زندگی کے مطابق ہو۔

'وَإِن تَعَاسَرْتُمْ فَسَتُرْضِعُ لَهُ أُخْرَىٰ' یعنی اس طرح کی قرارداد میں اگر فریقین زحمت محسوس کر رہے ہیں تو کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے کا معاملہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کا انحصار فریقین کی باہمی رضامندی، سہولت اور مفاہمت پر ہے۔ کسی کو اس معاملے میں اس کی مرضی کے خلاف مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۳۳ کے تحت رضاعت سے متعلق بنیادی مسائل پر گفتگو ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ ہمارے لیے فقہی جزئیات کی تفصیل کا زیادہ موقع نہیں ہے۔

لِيُنفِقْ ذُو سَعَةٍ مِّن سَعَتِهِ ۖ وَمَن قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللَّهُ ۚ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا مَا آتَاهَا ۚ سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا (۷)

خرچ کا معیار

یہ خرچ کا معیار بتا دیا کہ کشادہ حال کو اپنی کشادہ حالی کے معیار پر خرچ کرنا پڑے گا اور تنگ حال کو اپنی آمدنی کے مطابق۔ نہ کشادہ حال کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے معیارِ زندگی سے ان کو فروتر حال میں رکھے اور نہ غریب پر اس کی حیثیت سے زیادہ بوجھ ڈالا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص پر ذمہ داری اس کی حیثیت کے اعتبار سے ڈالی ہے۔

غریبوں کو اطمینان دہانی

'سَيَجْعَلُ اللَّهُ بَعْدَ عُسْرٍ يُسْرًا'۔ یہ غریبوں کو برسرِ موقع تسلی دی ہے کہ اگر وہ اپنی حالت پر قانع و صابر اور تنگ حالی کے باوجود خدا کے حدود کو قائم رکھنے کا اہتمام کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے لیے تنگی کے بعد آسانی پیدا کرے گا۔ غربت اور احتیاج کے باوجود اللہ کی خوشنودی کے لیے جو لوگ ایثار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے رزق میں برکت دیتا ہے۔

وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ عَتَتْ عَنْ أَمْرِ رَبِّهَا وَرُسُلِهِ فَحَاسَبْنَاهَا حِسَابًا شَدِيدًا

وَّعَذَّبْنٰهَا عَذَابًا نُّكْرًا (۸)

ایک عام تنبیہ

اس آیت کا موقع و محل سمجھنے کے لیے سورۂ تغابن کی آیات ۶-۸ پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہ ایک عام تنبیہ ہے جس کے مخاطب قریش اور مسلمان سب ہیں کہ اللہ نے تمھاری رہنمائی کے لیے اپنی ہدایات نازل کر دی ہیں۔ اگر تم نے ان کی قدر کی تو ان کا فائدہ تمھی کو پہنچے گا اور اگر نافرمانی کی تو یاد رکھو کہ تم سے پہلے کتنی قومیں گزر چکی ہیں جنھوں نے اپنے رب کے احکام اور اس کے رسولوں کی تعلیمات کی ناقدری کی تو اللہ نے ان کا سخت محاسبہ کیا اور ان کو نہایت ہولناک عذاب دیا۔ یہ اشارہ عاد و ثمود وغیرہ کی طرف بھی ہے جن کی سرگزشتیں قرآن میں سنائی گئی ہیں اور یہود کی طرف بھی جن کو اللہ نے اپنی شریعت سے نوازا لیکن انھوں نے اس کی قدر نہیں کی تو وہ اللہ کے نہایت سخت عذاب کی گرفت میں آئے۔

'عَتَتْ عَنْ اَمْرِ رَبِّهَا' میں 'عَنْ' اس امر کا قرینہ ہے کہ 'عَتَتْ' یہاں 'اَعْرَضَتْ' کے مفہوم پر متضمن ہے یعنی سرکشی کے سبب سے انھوں نے اپنے رب کے حکم سے اعراض کیا۔ 'حَاسَبْنٰهَا' یہاں محاسبہ کے مفہوم میں ہے یعنی اللہ نے ان پر سخت گرفت کی اور ان کو ہولناک عذاب دیا۔ 'نُكْر' کے معنی شدید اور ہولناک کے ہیں۔

فَذَاقَتْ وَبَالَ اَمْرِهَا وَكَانَ عَاقِبَةُ اَمْرِهَا خُسْرًا (۹)

یعنی جب وہ خدا کے محاسبہ کی زد میں آ گئیں تو انھیں اپنی سرکشی کا انجام بھگتنا پڑا اور ان کا انجام نامرادی ہوا۔ اس لیے کہ فلاح و بہبود کی واحد راہ وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے بتائی ہے۔ اگر قومیں اپنی سرکشی کے سبب سے اس سے انحراف اختیار کرتی ہیں تو لازماً نامرادی سے دوچار ہوتی ہیں۔

اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ ۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۙ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا (۱۰-۱۱)

ایک مؤثر تنبیہ و ترغیب

یہ نہایت واضح الفاظ میں مسلمانوں کو تنبیہ بھی ہے ساتھ ہی نہایت مؤثر انداز میں ترغیب بھی کہ اللہ نے تمھاری طرف اپنی یاد دہانی (قرآن) بھی نازل کر دی اور اپنا رسول بھی بھیج دیا ہے۔ اب آگے کا کام تمھارا ہے کہ تاریکی سے روشنی کی طرف نکلنے کے لیے جو اہتمام اللہ نے فرمایا ہے اس کی قدر کرتے ہو یا ان قوموں کی تقلید کرتے ہو جن کا انجام نامرادی ہوا اور جن کے لیے اللہ نے ایک سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔

'فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۚ ۛ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' یعنی جب قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا

معاملہ اسی سنت کے مطابق ہوا جو مذکور ہوئی تو اے اہلِ عقل جو ایمان لائے ہو، دانش مندی کا راستہ یہی ہے کہ اپنے اللہ سے ڈرو۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے ایمان کی راہ میں جو قدم بڑھایا ہے اس سے یہ بات تو ثابت ہوئی کہ تم خواہشوں کے غلام نہیں بلکہ عقل سے کام لینے والے لوگ ہو کہ ایمان کی راہ اختیار کی تو اب تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے اللہ سے ڈرو اور اس کے حدود سے انحراف نہ اختیار کرو ورنہ تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا جو ان قوموں کا ہوا جنھوں نے اللہ کی بتائی ہوئی راہ سے انحراف کیا۔

عقل و ایمان لازم و ملزوم ہیں

'یٰٓاُولِی الْاَلْبَابِ' کے بعد 'الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' سے یہ بات نکلتی ہے کہ عقل اور ایمان میں لازم و ملزوم کا رشتہ ہے۔ جو شخص عاقل ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ ایمان سے بہرہ ور ہو۔ اگر کوئی شخص ایمان سے بہرہ ور نہیں ہے تو خواہ وہ آسمان و زمین کا طول و عرض ناپنے میں کتنا ہی ماہر ہو لیکن اس کی عقل میں بہت بڑا فتور ہے۔

ہدایت کے لیے اہتمام

'قَدْ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکُمْ ذِکْرًا ۙ رَّسُوْلًا یَّتْلُوْا عَلَیْکُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ مُبَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ' یہ اس اہتمام کی طرف اشارہ ہے جو اللہ نے اپنی حجت تمام کر دینے کے لیے فرمایا ہے کہ تمہاری طرف اپنی یاددہانی بھی اس نے نازل کر دی ہے اور ایک رسول بھی بھیج دیا ہے جو ایمان و عملِ صالح کی راہ اختیار کرنے والوں کو اللہ کی آیات سنا رہا ہے تاکہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی شاہراہ پر لائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس اہتمام کے بعد بھی اگر تم نے روشنی پر تاریکی ہی کو ترجیح دی تو اس کی ذمہ داری تمہارے ہی اوپر ہوگی اور اس گمراہی کے لیے اپنے رب کے سامنے تم کوئی عذر نہ پیش کر سکو گے۔

رسول کی زندگی سراپا ذکرِ الٰہی ہوتی ہے

'ذِکْرًا ۙ رَّسُوْلًا' میں 'ذکر' سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن کو 'ذِکْرٰی' اور 'ذِی الذِّکْرِ' کے الفاظ سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے۔ اس تعبیر کے مضمرات کی طرف ہم اس کے محل میں اشارہ کر چکے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کے تمام مضمرات کی یاددہانی کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے خلق کی رہنمائی کے لیے جو ہدایات بھیجیں اور جن کو قومیں فراموش کرتی رہیں ان کی بھی یاددہانی کرتا ہے، رسولوں کی تکذیب کرنے والوں اور ان پر ایمان لانے والوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو معاملہ کیا اس کی بھی یاددہانی کرتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس جزا اور سزا کی یاددہانی کرتا ہے جس کا ایک معین دن اس زندگی کے بعد لازماً ظہور میں آنے والا ہے جو اس دنیا کی غایت و نہایت ہے۔

'رَسُوْلًا' یہاں 'ذِکْرًا' سے بدل ہے اور اس کا بدل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان دونوں میں روح اور قالب کا رشتہ ہے۔ چنانچہ قرآن کے لیے جس طرح لفظ 'ذکر' آیا ہے اسی طرح رسول کے لیے 'مُذَکِّر' آیا ہے 'اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ' (الغاشیۃ ۸۸: ۲۱) (تم تو بس ایک مذکر ہو)۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سراپا ان حقائق کی یاددہانی تھی جن کی یاددہانی کے لیے قرآن نازل ہوا۔ یعنی قرآن نے

جو کچھ بتایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ سب کچھ کر کے بھی دکھا دیا جس سے لوگوں پر اللہ کی حجت اس طرح پوری ہو گئی کہ اس میں کسی پہلو سے کوئی کسر باقی نہیں رہی۔

رزقِ آخرت کی بشارت

قَدْ اَحْسَنَ اللّٰهُ لَهٗ رِزْقًا۔ یعنی جو ایمان و عمل صالح کی راہ اختیار کرے گا اور حدودِ الٰہی کی حفاظت کی خاطر ایثار کرے گا وہ مطمئن رہے کہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ اللہ نے اس کے لیے آخرت میں نہایت اعلیٰ رزق تیار کر رکھا ہے۔ اوپر آیت ۳ میں ایثار و توکل کرنے والوں کو اس دنیا میں تائیدِ الٰہی کی بشارت دی ہے۔ یہ رزقِ آخرت کی بشارت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا (۱۲)

صفاتِ الٰہی کا حوالہ تاکہ لوگوں کا عقیدہ محکم ہو

یہ آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ قدرت اور صفتِ علم کی یاددہانی فرمائی ہے تاکہ اوپر جو باتیں فرمائی گئی ہیں، خواہ ان کا تعلق تنبیہ و تہدید سے ہو یا تسکین و تسلی سے، ان کا اعتقاد لوگوں کے اندر راسخ ہو اور وہ یہ جانیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پناہ ہے، وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور اس کا علم بھی محیطِ کل ہے، سات آسمانوں اور سات زمینوں کی کوئی چیز بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ اگر کسی نے کوئی نیکی کی ہے تو وہ بھی اس کے علم میں ہے اور اگر کسی نے کوئی بدی کی ہے تو وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ سے متعلق یہ شعور اچھی طرح دلوں کے اندر راسخ نہ ہو اس وقت تک اس کی شریعت کے احترام کا صحیح حق ادا نہیں ہو سکتا۔

سات آسمان اور سات زمین

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ۔ اپنی قدرت کی وسعت کا تصور دینے کے لیے فرمایا کہ یہ نہ گمان کرو کہ خدا کی کائنات کل اتنی ہی ہے جتنی تمھیں نظر آتی ہے۔ یہ تو اس کی کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر اور محدود حصہ ہے۔ یہ آسمان جو تمھیں نظر آتا ہے اس جیسے سات آسمان خدا نے بنائے ہیں اور زمین بھی یہی نہیں ہے جس پر تم چلتے پھرتے ہو بلکہ زمینیں بھی ہر آسمان کے ساتھ الگ الگ سات ہیں۔

سات آسمانوں کا ذکر تو قرآن میں بھی بار بار ہوا ہے اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی ہے لیکن سات زمینوں کا ذکر صرف اس سورہ میں ہوا ہے لیکن جب سات آسمانوں کا ذکر ہوا ہے تو ان کے ساتھ سات زمینوں کا پایا جانا تو لازمی ہوا۔ آسمان اور زمین میں وہی نسبت ہے جو مکان اور اس کی چھت میں ہوتی ہے تو جب چھتیں سات ہیں تو مکان بھی سات ہونے چاہئیں۔ جس طرح آسمان کے بغیر زمین کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح زمین کے بغیر آسمان کا بھی کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بلندی کے لیے پستی کا وجود ناگزیر ہے۔

رہا یہ سوال کہ ان ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں میں ایک ہی طرح کے قوانین و نوامیس نافذ ہیں اور ایک ہی قسم کی مخلوق آباد ہے یا الگ الگ مخلوق اور الگ الگ نوامیس و قوانین ہیں تو مجرد مِثْلَهُنَّ

کے لفظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ہر عالم میں ایک ہی مخلوق اور ایک ہی قسم کے نوامیس و قوانین ہوں۔ اس تثلیث کا تعلق صرف پیدا کرنے سے ہے کہ اللہ نے جس طرح سات آسمان بنائے ہیں اسی طرح زمینیں بھی سات بنائی ہیں۔ رہے ان کے نوامیس و قوانین تو یہ چیز نہ اللہ تعالیٰ نے بتائی ہے اور نہ ہماری اور آپ کی سمجھ میں آنے والی ہی ہے۔ ہمارے لیے یہ اجمالی ایمان بس ہے کہ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہماری سائنس ابھی خلائے لا متناہی میں آوارہ گردی کر رہی ہے۔ وہ ایک راز کا انکشاف کرتی ہے تو اس سے سینکڑوں معمے دوسرے پیدا ہو جاتے ہیں۔ تاہم مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اگر سائنس سراغ نہ دے سکی تو آخرت میں ان شاء اللہ سارے راز کھل جائیں گے۔ اس دنیا میں انسان کو جو علم ملا ہے وہ بہت قلیل ہے۔ 'وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا' (بنی اسرآءیل - ۱۷ : ۸۵)

'یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ'۔ یعنی جس طرح تمہارے آسمان و زمین کے درمیان خدا کے احکام و قوانین کا نزول ہوتا ہے اسی طرح دوسرے آسمانوں اور زمینوں کے اندر بھی اس کے احکام نازل ہوتے ہیں۔

'لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کا یہ راز تم پر اس لیے کھولا ہے کہ تم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ 'لِتَعْلَمُوْٓا' سے پہلے ایک مناسب موقع فعل محذوف ہے اور اس قسم کے حذف کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

'وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا'۔ یہ اس کا دوسرا مقصد واضح فرمایا کہ جس طرح اس کی قدرت کی کوئی حد و نہایت نہیں اسی طرح اس کے علم کی بھی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ اس کا علم ان تمام عوالم کی ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فللّٰہ الحمد ولہ المنۃ۔

رحمان آباد

۲۵- اپریل ۱۹۷۸ء

۱۶- جمادی الاول ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

٦٦

التّحریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلّق

سابق سورہ کی تفسیر میں ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ دونوں سورتیں —— الطلاق اور التحریم —— علی الترتیب یہ تعلیم دے رہی ہیں کہ نفرت اور محبت دونوں طرح کے حالات کے اندر اللہ تعالیٰ کے حدود کی پابندی واجب ہے۔ چنانچہ سابق سورہ میں بتایا کہ نفرت کے اندر کس طرح حدودِ الٰہی کا احترام قائم رکھا جائے۔ اب اس سورہ میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ محبت کے اندر کس طرح اللہ کے حدود کی حفاظت کی جائے۔

نفرت کی طرح محبت کا جذبہ بھی انسان پر غالب ہو جائے تو اس کو بالکل یک رخا بنا کے رکھ دیتا ہے اور وہ ان لوگوں کے ساتھ، حدودِ الٰہی کے معاملے میں، نہایت بے حس اور مداہنت کرنے والا بن جاتا ہے جن سے اس کو محبت ہوتی ہے۔ بیوی بچوں کو وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ ان کا رویہ شریعت سے ہٹا ہوا ہے لیکن یا تو اس کو ان کے انحراف کا احساس ہی نہیں ہوتا یا ہوتا ہے تو وہ یہ فرض کر کے نظر انداز کر جاتا ہے کہ آہستہ آہستہ خود بخود ان کی اصلاح ہو جائے گی۔ حد یہ ہے کہ بہت سے لوگ اپنے متعلّقین کی کھلی ہوئی زیادتیوں پر بھی، ان کو ٹوکنے یا روکنے کے بجائے یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی غلطی پر پردہ ڈالنے کے لیے کوئی عذر تلاش کریں۔ یہ کمزوری صرف عام لوگوں ہی کے اندر نہیں بلکہ ان لوگوں کے اندر بھی پائی جاتی ہے جو دوسروں کی اصلاح کے لیے خدائی فوجدار بنے پھرتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس طرح کے لوگوں پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ کسی کے ساتھ محبت کا صحیح تقاضا یہ نہیں ہے کہ اس کو اپنی مداہنت سے خدا کے غضب کے حوالہ کیا جائے بلکہ اس کا صحیح تقاضا یہ ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس کو خدا کی پکڑ سے بچایا جائے اگرچہ اس مقصد کی خاطر کچھ ناگواریاں بھی گوارا کرنی پڑیں۔ وہ شخص جو اپنے بیوی بچوں اور دوستوں کی خلافِ شریعت باتوں سے چشم پوشی کرتا ہے وہ درحقیقت ان سے محبت نہیں کرتا ہے بلکہ ان کو نہایت بے دردی کے ساتھ خدا کے غضب کے حوالے کر رہا ہے لیکن اس کو اپنے اس فعل کے نتائج کا شعور نہیں ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے احتساب جو اگرچہ صادر

ہوا تو کمزوروں پر رافت اور بیویوں کی دلداری کے جذبہ سے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر گرفت فرمائی کہ اللہ کا رسول تمام امت کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ معاملے میں بھی کوئی ایسی بات کرے جو اللہ کے حدود کے خلاف ہو، اگرچہ اس کا محرک نیک ہی ہو۔

اسی طرح ازواج نبی رضی اللہ عنہم کی ایک بات پر گرفت فرمائی گئی جو ہر چند صادر ہوئی باہمی حسن ظن و اعتماد کی بنا پر لیکن اللہ تعالیٰ نے اس پر بھی احتساب فرمایا کہ ازواج نبی رضی اللہ عنہم تمام امت کی خواتین کے لیے نمونہ ہیں۔ دوسروں کی نسبت وہ اس بات کی زیادہ ذمہ دار ہیں کہ ان سے کوئی ایسی بات صادر نہ ہو جو شریعت کے حدود سے ہٹی ہوئی ہو اگرچہ اس کا سبب باہمی اعتماد و حسن ظن ہی ہو۔ ساتھ ہی یہ تنبیہ کہ اللہ کے ہاں مسئولیت درجہ و مرتبہ کے اعتبار سے ہے جن کے درجے جتنے ہی اونچے ہیں ان کی مسئولیت اتنی ہی زیادہ ہے۔

(۶-۸) نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجؓ کے احتساب کے بعد عام مسلمانوں کو یہ موعظت کہ آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنا اور اپنے متعلقین کا برابر احتساب کرتے رہو اور اس بات کو یاد رکھو کہ اللہ نے دوزخ پر جو فرشتے مامور کیے ہیں وہ نہایت سخت گیر ہیں۔ کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی نرمی یا مداہنت کرنے والے نہیں ہیں۔ اس دن کسی کا بھی کوئی عذر قبول نہیں ہوگا۔ ہر ایک کو صاف جواب ملے گا کہ آج ہر ایک کے سامنے اس کا عمل ہی آرہا ہے، کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہو رہی ہے۔ اس دن فائز المرام صرف وہ ہوں گے جو مخلصانہ توبہ کے ذریعے سے اپنے کو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا حق دار بنالیں گے۔ وہ دن پیغمبرؐ اور اس کے مخلص ساتھیوں کی سرفرازی کا دن ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ان کے نور کو کامل کرے گا۔ باقی سب محروم و نامراد ہوں گے۔

(۹-۱۲) پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو پرزور الفاظ میں تاکید کہ کفار و منافقین کو پوری سختی کے ساتھ جھنجھوڑ کر سنا دو کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم ہی میں بنائیں گے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ آخر میں کفّار کے سامنے حضرت نوحؑ و حضرت لوطؑ کی بیویوں کی مثال اور مسلمانوں کے سامنے فرعون کی بیوی اور حضرت مریمؑ کی مثالیں پیش کر کے یہ حقیقت واضح فرمائی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کام آنے والی چیز آدمی کا اپنا ایمان و عمل ہے۔ اگر یہ چیز موجود نہ ہو تو حضرت نوحؑ و حضرت لوطؑ جیسے جلیل القدر نبیوں کی بیویاں ہونا بھی کوئی نفع پہنچانے والی چیز نہیں ہے اور اگر یہ چیز موجود ہو تو فرعون کی بیوی ہو کر بھی ایک عورت آخرت کے بلند سے بلند درجات کی حق دار ہو سکتی ہے۔

سُورَةُ التَّحرِيم (۶۶)

مَدَنِيَّةٌ ——— اٰيات : ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ آيات ۱-۱۲
اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱﴾ قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ
اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ﴿۲﴾ وَاِذْ اَسَرَّ
النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ
اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ ۚ فَلَمَّا نَبَّاَهَا
بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ؕ قَالَ نَبَّاَنِيَ الْعَلِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۳﴾
اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ
فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ ﴿۴﴾ عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا
خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ
سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ﴿۵﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ
وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ
غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا

يُؤْمَرُونَ ﴿٦﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَعْتَذِرُوا الْيَوْمَ ۖ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ
ع ١ / ١٩ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٧﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً
نَصُوحًا عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيُدْخِلَكُمْ جَنَّاتٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ يَوْمَ لَا يُخْزِي اللَّهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَهُ ۖ نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ
يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ
قَدِيرٌ ﴿٨﴾ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ
وَمَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿٩﴾ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا
لِلَّذِينَ كَفَرُوا امْرَأَتَ نُوحٍ وَامْرَأَتَ لُوطٍ ۖ كَانَتَا تَحْتَ
عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا
عَنْهُمَا مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَقِيلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدَّاخِلِينَ ﴿١٠﴾
وَضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا لِلَّذِينَ آمَنُوا امْرَأَتَ فِرْعَوْنَ إِذْ قَالَتْ وقف لازم
رَبِّ ابْنِ لِي عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِي مِنْ فِرْعَوْنَ
وَعَمَلِهِ وَنَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿١١﴾ وَمَرْيَمَ ابْنَتَ
عِمْرَانَ الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُوحِنَا
ع ٢ / ٥ / ٢٠ وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهِ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِينَ ﴿١٢﴾

ترجمۂ آیات

١ - ١٢

اے نبی، تم اپنی بیویوں کی دل داری میں وہ چیز کیوں حرام ٹھہراتے ہو جو اللہ
نے تمھارے لیے جائز کی ہے! اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اور اللہ نے

تمھاری خلافِ شرع قسموں کا توڑ دینا تم پر فرض کر دیا ہے اور اللہ ہی تمھارا مولیٰ و مرجع ہے اور وہ علیم و حکیم ہے۔ ۱-۲

اور جب کہ نبی نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی تو جب انھوں نے اس کی خبر کر دی اور اللہ نے اس سے پیغمبر کو آگاہ کر دیا تو پیغمبر نے کچھ بات جتا دی کچھ ٹال دی تو جب پیغمبر نے بیوی کو اس کی خبر کی تو وہ بولیں کہ آپ کو کس نے اس کی خبر دی؟ پیغمبر نے کہا، مجھے خدائے علیم و خبیر نے خبر دی۔ اگر تم دونوں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمھارے لیے زیبا ہے، تمھارے دل تو خدا کی طرف مائل ہی ہیں اور اگر تم اس کے خلاف ایکا کرو گی تو اس کا حامی اللہ ہے اور جبریل اور تمام نیکوکار مسلمان اور مزید برآں فرشتے بھی اس کے مددگار ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمھیں طلاق دے چھوڑے تو اس کا پروردگار تمھارے بدلے میں تم سے بہتر بیویاں اس کو دے دے۔ اطاعت شعار، مومنہ، فرمانبردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، ریاض کرنے والیاں، شوہر آشنا اور کنواریاں۔ ۳-۵

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے۔ جس پر درشت مزاج اور سخت گیر ملائکہ مامور ہوں گے۔ اللہ ان کو جو حکم دے گا اس کی تعمیل میں وہ اس کی نافرمانی نہیں کریں گے اور وہ وہی کریں گے جس کا ان کو حکم ملے گا۔ اے لوگو، جنھوں نے کفر کیا، آج عذر نہ پیش کرو، تم وہی بدلے میں پا رہے ہو جو تم کرتے رہے ہو۔ ۶-۷

اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اللہ کی طرف مخلصانہ رجوع کرو۔ امید ہے کہ

تمھارا پروردگار تمھارے اوپر سے تمھارے گناہ جھاڑ دے اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ جس دن کہ اللہ نبی کو اور ان لوگوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لائے، رسوا نہیں کرے گا۔ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دہنے چل رہی ہو گی۔ وہ دعا کر رہے ہوں گے: اے ہمارے پروردگار، ہمارے لیے روشنی کو کامل کر اور ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ ۸

اے نبی! کفار اور منافقین سے جہاد کر اور ان پر سخت ہو جا۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ کیا ہی برا ٹھکانا ہے! ۹

اللہ کافروں کے لیے مثال بیان کرتا ہے نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی۔ دونوں ہمارے بندوں میں سے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں تو انھوں نے ان کے ساتھ بے وفائی کی تو وہ اللہ سے ان کے کچھ کام آنے والے نہ بن سکے اور دونوں عورتوں کو حکم ہوا کہ جاؤ تم بھی دوزخ میں پڑنے والوں کے ساتھ دوزخ میں پڑو۔ ۱۰

اور اللہ ایمان والوں کے لیے مثال بیان کرتا ہے فرعون کی بیوی کی۔ جب کہ اس نے دعا کی: اے میرے رب! میرے لیے اپنے پاس جنت میں ایک گھر بنا اور مجھ کو نجات دے فرعون سے اور اس کے عمل سے اور مجھے نجات دے ظالموں کی قوم سے۔ اور مریم بنت عمران کی مثال بیان کرتا ہے جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی پس ہم نے اس میں اپنی روح پھونکی اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی اور وہ فرماں برداروں میں سے تھی۔ ۱۱-۱۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۱)

پیغمبر صلعم کے ایک فعل پر احتساب

اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ جن کے ساتھ محبت و مروّت کے تعلقات ہوں خدا کے حدود و حقوق کے معاملات میں ان کے ساتھ بھی کوئی مداہنت و رعایت جائز نہیں ہے بلکہ اس محبت ہی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا احتساب زیادہ احتیاط کے ساتھ ہوتا رہے تاکہ خدا کے چھاج میں پھٹکے جانے سے پہلے ہی ممکن ہو تو ان کی اصلاح ہو جائے اور اگر اصلاح نہ ہو تو بدرجۂ ادنیٰ آدمی اپنے حقِ نصیحت سے عنداللہ بری الذمہ ہو جائے۔

اس حقیقت کو مبرہن کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں سب سے پہلے اپنے پیغمبرؐ ہی پر گرفت فرمائی کہ آپ نے اپنی ازواجِ مطہراتؓ کی دلداری کے خیال سے اپنے اوپر ایک ایسی چیز حرام کیوں کر لی جو اللہ نے آپ کے لیے جائز کی؟

غور کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیغمبرؐ اور ان کی ازواجؓ سے زیادہ کون محبوب ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود آپ کی ایک معمولی سی فروگذاشت پر، جو خود قرآن کے بیان کے مطابق، ایک نہایت نیک محرک سے صادر ہوئی، آپ کو تنبیہ فرمائی گئی تاکہ ہر شخص کے سامنے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جائے کہ خدا کے حدود و قیود کی پابندی سے جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہراتؓ بھی بالا نہیں ہیں تو تا بہ دیگراں چہ رسد!

واقعہ کی نوعیت

رہا یہ سوال کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج کی دلداری کے خیال سے اپنے اوپر کیا چیز حرام کر لی تھی تو اس کے جواب میں راویوں سے مختلف اقوال منقول ہیں۔ زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ ازواجِ مطہراتؓ میں سے کسی کے پاس شہد نوش فرمایا جس کی بُو پر آپ کی بعض ازواج نے ناگواری کا اظہار فرمایا۔ شہد کی بعض قسمیں ناگوار بُو کی ہوتی بھی ہیں اور نہ بھی ہوں تو جو لوگ زیادہ ذکی الحس ہوتے ہیں وہ ہر بُو کو پسند نہیں کرتے۔ خاص طور پر خواتین اس معاملے میں زیادہ شدید الاحساس ہوتی ہیں۔ وہ بسا اوقات اچھی بھلی اور اچھے خاصے ذائقہ کی چیزوں کو بھی پسند نہیں کرتیں۔ لوگوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں۔ امہات المومنینؓ میں سے بھی بعض کو وہ شہد پسند نہیں تھا جس میں مغافیرؔ[1] کی بُو ہو۔ چنانچہ انھوں نے اپنی اس ناگواری کا اظہار حضورؐ کے سامنے فرمایا۔ حضورؐ چونکہ خود نہایت لطیف المذاق اور دوسروں

---

[1] یہ ایک خاص بوٹی کا نام ہے جس سے شہد کی مکھیاں شہد لیتی ہیں لیکن بعض لوگوں کو اس کی بُو ناگوار ہوتی ہے۔

بالخصوص جنسِ ضعیف، کے جذبات و احساسات کا بڑا پاس و لحاظ رکھنے والے تھے، اس وجہ سے آپؐ نے عہد کر لیا کہ اب کبھی شہد نوش نہیں فرمائیں گے۔

عام حالات میں تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی بلکہ ایک نیک محرک سے صادر ہونے کے سبب سے نہایت پسندیدہ بات تھی لیکن پیغمبر کا ہر قول و فعل دین میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا ہر عمل پوری امت کے لیے مثال و نمونہ ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ذاتی ذوق و رجحان اور اپنے محبوب سے محبوب لوگوں کی خاطر سے بھی کوئی ایسی بات کہے یا کرے جو بال برابر بھی اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے متجاوز ہو، ورنہ پوری امت کے لیے ایک غلط مثال قائم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ یہود کے متعلق معلوم ہے کہ انھوں نے اپنے اوپر اونٹ کو صرف اس بنا پر حرام کر لیا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کسی سبب سے اونٹ کا گوشت نہیں کھاتے تھے۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے علم میں یہ بات آتی کہ حضورؐ نے شہد نہ کھانے کا عہد کر لیا تو کوئی متقی مسلمان مشکل ہی سے شہد کو ہاتھ لگاتا۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ پر گرفت فرمائی اور فوراً اس کی اصلاح کے لیے ہدایت فرمائی۔

حضورؐ کے فعل کا محرک

'تَبۡتَغِیۡ مَرۡضَاتَ اَزۡوَاجِکَ' سے اس محرک کی طرف اشارہ ہے جو آپؐ کے اس اقدام کا باعث ہوا۔ اس محرک کا پتہ دینا اس لیے ضروری ہوا کہ اس سورہ کا مقصد ہی، جیسا کہ ہم نے تمہید میں بیان کیا، یہ تعلیم دینا ہے کہ جن کے ساتھ محبت کے تعلقات ہوں ان کے احتساب میں بھی آدمی کو مداہن نہیں ہونا چاہیے۔ نفرت کی طرح محبت بھی حدودِ الٰہی کے احترام سے آدمی کو غافل کر دیتی ہے۔ اس خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ اور آپ کی ازواج پر گرفت فرمائی، جن سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں کوئی دوسرا محبوب نہیں ہو سکتا، تاکہ مسلمانوں کو اس سے یہ سبق حاصل ہو کہ دین کے معاملے میں کسی محبوب سے محبوب کے ساتھ بھی کوئی رعایت جائز نہیں ہے۔

غلطی پر گرفت کے ساتھ ہی معافی کا اعلان

'وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ'۔ حضورؐ کے اس فعل کا محرک چونکہ نہایت نیک تھا، آپ نے محض جذبۂ رافت و محبت کے تحت، خاص اپنی ذات کے لیے ایک فیصلہ فرمایا تھا، امت کے لیے کسی چیز کو حرام کرنا مقصود نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے گرفت کے ساتھ ہی اس فروگزاشت کی معافی کا اعلان بھی فرما دیا۔

یہاں اس امر پر نگاہ رہے کہ معافی کے اعلان میں نہایت مبادرت پائی جاتی ہے۔ یعنی اس طرح کے کسی اقدام کا شرعی حکم بیان کرنے سے پہلے ہی معافی کا اعلان فرما دیا گیا۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتی ہے کہ حضورؐ کے سامنے اپنے اس فعل کا وہ پہلو بالکل نہیں تھا جس پر گرفت فرمائی گئی بلکہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، آپ نے محض جذبۂ رافت کے تحت، جنسِ ضعیف کی دلداری کے لیے، اپنی ذات پر ایک پابندی عائد فرمائی تھی، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر گرفت تو فرمائی تاکہ اس سے وہ مضرتیں نہ پیدا ہوں جن کے پیدا ہونے کا امکان تھا لیکن ساتھ ہی اس کی معافی کا اعلان بھی فرما دیا تاکہ یہ گرفت

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے دل پر گراں نہ گزرے۔

حضرات انبیاء علیہم السلام سے صادر ہونے والی لغزشوں کی نوعیت

یہاں وہ بات یاد رکھیے جو اس کتاب میں ہم بار بار بیان کر چکے ہیں کہ حضرات انبیاء علیہم السلام سے کوئی لغزش صادر ہوتی ہے تو وہ نفس کی پاسداری میں نہیں ہوتی بلکہ کسی خیر کی پاسداری میں وہ حد مطلوب سے متجاوز ہو جاتے ہیں۔ بیویوں کی دلداری کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ یہ شرافت، مروت، فتوت کا تقاضا اور فطرت و شریعت کا مطالبہ ہے جس کی قرآن نے تاکید فرمائی ہے بشرطیکہ یہ شریعت کے حدود کے اندر رہے۔ اگر یہ اس سے متجاوز ہونے لگے تو یہ فتنہ بن جاتی ہے جس سے بچنا اور بچانا ضروری ہے لیکن جب کسی فروگزاشت کا محرک نیک ہو تو اس پر گرفت اس طرح ہونی چاہیے کہ عفو و درگزر اس کے ہم رکاب رہے۔

قَدْ فَرَضَ اللّٰهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ ۚ وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ (۲)

ناجائز قسم کے بارے میں شریعت کا حکم

یہ حکم بیان فرمایا ہے اس صورت کے لیے جب کوئی شخص اپنے اوپر کسی جائز چیز کو حرام کر لینے کی قسم کھا بیٹھے۔ اوپر کی آیت میں خطاب صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تھا اس آیت میں عام مسلمانوں سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لغزش پر ٹوکنے سے اصل مقصود، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی تھا کہ اس کے سبب سے امت کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ چنانچہ اس آیت میں تمام مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے اوپر کسی جائز چیز کو حرام کر لینے کی قسم کھا بیٹھے تو اللہ نے اس کے لیے یہ ضروری ٹھہرایا کہ وہ اس قسم کو توڑ ڈالے اور حرام کردہ چیز کو جائز کرے۔

'وَاللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ' یہ وجہ بیان ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بات کیوں ضروری ٹھہرائی ہے؟ فرمایا کہ اللہ ہی تمہارا آقا و مولیٰ ہے اس وجہ سے اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ تمہیں بتائے کہ تمہارے لیے کیا حلال ہے اور کیا حرام؛ نہ کسی کو خود یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے جی سے کسی چیز کو حرام یا حلال ٹھہرائے اور نہ یہ جائز ہے کہ کسی دوسرے کے لیے وہ تحریم و تحلیل کا حق تسلیم کرے۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے حق میں مداخلت کرے گا جو شرک ہے۔

'وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ' یہ اسی حقیقت کی مزید وضاحت ہے کہ حقیقی علیم و حکیم اللہ تعالیٰ ہی ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو جو حکم دیا ہے یا جس چیز سے روکا ہے وہ تمام تر علم و حکمت پر مبنی ہے۔ کسی دوسرے کو خدا سے زیادہ علیم و حکیم ہونے کے خبط میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قسم توڑ دینے کا حکم تو دیا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ کسی کفارہ کا ذکر نہیں ہے تو کیا اس صورت میں کوئی کفارہ عائد نہیں ہوتا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قسم توڑنے پر کفارہ کا حکم المآئدۃ کی آیت ۸۹ میں بیان ہو چکا ہے اس وجہ سے اس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں تھی البتہ یہاں 'تَحِلَّةَ اَيْمَانِكُمْ' کے الفاظ سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ اگر کسی نے قسم کھا کر

کوئی چیز حرام ٹھہرائی ہو تب تو کفارہ ضروری ہوگا۔ لیکن قسم نہ کھائی ہو تو کفارہ ضروری نہیں ہے۔

وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا ۚ فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ ۖ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا ۖ قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ (۳)

ازواجِ نبی کے احتساب کی ایک مثال

اوپر کی آیت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احتساب تھا۔ اس آیت میں ازواجِ نبی میں سے ایک بیوی کی فروگذاشت پر گرفت فرمائی کہ انھوں نے حضورؐ کی کوئی بات، جو آپ نے بطورِ راز ان سے فرمائی، کسی دوسری بیوی پر ظاہر کر دی۔ پھر جب حضورؐ نے ان کی اس غلطی پر ٹوکا تو اس پر نادم ہونے کے بجائے انھوں نے اس ٹوکنے کو اپنی خودداری کے منافی محسوس کیا اور جن بیوی پر راز ظاہر کیا گیا تھا انھوں نے بھی اس کو ناگوار جانا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان دونوں بیویوں کو تنبیہ فرمائی تاکہ ہر شخص پر یہ واضح ہو جائے کہ دین کے معاملے میں ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) بھی احتساب سے بالاتر نہیں ہیں۔

واقعہ کی نوعیت

'وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا'۔ مفسرین نے عام طور پر اس واقعہ کو اوپر والے واقعہ ہی سے جوڑ کر ایک ناگوار داستان کی شکل دے دی ہے لیکن عربیت کے لحاظ سے یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ واقعہ اوپر کے واقعہ ہی کا ایک حصہ ہو بلکہ اقرب یہ ہے کہ یہ ایک دوسری بات کا حوالہ ہو جس کا صدور ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) میں سے کسی سے ہوا جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ زبان کا یہ نکتہ یاد رکھیے کہ 'وَإِذْ' سے بالعموم کسی دوسرے مستقل واقعہ ہی کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

یہاں قرآن نے اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے کہ حضورؐ نے کیا راز کی بات کہی اور کس بیوی سے کہی بلکہ اس کو پردے ہی میں رکھا ہے اس وجہ سے ہم اس راز کے درپے ہونا جائز نہیں سمجھتے۔ حضورؐ کی ازواج ہمارے لیے ماؤں کی منزلت میں ہیں۔ بیٹوں کے لیے یہ بات کسی طرح پسندیدہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی ماؤں اور باپوں کے درمیان کے رازوں کے کھوج میں لگیں۔ بالخصوص جب کہ اس راز کے انکشاف سے اس آیت کے فہم میں کوئی مدد بھی نہ مل رہی ہو۔ یہاں راز کے افشا ہی پر تنبیہ فرمائی گئی ہے تو اگر ہم اس کے درپے ہوں گے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس چیز سے روکا گیا ہے ہم نے اس کا ارتکاب کیا۔ البتہ اتنی بات اس آیت سے صاف واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ازواجِ مطہرات کو اپنا محرمِ راز بناتے تھے جو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کو ان کی رازداری اور ان کی فہم و بصیرت پر پورا اعتماد تھا۔ میاں بیوی کے تعلقات کا سارا حسن و جمال اسی اعتماد میں ہے۔ اگر باہم یہ اعتماد نہ ہو کہ ایک دوسرے کو محرمِ راز بنا سکیں تو یہ اعلیٰ انسانی اقدار سے بالکل خالی زندگی ہوگی۔

ازواجِ مطہرات کے بارے میں حضورؐ کا پورا اعتماد

'فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ'۔ یہاں اتنی بات بربنائے قرینہ محذوف ہے کہ حضورؐ نے جن بیوی کو محرمِ راز بنایا انھوں نے یہ راز کسی دوسری بیوی پر

ظاہر کر دیا۔ اگرچہ آیت میں جس طرح اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ کس بیوی سے یہ غلطی صادر ہوئی اسی طرح اس بات کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے کہ یہ افشائے راز کس بیوی پر ہوا لیکن اتنی بات واضح ہے کہ معاملہ ازواجِ مطہراتؓ کے درمیان ہی کا ہے، کسی غیر کے سامنے کوئی افشائے راز نہیں ہوا۔ مفسرین نے عام طور پر حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت حفصہؓ کے نام لیے ہیں۔ اگر اس قول پر اعتماد کیجیے تو اس سے یہ بات نہایت واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ ان سیدات کے باہمی تعلقات ایسے خوش گوار تھے کہ آپس میں اہم رازوں کے معاملے میں بھی کوئی پردہ نہ تھا۔ اس سے ان روایات کی تردید ہوتی ہے جن میں غیر محتاط راویوں نے ان کی باہمی چشمک و رقابت کے واقعات بیان کیے ہیں۔

حدودِ الٰہی کے معاملہ میں کوئی بھی احتساب سے بالا نہیں ہے

اس افشائے راز سے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو باخبر کر دیا جس کے بعد حضورؐ نے ان بیوی کو اس کی طرف توجہ دلائی جن سے یہ غلطی صادر ہوئی۔ یہ توجہ دلانا اس لیے ضروری تھا کہ میاں بیوی کے تعلقات میں رازداری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیویوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہروں کے رازوں کی حفاظت کرنے والی بنیں۔ قرآن میں ان کی خاص صفت 'حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ' (رازوں کی حفاظت کرنے والیاں) بیان ہوئی ہے۔ بیوی، شوہر کے رازوں کی قدرتی امین ہوتی ہے۔ اگر وہ اس میں خیانت کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے گھر میں اسی نے نقب لگائی جس کو اس نے گھر کا پاسبان بنایا۔ امانت کی یہ صفت یوں تو ہر بیوی میں ہونی ضروری ہے لیکن ذمہ داریاں علیٰ فرقِ مراتب ہوتی ہیں۔ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) پر یہ ذمہ داری دوسروں کی نسبت بدرجہا زیادہ تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کے ایما پر حضورؐ نے ان کو متنبہ فرمایا تاکہ یہ حقیقت کھل کر ہر شخص کے سامنے آ جائے کہ حدودِ الٰہی کے معاملے میں کوئی بھی احتساب سے بالا نہیں ہے۔

ایک نہایت لطیف حقیقت

'عَرَّفَ بَعْضَهٗ وَاَعْرَضَ عَنْۢ بَعْضٍ' کے الفاظ ایک نہایت ہی لطیف حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہ حضورؐ نے بیوی صاحبہ کا احتساب تو فرمایا کہ یہ دین کا تقاضا تھا لیکن اس طرح نہیں کہ ان کے لتے لے ڈالے ہوں بلکہ کچھ بات ظاہر فرمائی اور کچھ نظر انداز فرما دی۔ یہ طریقہ حضورؐ نے اس وجہ سے اختیار فرمایا کہ بیوی صاحبہ کو تنبیہ تو ہو جائے لیکن یہ تنبیہ ان کے دل پر زیادہ شاق نہ گزرے۔ حضورؐ کے اندر اولاً تو رافت تھی ہی بہت، منافقین و مخالفین کی غلطیوں پر بھی آپ کبھی درشت الفاظ میں نہیں ٹوکتے تھے۔ ثانیاً یہ معاملہ ازواجِ مطہراتؓ کا تھا جن کی نسبت یہ گمان نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کی کوئی غلطی ارادی بدنیتی پر مبنی ہوگی۔ چنانچہ یہ غلطی بھی، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، کسی بدنیتی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ محض اس وجہ سے صادر ہو گئی کہ بی بی صاحبہ نے خیال فرمایا کہ دوسری بیوی صاحبہ بھی جب شوہر کی محبوب و معتمد ہیں تو یہ بیچ کی بات ان کے سامنے ظاہر کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ ازدیادِ محبت و اعتماد کا سبب ہوگی۔ یہ خیال نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اس میں کسی قسم کے فسادِ نیت کو دخل نہیں تھا۔ لیکن ساتھ ہی

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایک اہم پہلو اس میں نظر انداز ہو گیا کہ یہ افشائے راز اس کردار کے منافی ہے جو بیویوں کے لیے اللہ اور رسول نے پسند فرمایا ہے اور جس کا ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کے اندر کمال درجہ پایا جانا اس وجہ سے ضروری تھا کہ وہ تمام امت کی خواتین کے لیے نمونہ ہیں۔ پھر معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا جو صرف ایک شوہر ہی نہیں بلکہ اللہ کے رسول بھی تھے۔ معاملہ کی اس اہمیت کے سبب سے اس پر گرفت ہوئی لیکن اس طرح نہیں کہ کسی کا فضیحتا ہو بلکہ اشاروں کے انداز میں ہوئی اور یہی انداز ان حالات میں بابرکت ہے جب کہ غلطی کا صدور کسی برے ارادے سے نہ ہوا ہو۔

مفسرین کی بے احتیاطی

ہمارے مفسرین نے اس راز سے پردہ اٹھانے کی جو کاوش کی ہے ہم اس سے تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ اس کی بنیاد اول تو ایسی روایات پر ہے جن میں نہایت واضح تضاد ہے۔ پھر یہ کاوش اس تعلیم کے بھی خلاف ہے جو اس آیت میں دی گئی ہے۔ جب خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو زیادہ کھولنے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی یہ بات پسند فرمائی تو کسی دوسرے کے لیے یہ کس طرح جائز ہے کہ وہ اس کے بخیے ادھیڑنے بیٹھے بالخصوص جب کہ معاملہ اللہ کے رسول اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے درمیان کا ہو۔

'فَلَمَّا نَبَّاَهَا بِهٖ قَالَتْ مَنْ اَنْۢبَاَكَ هٰذَا ۭ قَالَ نَبَّاَنِیَ الْعَلِیْمُ الْخَبِیْرُ'۔ جب حضورؐ نے یہ بات اشارۃً بیوی صاحبہ کو بتائی تو وہ فوراً بولیں کہ آپ کو اس کی خبر کس نے دی! یعنی اس کی صحت سے تو انھوں نے انکار نہیں کیا لیکن اپنی فروگزاشت کی طرف متوجہ ہونے کے بجائے انھیں فکر یہ ہوئی کہ یہ بات حضورؐ کو بتائی کس نے؟ ان کا ذہن اسی طرف گیا ہو گا کہ جس بیوی کو انھوں نے رازدار بنایا تھا انہی نے یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی۔ اس طرف ذہن جانے کے لیے قرینہ موجود تھا کیونکہ ان کے سوا انھوں نے کسی اور پر یہ بات ظاہر نہیں کی تھی۔ ہو سکتا ہے انھیں کچھ غصہ بھی آیا ہو جیسا کہ ان کے اندازِ سوال 'مَنْ اَنْۢبَاَكَ' سے اشارہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہوا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ کسی سے اپنے اعتماد کو ٹھیس پہنچے تو اس سے رنج ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ لیکن حضورؐ نے ان کی یہ غلط فہمی فوراً رفع فرما دی کہ یہ بات مجھے خدائے علیم و خبیر نے بتائی ہے، کسی دوسرے نے نہیں بتائی ہے۔ حضورؐ کی اس وضاحت سے بیوی صاحبہ کا سوءِ ظن دور ہو گیا ہو گا جس کا دور ہونا ضروری تھا۔ اسی مقصد سے حضورؐ نے یہ وضاحت بلا تاخیر ضروری سمجھی۔

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَیْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِیْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِیْرٌ (۴)

یہ ان دونوں بیویوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر تم اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی بات تمہارے شایانِ شان ہے اس لیے کہ تمہارے دل تو اللہ کی طرف جھکے ہوئے ہیں ہی۔ اور اگر تم نے رسول کے خلاف

ایکا کیا تو یاد رکھو کہ رسول اپنی دل جمعی کے لیے تمھارا محتاج نہیں ہے بلکہ اس کی طمانیت کے لیے اللہ، جبریل اور مومنین صالحین کی معیت و رفاقت کافی ہے، مزید براں فرشتے بھی اس کے ساتھی اور مددگار ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فروگزاشت تو ایک بیوی صاحبہ سے ہوئی تھی تو یہاں خطاب دوسے کیوں ہوا اور دوسری بیوی صاحبہ سے کون سی غلطی صادر ہوئی تھی جس پر ان کو بھی توبہ کی ہدایت ہوئی، بظاہر تو وہ بالکل بے قصور نظر آتی ہیں؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوی صاحبہ پر ان کے افشائے راز کے سبب سے ناخوشی کا اظہار فرمایا تو دوسری بیوی صاحبہ کو یہ گمان گزرا ہو گا کہ شاید اس ناخوشی کا سبب یہ ہے کہ یہ افشائے راز ان کے سامنے کیوں ہوا؟ انھوں نے خیال فرمایا ہو گا کہ بات میرے ہی سامنے ظاہر کی گئی تھی، کسی غیر کے سامنے نہیں، تو آخر اس پر عتاب کی کیا وجہ ہوئی، اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ مجھے غیر خیال کیا گیا، اگرچہ ان کا یہ احساس بالکل غلط فہمی پر مبنی تھا لیکن جہاں محبت و اعتماد کے معاملے میں تنافس ہو وہاں اس طرح کی غلط فہمی کا پیدا ہو جانا کچھ بعید نہیں۔

بے جا خودداری کے اظہار پر گرفت

بہرحال ان دونوں ہی سیدات نے اس گرفت کو اپنی خودداری کے خلاف محسوس کیا اور یہ چیز اس شکل میں ظاہر ہوئی کہ یہ دونوں ہی بیویاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ روٹھ سی گئیں۔ عام حالات میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ میاں بیوی میں اس طرح کی باتیں آئے دن ہوتی ہی رہتی ہیں لیکن معاملہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواج مطہراتؓ کا تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس پر سختی سے گرفت فرمائی تاکہ ازواجِ نبی پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ دین کے معاملے میں کسی کو بھی بے جا خودداری کے اظہار کا حق نہیں ہے۔ ان سے فروگزاشت ہوئی ہے تو دوسروں سے زیادہ وہ سزاوار ہیں کہ اپنے رویے کی اصلاح کریں۔ یہی بات ان کے شایانِ شان اور ان کے ایمان و انابت کا مقتضیٰ ہے۔ اور اگر انھوں نے ضد سے کام لیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا کیا تو یاد رکھیں کہ اللہ کا رسول اپنی دل جمعی و طمانیت کے لیے ان کا محتاج نہیں ہے بلکہ وہی اس کی محتاج ہیں۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ان بیویوں کی طرف سے جس رویے کا مظاہرہ ہوا اس کا محرک کوئی نفرت یا غصہ کا جذبہ نہیں بلکہ، جیساکہ واضح ہوا محض اعتماد و محبت یا بالفاظ دیگر تدلّل کا جذبہ تھا لیکن قرآن نے اس پر گرفت سخت الفاظ میں کی۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم تمہیدی مباحث میں اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سورہ میں دراصل تعلیم دی ہی اس بات کی گئی ہے کہ محبت کے جذبات کے اندر بھی اللہ کے حدود اور اس کے احکام و اوامر کی پوری پوری پابندی کی جائے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ازواجِ نبی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف اپنا شوہر ہی نہیں بلکہ ہر حال میں آپ کو اللہ کا رسول سمجھیں اور

ہر طرح کے حالات کے اندر اس خاص پہلو کو سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ مستحضر رکھیں۔ اس لیے کہ آپ کی یہ حیثیت دوسری تمام حیثیتوں پر بالا ہے۔

اِنْ تَتُوْبَآ اِلَی اللّٰہِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا۔ اس ٹکڑے کی تاویل میں ہمارے مفسرین سے سخت لغزش ہوئی ہے۔ انھوں نے 'صَغَتْ' کے معنی کج ہونے کے لیے اور تاویل یہ کی کہ اگر تم دونوں توبہ کرو تو یہی تمھیں کرنا چاہیے اس لیے کہ تمھارے دل تو کج ہو چکے ہیں۔

اس تاویل میں کئی غلطیاں ہیں جن میں سے بعض کی طرف ہم توجہ دلائیں گے۔

لفظ 'صغو' کی تحقیق

۱۔ اس میں پہلی غلطی تو یہ ہے کہ یہ تاویل عربیت کے بالکل خلاف ہے۔ لفظ 'صغو' عربی میں کسی شے سے انحراف کے معنی میں نہیں بلکہ کسی شے کی طرف جھکنے اور مائل ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر سورۂ تحریم میں اس لفظ کی لغوی تحقیق بیان فرمائی ہے۔ اس کا ضروری حصہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

"دنیا کی تمام زبانوں میں عموماً اور عربی زبان میں خصوصاً خاص خاص الفاظ ایک کلی معنی کے تحت ہوتے ہوئے بھی خاص خاص معانی کے لیے مخصوص ہوتے ہیں۔ جو لوگ زبان کی ان خصوصیات سے ناواقف ہوتے ہیں وہ اس کے فہم سے بالکل محروم رہتے ہیں۔"

یہ کلیہ بیان کرنے کے بعد مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"مثلاً 'میل' جس کے معنی جھکنے اور ہٹنے کے ہیں، ایک کلی مفہوم ہے جس کے تحت عربی میں بہت سے الفاظ ہیں، مثلاً زیغ، جور، اعوجاج، حیادۃ، انحراف وغیرہ لیکن یہ سب میل عن الشیء یعنی کسی چیز سے ہٹ جانے یا برگشتہ ہو جانے کے لیے آتے ہیں۔ پھر اسی کلی مفہوم کے تحت فی، توبۃ، التفات اور صغو وغیرہ الفاظ بھی ہیں جو سب کے سب میل الی الشیء یعنی کسی چیز کی طرف مائل ہونے اور جھکنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں......"

"لفظ کی اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد عربی زبان کے ایک عالم سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہ سکتی کہ 'صَغَتْ قُلُوْبُکُمَا' کے معنی انابت قلوبکما و مالت الی اللہ ورسولہ' (یعنی تم دونوں کے دل اللہ اور رسول کی طرف جھک چکے ہیں) کے ہوں گے کیونکہ لفظ 'صغو' کسی شے کی طرف جھکنے کے لیے آتا ہے، اس سے مڑنے اور ہٹنے کے لیے نہیں آتا۔"

"اس لفظ کی یہ حقیقت اس کے تمام مشتقات میں بھی موجود ہے۔ مثلاً 'صاغیۃ الرجل' کسی شخص کے اتباع کو کہتے ہیں۔ 'صغوہ معک' کے معنی ہیں اس کا میلان تمھاری طرف ہے۔ 'اصغیت الی فلان' کے معنی ہیں اس کی طرف تم نے کان لگایا۔ حدیث شریف میں ہے: 'ینفخ فی الصور فلا یسمعہ احد الا اصغی الیہ' (صور پھونکا جائے گا تو ہر شخص اس کی طرف متوجہ

ہو جائے گا) اسی طرح محاورہ ہے 'الصبی اعلم بمصغی خدہ' (بچہ اپنی آغوشِ محبت کو خوب پہچانتا ہے)۔ 'ھرۃ (بلی) والی حدیث میں ہے: 'کان یصغی لھا الاناء' (اس کے لیے برتن جھکا دیتے کہ وہ آسانی سے پانی پی لے)۔ برتن کے جوف کو 'صغو' کہتے ہیں کیونکہ چیز اس میں جمع ہو جاتی ہے۔"

ابن بری نے 'اصغاء سمع' (کسی کی طرف کان لگانا) کے ثبوت میں کسی شاعر کا مندرجہ ذیل شعر پیش کیا ہے:

تری السفیہ بہ عن کل محکمۃ   زیغ وفیہ للتسفیہ اصغاء

(بے وقوف عزت وشرف کی باتوں سے منہ موڑتا ہے اور سفاہت کی باتوں کی طرف کان لگاتا ہے)

"شاعر اونٹنی کی تعریف میں کہتا ہے:

تصغی اذا شدھا بالکور جانحۃ   حتی اذا ما استوی فی غرزھا تثب

(جب وہ اس پر کجاوہ کستا ہے وہ گردن موڑ کر کان لگاتی ہے اور جب وہ رکاب میں پاؤں رکھ دیتا ہے وہ جھپٹ پڑتی ہے)"

"اعشیٰ اپنی کتیا کی آنکھ کا ذکر کرتا ہے:

تری عینہا صغواء فی جنب موقہا   تراقب کفی والقطیع المحرما

(اس کی آنکھ گوشۂ چشم کی طرف جھکی ہوئی ہوتی ہے اور وہ میرے ہاتھ اور سخت کوڑے کو دیکھتی ہوتی ہے)

"نمر بن تولب نے 'اصغاء اناء' کا محاورہ ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے لیکن لفظ کے اصل مفہوم کی روح اس کے اندر بھی موجود ہے:

وان ابن اخت القوم مصغی اناؤہ   اذا لم یزاحم خالہ باب جلد

(اور قوم کے بھانجے کی حق تلفی کی جاتی ہے اگر وہ اپنے ماموؤں کی مزاحمت ایک بہادر باپ سے نہ کرے)"

مولانا رحمۃ اللہ علیہ، یہ محاورات واشعار لسان العرب سے نقل کرنے کے بعد، نہایت گہرے تاثر کے ساتھ فرماتے ہیں:

"جن لوگوں کو حق کی تلاش ہے ان کے لیے یہ شواہد بس ہیں۔ وہ ان سے مطمئن ہو جائیں گے اور گھڑنے والوں نے روایات و آثار میں جو زہر ملایا ہے اس سے وہ متاثر نہ ہوں گے۔ انھوں نے جب کتاب الٰہی میں کسی لفظی تحریف کی راہ مسدود دیکھی تو معنوی تحریف ہی کی کچھ

راہیں کھول لیں اور 'صغو' کے معنی 'زیغ' کے کر دیے حالانکہ دونوں کے درمیان آسمان وزمین کا فرق ہے۔ بعض روایات میں 'فقد صغت' کی جو قرارت آئی ہے وہ بالکل ہی ناقابلِ التفات ہے۔"

شرطیہ کے ایک اسلوب کی وضاحت

۲- دوسری غلطی اس میں یہ ہے کہ اگر بات یہ کہی ہوتی کہ تم دونوں توبہ کرو اس لیے کہ تمھارے دل کج ہو چکے ہیں، تو اس کے لیے یہ اسلوب بیان، جو قرآن نے یہاں اختیار کیا ہے، بالکل ہی ناموزوں ہے۔ 'ان' شرطیہ کے بعد 'قد' جو آتا ہے، جس طرح یہاں آیا ہے، اس کی متعدد مثالیں قرآن اور کلامِ عرب سے مولانا رحمۃ اللہ علیہ پیش کرنے کے بعد اس اسلوب کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"ان مثالوں پر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ اس اسلوب میں 'قد' کے بعد جو جملہ آتا ہے وہ اس امر کی آسانی و سہولت کو بیان کرتا ہے جو 'ان' کے بعد کہی جاتی ہے۔ یعنی اسلوب کے اجمال کو کھول دیا جائے تو تقدیرِ کلام یوں ہو گی کہ اگر ایسا ایسا ہوا تو کچھ حرج نہیں، یا کوئی تعجب نہیں یا یہ معمولی بات ہے کیونکہ ایسا ایسا ہو چکا ہے۔ اس روشنی میں آیت کی تاویل یہ ہو گی کہ اگر تم پیغمبر کی رضا جوئی کے لیے خدا سے توبہ کرو تو یہی تم سے متوقع ہے اس لیے کہ تمھارے دل تو پہلے ہی سے اس کی طرف جھکے ہوئے ہیں۔"

نفسیاتِ انسانی کی ایک حقیقت

۳- اس میں تیسری غلطی یہ ہے کہ ازواجِ مطہرات کو بالکل بلا سبب دل کے زیغ و انحراف کا گنہگار بنا دیا گیا ہے حالانکہ اوپر ہم نے الفاظِ قرآن کی روشنی میں واقعہ کی جو نوعیت بیان کی ہے اس سے صاف واضح ہے کہ اس میں کسی پہلو سے کسی فسادِ نیت کا کوئی شائبہ نہیں ہے بلکہ جو کچھ بھی ہوا باہمی اعتماد و محبت اور اخلاص کی بنا پر ہوا۔ حضورؐ نے ایک بات راز کے طور پر ایک بیوی سے کہی انھوں نے وہ بات بر بنائے محبت دوسری بیوی پر ظاہر کر دی۔ حضورؐ کو اللہ تعالیٰ نے اس افشائے راز سے آگاہ فرما دیا تو آپ نے ان بیوی صاحبہ کو ٹوکا جن سے یہ کوتاہی صادر ہوئی لیکن انھوں نے اس ٹوکنے کو قرار واقعی اہمیت نہ دی بلکہ یہ خیال کیا کہ شوہر کی بات انھوں نے شوہر ہی کی دوسری معتمد و محبوب بیوی پر اگر ظاہر کی تو یہ ایسی غلطی نہیں ہے جس پر گرفت کی جائے۔ پھر ان کے اس رویے پر حضورؐ کچھ کھنچے کھنچے ظاہر ہوئے تو اس اعتماد کی بنا پر جو شوہر کی محبت پر تھا وہ بھی ازراہ تدلل روٹھ گئیں اور اس میں ان بیوی صاحبہ نے بھی ان کا ساتھ دیا جن پر راز ظاہر کیا گیا تھا۔ انھوں نے، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس بات میں اپنی کچھ توہین سی محسوس فرمائی ہو گی کہ ایک ایسی بات پر عتاب ہوا جو ان پر ظاہر کی گئی۔ اس طرح کے احساسِ خودداری کا معزز گھرانوں کی سیدات کے اندر ابھرنا ذرا بھی عجیب نہیں ہے۔

یہاں نفسیاتِ انسانی کی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ جب روٹھنے کا سبب محبت و اعتماد ہو تو خفگی محض ظاہر کا پردہ ہوتی ہے جس کے پیچھے نہایت گہری خواہش ملاپ کی موجود ہوتی ہے۔

یہاں بھی یہی صورت تھی۔ دونوں بیویاں بظاہر روٹھ گئیں لیکن دل کے ہر گوشے میں یہ بے قراری موجود تھی کہ حضورؐ کی طرف سے ذرا ملاطفت کا اظہار ہو تو وہ خفگی کا یہ مصنوعی پردہ اٹھا دیں لیکن حضورؐ اپنے رویہ میں کوئی نرمی اس وجہ سے پیدا نہیں کر سکتے تھے کہ آپ کو، جیسا کہ واضح ہوا، گھر والوں کو یہ تعلیم دینی تھی کہ محبت کے اندر بھی وہ اللہ و رسول کے احکام کو مقدم رکھیں۔ ناچار بیویوں ہی کو اپنی بے جا خودداری سے دست بردار ہونا تھا لیکن اعتماد محبت کی زنجیر سخت ہوتی ہے۔ دل سے یہ چاہنے کے باوجود کہ کوئی ایسی بات ہو جائے کہ یہ بیگانگی دور ہو، وہ پہل کرنے سے ہچکچاتی رہیں۔ قرآن نے اِنْ تَتُوْبَآ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا کے الفاظ سے ان کی اسی باطنی کشمکش کی طرف نہایت خوبی سے اشارہ کیا ہے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مفسرین اس کو سمجھ نہ سکے۔ اور دل کے اس پُرمحبت جھکاؤ کو العیاذ باللہ وہ دل کی کجی گمان کر بیٹھے۔

سیدہ عائشہؓ اور سیدہ حفصہؓ میں گہری محبت تھی

وَاِنْ تَظٰهَرَا عَلَيْهِ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰٓئِكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ۔ 'تظاھر' کے معنی ہیں ایک دوسرے کے ساتھی اور مددگار رہنا۔ اس کے بعد 'علیٰ' کے صلہ سے اس کے اندر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا یا اتحاد کر لینے کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ اوپر ہم اس اتحاد کی نوعیت اور اس کے سبب کی طرف اشارہ کر چکے ہیں کہ یہ کسی جنگ و پیکار کا مظاہرہ نہیں بلکہ اعتماد و تدلل کا مظاہرہ تھا۔ انھوں نے یہ خیال کیا کہ اس معاملے میں انھیں اپنی خودداری کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ یہ حقیقت ان کی نگاہوں سے اس وقت اوجھل ہو گئی کہ دین کے معاملے میں احتساب سے کوئی بھی بالا نہیں ہے یہاں تک کہ اللہ کا رسول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس امر پر نگاہ رہے کہ یہاں جن سیدات کے اتحاد کی طرف اشارہ ہے مشہور روایت کے مطابق وہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما ہیں جن کی نسبت تفسیری روایات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان کے درمیان سوکنوں کے قسم کی چشمک و رقابت برابر رہتی تھی لیکن قرآن کے اس مقام میں ان کا جو کردار بیان ہوا ہے وہ اس امر کی ناقابل تردید شہادت ہے کہ ان میں ایسی گہری محبت تھی کہ وہ شوہر کے راز میں بھی ایک دوسری کو شریک کر لیتی تھیں۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ایک دوسری کی ہمدردی میں شوہر سے روٹھ بھی جاتی تھیں۔

پیغمبرؐ کی دلچسپی کا اصل مرکز

آیت میں خطاب اگرچہ دو بیویوں سے ہے لیکن اس میں جو تنبیہ ہے وہ تمام ازواج مطہراتؓ سے متعلق ہے۔ ان کو یہ آگاہی دی گئی ہے کہ اگر وہ روٹھ جائیں گی تو یہ نہ سمجھیں کہ اس سے ہمارے پیغمبر کی بزم سونی ہو جائے گی۔ پیغمبر کو جو دلچسپی ان کے ساتھ ہے اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس کی اصل وابستگی اللہ سے ہے جو اس کا مولیٰ و مرجع ہے، پھر جبریلؑ اس کے ساتھی ہیں جو وحی لاتے ہیں، پھر مومنین صالحین ہیں جو اس کی توجہ و تربیت کے اصل حقدار ہیں۔ مزید برآں اللہ کے فرشتے ہیں جن کی

رفاقت و معیت اس کو ہر شکل میں حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کو اپنے شوہر کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس فرقِ عظیم کو ملحوظ رکھنا چاہیے جو ایک عام شوہر اور ایک پیغمبرؐ میں ہوتا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی عظیم مصروفیات میں سے جو لمحے بچا کر انھیں بخش دیں اس کی قدر کریں۔ اس گمان میں نہ رہیں کہ پیغمبرؐ ان کی محبت و رفاقت کے محتاج ہیں اس وجہ سے ہر معاملے میں لازماً ان کی دلداری ملحوظ رکھیں گے۔ وہ دلداری وہیں تک کریں گے جہاں تک اللہ تعالیٰ کے حدود کے اندر گنجائش ہوگی۔ اگر کسی معاملے میں ذرا بھی حدود سے تجاوز ہوگا تو اس پر احتساب بھی ان کے فرائض میں داخل ہے جس میں کوتاہی ان کے لیے روا نہیں ہے۔

عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا (۵)

ازواجِ نبی کے سامنے اعلیٰ صفات کا ایک آئینہ

یہ وہی اوپر والا مضمون، احتساب کے تقاضے سے کس قدر تیز ہوگیا ہے۔ ازواجِ مطہراتؓ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تمھیں یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ اگر تم پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے روٹھ گئیں تو پھر اس کی دلبستگی کا کوئی سہارا باقی نہیں رہے گا۔ آج اللہ نے اس کی رفاقت کے لیے جس طرح تمھارا انتخاب فرمایا ہے اگر وہ تمھیں طلاق دے چھوڑے تو اللہ تم سے بہتر بیویاں اس کے لیے منتخب فرما دے گا جن کے اندر وہ تمام اوصاف ہوں گے جو ہونے چاہئیں۔ یہاں ان بیویوں کے جو اوصاف گنائے ہیں وہ سب دوسرے مقامات میں زیرِ بحث آ چکے ہیں۔ خاص طور پر سورۂ احزاب آیت ۳۵ کے تحت جو بحث گزر چکی ہے اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ یہاں اعادے میں طوالت ہوگی۔

کنواریوں کے ساتھ 'ثَيِّبٰتٍ' کے ذکر سے مقصود اس حقیقت کو سامنے لانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اصلی قدر و قیمت اعلیٰ اوصاف کی ہے، ثیبہ اور کنواری ہونا ثانوی چیزیں ہیں۔ اگر اوصافِ حمیدہ موجود ہوں تو ثیبہ کو کنواری پر تقدم حاصل ہے چنانچہ یہاں 'ثیبات' کا ذکر پہلے ہے۔

'سٰٓئِحٰتٍ' کا ترجمہ مترجمین نے 'روزہ رکھنے والیاں' کیا ہے لیکن ہمارے نزدیک لفظ کی یہ تعبیر ناقص ہے۔ یہ 'سیاحت' سے ہے جو ایک دینی اصطلاح ہے اور جس کا مفہوم وسیع ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۱۱۲ کے تحت اس کی پوری تحقیق ہم بیان کر چکے ہیں۔ اس کی روح زہد اور ترکِ دنیا ہے اس وجہ سے اس سے وہ عبادات اور ریاضتیں مراد ہیں جو اسلام نے ترکِ دنیا اور زہد کے لیے پسند فرمائی ہیں، مثلاً روزہ، اعتکاف اور حج وغیرہ۔ یہ درحقیقت رہبانیت کے زمرہ کی عبادت ہے۔ جس طرح رہبانیت اسلام میں ایک خاص حد ہی تک جائز ہے اسی طرح سیاحت بھی ایک خاص حد ہی تک مطلوب ہے۔ روزہ اس ریاضت کے اہم ارکان میں سے ضرور ہے لیکن اس کا ترجمہ روزہ کے لفظ سے صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ ریاضت کرنے والیاں کیا ہے جو نسبتہً جامع ہے اور ان

تمام عبادتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو اس کے تحت آتی ہیں۔ ان میں روزہ بھی شامل ہے۔

دین میں احتساب کی اہمیت

یہ آیات پڑھتے ہوئے یہ حقیقت مستحضر رہے کہ یہ احتساب ازواجِ نبی (رضی اللہ عنہم) کا ہو رہا ہے جن کی پاکی وطہارت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اور جن کو تمام عالم کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ ان ذوات کو محض اس بنا پر طلاق تک کی دھمکی دے دی گئی کہ ان سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تربیت قبول کرنے کے معاملے میں ذرا سی بے پروائی ہو گئی اور وہ بھی بربنائے مخالفت و مکابرت نہیں بلکہ محض بربنائے محبت و اعتماد۔ اس سے اندازہ کیجیے کہ دین میں احتساب و تربیت کا کیا درجہ ہے۔ گویا اسلامی معاشرہ میں وصل و فصل کی اصل بنیاد یہی ہے۔ جو محبت اس احتساب و تربیت سے خالی ہو وہ محبت نہیں بلکہ شیطان کا پھندا ہے۔ اہل ایمان کی محبت کا اصل جمال یہی ہے کہ وہ اللہ کے حدود کے تابع ہوتی ہے۔ اس معاملے میں وہ ایک دوسرے سے کبھی غافل نہیں ہوتے بلکہ جن سے جتنی ہی زیادہ محبت ہوتی ہے ان کے احتساب میں وہ اتنے ہی زیادہ بیدار ہوتے ہیں اس لیے کہ حقیقی محبت کا تقاضا یہی ہے۔ پھر جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کے خیرخواہانہ کلمات کے لیے دلوں میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے تو وہ عزیز سے عزیز رشتوں کے کاٹ دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اس لیے کہ روحانی تعلق کے ختم ہو جانے کے بعد مجرد جسمانی تعلق کی ان کی نگاہوں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلٰٓئِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (٦)

احتساب کی عام منادی

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی ازواجِ مطہراتؓ کے احتساب کے بعد یہ عام مسلمانوں کو جھنجھوڑا ہے کہ تم بھی اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی اس آگ سے بچانے کی کوشش کرو جس کے ایندھن لوگ اور پتھر بنیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نے دیکھ لیا کہ پیغمبرؐ اور ان کی ازواجؓ بھی اللہ تعالیٰ کے احتساب سے بالا نہیں ہیں تو دوسروں کا کیا ذکر! ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتا ہے وہ اٹھا نہ رکھے۔ جب بھی دیکھے کہ ان کے اندر اللہ کی شریعت سے بے پروائی راہ پا رہی ہے فوراً اس کے سدباب کی فکر کرے۔ یہ پروا نہ کرے کہ یہ چیز اس کی طبیعت پر شاق گزرے گی اور اس کے نتیجہ میں ان کی ناراضی و بیزاری مول لینی پڑے گی۔ یہ ناگواری و بیزاری اس امر کے مقابل میں آسان ہے کہ آدمی ان کو جہنم میں جانے کے لیے چھوڑ دے اور آخرت میں اس کی مسئولیت، جیسا کہ 'کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ'[1] والی حدیث میں وارد ہے، اپنے سر لے۔

آتش دوزخ کی اصلی غذا

'وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ' کے الفاظ اس آگ کے مزاج کو ظاہر کر رہے ہیں کہ اس کی اصل غذا

---

[1] تم میں سے ہر ایک چرواہا بنایا گیا اور ہر ایک سے اس کے گلے کے بارے میں پرسش ہونی ہے۔

لوگ اور پتھر بنیں گے۔ اسی ایندھن سے وہ اپنے اصلی رنگ میں بھڑکے گی۔ 'لوگ' سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس دنیا میں اپنے آپ کو پاک نہیں کیا بلکہ انہی گندگیوں میں لتھڑے رہے جن سے پاک کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت نازل فرمائی۔

'حِجَارَۃٌ' سے ہمارے نزدیک، جیسا کہ البقرۃ کی آیت ۲۴ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، وہ پتھر مراد ہیں جو اس دنیا میں شرک و کفر اور عبادت غیر اللہ کی علامت کی حیثیت سے پوجے گئے۔ انہی چیزوں کو جلانے کے لیے یہ آگ پیدا کی گئی ہے تو جب یہ ایندھن اس کو ملے گا تو اس کو گویا اس کا من بھاتا کھاجا ملے گا اور وہ 'ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ' کہتے ہوئے ایک ایک چیز کو نگلے گی اور جیسا کہ فرمایا ہے 'لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ' نہ کسی چیز پر ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز کو چھوڑے گی۔

دوزخ پر مامور فرشتوں کا مزاج

'عَلَیْهَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ'۔ یعنی اس دوزخ پر جو فرشتے مقرر ہوں گے وہ نہایت درشت مزاج اور سخت گیر ہوں گے۔ ذرا کسی کے ساتھ نرمی اور مداہنت نہیں برتیں گے۔ ان کو جو حکم ملے گا سرمو اس کی خلاف ورزی نہیں کریں گے بلکہ وہی کریں گے جس کا ان کو حکم ملے گا۔

اس ٹکڑے میں ان لوگوں پر تعریض ہے جو اپنے اہل و عیال کی کسی بڑی سے بڑی غلطی پر بھی ان کو ٹوکنا محبت کے منافی سمجھتے ہیں۔ فرمایا کہ آج اگر ان کی محبت ان کے احتساب سے تم کو روکے ہوئے ہے تو یاد رکھو کہ دوزخ پر جو فرشتے مامور ہیں وہ محبت کرنے والے نہیں بلکہ بڑے ہی درشت مزاج اور سخت گیر ہوں گے، بہتر ہے کہ ان سے سابقہ پڑنے سے پہلے پہلے تم ہی اپنے احتساب سے اپنے آپ کو بھی اور ان کو بھی جس حد تک عذاب کی گرفت سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہو کر لو۔

'لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ'۔ یعنی آج تمھیں احتساب کی جو ہدایت دی جا رہی ہے اگر تمھارے دلوں پر شاق گزر رہی ہے تو شاق گزرے دوزخ کے داروغوں پر یہ ذرا بھی شاق نہیں گزرے گی۔ وہ اللہ کے کسی حکم کی ذرا بھی خلاف ورزی نہیں کریں گے بلکہ ہر حکم کی پوری پوری تعمیل کریں گے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَا تَعْتَذِرُوا الْیَوْمَ ط اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۷)

یعنی اس دن کسی کے لیے کسی عذر و معذرت کی کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ جو لوگ کوئی عذر پیش کرنا چاہیں گے ان کو جواب ملے گا کہ آج کوئی عذر پیش نہ کرو۔ تمھارے سامنے جو کچھ آ رہا ہے تمھاری اپنی ہی بوئی ہوئی فصل کا حاصل ہے۔ دنیا میں تم نے جو کمائی کی ہے اب اس کے نتائج بھگتو۔ یہ کسی غیر کے کیے ہوئے جرائم نہیں ہیں جو تمھارے کھاتے میں ڈال دیے گئے ہوں بلکہ تمھارے ہی جرائم کی مکافات تمھارے سامنے آ رہی ہے تو اس پر تمھارا واویلا اب بے سود ہے۔ اس سے بچنے کے لیے تم جو کچھ کر سکتے تھے

دنیا میں کر سکتے تھے۔ اب اس کا وقت گزر گیا۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ط عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ لا یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ ج نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ج اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۸)

توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوتِ عام

اوپر والی تنبیہ کے بعد اب یہ تمام مسلمانوں کو توبہ اور رجوع الی اللہ کی دعوت دی ہے کہ اے لوگو، جو ایمان لائے ہو، اپنے غفلت کے بستر چھوڑو اور اپنے رب کی طرف مخلصانہ رجوع کرو۔

'توبۃ نصوح' سے مراد وہ توبہ ہے جو دل کے پورے انقیاد اور سچے عزم کے ساتھ ہو جس کے بعد گناہ کی طرف مڑنے کی کوئی خواہش باقی نہ رہے بلکہ گناہ کو آخری طلاق دے کر آدمی اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دے۔ فرمایا کہ جو لوگ اس طرح توبہ کریں گے وہ توقع رکھیں کہ اللہ ان کے گناہوں کے اثرات ان کے اوپر سے دور کر دے گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔

'عسٰی' کے متعلق اس کے محل میں یہ وضاحت ہو چکی ہے کہ جب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو خطاب کر کے آئے تو اس کی نوعیت بندوں کے لیے وعدے اور بشارت کی ہوتی ہے بشرطیکہ بندے اپنے کو اس کا اہل ثابت کریں۔

'یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ'۔ اس 'یَوْمَ' کو فعل 'یُدْخِلَ' کا ظرف بھی قرار دے سکتے ہیں اور اس سے پہلے کوئی فعل محذوف بھی مان سکتے ہیں۔ فرمایا کہ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے باایمان ساتھیوں کو رسوا نہیں کرے گا اس لیے کہ وہ اس دنیا ہی میں اپنے احتساب کے چھاج میں پھٹک کر صرف ان لوگوں کو اپنی معیت کے لیے انتخاب کریں گے جو کفر و نفاق کی آلائش سے بالکل پاک اور صدق و صفا کے کھرے ہوں گے۔ یہ ان لوگوں کے مانند نہیں ہوں گے جنھوں نے خود بھی منافقانہ زندگی گزاری اور اپنی مداہنت سے اپنے اہل و عیال اور دوسرے متعلقین کو بھی نفاق کی راہ دکھائی۔ یہ لوگ قیامت کے دن رسوا ہوں گے اس لیے کہ اس دن ان کو ان کے نفاق کی تاریکی گھیرے گی۔ جب کہ پیغمبرؐ اور ان کے اصحابؓ اپنے ایمان و اخلاص کی روشنی میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے ہوں گے۔

قیامت کے دن پیغمبرؐ اور ان کے صحابہؓ اور اہل ایمان کی سرفرازی

'نُوْرُھُمْ یَسْعٰی بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَبِاَیْمَانِھِمْ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سرخروئی اور سرفرازی کا بیان ہے کہ اس دن سب اندھیرے میں بھٹک رہے ہوں گے لیکن پیغمبرؐ اور ان کے ساتھیوں کے آگے اور داہنے ان کی روشنی ہو گی جو ان کی رہنمائی کر رہی ہو گی اور وہ دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہماری روشنی کو کامل کر، ہماری مغفرت فرما، بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

اس روشنی کا ذکر سورۂ حدید میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ان لوگوں کا بھی ذکر آیا ہے جو اس دن رسوا ہوں گے۔ فرمایا ہے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ بُشْرَاكُمُ الْيَوْمَ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا انْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا ۖ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُورٍ لَهُ بَابٌ ۖ بَاطِنُهُ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهُ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ۝ يُنَادُونَهُمْ أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغَرُورُ ۝

(الحدید - ۵۷ : ۱۲ - ۱۴)

جس دن مومن مردوں اور عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے دہنے چل رہی ہوگی۔ ان کو خوش خبری دی جا رہی ہوگی کہ آج تمھارے لیے ایسے باغوں کی بشارت ہے جن میں نہریں جاری ہیں۔ ان میں ہمیشہ رہو گے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ جس دن منافق مرد اور عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ ذرا ہمیں بھی موقع دیجیے کہ ہم بھی آپ لوگوں کی روشنی سے فائدہ اٹھالیں۔ ان کو جواب ملے گا کہ پیچھے پلٹو اور وہاں سے روشنی تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی جانب رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف سے عذاب۔ یہ منافقین ان کو پکاریں گے کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہ تھے؟ وہ جواب دیں گے ساتھ تھے تو سہی لیکن تم نے اپنے کو فتنوں میں ڈالا، انتظار میں رہے، شک کیا اور آرزوؤں نے تمھیں دھوکے میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہوگیا اور اللہ کے بارے میں شیطان نے تمھیں دھوکے ہی میں رکھا۔

رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا ۖ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یہ روشنی ان لوگوں کو جنت میں داخل ہونے سے پہلے جنت کے راستہ کو طے کرنے کے لیے دکھائی جائے گی جب کہ ان کے دہنے اور آگے کے سوا ہر طرف اندھیرا گھپ ہوگا اس وجہ سے یہ لوگ گہرے جذبۂ شکر کے ساتھ یہ دعا کریں گے کہ اے رب، تو اس روشنی کو کامل کر اور ہماری مغفرت فرما۔ ظاہر ہے کہ جب راستہ طے کرنے کے لیے یہ روشنی عطا ہوگی تو اس سے قدرتی طور پر یہ توقع بھی پیدا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی مغفرت سے نوازنے والا ہے اور وہ وقت لازماً اس روشنی کے کامل ظہور کا ہوگا۔ چنانچہ وہ اپنی اسی توقع کے پورے کیے جانے کے لیے دعا کریں گے۔

إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یہ ان لوگوں کی زبان سے اس حقیقت کا اظہار ہوگا کہ ہم ایک

عقیدہ کے طور پر مانتے تو رہے ہیں کہ تو ہر چیز پر قادر ہے لیکن اب ہم نے اپنی آنکھوں سے بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیا۔ لاریب تو ہر چیز پر قادر ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۹)

پیغمبر صلعم کو عام احتساب کی تاکید

مومنین و متعلقین کے احتساب کے بعد یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عام فریضۂ احتساب کی تاکید ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ مامور تھے۔ آیت میں جس جہاد کا حکم ہے وہ تلوار اور زبان دونوں ہی کا جہاد ہے، البتہ دونوں کے محل الگ الگ ہیں۔ جن لوگوں پر حجت تمام ہو چکی تھی اور وہ علانیہ حق دشمنی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے ان سے تو جہاد تلوار کے ذریعہ سے تھا جس کی تفصیل پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہے اور جو لوگ بظاہر تو ایمان کے مدعی تھے لیکن ایمان کے تقاضوں سے گریزاں تھے ان کے بارے میں خاص طور پر ہدایت ہوئی کہ ان کا احتساب کیا جائے اور اب یہ احتساب نرم انداز میں نہیں بلکہ سخت انداز (وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ) میں کیا جائے۔

منافقین کے احتساب میں درشت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت

یہ سخت انداز میں منافقین کے احتساب کی تاکید اس وجہ سے ہوئی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی کریم النفسی کے سبب سے ان کی غلطیوں پر جب بھی گرفت فرماتے نرم ہی انداز میں فرماتے تاکہ ان کی رسوائی نہ ہو۔ اس کریمانہ انداز کی انھیں قدر کرنی تھی لیکن منافقین اس کے اہل نہ تھے۔ وہ اس سے فائدہ اٹھانے کے بجائے دلیر ہوتے جا رہے تھے کہ ان کا فریب کامیاب ہو رہا ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ انداز بدل دینے کا حکم دیا اور سختی کے ساتھ ان کے احتساب کی تاکید فرمائی تاکہ ان کے کان کھلیں اور اگر وہ اپنی اصلاح کرنی چاہیں تو کر لیں ورنہ ان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۷۳ کے تحت اس مضمون کی وضاحت ہو چکی ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

'وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ' یعنی تم اب ان کو اچھی طرح جھنجھوڑ کر سنا دو کہ اگر انھوں نے اپنی روش نہ بدلی تو یاد رکھیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ ۭ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتٰهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ (۱۰)

آدمی کے کام آنے والی چیز اس کا عمل ہے نہ کہ بڑوں سے نسبت

یہ آخر میں مثال پیش کی ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کام آنے والی چیز آدمی کا اپنا عمل ہے۔ جس کے پاس حسن عمل کی پونجی نہیں ہو گی اس کو کسی بڑے سے بڑے کی نسبت بھی کچھ نفع پہنچانے والی نہیں بن سکے گی۔ فرمایا کہ نوح (علیہ السلام) اور لوط (علیہ السلام) کی بیویاں ہمارے دو نیک بندوں کے نکاح میں تھیں لیکن انھوں نے ان کا اسوۂ حسنہ اختیار کرنے کے بجائے ان کے ساتھ بے وفائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسولوں کی بیویاں ہونے کے باوجود ان کو حکم ہوا کہ دوسرے جہنم میں پڑنے والوں کے ساتھ جاؤ تم دونوں

بھی جہنم میں پڑو۔

اس مثال کا حوالہ کفار کی عام سبق آموزی کے لیے دیا گیا ہے چنانچہ فرمایا بھی ہے: 'ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا' (اللہ نے یہ مثال کفار کی سبق آموزی کے لیے بیان کی ہے) اس کو ابتدائے سورہ میں بیان کیے ہوئے امہات المومنینؓ کے واقعات سے ربط ہے تو محض ایک کلی نوعیت کا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ خاص اسی تعلق سے یہ بیان ہوئی ہے۔ آخرت کی مسئولیت سے سب سے زیادہ بے پروائی، خاص طور پر اہل مذاہب کے اندر، اس غلط وہم نے پیدا کی کہ انھوں نے خیال کیا کہ وہ اللہ کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں اس وجہ سے ان کو دوزخ کی آگ کبھی نہیں چھوئے گی۔ یہود اور نصاریٰ اسی فتنہ میں مبتلا ہو کر ہلاک ہوئے اور اب مسلمان بھی اسی فتنہ میں مبتلا ہیں۔

آیت میں ان دونوں عورتوں کے بارے میں لفظ 'خَانَتَا' آیا ہے جس سے یہ بات تو واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ یہ اپنے شوہروں کی رازدار و وفادار نہیں تھیں لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ان کے اندر فحشاء کے قسم کی کوئی برائی رہی ہو۔ اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو اس قسم کی گندگی کے ہر شائبہ سے پاک رکھتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ لوط علیہ السلام کی بیوی ان کے پاس آنے والے مہمانوں کی خبر قوم کے گنڈوں کو کر دیتی تھی۔ ان کی اس قسم کی بے وفائیوں کو خیانت سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا امْرَاَتَ فِرْعَوْنَ اِذْ قَالَتْ رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (۱۱)

برے سے برے ماحول کے اندر بھی اپنے ایمان کی حفاظت واجب ہے

یہ مثال اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی سبق آموزی کے لیے بیان فرمائی ہے کہ برے سے برے ماحول کے اندر بھی آدمی پر اپنے ایمان کی حفاظت واجب ہے۔ اگر اس ماحول کے اندر اسے عیش حاصل ہو جب بھی اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ محسوس کرے کہ گویا وہ اسے کاٹے کھا رہا ہے اور اگر وہ اس کے لیے دارالعذاب ہو جب بھی وہ ہر قسم کے مصائب جھیل کر اپنے ایمان کی حفاظت کرے۔ فرمایا کہ فرعون کی بیوی ملکہ تھیں اور محل میں رہتی تھیں لیکن ان کی دعا یہ تھی کہ اے میرے رب! تو خاص اپنے پاس جنت میں میرے لیے ایک گھر بنا اور فرعون اور اس کے عمل اور ظالموں کی قوم سے مجھے نجات دے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس ماحول کے اندر وہ اپنے آپ کو ایک دارالعذاب کے اندر محسوس کر رہی تھیں اس لیے کہ پورا ماحول ظلم اور معصیت کا ماحول تھا۔ ایک مومن اور ایک مومنہ کو کفر و معصیت اور ظلم و عدوان کے ماحول میں کبھی اطمینان کا سانس نہیں لینا چاہیے اگرچہ اس کے اندر ذاتی طور پر انھیں شاہی محل ہی حاصل ہو۔

'نَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ وَنَجِّنِيْ مِنَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ' سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ اس امر سے

اچھی طرح آگاہ تھیں کہ آدمی ایک برے ماحول کے اندر راضی و مطمئن ہو تو گو اس کے اندر ہونے والی برائیوں اور تعدیوں میں وہ براہِ راست ملوث نہ ہو لیکن ان کے وبال سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ ان کے وبال سے محفوظ رہنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس سے بیزار و نفور رہے اور جب بھی امکان دیکھے اس سے بھاگ کھڑا ہو۔

وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ (۱۲)

برے ماحول کے اندر اپنا اعلیٰ تربیت کی عظیم مثال

یہ آخر میں حضرت مریم علیہا السلام کی مثال پیش کی ہے جو اگرچہ پیدا تو ہوئیں ایک برے ماحول میں لیکن انھوں نے اپنی ذاتی توجہ، محنت، ریاضت، انابت اور عبادت سے وہ مقام اللہ تعالیٰ کے ہاں حاصل کیا جو انہی کا خاص حصہ ہے۔

وہ جس دور میں پیدا ہوئیں بنی اسرائیل رومیوں کے غلام تھے اور اخلاقی و مذہبی اعتبار سے ان کا زوال جس حد تک پہنچ چکا تھا اس کا اندازہ ان ملامتوں سے ہو سکتا ہے جو ان کو حضرت یحییٰؑ اور ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی ہیں۔ اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے کردار کا اندازہ ان کے اس رویہ سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے حضرت یحییٰؑ و حضرت عیسیٰؑ اور وقت کے دوسرے صالحین و ابرار کے ساتھ اختیار کیا اور جس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ نے ان پر ہمیشہ کے لیے لعنت کر دی۔ اسی تاریک ترین دور میں حضرت مریمؑ پیدا ہوتی ہیں جن کو ماضی کا کوئی قابلِ ذکر سہارا حاصل نہ ہوا لیکن بچپن ہی سے ان کا حال یہ تھا کہ جس زمانے میں وہ بیت المقدس کے اندر معتکف تھیں حضرت زکریاؑ (جو ان کے خالو تھے) کبھی کبھی ان کے پاس جاتے تو ان کے روحانی کمالات کو محسوس کر کے عش عش کر اٹھتے۔ یہاں تک کہ ان کے انہی کمالات سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے لیے بھی ایک ایسے ہی باکمال فرزند کی دعا کی اور ان کی اس دعا کی قبولیت ان کے لیے حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔

یہ حضرت مریمؑ اس حقیقت کی زندہ جاوید مثال ہیں کہ انسان کے اندر اگر سچی انابت ہو تو وہ بدتر سے بدتر ماحول کے اندر بھی اپنے کو ملائکہ کے لیے قابلِ رشک بنا سکتا ہے چنانچہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس قابل پایا کہ ان کو اپنی ایک عظیم امانت کا حامل بنایا اور ان کے ناموس کو بدگویوں کی زبان درازیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنی وہ شان ظاہر فرمائی جو اس آسمان کے نیچے کسی کے لیے بھی نہیں ظاہر فرمائی۔

'اَلَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا' یہ ان کے اس اصل کمال کی طرف اشارہ فرمایا ہے جس کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کی عظیم امانت کی حامل ہونے کی اہل ٹھہریں۔ لفظ فرج عربی میں محدود معنی میں نہیں آتا۔ اس کے اصل معنی موضع مخافۃ (اندیشہ کی جگہ) کے ہیں۔ جن راستوں سے بھی انسان کے اندر کوئی برائی راہ پا سکتی ہے وہ سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ عورتوں

اور مردوں دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ 'اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا' کا مفہوم یہ ہے کہ انھوں نے اپنے وجود کے ان تمام حصوں پر پورا پہرہ قائم رکھا جہاں سے کوئی بدی راہ پا سکتی تھی، اس کا انعام اللہ نے ان کو یہ دیا کہ ان کے اندر اپنی روح پھونکی اور حضرت مسیح علیہ السلام کی شکل میں ان کے بطن سے اللہ تعالیٰ کی عظیم نشانی ظاہر ہوئی۔

'وَصَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِيْنَ' یہ ان کی مذکورہ خاص فضیلت کے بعد ان کے عام ایمانی فضائل کی طرف اشارہ ہے کہ ان کو ان کے رب کی جانب سے جو حکم بھی ملا انھوں نے بے چون وچرا تصدیق و تعمیل کی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے صحیفوں کی ہر تعلیم پر بھی وہ قائم و دائم رہیں۔ وہ ہر لمحہ اپنے رب کی طرف دھیان رکھنے والی تھیں اس وجہ سے سخت سے سخت آزمائشوں کے اندر بھی انھیں اپنے رب کے احکام کی تعمیل کی توفیق ملی اور ان کے اوسان بجا رہے۔

ایک نکتہ خاص توجہ کے لائق

یہاں یہ امر خاص توجہ کے لائق ہے کہ برائی کی مثال کے لیے بھی عورتوں ہی کا انتخاب کیا ہے اور بھلائی کی مثال کے لیے بھی انہی کے نام لیے ہیں۔ اس سے مقصود اس عام غلط فہمی کو رفع کرنا ہے کہ تمام برائی کا سرچشمہ عورت ہی ہے۔ اپنی خلقت کے اعتبار سے عورت بھی خیر و شر دونوں صلاحیتوں کی حامل ہے۔ اگر وہ اپنے اختیار و ارادہ کو صحیح طور پر استعمال نہ کرے تو بہتر سے بہتر رفیق کی بدترین ساتھی بن سکتی ہے اور اگر وہ ایمان و قنوت کی حلاوت سے آشنا ہو جائے تو بدتر سے بدتر ماحول کے اندر بھی وہ حورِ جنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی فضلہ واحسانہ۔

رحمان آباد

۶ - جون ۱۹۷۸ء

۲۸ - جمادی الثانی ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

٦٧

المُلک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۔ سورتوں کے ساتویں گروپ پر ایک اجمالی نظر

سورۂ ملک سے سورتوں کا ساتواں یعنی آخری گروپ شروع ہو رہا ہے۔ اس گروپ میں بھی سورتوں کی ترتیب اسی طرح ہے جس طرح پچھلے گروپوں میں آپ نے دیکھی۔ پہلے مکی سورتیں ہیں آخر میں چند سورتیں مدنی ہیں اور یہ مدنی سورتیں مکی سورتوں کے ساتھ اسی طرح مربوط ہیں جس طرح فرع اپنی اصل سے مربوط ہوتی ہے۔

اس گروپ کی چند سورتوں کے مکی یا مدنی ہونے کے بارے میں اختلاف ہے اس وجہ سے یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ کہاں سے کہاں تک اس کی سورتیں مکی ہیں اور کہاں سے کہاں تک مدنی۔ جب تمام مختلف فیہ سورتوں پر بحث ہو کر بات منقح ہو جائے گی تب ہی یہ قطعی فیصلہ ہو سکے گا کہ کتنی مکی ہیں اور کتنی مدنی تاہم میری اجمالی رائے یہ ہے کہ سورۂ ملک سے سورۂ کافرون تک ۴۳ سورتیں مکی ہیں اور سورۂ نصر سے سورۂ ناس تک پانچ سورتیں مدنی۔

اس گروپ میں بھی دوسرے گروپوں کی طرح قرآنی دعوت کی تمام اساسات ——— توحید، رسالت اور معاد ——— زیر بحث آئی ہیں اور دعوت کے تمام مراحل کی جھلک بھی اس میں موجود ہے۔ لیکن اس پورے گروپ کا اصل مضمون انذار ہے۔ اس کی بیشتر سورتیں مکی زندگی کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہیں اور ان میں انذار کا انداز وہی ہے جس انداز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہِ صفا پر چڑھ کر انذار فرمایا تھا۔ اس انذار کے تقاضے سے اس میں قیامت اور احوالِ قیامت کی بھی پوری تصویر ہے اور اس عذاب کو بھی گویا قریش کی نگاہوں کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے جو رسول کی تکذیب کر دینے والوں پر لازماً آیا کرتا ہے۔ استدلال میں بیشتر آفاق کے شاہدات، تاریخ کے مسلّمات اور انفس کی بیّنات سے کام لیا گیا ہے اور کلام کے زور کا بالکل وہی حال ہے جس کی تصویر مولانا حالیؒ نے اپنے اس شعر میں کھینچی ہے۔ ع

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی

عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

ان سورتوں نے سارے عرب میں ایسی ہلچل برپا کر دی کہ ایک شخص بھی قرآن کی دعوت کے معاملے میں غیر جانبدار نہیں رہ گیا بلکہ وہ یا تو اس کا جانی دشمن بن کر اٹھ کھڑا ہوا یا سچا فدائی اور ان دونوں کی کشمکش کا نتیجہ بالآخر اس غلبۂ حق کی شکل میں نمودار ہوا جس کا ذکر ہر گروپ کی آخری سورتوں میں ہوا ہے اور اس

کے آخر میں بھی آئے گا۔

ساتویں گروپ کی تفسیر کا آغاز کرتے ہوئے میں سورۂ حجر کی آیت ۸۷: وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ' کا پھر حوالہ دیتا ہوں جس کا ذکر میں نے مقدمۂ کتاب میں، ساتوں گروپوں کے تعارف کے بعد، اس حقیقت کی طرف توجہ دلانے کے لیے کیا ہے کہ یہ تقسیم از روئے قرآن منصوص ہے۔ پھر سورۂ حجر کی تفسیر میں آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل باتیں میں نے دلائل کے ساتھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

—— ایک یہ کہ قرآن نے کسی خاص سورہ کو سبع مثانی نہیں کہا ہے بلکہ 'کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِیَ' کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا قرآن 'سبع مثانی' ہے۔

—— دوسری یہ کہ مثانی کسی بار بار دہرائی ہوئی چیز کو نہیں بلکہ اس چیز کو کہتے ہیں جو جوڑا جوڑا ہو۔

—— تیسری یہ کہ قرآن کی سورتوں کی ترتیب سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ سات گروپوں میں تقسیم ہیں اور ہر سورہ اپنے ساتھ اپنا ایک جوڑا بھی رکھتی ہے جس کی طرف میں برابر اشارہ کرتا آ رہا ہوں۔

یہاں اس بات کی یاد دہانی سے مقصود یہ ہے کہ قرآن کے آخری گروپ میں پہنچنے کے بعد آپ بہتر طریقہ سے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ یہ رائے کچھ وزن رکھتی ہے یا نہیں اور قرآن کی اس ترتیب کے سامنے آنے سے فکر و نظر کے نئے دروازے کھلتے ہیں یا نہیں؟

میرے نزدیک قرآن کی اسی حقیقت کی طرف وہ حدیث بھی اشارہ کر رہی ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہ 'انزل القرآن علی سبعة احرف' (قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے) سات حرفوں کے معنی اگر یہ لیے جائیں کہ قرآن کے تمام الفاظ سات طریقوں پر پڑھے جا سکتے ہیں تو یہ بات بالبداہت غلط ہے۔ اس صورت میں قرآن ایک معمہ بن کے رہ جائے گا درآنحالیکہ قرآن خود اپنے بیان کے مطابق کتابِ مبین ہے اور قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے۔ جو لوگ قراءتوں کے اختلاف کو بڑی اہمیت دیتے ہیں وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ قرآن کے کسی لفظ کی قراءت سات طریقے پر کی گئی ہو۔ ابن جریرؒ قراءتوں کے اختلاف نقل کرنے میں بڑے فیاض ہیں لیکن مجھے یاد نہیں کہ کسی لفظ کی انھوں نے دو تین سے زیادہ قراءتیں نقل کی ہوں۔

غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قراءتوں کا اختلاف دراصل قراءتوں کا اختلاف نہیں بلکہ بیشتر تاویل کا اختلاف ہے۔ کسی صاحبِ تاویل نے ایک لفظ کی تاویل کسی دوسرے لفظ سے کی اور اس کو قراءت کا اختلاف سمجھ لیا گیا حالانکہ وہ قراءت کا اختلاف نہیں بلکہ تاویل کا اختلاف ہے۔ ابھی سورۂ تحریم کی تفسیر میں آپ پڑھ آئے ہیں کہ بعض لوگوں نے 'فَقَدْ صَغَتْ' کو 'فَقَدْ زَاغَتْ' بھی پڑھا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی یہ پڑھا ہے اس نے یہ قراءت نہیں بتائی ہے بلکہ اپنے نزدیک اس نے 'فَقَدْ صَغَتْ' کے معنی بتائے ہیں جس کی غلطی، کلامِ عرب کے دلائل کی روشنی میں،

اچھی طرح ہم واضح کر چکے ہیں۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ اگر قراءتوں کا اختلاف ہے بھی تو متواتر قراءت کا درجہ تو صرف اسی قراءت کو حاصل ہے جس پر مصحف، جو تمام امت کے ہاتھوں میں ہے، منضبط ہوا ہے۔ اس قراءت کے سوا دوسری قراءتیں ظاہر ہے کہ غیر متواتر اور شاذ کے درجہ میں ہوں گی جن کو متواتر قراءت کی موجودگی میں کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ چنانچہ میں نے اس تفسیر میں اختلاف قراءت سے مطلق تعرض نہیں کیا بلکہ صرف مصحف کی قراءت کو اختیار کیا ہے اور مجھے تاویل میں کہیں تکلف نہیں کرنا پڑا بلکہ ہر جگہ نہایت صاف، دل نشین، سیاق و سباق اور نظائر قرآن سے قرین تاویل سامنے آگئی ہے جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ قراءتوں کے اختلافات میں پڑنے کے معنی تو یہ ہیں کہ آپ ان الجھنوں میں پڑنے کے خود خواہاں ہیں جن سے سیدنا ابوبکر اور سیدنا عثمان رضی اللہ عنہما نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امت کو محفوظ کرنے کی کوشش فرمائی۔

بہرحال اس حدیث میں 'سبعۃ احرف' سے سات قراءتیں مراد لینے کا تو کوئی قرینہ نہیں ہے البتہ اگر 'حرف' کو عبارت، بیان اور اسلوب کے معنی میں لیں، جس کی زبان اور لغت کے اعتبار سے پوری گنجائش ہے، تو اس کی تاویل یہ ہوگی کہ قرآن سات اسلوبوں یا عبارتوں میں نازل ہوا ہے اور اس سے اشارہ انہی سات گروپوں کی طرف ہوگا جو قرآن میں ہر تلاوت کرنے والے کو نظر آتے ہیں۔

ان گروپوں کی نوعیت، جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں، یہ ہے کہ ہر گروپ میں ایک جامع عمود کے تحت قرآنی دعوت کے تمام بنیادی مطالب مختلف اسلوبوں سے اس طرح بیان ہوئے ہیں کہ ہر بات بار بار سامنے آنے کے باوجود پڑھنے والا اس سے کبھی تکان محسوس نہیں کرتا بلکہ طرز بیان اور نہج استدلال کے تنوع، پیش و عقب کی تبدیلی، اطراف و جوانب کے فرق اور لواحق و تضمنات کی گوناگونی کے سبب سے ہر بار وہ ایک نیا لطف و حظ حاصل کرتا ہے۔ قرآن کی اسی خصوصیت کا ذکر بعض حدیثوں میں یوں آیا ہے کہ اہل علم اس سے کبھی آسودہ نہیں ہوتے اور اس کی تازگی پر کبھی خزاں کا گزر نہیں ہوتا۔ یہی ساتوں گروپ مل کر قرآن عظیم کی شکل اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ سورۂ حجر کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ 'وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ' میں 'و' تفسیر کے لیے ہے۔

ب۔ سورہ کا عمود

اس سورہ کا عمود انذار ہے اور اس انذار میں دونوں ہی عذاب شامل ہیں۔ وہ عذاب بھی جس سے رسولوں کے مکذبین کو لازماً اس دنیا میں سابقہ پیش آیا ہے اور وہ عذاب بھی جس سے آخرت میں دوچار ہونا پڑے گا۔ استدلال اس میں آفاق کی نشانیوں سے ہے۔ یعنی اس میں بتایا گیا ہے کہ کائنات کے مشاہدہ سے اس کے خالق کی جو صفات سامنے آتی ہیں وہ اس بات کو مستلزم ہیں کہ یہ

دنیا ایک دن اپنی انتہا کو پہنچے گی۔ جن لوگوں نے اس کے اندر بالکل اندھے بہرے بن کر زندگی گزاری وہ جہنم میں جھونک دیے جائیں گے اور جنھوں نے اپنی عقل و فہم سے کام لیا اور غیب میں ہوتے خدا سے ڈرتے رہے وہ اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہریں گے۔

ج۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۵) اس کائنات کے مشاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس کے ہاتھ میں اس کی باگ ہے وہ بڑی ہی بابرکت اور بے نہایت قدرت والی ہستی ہے۔ اس نے موت اور زندگی کا یہ کارخانہ عبث نہیں بنایا ہے جو اسی طرح چلتا رہے یا یوں ہی ختم ہو جائے بلکہ لوگوں کے امتحان کے لیے بنایا ہے کہ کون اس میں نیکی کی زندگی اختیار کرتا ہے، کون بدی کی؟ اس امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ ایک جزا و سزا کا دن آئے جس میں نیکوکار اپنی نیکیوں کا صلہ پائیں اور بدکار اپنی بدیوں کی سزا بھگتیں۔ اس کائنات کے خالق کی عظیم برکت و قدرت کے مشاہدے کے لیے ان آسمانوں پر ایک نظر ڈالو اور غور سے مشاہدہ کرو، کیا اس عظیم و ناپیدا کنار چھت میں تم کہیں کسی معمولی خلل کی بھی نشان دہی کر سکتے ہو؟ بار بار نگاہ دوڑانے کے بعد بھی تم اس میں کوئی نقص نہ پا سکو گے۔ پھر تم اپنے آسمانِ زیریں کو دیکھو اس کو خالق نے ستاروں کے قمقموں سے کیسا سجایا ہے جن سے تمھیں رہنمائی بھی ملتی ہے اور شیاطین پران سے سنگ باری بھی ہوتی ہے۔

(۶-۱۱) اللہ تعالیٰ کی یہ قدرت و ربوبیت اس بات کی دلیل ہے کہ جو جزا و سزا کو جھٹلائیں گے ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے۔ ان کو دیکھ کر جہنم بھوکے شیر کی طرح دھاڑے گی۔ جب جب ان کی کوئی بھیڑ جہنم میں جھونکی جائے گی اس کے داروغے ان کو ملامت کریں گے کہ بدبختو! کیا اس روزِ بد سے تمھیں کوئی خبردار کرنے نہیں آیا؟ وہ اعتراف کریں گے کہ ایک نذیر آیا تو سہی لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، جو لوگ اس کے مدعی ہیں وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ وہ یہ اعتراف بھی کریں گے کہ ہم نے سننے سمجھنے کی کوشش نہیں کی ورنہ اس انجام سے دوچار نہ ہوتے۔

(۱۲-۱۴) ان لوگوں کے صلہ کا بیان جو اس دنیا میں اپنے رب سے ڈرتے رہیں گے۔ ان کو یہ اطمینان دہانی کہ ان کی ہر نیکی اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے اور وہ ہر نیکی کا صلہ دے گا۔ اللہ تعالیٰ خالق بھی ہے اور لطیف و خبیر بھی، اس سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں رہے گی۔

(۱۵-۱۸) اس زمین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے نہایت مطیع و فرماں بردار بنایا ہے۔ یہ اپنے وجود سے انسان کو یہ رہنمائی دے رہی ہے کہ وہ اس میں چلے پھرے، اس کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو لیکن اس بات کو یاد رکھے کہ یہ سامانِ پرورش مقتضی ہے کہ ایک دن اس کو اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ ہر نعمت کے متعلق مسئول ہوگا۔ انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے رب کی پکڑ سے نچنت نہیں ہونا چاہیے بلکہ ہر

وقت یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے اس کے اوپر سے یا نیچے سے کوئی آفتِ ارضی و سماوی بھیج کر اس کو تباہ کر دے۔ تاریخ میں اس کی کتنی عبرت انگیز مثالیں موجود ہیں۔

(۱۹-۲۱) یہ تنبیہ کہ جو چیز بھی اس فضائے لا متناہی میں ٹکی ہوئی ہے خدا کے تھامے ٹکی ہوئی ہے۔ وہی ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ اگر اس کے سہارے سے محروم ہو جاؤ تو کوئی بھی نہیں ہے جو تمھاری مدد کر سکے۔ اگر وہ اپنے رزق سے محروم کر دے تو کوئی بھی نہیں ہے جو رزق دینے والا بن سکے۔

(۲۲-۲۳) جو لوگ اپنی خواہشوں کے غلام بن کر زندگی گزاریں گے وہ منزل پر پہنچنے والے نہیں بنیں گے۔ منزل پر وہی پہنچیں گے جو سیدھی راہ اختیار کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سمع و بصر اور عقل و دل کی صلاحیتیں اسی لیے دی ہیں کہ لوگ سیدھی راہ اختیار کریں، لیکن ان نعمتوں کی قدر کرنے والے بہت تھوڑے ہیں۔

(۲۴-۲۷) اللہ ہی نے اس زمین میں انسان کو پھیلایا اور وہ اس کو ایک دن ضرور اکٹھا کرے گا۔ رہا یہ سوال کہ یہ دن کب آئے گا تو اس کا جواب ان کو یہ دے دو کہ اس کا علم صرف اللہ ہی کو ہے۔ میں اس سے آگاہ کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں، اس کا وقت بتانے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں۔ البتہ جب وہ دن ظاہر ہو گا تو ان سب کے چہرے اس دن بگڑ جائیں گے جو آج اکڑ رہے ہیں۔

(۲۹-۳۰) اگر یہ لوگ تمھارے اور تمھارے ساتھیوں کے لیے گردشِ روزگار کے منتظر ہیں تو ان سے کہو کہ بالفرض ہمارے ساتھ وہی معاملہ ہوا جو تم سمجھ رہے ہو تو اس میں تمھارے لیے کیا اطمینان کا پہلو ہے؟ کافروں کو تو بہر حال اس عذاب سے دوچار ہونا ہے جس کی انھیں خبر دی جا رہی ہے۔

سورة الملك (۶۷)

مكية ــــــــــ آیات: ۳۰

بسم الله الرحمن الرحيم

آیات ۱-۳۰ تبارك الذي بيده الملك ز وهو على كل شيء قدير ﴿١﴾
الذي خلق الموت والحيوة ليبلوكم ايكم احسن عملا ط
وهو العزيز الغفور ﴿٢﴾ الذي خلق سبع سموت طباقا ط
ما ترى في خلق الرحمن من تفوت ط فارجع البصر لا هل
ترى من فطور ﴿٣﴾ ثم ارجع البصر كرتين ينقلب اليك البصر
خاسئا وهو حسير ﴿٤﴾ ولقد زينا السماء الدنيا
بمصابيح وجعلنها رجوما للشيطين واعتدنا لهم عذاب
السعير ﴿٥﴾ وللذين كفروا بربهم عذاب جهنم ط و
بئس المصير ﴿٦﴾ اذا القوا فيها سمعوا لها شهيقا و
هي تفور ﴿٧﴾ تكاد تميز من الغيظ ط كلما القي فيها فوج
سالهم خزنتها الم ياتكم نذير ﴿٨﴾ قالوا بلى قد
جاءنا نذير لا فكذبنا وقلنا ما نزل الله من شيء ج ان
انتم الا في ضلل كبير ﴿٩﴾ وقالوا لو كنا نسمع او نعقل

مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۰﴾ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا
لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ﴿۱۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَيْبِ
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۲﴾ وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ
اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾ اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ
اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾ هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا ع ۱ ۳
فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾ ءَاَمِنْتُمْ
مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِيَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾ اَمْ
اَمِنْتُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ؕ فَسَتَعْلَمُوْنَ
كَيْفَ نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ
كَانَ نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صٰٓفّٰتٍ وَّ
يَقْبِضْنَ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ؕ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍۢ بَصِيْرٌ ﴿۱۹﴾ وقف لازم اختلافی / وقف غفران / منزل
اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ؕ
اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ ﴿۲۰﴾ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ
اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ ﴿۲۱﴾ اَفَمَنْ يَّمْشِيْ
مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖٓ اَهْدٰٓى اَمَّنْ يَّمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۲﴾ قُلْ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾ قُلْ هُوَ
الَّذِيْ ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾ وَيَقُوْلُوْنَ

مَتٰی هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۵﴾ قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ
اللّٰهِ ۪ وَ اِنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۶﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓــَٔتْ
وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ قِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ
تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِیَ
اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۸﴾
قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ
مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۲۹﴾ قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ
ع ۱۶ ۲ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ یَّاْتِیْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِیْنٍ ﴿۳۰﴾

ترجمۂ آیات ۱-۳۰ بڑی ہی عظیم اور بافیض ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں اس کائنات کی بادشاہی ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے جس نے پیدا کیا ہے موت اور زندگی کو تاکہ تمھارا امتحان کرے کہ تم میں کون سب سے اچھے عمل والا بنتا ہے۔ اور وہ غالب بھی ہے اور مغفرت فرمانے والا بھی۔ ۱-۲

جس نے بنائے سات آسمان تہ بہ تہ۔ تم خدائے رحمان کی صنعت میں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔ نگاہ دوڑاؤ، کیا تمھیں کوئی نقص نظر آتا ہے۔ پھر بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ ناکام تھک کر واپس آجائے گی۔ ۳-۴

اور ہم نے آسمانِ زیریں کو چراغوں سے سجایا اور ان کو شیاطین کو سنگسار کرنے کا ٹھکانا بھی بنایا اور ان شیاطین کے لیے دوزخ کا عذاب بھی ہم نے تیار کر رکھا ہے۔ اور جنھوں نے اپنے رب کا کفر کیا ان کے لیے جہنم کا عذاب ہے اور وہ کیا

ہی برا ٹھکانا ہے! ۵-۶

جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے اس کا دھاڑنا سنیں گے اور وہ جوش مارتی ہوگی، معلوم ہوگا کہ غصہ سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ جب جب ان کی کوئی بھیڑ اس میں جھونکی جائے گی اس کے داروغے ان سے پوچھیں گے، کیا تمھارے پاس اس دن سے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تھا! وہ جواب دیں گے کہ ایک خبردار کرنے والا آیا تو سہی لیکن ہم نے اس کو جھٹلا دیا اور کہہ دیا کہ اللہ نے کوئی چیز نہیں اتاری، تم لوگ بس ایک بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہو! اور وہ کہیں گے کہ ہم سننے والے یا سمجھنے والے ہوتے تو ہم دوزخ والوں میں سے نہ بنتے تو وہ اپنے گناہ کا اعتراف کریں گے۔ پس لعنت ہو دوزخ والوں پر!! ۷-۱۱

بے شک جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں غیب میں رہتے، ان کے لیے مغفرت اور ایک بہت بڑا اجر ہے۔ اور تم اپنی بات کو چھپا کر کہو یا علانیہ کہو وہ اس کو جانتا ہے۔ وہ تو دلوں کے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے۔ وہ تو بڑا ہی باریک بین اور خبر رکھنے والا ہے۔ ۱۲-۱۴

وہی ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ایک فرمانبردار ناقہ کے مانند بنایا تو تم اس کے مونڈھوں میں چلو پھرو اور اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق میں سے برتو اور اسی کی طرف پھر اکٹھے ہونا ہے۔ ۱۵

کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بے خوف ہو گئے کہ وہ تمھارے سمیت زمین کو دھنسا دے اور وہ دفعتاً بگٹٹ چل پڑے! کیا تم اس سے جو آسمان میں ہے بےخوف ہو گئے

کہ وہ تم پر پتھر برسانے والی ہوا مسلط کردے تو تم جان لو گے کہ میرا انذار کیسا ہوتا ہے۔ اور ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو ان سے پہلے گزرے تو دیکھو کیسی ہوئی ان پر میری پھٹکار۔ ۱۶-۱۸

کیا انھوں نے اپنے اوپر پرندوں کو نہیں دیکھا، وہ پروں کو پھیلائے اڑتے ہیں اور ان کو سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ ان کو خدائے رحمان ہی سنبھالتا ہے۔ بے شک وہی ہر چیز کی نگرانی رکھنے والا ہے۔ ۱۹

بتاؤ، تمھارے پاس وہ کون سا لشکر ہے جو خدائے رحمان کے مقابل میں تمھاری مدد کر سکے گا! یہ کافر بالکل دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں! بتاؤ، وہ کون ہے جو تمھیں روزی دے گا اگر وہ اپنی روزی روک لے! بلکہ یہ لوگ سرکشی اور حق بیزاری پر اڑ گئے ہیں! ۲۰-۲۱

کیا وہ جو اوندھے منہ چل رہا ہے راہ یاب ہونے والا بنے گا یا وہ جو سیدھا ایک سیدھی راہ پر چل رہا ہے؟ کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور تمھارے لیے کان، آنکھیں اور دل بنائے۔ پر تم بہت ہی کم شکر ادا کرتے ہو! کہہ دو کہ وہی ہے جس نے تم کو زمین میں پھیلایا ہے اور تم اسی کی طرف اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۲۲-۲۴

اور وہ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہو گی، اگر تم لوگ سچے ہو! کہہ دو، یہ علم اللہ ہی کے پاس ہے، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ پس جب وہ اس کو دیکھیں گے قریب آتے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ یہی ہے وہ چیز جس کا تم مطالبہ کر رہے تھے۔ ۲۵-۲۷

ان سے پوچھو، بتاؤ اگر اللہ مجھ کو اور ان لوگوں کو جو میرے ساتھ ہیں ہلاک کر دے
یا ہم پر رحم فرمائے تو کافروں کو ایک دردناک عذاب سے کون پناہ دے گا! ۲۸
کہہ دو کہ وہ رحمان ہے۔ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور اسی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے
تو تم عنقریب جان لو گے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون ہے! ان سے پوچھو کہ بتاؤ اگر تمھارا
یہ پانی نیچے اتر جائے تو تمھارے لیے صاف و شفاف پانی کون لائے گا؟ ۲۹-۳۰

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ۡ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ (۱)

اس کائنات کے خالق سے متعلق صحیح تصور کی راہ

'تَبٰرَكَ' کے اندر عظمت اور برکت دونوں کے مفہوم پائے جاتے ہیں اور ساتھ ہی یہ صیغہ مبالغہ کا بھی ہے اس وجہ سے اس کے معنی ہوں گے کہ بڑی ہی باعظمت اور بافیض ہے وہ ذات جس کے قبضۂ قدرت میں اس کائنات کی باگ ہے۔ 'وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ' اور باعظمت و بافیض ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا اور مشکل سے مشکل کام بھی ایسا تصور نہیں کیا جا سکتا جو اس کے حیطۂ امکان سے خارج ہو۔[1]

یہ حال بیان ہوا ہے اس مشاہدے کا جو ایک عاقل اور صاحب فکر کے سامنے آتا ہے یا آنا چاہیے جب وہ اس کائنات کی نشانیوں پر غور کرتا ہے۔ اس کی دلیل آگے آ رہی ہے۔ یہاں خلاصۂ فکر پہلے بیان کر دیا ہے تاکہ ہر شخص کے سامنے یہ حقیقت آ جائے کہ اس کائنات پر غور کرنے والا کبھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرا ہے یا وہ کوئی لاابالی اور غیر ذمہ دار ہے جس نے یہ دنیا پیدا تو کر ڈالی لیکن اس کو اس کے خیر و شر سے کوئی دلچسپی نہیں، یا وہ محض ایک محرکِ اوّل ہے جس سے ایک حرکت تو صادر ہو گئی لیکن اس حرکت کے نتائج سے اسے کچھ بحث نہیں، یا وہ صرف ایک خاموش علۃ العلل ہے جس کو اپنی معلولات سے علّت ہونے کے سوا کوئی اور واسطہ نہیں ہے۔

اس کائنات کے خالق سے متعلق اس قسم کے تصورات میں جو لوگ مبتلا ہوئے یا تو اس وجہ

---

[1] لفظ 'تَبٰرَكَ' کے تضمنات پر سورۂ فرقان کی آیات ۱، ۱۰ اور ۶۱ کے تحت بحث ہو چکی ہے۔

سے ہوئے کہ انھوں نے اس کا صحیح تصوّر کرنا ہی نہیں چاہا تا کہ ان کی ہوا پرستی ہیں یہ تصوّر خلل انداز نہ ہو سکے یا کرنا تو چاہا لیکن اس کی صفات کا عکس اس کی پیدا کی ہوئی وسیع و عظیم کائنات کے آئینہ میں دیکھنے کے بجائے انھوں نے اپنی ان چھوٹی چھوٹی عینکوں سے دیکھنے کی کوشش کی جو ان کے اپنے ہاتھوں کی ایجاد تھیں۔ حالانکہ اس کا صحیح طریقہ صرف ایک ہی تھا کہ بالکل بے لوث اور غیر جانبدار ہو کر اس کی پیدا کی ہوئی کائنات کا مشاہدہ کرتے اور اس کے اندر اس کی صفات کا جلوہ دیکھتے۔ اگر ایسا کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہوتی کہ اس کا خالق بڑا ہی عظیم بھی ہے اور بڑا ہی بافیض اور حکیم بھی اور ساتھ ہی اس کی قدرت بھی بے پناہ ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے، کوئی کام بھی اس کے لیے مشکل یا ناممکن نہیں۔ اس تصوّر سے ظاہر ہے کہ ان تمام باطل تصوّرات کی جڑ بھی کٹ جاتی ہے جن میں مشرک قومیں مبتلا ہوئیں اور ان اوہام کے لیے بھی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے جن میں فلاسفہ اور سائنس دان مبتلا ہوئے۔

الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ وَ ہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ (۲)

صحیح تصوّر کے لازمی نتائج

یہ اوپر والی ہی بات دوسرے اسلوب میں فرمائی گئی ہے جس سے اس کی قدرت، حکمت اور فیض بخشی کی مزید وضاحت ہوتی ہے۔ فرمایا کہ وہی ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا ہے۔ ان میں سے کسی پر بھی کسی دوسرے کو کوئی اختیار نہیں ہے۔ پھر موت زندگی پر مقدم ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ ہی کی قدرت اور اسی کے فیض سے پردۂ عدم سے عالمِ وجود میں آئی ہے، وہ نہ چاہے تو کوئی چیز وجود میں نہیں آسکتی۔

عدم کے بعد زندگی اور زندگی کے بعد پھر موت اس بات کی شہادت ہے کہ اس دنیا کا کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہے کہ یوں ہی چلتا رہے یا یوں ہی ایک دن ختم ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو یہ ایک کارِ عبث ہو گا جو ایک حکیم و قدیر اور بافیض ہستی کی شان کے خلاف ہے بلکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جس کو زندگی بخشتا ہے اس امتحان کے لیے بخشتا ہے کہ دیکھے کون اس کی پسند کے مطابق زندگی بسر کرتا ہے اور کون اپنی من مانی کرتا ہے۔ اس امتحان کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں لوگوں کو از سرِ نو زندہ کرے، ہر شخص کی نیکی اور بدی کا حساب ہو اور وہ اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پائے۔

علاوہ بریں وہ 'عزیز' ہے اس وجہ سے جو سزا کے مستحق ہوں گے ان کو اس کی پکڑ سے کوئی بچا نہیں سکتا اور وہ 'غفور' بھی ہے اس وجہ سے جو اس کی مغفرت کے مستحق ہوں گے ان کو وہ اس سے محروم نہیں فرمائے گا بلکہ وہ کسی کی سعی و سفارش کے بغیر اس کے حق دار ٹھہریں گے۔

الَّذِیۡ خَلَقَ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا

وَهُوَ حَسِيۡرٌ (۳-۴)

مشاہدۂ کائنات کی دعوت

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کی جس قدرت و عظمت اور جس فیض بخشی و ربوبیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے اس آیت میں اس کا مشاہدہ کرنے کی دعوت دی ہے کہ آؤ، دیکھو اس کائنات کے خالق کی عظمت و شان، اس کی بے مثال صنعت گری اور اس کا کمالِ فن کہ اس نے تہ بہ تہ سات آسمان بنا ڈالے اور تم اس میں کہیں ڈھونڈھے سے بھی کوئی ناہمواری یا کوئی نقص و خلل نہیں پا سکتے۔ کیا کوئی چیز آسمانوں سے بھی بڑی ہو سکتی ہے لیکن اس وسیع و عریض اور ناپیداکنار چیز کے اندر بھی اس کے خالق کے کمالِ فن کا حال یہ ہے کہ مجال نہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا ماہرِ فن بھی کہیں انگلی رکھ سکے کہ اس جگہ کسی جوڑ بند کو ہموار کرنے میں کوئی کسر رہ گئی۔ لفظ تَفٰوُتٌ کے معنی فرق و اختلاف اور ناہمواری کے ہیں۔ اسی مضمون کو آگے لفظ فُطُوۡرٌ سے بھی تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی نقص و خلل کے ہیں۔ اسی مضمون کی تعبیر کے لیے سورۂ قٓ آیت ۶ میں لفظ فُرُوۡجٌ استعمال فرمایا ہے۔ اَفَلَمۡ يَنۡظُرُوۡۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ كَيۡفَ بَنَيۡنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ (کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا، ہم نے کیسا اس کو بنایا اور سنوارا اور کہیں اس میں کوئی دراڑ اور شگاف نہیں)۔

'ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ كَرَّتَيۡنِ يَنۡقَلِبۡ اِلَيۡكَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيۡرٌ' اتمامِ حجت کے لیے پھر دعوت دی کہ ایک ہی بار نہیں بلکہ بار بار نگاہ دوڑاؤ، تمھاری نگاہ تھک کر واپس آجائے گی لیکن کہیں کوئی نقص یا خلل نہیں پا سکے گی۔ مطلب یہ ہے کہ جس خدا کی یہ بے مثال قدرت و حکمت اپنے سروں پر اس طرح پھیلی ہوئی دیکھتے ہو کہ نہ تم اس کا احاطہ کر سکتے اور نہ اس میں کوئی معمولی سے معمولی نقص ڈھونڈھ سکتے اس کے لیے وہ کون سا کام ہے جو دشوار ہو سکتا ہے؟ کیا مرکھپ جانے کے بعد تم کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا اور جزا اور سزا دینا یا تم کو کسی آفتِ ارضی و سماوی سے چشم زدن میں یہیں تباہ کر دینا اس آسمان کے پیدا کر دینے سے زیادہ مشکل کام ہے؟

وَلَقَدۡ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡيَا بِمَصَابِيۡحَ وَجَعَلۡنٰهَا رُجُوۡمًا لِّلشَّيٰطِيۡنِ وَاَعۡتَدۡنَا لَهُمۡ عَذَابَ السَّعِيۡرِ (۵)

قدرت کے پہلو بہ پہلو رحمت کے جلوے

سات آسمانوں کا حوالہ دینے کے بعد آسمانِ زیریں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی جس کے عجائب کا نسبۃً آسانی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ فرمایا کہ اس کو دیکھو کس طرح ہم نے اس کو قمقموں سے آراستہ کیا ہے! مطلب یہ ہے کہ ان قمقموں کو دیکھو گے تو تمہارے سامنے یہ پہلو بھی آئے گا کہ اس جہان کا خالق صرف قدرت والا ہی نہیں بلکہ عظیم رحمت والا بھی ہے، جس نے اس چھت کو ایسے قمقموں سے جگمگایا ہے جن کی حسن افروزی اور فیض بخشی کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اوپر 'مَا تَرٰى فِىۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ' میں صفتِ رحمان کا حوالہ آیا ہے۔ یہ اسی ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے گویا یہ دنیا اپنے وجود سے صرف اس بات

کی شہادت نہیں دیتی کہ یہ ایک عظیم قدرت والے کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے ساتھ ہی یہ اس بات کی بھی شہادت دیتی ہے کہ وہ نہایت رحمان، نہایت کریم اور نہایت ہی بندہ نواز بھی ہے جس نے اپنے بندوں کے لیے ایسے لاجواب قمقموں سے آراستہ چھت بنائی ہے۔ اس سورہ میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمان کا حوالہ بار بار آئے گا۔ ہر جگہ اس کے اس خاص پہلو پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ ورنہ کلام کا اصلی حسن نگاہوں سے اوجھل رہے گا۔

ستاروں سے ایک ضمنی فائدہ کی طرف اشارہ

'وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ' کے الفاظ سے ان ستاروں کے ایک اور ضمنی فائدہ کی طرف اشارہ فرما دیا کہ ان سے اللہ تعالیٰ شیاطین کو سنگسار کرنے کے لیے ڈھکانوں کا کام بھی لیتا ہے۔ یہاں بات اجمال کے ساتھ فرمائی گئی ہے۔ اس کی تفصیل قرآن مجید کے دوسرے مقامات میں آئی ہے کہ ان ستاروں کے اندر اللہ تعالیٰ نے دیدبان (بُرُوْج) بنائے ہیں جن میں اس کے کروبی ہر وقت پہرہ دیتے ہیں۔ اگر شیاطین عالمِ بالا کی سن گن لینے کے لیے اوپر چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ان پر شہابوں کے راکٹ پھینک کر ان کو کھدیڑ دیتے ہیں۔ ان شہابوں کی نوعیت پر سورۂ رحمان کی تفسیر میں ہم بحث کر چکے ہیں، تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر ڈال لیجیے۔ اس ضمنی اشارہ سے یہاں مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس شان و اہتمام کے ساتھ پیدا کرنے کے بعد اس کو چھوڑ نہیں دیا ہے کہ شیاطین اس کو اپنی بازی گاہ بنا لیں بلکہ اس نے اس کی نگرانی کا بھی سامان کیا ہے اور جب وہ حدود سے تجاوز کرتے ہیں تو ان کی سرکوبی بھی ہوتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خلق بے راعی کا گلہ نہیں ہے بلکہ جس نے اس کو خلق کیا ہے وہ پوری بیداری کے ساتھ اس کی نگرانی فرما رہا ہے اور ایک دن وہ تمام جن و بشر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچیں گے جو اس میں دھاندلی مچائیں گے۔ ان کے لیے دوزخ کا عذاب تیار ہے، 'وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ'۔

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۶)

قیامت کا انکار خدا کے انکار کے ہم معنی ہے

اوپر شیاطین کے ساتھ جو معاملہ مذکور ہوا ہے اس سے یہ ان انسانوں کے انجام کے ذکر کی طرف گریز ہے جو اپنے رب کا کفر کریں گے۔ 'رب کے کفر' سے یہاں مراد قیامت اور جزاء و سزا کا انکار ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم جگہ جگہ اس کتاب میں تفصیل سے واضح کرتے آ رہے ہیں، یہ ہے کہ قیامت کے انکار سے اللہ تعالیٰ کی تمام بنیادی صفات ــــــ قدرت، عدل، رحمت اور ربوبیت ــــــ کی نفی ہو جاتی ہے۔ ان صفات کی نفی کر کے خدا کو ماننا اور نہ ماننا دونوں یکساں ہے۔ چنانچہ قرآن نے اسی بنیاد پر مشرکین کو جگہ جگہ کفار سے تعبیر کیا ہے حالانکہ وہ خدا کے منکر نہیں تھے۔

'وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ'، فرمایا کہ یہ نہایت برا ٹھکانا اور مرجع ہے جو انھوں نے اپنے لیے انتخاب کیا۔ اس کے برے ہونے کے بعض پہلوؤں کی وضاحت آگے آ رہی ہے۔

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا وَّهِيَ تَفُوْرُ (۷)

فرمایا کہ جب یہ منکرین دوزخ میں جھونکے جائیں گے تو ان کو دیکھ کر جہنم اس طرح دھاڑے گی جس طرح

بھوکا شیر شکار کو دیکھ کر دھاڑتا ہے اور وہ جوش مار رہی ہوگی۔ یعنی اس کا بھڑکنا اپنے پورے شباب پر ہوگا۔

تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ كُلَّمَآ اُلْقِىَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ۙ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ ۚ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ (۸-۹)

جہنم کے جوش غضب کی تصویر

یہ جہنم کے غصہ کی تعبیر ہے کہ معلوم ہوگا کہ وہ غضب سے پھٹی پڑ رہی ہے۔ اس کے اس غیظ و غضب کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہوگی کہ اس کے نزدیک اس ہولناک دن سے جن لوگوں نے بے پروا ہو کر زندگی گزاری انھوں نے بالکل آنکھیں اور کان بند کر کے زندگی گزاری۔ ورنہ اس دنیا میں نہ قیامت اور جزا و سزا کی نشانیوں کی کمی تھی اور نہ کبھی یہ منذروں سے خالی رہی۔ پس جن لوگوں نے آنکھیں اور کان رکھتے ہوئے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا وہ ہرگز کسی ہمدردی کے مستحق نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جہنم کے داروغے ان کو ملامت کریں گے کہ بدبختو! کیا تمھارے پاس اس دن سے آگاہ کرنے کے لیے کوئی نذیر نہیں آیا کہ تم نے اپنی یہ شامت بلائی! اس وقت یہ لوگ اعتراف کریں گے کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ اس سے آگاہ کرنے کے لیے نذیر ہمارے پاس آئے لیکن ہم نے ان کو جھٹلا دیا اور یہ کہہ دیا کہ خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری ہے، تم محض ہم پر دھونس جمانے کے لیے یہ دعوے کر رہے ہو کہ تم کو خدا نے بھیجا ہے کہ ہمیں اس دن سے آگاہ کرو اور خدا کی خوشنودی کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت ہے ان کی ہمیں تعلیم دو۔

'اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِىْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ'۔ یعنی یہی نہیں کہ ہم نے ان کی کوئی بات مانی نہیں اور اپنی گمراہی پر متنبہ نہیں ہوئے بلکہ الٹے ان کو گمراہ ٹھہرایا کہ ہم نہیں بلکہ تم ایک بہت بڑی گمراہی میں مبتلا ہو کہ ہمیں یہ ڈراوا سنا رہے ہو کہ مرکھپ جانے کے بعد ہم از سر نو زندہ کیے جائیں گے، ہمارے ایک ایک قول و فعل کا حساب ہوگا اور ہم اور ہمارے آباء و اجداد جہنم میں پڑیں گے۔

'اَنْتُمْ' کی ضمیر جمع ہے حالانکہ اوپر لفظ 'نَذِيْرٌ' واحد ہے اس سے یہ اشارہ نکل رہا ہے کہ یہ لوگ یہ اعتراف بھی کریں گے کہ یہی جواب ہم نے ہر اس شخص کو دیا جس نے ہمیں اس دن سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ خواہ وہ اللہ کا رسول رہا ہو یا اس کے ساتھی رہے ہوں۔

وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِىْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۱۰)

جہنمیوں کا اعتراف کہ انھوں نے اپنی عقل سے کام نہیں لیا

اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر وہ یہ اعتراف بھی کریں گے کہ اگر وہ بات کے سننے والے اور اپنی عقل سے کام لینے والے ہوتے تو حقیقت اتنی واضح تھی کہ وہ بھی ہدایت پا اور جنت کے حقدار ہوتے، جہنم والوں کے ساتھی نہ بنتے۔ لیکن نہ ہم نے ناصحوں کی بات سننے کے لیے اپنے کان کھولے اور نہ خود اپنی عقل سے کام لیا اس وجہ سے اس انجام بد کو پہنچے۔

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِیْرِ (۱۱)

فرمایا کہ اس طرح وہ اپنے گناہ کا اعتراف کرلیں گے اور خود اپنے اعتراف کی رو سے جہنم کے مستحق بن جائیں گے تو ان بدبختوں پر خدا کی پھٹکار ہو جنھوں نے جانتے بوجھتے اپنے لیے جہنم کا سامان کیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِیْرٌ (۱۲)

منکرین قیامت کے انجام کے بعد یہ ان لوگوں کا صلہ بیان فرمایا ہے جو قیامت کو آنکھوں سے دیکھے بغیر، اس دنیا میں اپنے رب سے ڈرتے رہے۔ فرمایا کہ ان لوگوں کے لیے بے شک ایک عظیم رحمت و مغفرت اور ایک بہت بڑا اجر ہے۔

عقل سے کام لینے والوں کا صلہ

'یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَیْبِ' کے الفاظ سے ان لوگوں کا صاحب عقل و بصیرت ہونا واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے کان اور آنکھیں بند کر کے زندگی نہیں گزاری اور نہ اس بات کے منتظر رہے کہ جب سب کچھ سامنے آجائے گا تب مانیں گے بلکہ اس کائنات کی نشانیوں پر انھوں نے غور کیا، جن لوگوں نے ان کو ہوشیار کیا ان کی باتیں انھوں نے توجہ سے سنیں اور ان پر غور کیا اس وجہ سے یہ مستحق ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے فضل عظیم سے نوازے۔ اس دنیا میں انسان کا اصلی امتحان یہی ہے کہ وہ اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر ان حقائق پر ایمان لائے جن کی خبر اللہ کے رسولوں نے دی ہے۔ جس نے یہ امتحان پاس کرلیا وہ اللہ تعالیٰ کے ہر انعام کا حقدار ہے اور جو اس میں ناکام رہا وہ جانور بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہے اگرچہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی اور سائنس دان مانا گیا ہو۔

وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ۭ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ (۱۳-۱۴)

منکروں کو تہدید مومنوں کو تسلی

یہ آیتیں تہدید کے محل میں بھی ہو سکتی ہیں اور تسلی کے محل میں بھی۔ یہاں یہ دونوں ہی کے محل میں ہیں۔ اوپر جن منکرین قیامت کا ذکر ہوا ہے ان کے لیے ان میں تہدید و وعید ہے کہ اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تمھارا رب، تمھارے کسی جلی یا خفی سے بے خبر رہ سکتا ہے۔ تم پوشیدہ طور پر اپنی بات کہو یا علانیہ طور پر، وہ سب کو جانتا ہے۔ وہ سینوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے تو اس کے سامنے سرّ و علانیہ کا کیا سوال!

منکرین قیامت کے بعد غیب میں رہتے خدا سے ڈرنے والوں کا بیان ہوا ہے۔ ان کے لیے اس میں تسلی ہے کہ تمھارے کسی قول و فعل کا غیب یا شہادت میں ہونا خدا کے لیے بالکل یکساں ہے۔ رات کی خلوتوں میں تم اپنے رب سے راز و نیاز کی جو باتیں کرتے ہو وہ بھی اس کے علم میں ہیں اور دن کی جلوتوں میں جو کچھ تم کہتے ہو اور کرو گے وہ بھی اس کے سامنے ہے اور تمھارے دلوں میں جو کچھ ہے وہ بھی اس سے مخفی نہیں تو جب اس سے کوئی چیز مخفی نہیں تو اطمینان رکھو کہ تمھاری رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی نیکی

رائگاں جانے والی نہیں بلکہ تم اپنے ہر عمل کا بھرپور صلہ پاؤ گے۔

'اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ ؕ وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ'۔ یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں اللہ تعالیٰ تمہارے ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے یا اسے آگاہ ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ جب وہ تمہارا خالق ہے اور اس کے خالق ہونے سے کسی کے لیے مجالِ انکار نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ خالق اپنی مخلوق سے ناواقف ہو۔ جس نے تمام قابلیتوں اور صلاحیتوں کو وجود بخشا اور جس کے حکم سے ساری مشینری حرکت کر رہی ہے وہ اپنی مخلوق کی کسی نقل و حرکت سے کس طرح بے خبر رہ سکتا ہے!

'وَ ہُوَ اللَّطِیۡفُ الۡخَبِیۡرُ'۔ 'لَطِیۡفٌ' کے معنی، جیسا کہ جگہ جگہ اس کی وضاحت ہو چکی ہے، باریک بین اور دقیقہ رس کے ہیں۔ فرمایا کہ حقیقی باریک بین اور باخبر تو وہی ہے۔ دوسرا اگر کسی کی زندگی کے کسی پہلو سے واقف ہوتا ہے تو اس کی واقفیت جزوی اور ناتمام ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ سب کو وجود میں لانے والا اور سب کو رزق و زندگی بخشنے والا ہے اس وجہ سے اس کا علم ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل وہ گمراہی بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے علم کے باب میں قوموں کو لاحق ہوئی۔ جب تک خدا کے علیم و خبیر ہونے کا صحیح تصور دل میں راسخ نہ ہو اس وقت تک انسان کے اندر نہ اس کی خشیت پیدا ہو سکتی اور نہ وہ خدا کے اعتماد و توکل کی حقیقی لذت سے آشنا ہو سکتا۔

ہُوَ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ ذَلُوۡلًا فَامۡشُوۡا فِیۡ مَنَاکِبِہَا وَ کُلُوۡا مِنۡ رِّزۡقِہٖ ؕ وَ اِلَیۡہِ النُّشُوۡرُ (۱۵)

زمین کے آثارِ ربوبیت کی طرف اشارہ

اوپر آسمان کے عجائبِ قدرت و حکمت سے استشہاد کیا تھا یہ زمین کے آثارِ ربوبیت سے قیامت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ فرمایا کہ وہی خدا ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو نہایت مطیع و فرمانبردار بنایا کہ تم اس کی بلندیوں اور پستیوں، اس کی وادیوں اور کوہساروں میں چلو پھرو اور اس میں تمہارے رب نے تمہارے لیے جو رزق پھیلا رکھا ہے اس سے بہرہ مند ہو اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ ایک دن اسی کے حضور میں سب کو اکٹھے ہونا ہے۔

لفظ 'ذَلُوۡلٌ' اور 'مَنَاکِبُ' پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت میں ایک تمثیل مضمر ہے۔ یعنی اس زمین کی مثال ایک فرمانبردار ناقہ سے دی گئی ہے۔ اس کے اندر جو دڑے اور راستے اور جو وادی و کہسار ہیں ان کو ناقہ کے 'مناکب'، یعنی مونڈھوں اور کندھوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور انسانوں کو اس ناقہ کے جسم پر اس طرح فرض کیا گیا ہے گویا وہ اس کے مونڈھوں اور کندھوں میں جوئیں ہوں جن کی پرورش کا سارا سامان ناقہ کے مونڈھوں اور شانوں ہی میں موجود ہوتا ہے۔ وہ انہی کے اندر چلتی پھرتی بھی ہیں اور وہیں سے اپنی

غذا بھی حاصل کر لیتی ہیں۔

ربوبیت کا لازمی تقاضا

کُلُوْا مِنْ رِّزْقِہٖ ط وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ۔ یہ وہ اشارہ ہے جو ربوبیت کا یہ اہتمام و انتظام زبانِ حال سے، انسان کو کر رہا ہے کہ اس رزق و امن سے فائدہ اٹھاؤ اور اس حقیقت کو یاد رکھو کہ جس خدا نے تمہارے لیے بلا استحقاق یہ اہتمام کیا ہے وہ تمہیں شتر بے مہار اور غیر مسئول بنا کے چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ ایک دن تمہیں مرنا ہے اور مرنے کے بعد پھر اٹھنا اور اپنے رب کی طرف لازماً جانا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات عقل اور فطرت کے بالکل خلاف ہے کہ انسان کو نعمتیں اور حقوق تو حاصل ہوں لیکن وہ مسئولیت سے بری رہے۔

ءَاَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یَّخْسِفَ بِكُمُ الْاَرْضَ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ (۱۶)

ایک مورِ ناتواں کے لیے اپنی ہستی پر غرور جائز نہیں

اوپر کی آیت میں انسان کی ناتوانی اور بے حقیقتی کا جو ذکر ہے اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ تنبیہ ہے کہ جو انسان اس زمین کے وسیع و عریض اطراف و اکناف میں چیونٹی کی طرح رینگ رہا ہے اس کو اپنی طاقت اور اپنے وسائل پر اتنا غرہ نہیں ہونا چاہیے کہ اسے خدا کے عذاب سے ڈرایا جائے تو وہ اس کا مذاق اڑائے کہ اس پر کدھر سے عذاب آئے گا اور کون عذاب لائے گا! فرمایا کہ کیا تم اس عظیم ہستی سے جو آسمانوں میں ہے بالکل بے خوف اور نچنت ہو گئے کہ وہ زمین کو تمہارے سمیت دھنسا دے اور وہ بالکل تگ ٹٹ ہو کر کسی سمت کو چل پڑے!

'مَوْرٌ' کے معنی تیزی سے حرکت کرنے کے ہیں، جیسا کہ یَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا (الطور - ۵۲ : ۹) سے واضح ہے۔ اس کے مختلف ترجمے لوگوں نے کیے ہیں لیکن میرا ذہن بار بار اس طرف جاتا ہے کہ یہاں یہ تگ ٹٹ چل پڑنے کے معنی میں ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ 'مور' کے اصل معنی حرکتِ سریع ہی کے ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اوپر اس زمین کو ناقۂ ذلول (فرمانبردار اونٹنی) سے تشبیہ دی ہے۔ اس تعلق سے دیکھیے تو یہ معنی یہاں زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو خدا کی عنایت ہے کہ اس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے اور وہ تمہاری خدمت کے لیے ایک فرمانبردار اونٹنی بنی ہوئی ہے لیکن خدا اس کی باگ ذرا ڈھیلی کر دے تو پھر دیکھو وہ کس طرح بھاگ کھڑی ہوتی ہے کہ کسی کے سنبھالے نہ سنبھلے۔

اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ط فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ (۱۷)

فضائی عذاب کی دھمکی

اوپر کی آیت میں قدموں کے نیچے سے کسی عذاب کے نمودار ہو جانے کا اشارہ تھا یہ سر کے اوپر سے کسی عذاب کے آدھمکنے کی دھمکی ہے کہ کیا تم اپنے اس خداوند سے، جو آسمان میں ہے نچنت ہو کہ وہ تم پر کنکر پتھر برسا دینے والی ہوا مسلط کر دے۔

'حَاصِبٌ' کنکر پتھر برسا دینے والی طوفانی ہوا کو کہتے ہیں۔ اس کی وضاحت ہم اس کتاب میں جگہ جگہ کر چکے ہیں۔ سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم نے اس کے متعلق استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق بھی نقل کی ہے

پچھلی قوموں کی ہلاکت میں اس کو ایک اہم عامل کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ خاص طور پر قوم لوط تو اسی عذاب سے ہلاک ہوئی۔ قریش کو قوم لوط کی تباہ شدہ بستیوں پر سے گزرنے کے مواقع اکثر حاصل ہوتے رہتے تھے اس وجہ سے قوم لوط کی تمثیل ان کے لیے مؤثر ہو سکتی تھی۔

'نَذِيْرِ' یہاں مصدر کے معنی میں ہے اور اس معنی میں اس کا استعمال معروف ہے۔ یعنی آج تو تمھیں میرا انذار مذاق معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ سامنے آ جائے گا تب تمھیں پتہ چلے گا کہ جس چیز کا تم مذاق اڑا رہے ہو وہ کس طرح حقیقت بنتی ہے اور کیسی ہولناک شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ (۱۸)

تاریخ سے سبق لینے کی ہدایت

یہ قریش کو تاریخ سے سبق لینے کی ہدایت ہے کہ یہ عذاب اگر ان کے اوپر ابھی نہیں آیا ہے تو اس کے سبب سے اس کا مذاق نہ اڑائیں۔ یہ کوئی دانشمندی کی بات نہیں ہے کہ جو کچھ آدمی کے اپنے سر پر گزر جائے اسی کو مانے بلکہ دوسری قوموں کی سرگزشت سے انھیں سبق لینا چاہیے جن کو انھی کی طرح انذار کیا گیا لیکن انھوں نے اس کا مذاق اڑایا بالآخر وہ عذاب ان پر مسلط ہو کر رہا جس کا انھوں نے مذاق اڑایا۔

'فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ'، تو دیکھیں کس طرح ان پر میری پھٹکار رہی! یعنی میں نے کس نفرت و بیزاری کے ساتھ ان کو اپنے عذاب کا ہدف بننے کے لیے چھوڑ دیا اور کوئی ان کو بچانے والا نہ بن سکا۔

أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ ۚ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَٰنُ ۚ
إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ (۱۹)

ہر چیز خدا ہی کے تھامے تھمی ہوئی ہے

یعنی اس دنیا میں کوئی چیز بھی، خواہ اوپر ہو یا نیچے، نہ خود کار ہے نہ اپنے بل بوتے پر ٹکی ہوئی ہے بلکہ اللہ ہی اس کو حرکت دیتا ہے اور وہی اس کو تھامتا ہے۔ زمین ہمارے قدموں کے نیچے ٹکی ہوئی ہے تو اس وجہ سے ٹکی ہوئی ہے کہ خدا نے اس کو ٹکا رکھا ہے۔ اگر وہ اس کو نہ تھامے رکھے تو، جیسا کہ اوپر اشارہ ہے، وہ سب کے سمیت کہیں سے کہیں جا نکلے۔ اسی طرح آسمان اگر ہمارے سروں پر تھما ہوا ہے تو خود نہیں تھما ہوا ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے تھام رکھا ہے۔ اگر وہ اس کو چھوڑ دے تو کیا عجب وہ ہمارے اوپر ہی گر پڑے۔ اسی حقیقت کو یہاں مثال سے سمجھایا ہے کہ کیا یہ لوگ اپنے سروں پر پرندوں کو نہیں دیکھتے کہ وہ پروں کو پھیلائے ہوئے بھی اڑتے ہیں اور پروں کو سمیٹ بھی لیتے ہیں۔ ان دونوں ہی حالتوں میں خدائے رحمان ہی ہے جو ان کو فضا میں تھامے رہتا ہے۔ وہ نہ تھامے تو وہ فوراً گر پڑیں۔ مطلب یہ ہے کہ انھی پر قیاس کرو اس فضائے لامتناہی کے کواکب و نجوم اور اس کے ثوابت اور سیاروں کو۔ وہ اگر ٹکے ہوئے ہیں تو اس وجہ سے کہ خدا نے ان کو سنبھال رکھا ہے ورنہ ان میں سے کوئی ایک بھی گر کر پورے کرۂ زمین کو تہ و بالا کر دے۔

'إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ' یعنی یہ خدائے رحمان ہی کی رحمت ہے کہ وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کر رہا ہے

اور اس کو سنبھالے ہوئے ہے ورنہ کسی چیز کا کوئی ایک پیچ بھی ذرا سا ڈھیلا ہو جائے تو یہ سارا عالم چشم زدن میں تباہ ہو جائے۔

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي هُوَ جُندٌ لَّكُمْ يَنصُرُكُم مِّن دُونِ الرَّحْمَٰنِ ۚ إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ (۲۰)

کوئی فوج خدائی حملہ کا دفاع نہیں کر سکتی

یعنی اگر تم عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو کہ تمھیں دکھا دیا جائے تو تمھارے پاس کون سا لشکر ہے جو خدائے رحمان کے مقابل میں تمھاری مدد کرے گا؟

إِنِ الْكَافِرُونَ إِلَّا فِي غُرُورٍ۔ یہ ان لوگوں کی بدبختی پر اظہار افسوس ہے کہ ان کے طنطنہ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بڑا ہی ناقابلِ تسخیر دفاعی حصار ان لوگوں نے تعمیر کر رکھا ہے جس کو کوئی طاقت بھی توڑ نہیں سکتی لیکن یہ لوگ سخت دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ عذابِ الٰہی کا کوئی معمولی سا جھونکا بھی آ گیا تو ان کے سارے قلعے اور حصار خس و خاشاک کی طرح اڑ جائیں گے۔

أَمَّنْ هَٰذَا الَّذِي يَرْزُقُكُمْ إِنْ أَمْسَكَ رِزْقَهُ ۚ بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ (۲۱)

قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ 'رِزْق' یہاں بارش کی تعبیر ہے جو رزق کا ذریعہ بنتی ہے۔ یہ تعبیر قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوئی ہے۔ فرمایا کہ فرض کرو اللہ تعالیٰ اس بارش ہی کو روک لیتا ہے جو تمھارے لیے رزق رسانی کا ذریعہ ہے تو کیا تمھارے پاس ہے کوئی ایسا زور آور جو اس بند دروازے کو از سرِ نو کھول دے؟

'بَل لَّجُّوا فِي عُتُوٍّ وَنُفُورٍ'۔ یہ ان لوگوں کی ہٹ دھرمی پر اظہار افسوس ہے کہ اگرچہ ان میں سے کسی سوال کا جواب بھی یہ اثبات میں دینے کی جرأت نہیں کر سکتے لیکن اس کے باوجود یہ اپنی سرکشی اور حق بیزاری پر بضد ہیں — مطلب یہ ہے کہ اگر یہ سوچنے سمجھنے والے ہوں تو ان کو بات سمجھائی جا سکتی ہے لیکن ضد اور ہٹ دھرمی کا کیا علاج!

أَفَمَن يَمْشِي مُكِبًّا عَلَىٰ وَجْهِهِ أَهْدَىٰ أَمَّن يَمْشِي سَوِيًّا عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ (۲۲)

گمراہی کی اصل علت

اب یہ وضاحت فرمائی ہے اس بات کی کہ کیوں ان لوگوں پر ہدایت کی راہ نہیں کھل رہی ہے اور سمجھانے کے باوجود یہ گمراہی میں بھٹک رہے ہیں؟

فرمایا کہ یہ لوگ کتے کے مانند اپنی خواہشوں کے غلام ہیں جس طرح کتا زمین کو سونگھتا ہوا چلتا ہے کہ شائد کوئی چیز کھانے کی مل جائے اسی طرح ان لوگوں کی رہنما بھی عقل کی جگہ ان کی خواہش ہے اور یہ سر جھکائے، آنکھ بند کیے، اپنی خواہش کے پیچھے چل رہے ہیں۔ خواہش کے پیچھے چلنے والا کبھی ہدایت کی راہ نہیں پا سکتا۔ ہدایت کی راہ اس کو ملتی ہے جو سیدھی راہ پر، سر اٹھا کر، دہنے بائیں اور آگے پیچھے کا جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے انسان کو مستوی القامت پیدا کیا، جانوروں کی طرح زمین کی طرف جھکا ہوا نہیں پیدا کیا، لیکن بہت سے انسان جانوروں ہی کی روش کی تقلید کرتے ہیں اور اس طرح وہ اس اعلیٰ خصوصیت کو کھو

بیٹھتے ہیں جو انسان کا اصلی شرف اور تمغۂ امتیاز ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ خواہشوں کے پیچھے چلنے والوں کی مثال قرآن میں جگہ جگہ جانوروں بالخصوص کتوں سے دی گئی ہے۔

قُلْ هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ ۖ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (۲۳)

یہ ان لوگوں کی محرومی اور ناقدرشناسی پر اظہار افسوس ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے تو تمھیں نہایت بلند مقصد کے لیے سمع و بصر اور دل و دماغ کی نہایت اعلیٰ صلاحیتوں سے آراستہ کر کے پیدا کیا لیکن تم نہایت ناقدرے اور ناشکرے نکلے کہ ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے بجائے تم نے کتوں اور چوپایوں کی تقلید کی اور عقل و دل کی جگہ اپنی خواہشوں کو اپنا امام بنایا۔

قُلْ هُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ وَإِلَيْهِ تُحْشَرُونَ (۲۴)

اصل حقیقت کی یاددہانی نئے اسلوب سے

اب یہ اس اصل حقیقت کی پھر یاددہانی کردی کہ اگر تم عقل سے کام لو تو یہ واضح حقیقت نہایت آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیے کہ جس خدا نے تم کو زمین میں بویا اور تمھاری پرورش کر رہا ہے وہ تم کو یونہی چھوڑے نہیں رکھے گا بلکہ وہ اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹ کر اپنے کھلیان میں جمع کرے گا۔ پھر اس کے دانے کو بھس سے الگ کرے گا اور اس کو کھتے میں جمع کر کے بھس کو جلا دے گا۔ ایک کسان جب اپنے کھیت میں کوئی فصل بوتا ہے، اس کو کھاد اور پانی دیتا ہے، چرند و پرند سے اس کی حفاظت کرتا ہے تو ہر شخص بن بتائے یہ جانتا ہے کہ ایک دن وہ اس کو کاٹے گا، اور اس کے دانے اور بھس کو الگ الگ کرے گا۔ آخر یہی واضح حقیقت خدا کے متعلق تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؛ کیا تم کو خدا نے بالکل عبث پیدا کیا ہے اور تمھاری ربوبیت کا یہ سارا سامان بالکل بے مقصد ہے؛

یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے یہاں جو حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں بیان کردی ہے قدیم صحیفوں، خصوصاً انجیل میں، مختلف اسلوبوں سے، بیان ہوئی ہے۔

یہ آیت سورۂ مومنون میں بھی گزر چکی ہے اور ہم وہاں بھی اس کی وضاحت کر چکے ہیں۔ تفصیل مطلوب ہو تو آیت ۷۹ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔

وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ قُلْ إِنَّمَا الْعِلْمُ عِندَ اللَّهِ م وَإِنَّمَا أَنَا نَذِيرٌ مُّبِينٌ (۲۵-۲۶)

منکرین کا ایک سفیہانہ معارضہ

یعنی یہ سب کچھ سننے کے بعد اگر دم کہتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ اچھا یہ وعدہ کب پورا ہوگا؟ ان کے پاس قیامت کو جھٹلانے کی واحد دلیل یہی ہے کہ اس کا آنا ضروری ہے تو وہ آ کیوں نہیں جاتی اور اس سے ڈرانے والے ٹھیک ٹھیک اس کا وقت کیوں نہیں بتاتے؟ ان کے خیال میں چونکہ وہ اس کا وقت نہیں بتاتے یا بتا سکتے اس وجہ سے جھوٹے ہیں۔ فرمایا کہ ان نادانوں کو یہ جواب دے دو کہ میں تو بس صرف ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔ اس کے وقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا

کہ وہ کب آئے گی پر وہ آئے گی ضرور۔

یہ معارضہ چونکہ ایک بالکل ہی لغو معارضہ ہے اس وجہ سے یہاں اس کے جواب کی زیادہ تفصیل نہیں کی ہے لیکن دوسرے مقامات میں اس کی تفصیل بھی فرمائی ہے کہ کسی حقیقت کو مجرد اس بنیاد پر جھٹلانا کہ اس کے ظہور کا صحیح وقت نہیں بتایا جا سکتا، کھلی ہوئی سفاہت ہے۔ اس دنیا کے کتنے واقعات کا تجربہ ہم اپنی روزمرہ زندگی میں کرتے ہیں جن کے ظہور کا صحیح وقت اگرچہ کوئی نہیں بتا سکتا لیکن ان کے وقوع کو سب مانتے ہیں۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ زُلْفَةً سِیْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ قِیْلَ هٰذَا الَّذِیْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ (۲۷)

منکرین کے غرور کی بے ثباتی

یعنی ابھی تو بڑے طنطنہ اور غرور سے یہ عذاب کو دکھانے کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن یہ ساری شیخی اسی وقت تک ہے جب تک وہ سامنے نہیں آ جاتا۔ جب اس کو قریب آتا دیکھیں گے تو ان کے چہرے بگڑ جائیں گے اور سب کی سٹی بھول جائے گی۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا مطالبہ کر رہے تھے تو اب اس کو دیکھتے ہی بدحواسی کیوں طاری ہو رہی ہے! یہ تو تمھاری مانگی ہوئی مراد ہے تو اب اس کا مزہ چکھو!

قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَ مَنْ مَّعِیَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ (۲۸)

طفل تسلیوں کے بجائے حقیقت کا سامنا کرنے کی دعوت

جب کفار کو عذاب سے ڈرایا جاتا تو وہ اپنے عوام کو مطمئن رکھنے کے لیے یہ بھی کہتے کہ اس شخص کی دھونس میں نہ آؤ۔ یہ عذاب وغیرہ کی دھمکی محض اس کی خطابت اور شاعری ہے۔ بہت جلد دیکھو گے کہ یہ بھی ختم ہو جائے گا اور اس کی یہ ساری باتیں بھی ہوا میں اڑ جائیں گی۔ یہ ہمیں عذاب سے ڈراتا ہے حالانکہ ہم اس کے اور اس کے ساتھیوں ہی کے لیے گردشِ روزگار کے منتظر ہیں۔ قرآن میں یہ مضمون جگہ جگہ بیان ہوا ہے۔ ہم سورۂ طور سے ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرمایا ہے:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ	کیا یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک شاعر ہے اور ہم اس کے لیے
بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ ۔ قُلْ تَرَبَّصُوْا	گردشِ روزگار کا انتظار کر رہے ہیں۔ کہہ دو، تم
فَاِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِیْنَ ۔	انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کرنے والوں
(الطور - ۵۲: ۳۰-۳۱)	میں سے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ تم اپنے گمان کے مطابق ہمارے لیے گردشِ روزگار کے منتظر ہو اور ہم تمھارے لیے اس عذاب کے منتظر ہیں جس سے ڈرانے کے لیے خدا نے ہمیں ہدایت فرمائی ہے۔ ہم تمھارے گمان کے باب میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتے۔ یہ اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ ہمیں ہلاک کرے گا یا ہم پر رحم فرمائے گا۔ ہم نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اس وجہ سے امید یہی ہے کہ وہ ہم پر رحم فرمائے گا لیکن فرض کیا کہ تمھارا ہی گمان سچا ثابت ہوتا ہے اور ہم گردشِ روزگار کے شکار ہو جاتے ہیں تو اس میں تمھارے لیے تسلی کا کیا پہلو ہے؟ آخر تم کو خدا کے قہر و غضب سے بچانے والا کون بنے گا؟ قیامت بہرحال شدنی ہے۔ اس کے شدنی ہونے کے دلائل اٹل ہیں۔ جزا اور سزا یقینی ہے جس کے

انکار یا جس سے فرار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کافر اور مومن، نیکوکار اور بدکار دونوں یکساں نہیں ہو سکتے، یہ ایک مسلّم حقیقت ہے تو تھوڑی دیر کے لیے مان لو کہ ہم فنا ہو گئے تو اس سے تمہارا کیا بھلا ہو گا، تمھیں تو پھر بھی ان حقائق کا مواجہ کرنا پڑے گا جن سے ہم تمہیں آگاہ کر رہے ہیں! مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی طفل تسلیوں سے اپنی شامت کو دعوت نہ دو بلکہ ع

ڈرو اس سے جو وقت ہے آنے والا

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۲۹)

یعنی ان لوگوں کو بتا دو کہ ہم اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کرتے کہ ہمارے ساتھ کیا معاملہ ہو گا۔ اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن و رحیم ہے، ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور ہم نے اسی پر بھروسہ کیا ہے اس کی وجہ سے ہمیں امید یہی ہے کہ ہمارے حال پر وہ رحم فرمائے گا۔ اس معاملے میں اگر تم جھگڑتے ہو تو انتظار کرو جلد تم جان لو گے کہ کھلی ہوئی گمراہی میں کون ہے؟ ہم کہ تم؟

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ (۳۰)

'مَآءٍ مَّعِيْنٍ' صاف شفاف، خالص اور بے آمیز پانی۔

ایک قریب الفہم استدلال

پانی کے نیچے اتر جانے کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ پانی کی سطح ہی اتنی نیچی ہو جائے کہ زمین سے پانی حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے ہم معنی بن جائے۔ کتنے علاقے ہیں جہاں پانی کی سطح اتنی نیچی ہے کہ وہاں کنوئیں تو درکنار ٹیوب ویل سے بھی پانی حاصل کرنا ایک کارِ عظیم ہے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بارش نہ ہونے یا کم ہونے کے سبب سے نہروں، چشموں اور ندیوں کا پانی کم ہو کر گدلا ہو جائے۔ یہاں یہ دونوں مفہوم لینے کی گنجائش ہے۔ 'مَآءٍ مَّعِيْنٍ' کے لفظ کی وجہ سے میرا ذہن اس دوسرے مفہوم کی طرف جاتا ہے۔

عذابِ الٰہی کا مذاق اڑانے والے متمردین کو اوپر متعدد قریب الوقوع چیزوں سے ڈرایا گیا ہے کہ اس کو بعید از امکان نہ خیال کرو۔ خدا جہاں سے چاہے تمھیں پکڑ سکتا ہے۔ اسی سلسلہ کی یہ آخری بات فرمائی کہ دور کیوں جاتے ہو اپنے اس پانی ہی کو دیکھو کہ اگر اس کی سطح نیچی ہو جانے کے سبب سے یہ گدلا ہو جائے تو تمھیں صاف شفاف، تازہ و شیریں پانی کون فراہم کر سکتا ہے؟ تو جس خدا کے قبضہ میں تمھاری زندگی کی رگ رگ ہے اس سے نچنت اور بے خوف ہونے کے کیا معنی!

رب کریم و کارساز کی توفیق و عنایت سے ان سطروں پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

رحمان آباد

۲۲- جون ۱۹۷۸ء

۱۵- رجب ۱۳۹۸ھ

تدبّرِ قرآن

٦٨

القلم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلّق اور مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ سابق سورہ ——— الملک ——— کا مثنیٰ ہے اس وجہ سے دونوں کے عمود اور موضوع میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف طرزِ بیان، نہجِ استدلال اور لب و لہجہ میں فرق ہے۔ جس طرح سابق سورہ میں قریش کو عذاب اور قیامت سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی ان کو عذاب و قیامت سے ڈرایا گیا ہے لیکن اس سورہ کا لب و لہجہ سابق سورہ کے مقابل میں تیز ہے۔

سابق سورہ کے آخر میں قریش کو مخاطب کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ کہلوایا گیا ہے کہ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ وَمَنْ مَّعِیَ اَوْ رَحِمَنَا ۙ فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ، کہ اس خبط میں نہ رہو کہ میں کوئی شاعر اور دیوانہ ہوں جس کو گردشِ روزگار بہت جلد فنا کر دے گی۔ تمھاری یہ توقع بالفرض پوری بھی ہو جائے جب بھی تمھارے لیے اس میں اطمینان کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ یہ سوال پھر بھی باقی رہتا ہے کہ تمھیں خدا کے عذاب سے بچانے والا کون بنے گا؟ اس سورہ میں اسی مضمون کی تائید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپ کی پیش کردہ کتاب اور آپ کے اعلیٰ کردار کا موازنہ قریش کی فاسقانہ قیادت کے کردار سے کر کے یہ دکھایا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب موافق و مخالف دونوں پر واضح ہو جائے گا کہ کن کی باگ فتنہ میں پڑے ہوئے لیڈروں کے ہاتھ میں ہے جو ان کو تباہی کی راہ پر لے جا رہے ہیں اور کون لوگ ہدایت کی راہ پر ہیں اور وہ فلاح پانے والے بنیں گے۔

اس کے بعد باغ والوں کی تمثیل کے ذریعہ سے قریش کو متنبہ فرمایا ہے کہ آج جو امن و اطمینان تمھیں حاصل ہے اس سے اس دھوکے میں نہ رہو کہ اب تمھارے اس عیش میں کوئی رخنہ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جس خدا نے تمھیں یہ سب کچھ بخشا ہے اس کے اختیار میں اس کو چھین لینا بھی ہے۔ اگر تم اس سے نچنت ہو بیٹھے ہو تو یاد رکھو کہ وہ چشم زدن میں تم کو اس سے محروم بھی کر سکتا ہے۔ پھر تم کفِ افسوس ملتے ہی رہ جاؤ گے۔

آخر میں مکذبینِ قیامت کی اس فاسد ذہنیت پر ضرب لگائی ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ جو عیش و آرام انھیں یہاں حاصل ہے اگر آخرت ہوئی تو وہاں بھی انھیں یہی کچھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر حاصل ہوگا۔ ان سے سوال کیا ہے کہ آخر انھوں نے خدا کو اتنا نامنصف کس طرح سمجھ رکھا ہے کہ وہ نیکوں اور

بدوں میں کوئی امتیاز نہیں کرے گا؛ ساتھ ہی ان کو چیلنج کیا ہے کہ اگر انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس طرح کا کوئی عہد کرا لیا ہے یا کوئی ان کے لیے اس کا ضامن بنا ہے تو اس کو پیش کریں۔ اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آج جو سخن سازیاں یہ لوگ کر رہے ہیں اس کا غم نہ کرو، جب قیامت کی ہلچل برپا ہوگی تب انھیں معلوم ہو جائے گا کہ جو خواب وہ دیکھتے رہے تھے وہ حقیقت سے کتنے دور تھے۔ فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے استدراج کے پھندے میں پھنس چکے ہیں اور اس کی تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ اس سے بچ نکلنے کا ان کے لیے کوئی امکان نہیں ہے تو صبر کے ساتھ اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس طرح کی عجلت سے بچو جس میں یونس علیہ السلام مبتلا ہوئے اور جس کے سبب سے ان کو ایک سخت امتحان سے دوچار ہونا پڑا۔

سورۃ القلم (۶۸)

مکیۃ ______ آیات : ۵۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیات ۱-۵۲ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴿۱﴾ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲﴾
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ﴿۳﴾ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ﴿۴﴾
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ﴿۵﴾ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ﴿۶﴾ اِنَّ رَبَّكَ
هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۷﴾
فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۸﴾ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ﴿۹﴾
وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ﴿۱۰﴾ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ﴿۱۱﴾
مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ ﴿۱۲﴾ عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِكَ زَنِيْمٍ ﴿۱۳﴾
اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ﴿۱۴﴾ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ
اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۵﴾ سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ ﴿۱۶﴾ اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ
كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ ﴿۱۷﴾
وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ
نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ ﴿۲۰﴾ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ ﴿۲۱﴾
اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾ فَانْطَلَقُوْا

وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ﴿۲۳﴾ اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ ﴿۲۴﴾ ۙ
وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾ فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴿۲۶﴾ ۙ
بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا
تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَقْبَلَ
بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾ قَالُوْا يٰوَيْلَنَاۤ اِنَّا كُنَّا
طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾ عَسٰى رَبُّنَاۤ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَاۤ اِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا
رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ وقف لازم
كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾ ع اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾ ع ۱ ۳۳ ۲
اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾ ؕ مَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾ ج
اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾ ۙ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾ ج
اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ
لَمَا تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۹﴾ ج سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ ﴿۴۰﴾ ج اَمْ لَهُمْ مع ۱۵
شُرَكَآءُ ج فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿۴۱﴾ يَوْمَ
يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّيُدْعَوْنَ اِلَى السُّجُوْدِ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ ۙ
خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ؕ وَقَدْ كَانُوْا يُدْعَوْنَ
اِلَى السُّجُوْدِ وَهُمْ سٰلِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَذَرْنِيْ وَمَنْ يُّكَذِّبُ بِهٰذَا
الْحَدِيْثِ ؕ سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۴﴾ ۙ وَاُمْلِيْ
لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾ اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ

مُّثْقَلُونَ ﴿۴۶﴾ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ﴿۴۷﴾ فَاصْبِرْ
لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ وقف لازم
مَكْظُومٌ ﴿۴۸﴾ لَّوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّن رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ
وَهُوَ مَذْمُومٌ ﴿۴۹﴾ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ﴿۵۰﴾
وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا
الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ﴿۵۱﴾ وَمَا هُوَ إِلَّا وقف لازم
ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ﴿۵۲﴾ ع ۲ ۱۹ ۴

ترجمۂ آیات ۱-۵۲

یہ سورۂ نٓ ہے۔ قسم ہے قلم کی اور اس چیز کی جو وہ لکھتے ہیں کہ تم اپنے رب کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو اور تمھارے لیے یقیناً ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو۔ پس تم بھی عنقریب دیکھ لو گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے کہ فتنہ میں پڑا ہوا تم میں سے کس گروہ کے ساتھ ہے۔ تمھارا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ انھیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یاب ہیں۔ ۱-۷

پس ان جھٹلانے والوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ ذرا تم نرم پڑو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں گے۔ اور تم بات نہ سنو ہر جھوٹی قسمیں کھانے والے، ذلیل، اشارہ باز، لُتڑے، خیر سے روکنے والے، حد سے تجاوز کرنے والے، حق مارنے والے، سنگدل، مزید برآں بے نسب کی۔ یہ کردار اس وجہ سے ہوا کہ وہ مال و اولاد والا ہے۔ جب اس کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو کہتا ہے، یہ تو اگلوں کے فسانے ہیں۔ ہم عنقریب

اس کے ناک کے پر داغیں گے۔ ۸-۱۶

ہم نے ان کو اس طرح امتحان میں ڈالا ہے جس طرح باغ والوں کو امتحان میں ڈالا جب کہ انھوں نے قسم کھائی کہ وہ صبح سویرے ضرور اس کے پھل توڑ لیں گے اور کچھ بھی نہ چھوڑیں گے۔ تو ابھی وہ سوئے پڑے ہی تھے کہ اس پر تیرے رب کی طرف سے گردش کا ایک جھونکا آیا تو وہ کٹی ہوئی فصل کے مانند ہو کر رہ گیا۔ صبح کو انھوں نے پکارا کہ پھل توڑنے ہیں تو سویرے اپنے کھیت پر پہنچو۔ پس وہ چلے اور آپس میں چپکے چپکے کہہ رہے تھے کہ دیکھنا آج باغ میں کوئی مسکین نہ گھسنے پائے اور وہ بڑے عزم و حوصلہ سے نکلے۔ پس جب اس کو دیکھا تو بولے کہ ہم تو راستہ بھول گئے! نہیں، بلکہ ہم تو محروم ہو کے رہ گئے! ان میں جو شخص کچھ معقول تھا اس نے کہا، میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ رب کی تسبیح کیوں نہیں کرتے! تب وہ پکار اٹھے، ہمارا رب پاک ہے، بے شک ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنے! پھر وہ آپس میں ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ انھوں نے کہا ہائے بدبختی! ہم ہی سرکشی میں مبتلا رہے! توقع ہے کہ ہمارا رب اس کی جگہ اس سے بہتر باغ ہمیں دے۔ اب ہم اپنے رب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ اسی طرح عذاب آجائے گا اور آخرت کا عذاب تو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ کاش! یہ لوگ اس کو جانتے! ۱۷-۳۳

بے شک متقیوں کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے! تمھیں کیا ہوا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو! کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو، اس میں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو تم پسند کرو گے! کیا تمھارے لیے ہمارے اوپر قسمیں ہیں قیامت تک باقی رہنے والی کہ تمھارے

لیے وہی کچھ ہے جو تم فیصلہ کرو گے! ان سے پوچھو، ان میں سے کون اس کا ضامن بنتا ہے؟ کیا ان کے کچھ شرکاء ہیں؟ تو وہ لائیں اپنے شریکوں کو اگر وہ سچے ہوں! ۳۴-۴۱

اس دن کو یاد رکھو جس دن ہلچل پڑے گی اور یہ لوگ سجدے کے لیے بلائے جائیں گے تو یہ نہ کر سکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی۔ ان پر ذلت طاری ہو گی اور یہ سجدے کے لیے اس وقت بھی بلائے جاتے تھے جب وہ صحیح سالم تھے۔ ۴۲-۴۳

پس چھوڑو مجھ کو اور ان کو جو اس کلام کو جھٹلا رہے ہیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ لا رہے ہیں وہاں سے جہاں سے وہ نہیں جانتے۔ اور میں ان کو ڈھیل دے رہا ہوں بے شک میری تدبیر نہایت محکم ہوتی ہے۔ ۴۴-۴۵

کیا تم ان سے کوئی معاوضہ طلب کر رہے ہو کہ وہ اس کے تاوان سے دبے جا رہے ہوں! یا ان کے پاس غیب کا علم ہے پس وہ اس کو لکھ رہے ہیں تو اپنے رب کے فیصلہ تک صبر کرو اور مچھلی والے کی طرح نہ بن جائیو! جب اس نے اپنے رب کو پکارا اور وہ غم سے گھٹا ہوا تھا۔ اگر اس کے رب کا فضل اس کی دست گیری نہ کرتا تو وہ مذمّت کیا ہوا چٹیل میدان ہی میں پڑا رہ جاتا۔ پس اس کے رب نے اس کو برگزیدہ کیا اور اس کو نیکوکاروں میں سے بنایا۔ ۴۶-۵۰

اور یہ کافر جب یاددہانی سنتے ہیں تو اس طرح تمھیں دیکھتے ہیں گویا اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں پھسلا دیں گے اور کہتے ہیں لاریب یہ ایک دیوانہ ہے، حالانکہ یہ عالم والوں کے لیے ایک یاددہانی ہے۔ ۵۱-۵۲

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ (۱)

حروف 'نٓ' کے معنی — جس طرح قٓ قف وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (قٓ - ۵۰ : ۱) میں 'قٓ' سورہ کا نام ہے اسی طرح یہاں 'نٓ' اس سورہ کا نام ہے۔ عربیت کے معروف قاعدے کے مطابق مبتدا یہاں حذف ہو گیا ہے جس کو ہم نے ترجمہ میں کھول دیا ہے۔ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں امام فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے اس نظریہ کا حوالہ ہم دے چکے ہیں کہ ابتداءً یہ حروف معانی پر دلیل ہوتے تھے، اب ان کے معانی کا علم اگرچہ باقی نہیں رہا تاہم بعض حروف اب بھی معنی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس دعوے کے ثبوت میں استاذ امامؒ نے جن حروف کا حوالہ دیا ہے ان میں یہ حرف بھی شامل ہے۔ جو اب بھی اپنے قدیم معنی (مچھلی) میں مستعمل ہے۔ اس سورہ کو اس نام سے موسوم کرنے میں اشارہ ہے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی طرف جن کو مچھلی نے نگل لیا تھا، چنانچہ سورہ کے آخر میں 'صَاحِبُ الْحُوْتِ' (مچھلی والے) کے لقب سے آنجنابؑ کا ذکر آیا بھی ہے۔ سورۂ انبیاء کی آیت ۸۷ میں 'ذُوالنُّوْنِ' کے لقب سے بھی آپ کو ملقّب فرمایا گیا ہے جس کے معنی بعینہٖ وہی ہیں جو 'صاحب الحوت' کے ہیں۔

قلم کی شہادت تین دعاوی پر — 'وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ' پر 'وَ' قسم کے لیے ہے اور یہ بات ہم بار بار ظاہر کر چکے ہیں کہ قرآن میں قسمیں کسی دعوے پر شہادت کے لیے کھائی گئی ہیں۔ یہاں دعوے کے طور پر، جیسا کہ آگے تفصیل آئے گی، تین باتیں مذکور ہیں جن کو ثابت کرنے کے لیے یہ قسم کھائی گئی ہے۔

ایک یہ کہ مخالفین آپ کو (پیغمبر صلعم) جو دیوانہ کہتے ہیں یہ ان کی خرد باختگی ہے۔ آپ دیوانے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے تمام فرزانوں سے بڑھ کر فرزانے ہیں۔

دوسری یہ کہ مخالفین جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ آپ کی یہ ساری سرگرمیاں چند روزہ ہیں جو بہت جلد ہوا میں اڑ جائیں گی، یہ بالکل غلط ہے۔ آپ کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں ایک غیر منقطع اجر مقدّر ہے۔

تیسری یہ کہ آپ ایک اعلیٰ کردار کے مالک ہیں اس وجہ سے جو لوگ آپ کو شاعر، کاہن یا دیوانہ سمجھ کر نظر انداز کر رہے ہیں وہ اپنی شامت کو دعوت دے رہے ہیں۔

ان دعاوی پر قرآن میں جگہ جگہ خود قرآن ہی کو شہادت میں پیش کیا گیا ہے اس وجہ سے قرینہ اسی بات کا ہے کہ یہاں بھی 'وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ' سے قرآن ہی مراد ہو۔ چنانچہ مجاہدؒ سے روایت بھی ہے کہ 'الْقَلَمِ' سے مراد وہ قلم ہے جس سے قرآن مجید لکھا جا رہا تھا اور 'وَمَا يَسْطُرُوْنَ' سے مراد قرآن مجید ہے۔

قلم کی اہمیت کے چند پہلو — یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ 'تعلیم بالقلم' اللہ تعالیٰ کے عظیم احسانات میں سے ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۙ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (العلق - ۹۶ : ۳ - ۵)

(پڑھو اور تمہارا رب نہایت ہی بافیض رب ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی، انسان کو سکھایا وہ کچھ

جو وہ نہیں جانتا تھا) سابق انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیم دی وہ زبانی تعلیم کی شکل میں تھی جس کو محفوظ رکھنا نہایت مشکل تھا۔ وہ بہت جلد یا تو محرف ہو کر مسخ ہو جاتی یا اس پر نسیان کا پردہ پڑ جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے دین کو اس آفت سے محفوظ رکھنے کے لیے انسان کو قلم اور تحریر کے استعمال کا طریقہ سکھایا جس سے وہ اس قابل ہوا کہ زبانی تعلیم کی جگہ اس کو تحریر کے ذریعہ سے تعلیم دی جائے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کو تورات کے احکامِ عشرہ الواح میں لکھ کر دیے گئے۔ پھر دوسرے نبیوں کی تعلیمات بھی قلمبند ہوئیں اور سب کے آخر میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس طرح محفوظ کی گئی کہ قیامت تک اس میں کسی تحریف و تغیر کا کوئی ادنیٰ احتمال بھی باقی نہ رہا۔

قلم سے مراد — 'قلم' کی اسی اہمیت کے سبب سے یہاں اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے یہاں کوئی خاص قلم مراد نہیں ہے بلکہ یہ لفظ تعبیر ہے تعلیماتِ الٰہیہ کے اس پورے مدوّن سرمایہ (WRITTEN RECORD) کی جو قلم کے ذریعہ سے محفوظ ہوا۔ یعنی تورات، زبور، انجیل وغیرہ۔ ان مقدس صحیفوں کی تعلیمات بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتی ہیں اور ان کے اندر آپ کے ظہور کی ناقابلِ تردید شہادتیں بھی ہیں۔ ان ساری چیزوں کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔

'مَا یَسْطُرُوْنَ' کا مفہوم — 'وَمَا یَسْطُرُوْنَ' سے مراد، قرینہ دلیل ہے کہ، قرآن مجید ہے جو اس وقت نازل بھی ہو رہا تھا اور صحابہؓ کے ہاتھوں لکھا بھی جا رہا تھا۔ پچھلے صحیفوں کی قسم کے بعد یہ خود قرآن مجید کی قسم ہے۔ اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت، رزانت اور رسالت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے کہ جو شخص ایسا اعلیٰ اور برتر کلام پیش کر رہا ہے۔ اس کا یہ کلام ہی دلیل ہے کہ یہ کوئی کاہن یا شاعر یا دیوانہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا رسول ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ کفار کے اس قسم کے طعنوں کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے بالعموم قرآن مجید ہی کو ان کے سامنے پیش کیا ہے کہ وہ اس کو دیکھیں اور انصاف سے فیصلہ کریں کہ یہ کسی دیوانے یا کاہن یا شاعر کا کلام ہو سکتا ہے یا اللہ تعالیٰ کا؟

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ (۲)

قسم کا مقسم علیہ — یہ مُقسم علیہ ہے۔ یعنی تمام پچھلے آسمانی صحیفے اور یہ قرآن، جو لکھا جا رہا ہے، سب اس بات پر شاہد ہیں کہ تم اللہ کے فضل سے کوئی دیوانے نہیں ہو۔ بلکہ تم انہی باتوں سے لوگوں کو آگاہ کر رہے ہو جن سے آدم علیہ السلام سے لے کر مسیح علیہ السلام تک ہر نبی نے آگاہ کیا اور جن کی صداقت پر تاریخ گواہ ہے۔ اگر یہ مدّعیانِ دانش اس جرم میں تمھیں دیوانہ کہہ رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو، تم دیوانے نہیں بلکہ اپنے رب کے سب سے بڑے فضل سے بہرہ مند ہو البتہ ان دانش فروشوں کی عقل ماری گئی ہے کہ یہ دیوانے اور فرزانے میں امتیاز سے قاصر ہیں۔

آنحضرت صلعم کو مجنون کہنے کی وجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مجنون کہنے کی وجہ ہم اس کے محل میں ظاہر کر چکے ہیں کہ قریش کے لیڈروں کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی تھی کہ آپ جس عذاب سے ان کو اس شدت و مدا ور اس جزم و یقین کے ساتھ ڈرا رہے ہیں کہ گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں آخر وہ کدھر سے آجائے گا؟ ان کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ آپ کے لب و لہجہ میں جو غیر معمولی جزم و یقین، آپ کے اندازِ دعوت میں جو مافوق العادت بے چینی و بے قراری اور آپ کی تذکیر میں دلوں کو ہلا دینے والی جو دردمندی و شفقت ہے اس سے ان کے عوام متاثر ہو رہے ہیں۔ اس اثر کو زائل کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہا کہ اس شخص کی یہ ساری بے چینی و بے قراری اس وجہ سے نہیں ہے کہ فی الواقع کوئی عذاب آنے والا ہے جس سے آگاہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو بھیجا ہے بلکہ بعض اشخاص کو جس طرح کسی چیز کا مالیخولیا ہو جاتا ہے اور وہ اٹھتے بیٹھتے اسی کی رٹ لگاتے رہتے ہیں اسی طرح اس شخص کو بھی عذاب کا مالیخولیا ہو گیا ہے جو اس کو ہر طرف سے آتا دکھائی دے رہا ہے۔ اس بات کو تقویت دینے کے لیے اس پر وہ یہ اضافہ بھی کر دیتے کہ کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے جس کے سبب سے اس کی دماغی حالت ٹھیک نہیں رہی ہے اور بہکی بہکی باتیں کرنے لگا ہے۔

وَإِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ (۳)

رسول کے لیے ابدی فیروزمندی کی بشارت

یہ اسی بات کی وضاحت مثبت پہلو سے ہے کہ احمق ہیں وہ جو تمھیں دیوانہ سمجھ کر تمھارے لیے گردشِ روزگار کے منتظر ہیں جو ان کے خیال میں تمھیں تباہ کر دے گی۔ تباہی تمھارے لیے نہیں بلکہ خود ان کے لیے مقدر ہے۔ تمھارے لیے تو کبھی نہ ختم ہونے والا اجر ہے اور مغروروں کو جو دنیا ملی ہے اور جس پر یہ نازاں ہیں یہ اب عذاب کی زد میں ہے اور بہت جلد یہ اس کا انجام دیکھ لیں گے لیکن تمھیں تمھاری حق پرستی کا جو صلہ ملنے والا ہے وہ ابدی ہے جس کے لیے کبھی زوال نہیں ہے۔

'غَيْرَ مَمْنُونٍ' کے معنی غیر منقطع کے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی اس سے مختلف بھی لیے ہیں لیکن وہ عربیت اور نظائرِ قرآن کے خلاف ہے۔

وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ (۴)

رسول کا کردار اس کے دعوے پر عظیم حجت ہے

یعنی حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی تاریخ نے اعلیٰ کردار کے جو نمونے پیش کیے ہیں تم اسی کی ایک نہایت شاندار مثال ہو اور تمھارا یہ کردار ان لوگوں کے خلاف سب سے بڑی حجت ہے جو تمھیں دیوانہ یا کاہن یا شاعر کہہ کر اپنے کو اور اپنے عوام کو یہ باور کرا رہے ہیں کہ تمھاری یہ باتیں ہوا میں اڑ جائیں گی۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ کردار کو آپ کے دعوے کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ سورۂ شعراء میں نہایت تفصیل سے کاہنوں اور شاعروں کے اخلاق کی پستی، ان کی فکری ہرزہ گردی اور ان کے قول و عمل کی بے ربطی کا حوالہ دے کر ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ناپاک زمرے میں شامل کرتے تھے۔ ان سے سوال کیا گیا ہے کہ نبی کے اعلیٰ کردار کو ان کاہنوں اور شاعروں کے کردار سے کیا تعلق جن کا ظاہر و باطن دونوں ہی یکساں تاریک ہے!

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ (۵-۶)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلّی اور مخالفین کے لیے دھمکی ہے کہ اگر یہ تمھیں دیوانہ کہہ کر تمھاری باتوں کو بے وزن بنانا چاہتے ہیں تو کچھ دن صبر کرو۔ عنقریب تم بھی دیکھ لوگے اور یہ بھی دیکھ لیں گے کہ دونوں میں سے کس پارٹی کی باگ فتنہ میں پڑے ہوئے لیڈر کے ہاتھ میں ہے؟ اہل ایمان کی باگ، جن کی قیادت تم کر رہے ہو یا قریش کی باگ جن کی قیادت ابولہب اور ابوجہل کر رہے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ اب فیصلہ کا وقت قریب ہے اور حقیقت کے ظاہر ہونے میں زیادہ دیر نہیں رہ گئی ہے۔ بہت جلد سب دیکھ لیں گے کہ کون لوگ شیطان کے فتنہ میں پڑے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنی قوم کو تباہی کے کھڈ میں گرایا اور کون شیطان کے فتنوں سے امان میں رہا اور اس نے اپنے پیروؤں کو دنیا اور آخرت کی کامیابی کی راہ دکھائی!

اہلِ ایمان کے لیے بشارت اور مخالفوں کے لیے وعید

یہاں وہ حقیقت پیش نظر رکھیے جس کی بار بار یاددہانی کی جا چکی ہے کہ رسولوں کے باب میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب وہ آتے ہیں تو اسی دنیا میں اپنی جماعت اور اپنے مخالفوں کے انجام کا فیصلہ کر کے جاتے ہیں۔ آیت میں اہلِ ایمان کے لیے جو تسلی اور اہلِ کفر کے لیے جو وعید ہے وہ جس طرح آخرت سے متعلق ہے اسی طرح اس دنیا سے بھی متعلق ہے۔ سابق سورہ کے آخر میں جو فرمایا ہے کہ 'فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ' یہ اسی کا اعادہ دوسرے الفاظ میں ہے۔

'بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ' میں 'ب' بظاہر 'تُبْصِرُ' اور 'يُبْصِرُوْنَ' کے ساتھ بے جوڑ سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہاں تضمین ہے یعنی 'يُبْصِرُوْنَ' متضمن ہے 'يَعْلَمُوْنَ' کے معنی پر مجھے یاد پڑتا ہے کہ زمخشری کی رائے یہی ہے اور میرے نزدیک یہ رائے اصولِ عربیت کے مطابق ہے۔ 'بِاَيِّكُمُ' کے معنی 'بِاَيِّ الْحِزْبَيْنِ' کے ہیں۔

'مَفْتُوْنٌ' کے معنی 'مَجْنُوْنٌ' کے نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ 'مَفْتُوْنٌ' ہی کے ہیں۔ یعنی وہ شخص جو دنیا اور شیطان کے جال میں پھنسا ہوا ہو۔ یہاں 'مجنون' کے بجائے 'مفتون' کا لفظ استعمال کر کے قرآن نے یہ رہنمائی دی ہے کہ جو لوگ دنیا اور شیطان کے چکر میں پھنسے ہوئے ہیں اصلی مجنون وہی ہوتے ہیں اور جس پارٹی کی باگ ایسے مفتونوں کے ہاتھ میں ہو وہ بالآخر جہنم میں گر کے رہتی ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۝ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ (۷)

یہ اسی اوپر والے مضمون کی تائید و توثیق ہے کہ تمھارا رب نہ تو ان لوگوں سے بے خبر ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور نہ ان لوگوں سے ناواقف ہے جو ہدایت پر ہیں بلکہ وہ دونوں

ہی سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہوگا۔ نہ یہ ہو سکتا کہ جو ذلّت کے مستحق ہیں وہ ہمیشہ عزت سے سرفراز رہیں اور نہ یہ ہو سکتا کہ جو سرفرازی کے حق دار ہیں وہ برابر ظالموں کے ظلم کے ہدف بنے رہیں۔ یہ دنیا اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ یہ ایک علیم و خبیر خالق کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے لیے ایک روز انصاف آئے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اس رب پر بھروسہ رکھو۔ وہ نیکوکاروں اور شریروں کے ساتھ ایک ہی طرح کا معاملہ نہیں کرے گا۔

فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ (۸)

یعنی جب اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی تو عذاب اور قیامت کی تکذیب کرنے والوں کی باتوں کا دھیان نہ کرو اور ان کی ہفوات پر کان نہ دھرو۔ یہ لوگ اگر نچنت ہیں کہ نہ عذاب ہے نہ قیامت تو انھیں نچنت رہنے دو۔ اگر یہ مطمئن ہیں کہ قیامت ہوئی تو وہاں بھی ان کو وہی کچھ حاصل ہوگا جو یہاں حاصل ہے تو انھیں یہ خواب خوش دیکھ لینے دو۔ یہ دنیا ان کی خواہشوں کے محور پر نہیں گھوم رہی ہے کہ جو کچھ یہ چاہیں گے انھیں مل جائے گا بلکہ یہ ایک حکیم و عزیز کی پیدا کی ہوئی دنیا ہے اور یہ لازم ہے کہ ایک دن اس کی حکمت اور اس کا عدل اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو۔

لفظ 'اِطَاعَۃ' یہاں کسی کی بات کا اثر لینے کے مفہوم میں ہے۔ اس مفہوم میں یہ لفظ کلام عرب میں بھی استعمال ہوا ہے اور قرآن میں بھی۔

وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (۹)

مخالفین کی اصل پالیسی

یہ ان مکذبین کی مخالفت کے اصل سبب سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کی یہ ساری تگ و دو اس مقصد سے ہے کہ تم کچھ اپنے رویہ میں لچک پیدا کرو تو یہ بھی نرم پڑ جائیں۔ یعنی تمھاری باتوں کی صداقت میں انھیں شبہ نہیں ہے لیکن ان کو ماننا ان کی خواہشوں کے خلاف ہے اس وجہ سے انھوں نے یہ طوفان اٹھایا ہے کہ تم پر دباؤ ڈال کر تمھیں کچھ نرم کریں تاکہ تم کچھ باتیں ان کی مان لو اور وہ کچھ باتیں تمھاری مان لیں اور اس طرح 'کچھ لو اور کچھ دو' کے اصول پر باہم سمجھوتہ ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ مخالفت اپنے دین جاہلی کے ساتھ کسی اخلاص پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ محض ایک قسم کی (BARGAINING) کی کوشش ہے۔ جب تک انھیں توقع ہے کہ وہ تمھیں دبانے میں کچھ کامیاب ہو جائیں گے ان کی یہ کوشش جاری رہے گی۔ جب یہ توقع ختم ہو جائے گی ان کا حوصلہ پست ہو جائے گا۔

زبان سے متعلق ایک سوال کا جواب

یہاں ایک سوال زبان سے متعلق پیدا ہوتا ہے کہ عربیت کے قاعدے سے تو یہاں 'وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْا' ہونا تھا لیکن ہے 'فَيُدْهِنُوْنَ'۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں اسلوب مختلف اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں در اصل مبتدا محذوف کر دیا گیا ہے۔ یعنی اصل میں 'فَهُمْ يُدْهِنُوْنَ' ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان کی خواہش یہ ہے کہ جب تم کچھ نرم پڑ جاؤ گے تو وہ بھی

اپنے رویہ میں نرمی پیدا کریں گے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ (۱۰)

قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی تصویر

یہ اسی 'فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ' پر عطف کر کے تاکید کے ساتھ پھر تنبیہ فرمائی کہ تم ہر لپاٹیے ذلیل کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی پستی کی تصویر آگے کی چند آیتوں میں کھینچ دی گئی ہے اور مقصود اس سے یہ دکھانا ہے کہ ایک طرف پیغمبر کا وہ بے مثال 'خلق عظیم' ہے جس کا آیت ۴ میں حوالہ ہے اور دوسری طرف قریش کے لیڈروں ——— ابولہب، ولید بن مغیرہ، ابوجہل، اخنس بن شریق ——— وغیرہ کا یہ کردار ہے جو بیان ہو رہا ہے۔ ان دونوں کو سامنے رکھ کر ہر منصف فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے!

یہ بات کہ یہ کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا کردار بیان ہو رہا ہے مختلف پہلوؤں سے واضح ہے۔

اول یہ کہ اس کا عطف 'فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِينَ' پر ہے اور مکذبین سے مراد ظاہر ہے کہ کوئی معیّن شخص نہیں بلکہ موقع و محل دلیل ہے کہ قریش کی پوری قیادت ہے۔

دوسرا یہ کہ لفظ 'کُلّ' بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں زیر بحث کسی معیّن شخص کا کردار نہیں بلکہ جماعت کا کردار ہے۔

تیسرا یہ کہ آگے 'إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ' کے الفاظ آئے ہیں جس میں جمع کی ضمیر 'هُمْ' اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مرجع کوئی فرد نہیں بلکہ جماعت ہے۔

چوتھا یہ کہ یہاں جو کردار بیان ہوا ہے وہ قریش کی پوری قیادت پر تو ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے لیکن ہر بات کسی ایک معیّن شخص پر اگر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو تکلف کرنا پڑے گا۔

اس اصولی بحث کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب الفاظ پر غور فرمائیے۔

'حلاف'

'حَلَّاف' کے معنی بہت زیادہ قسم کھانے والے کے ہیں۔ لفظ 'حلف' جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، اول تو اچھے معنی میں آتا نہیں پھر اس کے ساتھ 'مَهِين' کی صفت بھی لگی ہوئی ہے جس کے معنی ذلیل کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ زیادہ قسم وہی شخص کھائے گا جس کو اپنی عزت نفس کا خیال نہیں ہو گا۔ جو لوگ کردار کے اعتبار سے پست یا مطعون ہوتے ہیں وہ ہمیشہ احساس کہتری کے سبب سے شک میں مبتلا رہتے ہیں کہ مخاطب ان کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ قسم کھا کے اطمینان نہیں دلائیں گے اس وجہ سے وہ بات بات پر قسم کھاتے ہیں۔ چنانچہ منافقین کے متعلق قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ وہ اپنے کردار پر پردہ ڈالے رکھنے کے لیے قسموں کا سہارا لیتے ہیں۔ قریش کے لیڈروں کے پاس نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار پر حرف رکھنے کی گنجائش تھی اور نہ اسلام کے خلاف کوئی

مبنی بر دلیل بات کہنے کی۔ عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے واحد سہارا ان کے پاس یہی تھا کہ قسمیں کھا کھا کے لوگوں کو اطمینان دلائیں کہ العیاذ باللہ آپ شاعر، کاہن، مجنون اور مفتری ہیں۔

هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ (۱۱)

هَمَّاز ‘هَمَّازٍ’ ‘هَمز’ سے مبالغہ ہے جس کے معنی اشارہ باز کے ہیں۔ اشارہ بازی اور پھبتی اس قسم کے لوگوں کا خاص شیوہ ہوتا ہے جو کسی کو دوسروں کی نگاہوں سے گرانے کے درپے ہوں۔ یہ اشارہ بازی حرکات اور چشم و ابرو سے بھی ہوتی ہے، الفاظ اور فقروں سے بھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور غریب مسلمانوں کو قریش کے متکبرین جس قسم کے اشاروں اور فقروں کا ہدف بناتے تھے اس کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں اور ان کی وضاحت ان کے محل میں ہو چکی ہے۔ ‘وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ’ (الھمزۃ - ۱۰۴: ۱) میں اسی کردار کی طرف اشارہ ہے۔ متکبرین کے پاس دلیل کی قوت نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ اسی اوچھے ہتھیار سے حق کو شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس قسم کے تیر تکے حقیقت کی شمشیرِ براں کے مقابل میں کیا کام آ سکتے ہیں!

مَشَّآءٍ بِنَمِيْم ‘مَشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ’۔ ‘نمیمۃ’ اور ‘نمیم’ کے معنی چغلی اور لگانے بجھانے کے ہیں۔ یہ اشارہ ان مفسدین کے جوڑ توڑ کی خصلت کی طرف ہے کہ یہ رات دن جوڑ توڑ میں سرگرم رہتے ہیں اور اس کے ذریعے چغلی کو ذریعہ بناتے ہیں۔ جس کو بھی دوسرے سے کاٹنا اور اپنے سے ملانا چاہا تو اس کے لیے سب سے بڑا حربہ ان کے پاس یہی ہوتا ہے۔

اسی نسخہ سے وہ اسلام کی مخالفت کا کام بھی لے رہے تھے۔ ان کی رات دن یہی کوشش تھی کہ مختلف قسم کی بے بنیاد غلط فہمیاں مسلمانوں میں پھیلا کر ان کے درمیان پھوٹ ڈلوائیں تاکہ اسلام نے ان کے اندر جو اخوت و مودّت پیدا کی ہے وہ مستحکم نہ ہونے پائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں کے دلوں میں بدگمانی پیدا ہو۔

مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ (۱۲)

مناع، معتدی اور اثیم اوپر کی آیات سے واضح ہوا کہ ان کی قیادت کی پوری عمارت جھوٹ، دوسروں کی تحقیر و توہین اور چغلی و نمامی پر قائم ہے۔ اب یہ واضح فرمایا جا رہا ہے کہ یہ نیکی کے کٹر دشمن، اللہ کے حدود کو توڑنے والے، بندوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے اور ان کو دبا بیٹھنے والے ہیں۔

‘مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ’ یوں تو عام ہے کہ وہ ہر نیکی اور بھلائی کی راہ میں ایک بھاری پتھر ہیں لیکن یہاں خاص اشارہ ان کی بخالت کی طرف ہے کہ وہ غربا و مساکین کی امداد میں نہ خود کوڑی خرچ کرنے کا حوصلہ رکھتے اور نہ دوسروں کو خرچ کرتے دیکھ سکتے بلکہ چاہتے ہیں کہ دوسرے بھی انھی کی طرح مارِ گنج بنے بیٹھے رہیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔ قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بخیلوں کے کردار کا یہ پہلو واضح فرمایا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی بخالت کی راہ سجھاتے ہیں تاکہ خود ان کی بخالت کا راز فاش نہ ہو۔

'مُعۡتَدٍ اَثِیۡمٍ' یعنی صرف یہی نہیں کہ نہ خود خرچ کرتے نہ خرچ کرنے دیتے بلکہ وہ دوسروں کے حقوق پر تعدی کرنے والے بھی ہیں اور جو حقوق ان پر عائد ہوتے ہیں ان کو دبا بیٹھنے والے بھی۔ ان دونوں لفظوں کی تحقیق اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ اعتداء میں دوسروں کے حقوق پر دست درازی کا مفہوم پایا جاتا ہے اور 'اثم' میں حق تلفی کا۔

'عُتُلّ'

عُتُلٍّ بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ (۱۳)

'عُتُلٍّ' کے معنی سخت دل اور بے مروّت کے ہیں۔ جو شخص بخیل ہو گا وہ لازماً سنگ دل بھی ہو گا۔ یہ گویا اوپر کے بیان کردہ کردار کا باطنی پہلو ہے۔ انہی لوگوں کے باب میں ارشاد ہوا ہے 'اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ ہ فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ' (الماعون۔ ۱۰۷: ۱-۲) (ذرا دیکھو تو اس کو جو جزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی ہے جو یتیموں کو دھکے دیتا ہے)۔

'زنیم'

'بَعۡدَ ذٰلِکَ زَنِیۡمٍ'۔ 'زنیم' کی وضاحت اہلِ لغت نے یوں کی ہے: الملحق بقوم لیس منھم ولا یحتاجون الیہ (وہ شخص جو کسی قوم کے نسب میں شریک بن بیٹھے درآنحالیکہ نہ وہ ان میں سے ہو اور نہ اہلِ قوم اس کی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہوں) یہ لفظ 'زنمۃ' سے نکلا ہے۔ 'زنمۃ' اس غدود کو کہتے ہیں جو بعض بکریوں کی گردن میں لٹک آتا ہے اور جس کی حیثیت جسم میں ایک بالکل فالتو عضو کی ہوتی ہے۔ روایات میں اخنس بن شریق کے متعلق آیا ہے کہ اصلاً وہ ثقیف میں سے تھا لیکن مدعی تھا کہ وہ زہرہ میں سے ہے۔ اسی طرح ولید بن مغیرہ کے متعلق بھی مشہور ہے کہ وہ قرشی ہونے کا مدعی تھا حالانکہ وہ قریش میں سے نہ تھا۔ جو لوگ اپنے نسب کو حقیر سمجھ کر دوسروں کے نسب میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں وہ شیخی باز قسم کے ہوتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کا زیادہ اعتماد تملّق، چاپلوسی اور قومی حمیّت وحمایت کی جھوٹی نمائش پر ہوتا ہے تاکہ قوم کے اندر ان کا بھرم قائم رہے۔ چنانچہ اس طرح کے کھوٹے قرشی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں، خاص طور پر، پیش پیش تھے۔ وہ اپنی قوم پرستی کا مظاہرہ کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف لوگوں کو اکساتے کہ آپ کی دعوت سے قریش کی وحدت وجمعیّت میں انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ انہی شیخی بازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے فرمایا کہ اور رذائل ان کے اندر جو تھیں وہ تو تھیں ہی مزید براں یہ بھی ہے کہ ان میں کچھ طفیلی بھی ہیں جو اہلِ قوم سے بھی زیادہ قوم کے وفادار ہونے کے مدعی اور اس کی جاہلی روایات کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ کڑوے کریلے تو تھے ہی ستم بالائے ستم یہ ہوا ہے کہ یہ نیم چڑھے بھی ہیں۔ قرآن نے یہ ضرب اس کردار پر لگائی ہے جو اس قسم کے لوگوں کے اندر لازماً پیدا ہو جاتا ہے جو احساسِ کہتری کے مریض اور خود اعتمادی سے محروم ہوتے ہیں۔

اَنۡ کَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ (۱۴)

فاسد کردار کا سبب

یہ سبب بیان ہوا ہے اس بات کا کہ ان کے اندر یہ کردار کیوں پیدا ہوا۔ فرمایا کہ اس وجہ سے پیدا

ہوا کہ یہ مال و اولاد والے ہوئے ۔ یہ فقرہ نہایت بلیغ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ نے ان کو مال و اولاد والا بنایا تو ہونا تو یہ تھا کہ یہ اپنے رب کے شکر گزار، فرمانبردار اور اس کے نازل کیے ہوئے حق کے علمبردار بن کر اٹھتے لیکن یہ اس کے برعکس بالکل ناشکرے اور ناہنجار بن کر اٹھے ۔ قرآن میں یہ حقیقت جگہ جگہ مختلف اسلوبوں سے واضح فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دنیا میں جن کو اپنی نعمتوں سے بہرہ مند فرماتا ہے وہ ان کا امتحان کرتا ہے کہ دیکھے اس کی نعمتیں پا کر وہ اس کے شکر گزار بنتے ہیں یا غرور میں مبتلا ہو کر شیطان کے ساتھی بن جاتے ہیں ۔ اسی امتحان میں اللہ نے ان لوگوں کو ڈالا لیکن یہ بالکل فیل ہو کر رہ گئے اور اللہ کی نعمت ان کے لیے نقمت کا سبب بن گئی ۔

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (۱۵)

غرور و استکبار کی تصویر

یہ اس غرور و استکبار کی تصویر ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہوئے ۔ فرمایا کہ جب ان کو ان قوموں کی سرگزشتیں سنائی جاتی ہیں جو انہی کی طرح غرور و استکبار میں مبتلا ہوئیں اور اس کے نتیجہ میں تباہ کر دی گئیں تو ان سے سبق لینے کے بجائے ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ تو پچھلی قوموں کے فسانے ہیں، ان کو حاضر سے کیا تعلق! مطلب یہ کہ اس قسم کے قصے سنانے والوں کو نہ ہم نبی ماننے کے لیے تیار ہیں اور نہ ان افسانوں سے ہم مرعوب ہی ہونے والے ہیں ۔ اس امر کو کسی کی تصدیق یا تکذیب سے کیا تعلق!

سَنَسِمُهٗ عَلَى الْخُرْطُوْمِ (۱۶)

استکبار کی سزا

یہ ان متکبرین کے غرور و استکبار کی سزا بیان ہوئی ہے جو آخرت میں ان کو ملنے والی ہے ۔ فرمایا کہ جلد وہ وقت آ رہا ہے جب ہم ان کے ناکڑے پر داغ لگائیں گے ۔ 'خرطوم' اصل میں سونڈ کو کہتے ہیں ۔ یہاں یہ متکبرین کی ناکوں کے لیے بطریق استعارہ استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت درحقیقت اپنی ناک ہی اونچی رکھنے کے لیے کر رہے تھے ۔ اگر کسی کے اندر ناک اونچی رکھنے کا ایسا جنون پیدا ہو جائے کہ وہ اس کی خاطر بڑے سے بڑے اور واضح سے واضح حق کو بھی جھٹلانے پر کمربستہ ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ناک صرف ناک نہیں ہے بلکہ اس نے اس کو بڑھا کر اور پھلا کر سونڈ بنا لیا ہے ۔ فرمایا کہ اگر انھوں نے اپنی ناک کو ناکڑا بنا لیا ہے تو بنا لیں، ہم عنقریب ان کے ناکڑے پر ذلت کا داغ لگائیں گے جو سب دیکھیں گے ۔ یہ استکبار اور اس کی سزا کی بہترین تعبیر ہے جس کی بلاغت احاطۂ بیان میں نہیں آ سکتی ۔

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ (۱۷)

قریش کے لیڈروں کے لیے ایک تمثیل

اوپر قریش کے قائدین کا جو کردار بیان ہوا ہے اس کا کھوکھلا پن واضح کرنے کے لیے یہ ان کے سامنے ایک تمثیل بیان فرمائی ہے جس میں ان کو یہ دکھایا ہے کہ اپنے جس اقتدار پر ان کو یہ ناز و اعتماد ہے کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے انذار کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کی بنیاد بالکل ریت پر ہے ۔ اللہ تعالیٰ

جب چاہے گا چشم زدن میں اس کو خاک میں ملا دے گا۔ اس وقت وہ اپنی بدبختی پر سر پیٹیں گے اور توبہ استغفار بھی کریں گے لیکن ان کا سارا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔

'بَلَوْنٰھُمْ' میں ضمیر 'ھُمْ' کا مرجع ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہوں گے جن کا کردار اوپر زیر بحث آیا ہے۔ یہ اس بات کا، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، نہایت واضح قرینہ ہے کہ یہ کردار کسی معیّن شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا ہے۔ اگر کسی ایک شخص کا کردار بیان ہوا ہوتا تو ضمیر جمع کی جگہ واحد کی آتی۔

اسی طرح یہاں زبان کا ایک دوسرا نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ 'اَصْحٰبَ الْجَنَّۃِ' میں لفظ 'اَلْجَنَّۃ' پر الف لام داخل ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص باغ والوں کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمثیلات میں لام تعریف یا 'اَلَّذِیْ' اور 'اَلَّتِیْ' وغیرہ جو آتے ہیں تو اس سے مقصود، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مواقع میں وضاحت کر چکے ہیں، یہ نہیں ہوتا کہ کوئی معیّن ذات مدنظر ہے بلکہ اس سے مقصود صرف صورتِ حال کو مشخص و مصور کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری کے سامنے واقعے کی پوری تصویر آ جائے۔ اس وجہ سے یہاں یمن یا صنعاء کے کسی خاص باغ کے مالکوں کے واقعہ کی جستجو کی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ ہمارے مفسرین نے اٹھائی ہے، بلکہ یہ ایک خاکہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں کے ذہن اور ان کے انجام کی تصویر اس طرح کھینچ دی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے۔

'اِذْ اَقْسَمُوْا لَیَصْرِمُنَّھَا مُصْبِحِیْنَ' یہ اس اعتماد کی طرف اشارہ ہے جو باغ والوں کو اپنی کامیابی پر تھا۔ وہ نہایت مطمئن اور پُرامید تھے کہ ان کا باغ موسموں کے تمام تغیرات سے گزر کر اب اس مرحلہ میں داخل ہو گیا جس میں اس پر کسی آفت کا کوئی اندیشہ نہیں رہا۔ ان کے خیال میں بس اتنا کام باقی رہ گیا تھا کہ کل صبح وہ جائیں اور پھل توڑ کر اپنے گھروں کو لائیں۔ چنانچہ انھوں نے قسم کھا کر یہ ارادہ کیا کہ صبح ہم اس کے پھل ضرور ہی توڑ لیں گے۔

وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ (۱۸)

ایک عام غلط فہمی

عام طور پر لوگوں نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ قسم کھاتے ہوئے انھوں نے 'اِنْ شَآءَ اللّٰہُ' نہیں کہا۔ ان کو اپنی کامیابی اتنی متیقّن نظر آئی کہ یہ وہم بھی نہ گزرا کہ اس میں کوئی رخنہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مطلب پر اگرچہ تمام مفسرین کا اتفاق ہے لیکن میرا دل اس پر نہیں جمتا۔ لفظ 'اِسْتِثْنَآءٌ' کے اندر اگرچہ اس مفہوم کی گنجائش ہے لیکن جس اسلوب میں یہاں بات فرمائی گئی ہے وہ اس کے لیے کچھ موزوں نہیں ہے۔ اگر یہ بات کہنی ہوتی تو 'وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ' کی جگہ 'وَلَمْ یَسْتَثْنُوْا' یا اس سے ملتا جلتا کوئی اور اسلوب ہونا تھا۔ خود لفظ 'اِسْتِثْنَآءٌ' بھی 'اِنْ شَآءَ اللّٰہُ' کہنے کے مفہوم کے لیے کوئی واضح لفظ نہیں ہے۔

اس کا یہ مطلب جہاں بھی لیا جائے گا قرینہ ہی کی مدد سے لیا جائے گا۔ اور یہاں اس کا قرینہ ایسا واضح نہیں ہے کہ اس پر ذہن پوری طرح مطمئن ہو سکے۔

میرے نزدیک یہاں 'وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ' اپنے اصل لغوی مفہوم ہی میں ہے یعنی انھوں نے قسم کھائی کہ کل ہم اپنے باغ کے پھل ضرور ہی توڑ لیں گے اور اس میں سے کچھ بھی چھوڑیں گے نہیں۔ مطلب یہ کہ ہم ان لوگوں کا طریقہ نہیں اختیار کریں گے جو باغ کے پھل توڑتے ہیں تو کچھ غریبوں مسکینوں کے نام پر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ باغوں سے متعلق دین دار اور فیاض لوگوں کے اندر یہ طریقہ قدیم زمانہ سے معروف چلا آرہا ہے کہ جب باغ کے پھل توڑتے تو کچھ حصہ مسکینوں کے حق کے طور پر چھوڑ دیتے۔ انجیلوں میں حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ تعلیم مذکور ہے کہ جب تو اپنے باغ کے پھل توڑے تو کل نہ توڑ لے بلکہ اس کا کچھ حصہ غریبوں اور مسکینوں کے لیے بھی چھوڑ۔ اسی معروف طریقہ کو پیش نظر رکھ کر ان لئیموں نے قسم کھائی کہ ہم ایسا ہرگز کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کو اپنی اسی بات کو مؤکد کرنے کے لیے قسم کھانے کی ضرورت پڑی ورنہ جملہ میں قسم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس تمثیل میں چونکہ قریش کے ان لیڈروں کا کردار نمایاں کیا جا رہا ہے جن کو اوپر 'مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ'، 'عُتُلٍّ' اور 'اَثِيْمٍ' کہا گیا ہے اس وجہ سے باغ والوں کی مذکورہ بالا قسم کا خاص طور پر حوالہ دیا گیا تاکہ دونوں کے کردار کی مشابہت پوری طرح واضح ہو جائے۔ قرآن میں ابولہب اور اس کے ہم مشربوں کی بخالت کی جو تصویر جگہ جگہ کھینچی گئی ہے اس کو بھی یہاں ذہن میں تازہ کر لیجیے۔

فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُوْنَ ٥ فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ (۱۹-۲۰)

یعنی مذکورہ فیصلہ بڑے عزم و جزم اور بڑی تاکید و قسم کے ساتھ کر کے وہ رات میں سوئے لیکن ابھی سوئے ہی پڑے تھے کہ ان کے باغ پر کوئی خدائی گردش ایسی آئی جس نے باغ کا ستھراؤ کر دیا اور وہ بالکل کٹی ہوئی فصل کے مانند ہو کر رہ گیا۔ 'طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ' میں گردش کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف دو حقیقتوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ ایک اس حقیقت کی طرف کہ یہ بالکل بے سان گمان نمودار ہوئی؛ دوسری اس کی بے پناہی کی طرف کہ اس نے چشم زدن میں وہ کرشمہ کر دکھایا کہ ہرا بھرا باغ بے نشان ہو کر رہ گیا۔

'مِّنْ رَّبِّكَ' میں خطاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تسلی کے لیے ہے۔ ابتدائی آیات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ آج تم ان کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہو تو وہ اپنے ظاہری حالات کو بالکل ہموار و سازگار دیکھ کر تمھیں دیوانہ کہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی ہے کہ بھلا ان پر عذاب کدھر سے آجائے گا؟ اس تمثیل میں دکھایا کہ تیرے رب کا عذاب جب آتا ہے تو یوں آتا ہے کہ منصوبہ بندی کرنے والے سارے منصوبے، عہد و قسم کے ساتھ، بنا کے سوتے ہیں

لیکن جب صبح کو اٹھتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

فَتَنَادَوْا مُصْبِحِیْنَ ۝ اَنِ اغْدُوْا عَلٰی حَرْثِکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ (۲۱-۲۲)

یہ لوگ ساری اسکیم بنا کے رات میں سوئے اور صبح اٹھتے ہی تمام شرکا رنے ہانک پکار مچائی کہ پھل توڑنے اور فصل اٹھانی ہے تو سویرے سویرے اپنے کھیتوں پر پہنچو۔ 'حَرْث' اگرچہ کھیتی کے معنی میں آتا ہے لیکن اس سے مراد وہ باغ ہی ہے جس کا ذکر اوپر سے آرہا ہے۔ اس کی وجہ، جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ عرب میں باغوں ہی کے اندر مختلف چیزوں کی کاشت کے لیے قطعات بھی ہوتے تھے اس وجہ سے ان کو باغ (جنت) بھی کہہ سکتے تھے اور کھیتی (حرث) بھی۔

'اِنْ کُنْتُمْ صٰرِمِیْنَ' کے الفاظ شرکاء کو للکارنے اور آمادہ کرنے کے لیے ہیں۔ یعنی یہ کام کرنا ہے تو وقت ضائع نہ کرو۔ فوراً چلو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔

فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ یَتَخَافَتُوْنَ ۝ اَنْ لَّا یَدْخُلَنَّهَا الْیَوْمَ عَلَیْکُمْ مِّسْکِیْنٌ (۲۳-۲۴)

یعنی گھر سے نکلے تو چپکے چپکے ایک دوسرے کو ہوشیار کرتے ہوئے نکلے کہ خیال رکھنا، آج کے دن کوئی فقیر نہ باغ میں گھسنے پائے۔ یہ ان کی اسی خست کی تعبیر دوسرے الفاظ میں ہے جو اوپر 'وَلَا یَسْتَثْنُوْنَ' کے الفاظ سے بیان ہوئی ہے۔

وَّغَدَوْا عَلٰی حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ (۲۵)

لفظ 'حَرْد' کے اندر تیز گامی، جوش، امنگ اور نشاط کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غریبوں اور مسکینوں کے تعاقب سے بچنے کا پورا سامان کر کے وہ بڑے حوصلہ اور پورے اعتماد کے ساتھ باغ کی طرف چلے 'قٰدِرِیْنَ' یعنی ان کے دل اعتماد و حوصلہ سے معمور تھے کہ اب کیا اندیشہ ہے، باغ اپنا ہے اور پھل تیار ہے، اب ہمارے ارمانوں میں کون خلل انداز ہو سکتا ہے! غریبوں، مسکینوں کے ٹوٹ پڑنے کا اندیشہ تھا سو اس کا بھی سدِّ باب کر لیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۝ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ (۲۶-۲۷)

یعنی جب باغ پر نظر پڑی تو گردشِ آسمانی نے اس کا حلیہ اس طرح بگاڑ دیا تھا کہ پہلے وہلہ میں اس کو پہچان نہ سکے۔ خیال ہوا کہ شاید اندھیرے میں کسی اور سمت میں نکل آئے۔ بولے کہ ارے! ہم تو راستہ بھول گئے۔ لیکن پھر اصل حقیقت سامنے آئی کہ راستہ نہیں بھولے ہیں بلکہ باغ ہی اجڑ گیا ہے تب نہایت حسرت کے ساتھ بولے کہ یہ تو ہم بالکل ہی محروم ہو کے رہ گئے! ہم کن ارمانوں اور حوصلوں کے ساتھ گھر سے نکلے لیکن یہاں تو خاک نہیں!

قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّکُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ (۲۸)

'اَوْسَطُھُمْ' سے مراد ان کے اندر کا سب سے زیادہ میانہ رو اور معقول آدمی۔ برے سے برے معاشرے کے اندر بھی بعض سعید روحیں ہوتی ہیں جو لوگوں کو ان کی بے راہ روی پر ٹوکتی رہتی ہیں خواہ غفلت کے متوالے سنیں یا نہ سنیں۔ اسی طرح کا کوئی اللہ کا بندہ ان کے اندر بھی تھا جو وقتاً فوقتاً ان کو یاد دہانی کرتا رہتا تھا کہ اپنے رب سے غافل نہ رہو بلکہ اس کی تسبیح کرتے رہو۔ لفظ 'تَسْبِیْح' ایک جامع کلمہ ہے جو اللہ کی یاد اور اس کی بندگی کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ پہلے تو اس کا وعظ ان سرمستوں پر کارگر نہ ہوا لیکن جب ان کی غفلت کا انجام ان کے سامنے آگیا تب ان کو اندازہ ہوا کہ خدا بھی کوئی چیز ہے اور یہ اللہ کا بندہ غلط نہیں کہتا تھا!

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ (۲۹)

فوراً بولے کہ لاریب ہمارا رب پاک ہے، یہ اس نے ہمارے اوپر کوئی ظلم نہیں کیا بلکہ ہم ہی اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے بنے کہ اپنی کامیابیوں کے نشہ میں اس کی شان کو بھول گئے اور اگر کسی نے ہمیں یاد دلانے کی کوشش کی تو سُنی ان سنی کر دی ــــــ یہ اسی طرح کا اعتراف ہے جس طرح کا اعتراف فرعون نے اس وقت کیا جب وہ اپنی فوجوں سمیت موجوں کی لپیٹ میں آگیا۔ اس طرح کی توبہ بعد از وقت ہونے کے سبب سے بالکل بے سود ہوتی ہے۔

فَاَقْبَلَ بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ یَّتَلَاوَمُوْنَ ۝ قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا طٰغِیْنَ (۳۰-۳۱)

جب انجام سامنے آگیا تو سب ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے۔ کسی نے کسی پر الزام لگایا کہ اس نے صحیح راہ اختیار کرنے نہ دی، کسی نے دوسرے کو مجرم ٹھہرایا کہ اس نے ناصح کی بات سننے نہ دی۔ جو لوگ اپنی عقل سے کام نہیں لیتے وہ اپنی بے عقلی کا انجام دیکھ لینے کے بعد اسی طرح ایک دوسرے کو ملعون کرتے ہیں حالانکہ مجرم سب ہی ہوتے ہیں۔ بس یہ فرق ہوتا ہے کہ کچھ فساد کی راہ کھولتے ہیں اور کچھ آنکھ بند کر کے ان کی پیروی کرتے ہیں۔ بالآخر ان سب کو اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ جرم میں شریک سب ہی ہیں۔

عَسٰی رَبُّنَآ اَنْ یُّبْدِلَنَا خَیْرًا مِّنْھَآ اِنَّآ اِلٰی رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (۳۲)

یعنی ایک دوسرے پر لعن طعن اور اپنی نالائقی کا اعتراف کرنے کے بعد انھوں نے اس توقع کا بھی اظہار کیا کہ اب ہم اپنے رب کی طرف راغب ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ وہ اس باغ کی جگہ اس سے بہتر باغ ہمیں عطا فرمائے گا۔

یہاں قرآن نے ان کی اس توقع پر کوئی تبصرہ نہیں کیا ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ وقت گزر جانے کے بعد جو لوگ توبہ کرتے ہیں ان کی توبہ اللہ تعالیٰ کے ہاں درخورِ اعتنا نہیں ٹھہرتی۔

جس مقصد سے قریش کو یہ تمثیل سنائی گئی ہے بعینہٖ اسی مقصد سے اسی طرح کی ایک تمثیل سورہ کہف

آیات ۳۲-۳۳ میں سنائی گئی ہے۔ بہتر ہوگا کہ اس پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ۖ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۳۳)

تمثیل کے بعد قریش کو تنبیہ

تمثیل سنانے کے بعد یہ قریش کو تنبیہ ہے کہ اللہ کا رسول ان کو جس عذاب سے ڈرا رہا ہے وہ اسی طرح ان پر آ دھمکے گا۔ آج وہ اپنے عیش میں مگن اور خدا کی پکڑ سے بالکل بے فکر ہیں۔ رسول ان کو خطرہ سے آگاہ کر رہا ہے تو اس کو خبطی کہتے ہیں۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی ہے کہ ان پر عذاب کدھر سے آ جائے گا۔ وہ ادھر سے آئے گا جدھر سے اس کے آنے کا گمان بھی نہ ہوگا اور اس وقت ان کا وہی حال ہوگا جو باغ والوں کا ہوا لیکن اس وقت ان کا نالہ و شیون بالکل بے سود ہوگا۔

'کَذٰلِکَ الْعَذَابُ' میں 'عَذَاب' سے اس عذاب کی طرف اشارہ ہے جو سنتِ الٰہی کے مطابق کسی قوم پر اس وقت آیا ہے جب اس نے اپنے رسول کی تکذیب کر دی اور رسول اپنا فرضِ بلاغ ادا کر چکا ہے۔ یہ عذاب، جیسا کہ ہم جگہ جگہ وضاحت کر چکے ہیں اس قوم کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اس کو عذاب آخرت سے سابقہ پیش آئے گا جو اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ اللہ کے رسولوں نے اپنی قوموں کو ان دونوں ہی عذابوں سے ڈرایا ہے۔

'لَوْ کَانُوْا یَعْلَمُوْنَ' اظہارِ حسرت و افسوس کا جملہ ہے کہ عقل کے ان اندھوں کو آخرت بہت بعید از قیاس چیز معلوم ہوتی ہے حالانکہ وہ ایک حقیقت اور اس کا عذاب بڑا ہی ہولناک ہے۔ بشرطیکہ یہ جانیں اور سمجھیں۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ (۳۴)

نیکوکاروں کا انجام

متکبرین کا انجام بیان کر چکنے کے بعد یہ اللہ سے ڈرتے رہنے والوں کا انجام بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جن لوگوں نے اس دنیا میں آخرت کے حساب کتاب سے ڈرتے ہوئے زندگی گزاری ان کے لیے ان کے رب کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔ یہ 'مُتَّقِیْن' کا ذکر ان متکبرین کے مقابل میں ہوا ہے جو اپنی دنیوی کامیابیوں کے نشہ میں خدا کی پکڑ اور آخرت کے عذاب سے بالکل بے فکر تھے۔ اس تقابل سے اس لفظ کے اصل مفہوم پر روشنی پڑتی ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو اس دنیا کی ظاہر فریبیوں میں گم نہیں ہوتے ہیں بلکہ اس کے پس پردہ جو حقیقت ہے اس پر بھی ان کی نظر ہے۔

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ (۳۵)

نیک و بد میں امتیاز عدلِ الٰہی کا لازمی تقاضا ہے

یہ دلیل بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں خدا سے ڈرنے والوں کے لیے نعمت کے باغ ہوں گے۔ فرمایا کہ ایسا ہونا خدا کے عدل اور اس کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ ایسا نہ ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس دنیا کے خالق کے نزدیک نیکوکار اور بدکار، وفادار اور غدار، بے ایمان اور ایمان دار دونوں

یکساں ہیں۔ یہ بات بالبداہت اللہ تعالیٰ کی اعلیٰ صفات کے منافی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ اس کی نظر میں نیک اور بد دونوں برابر ہوں۔

مَا لَكُمْ تف كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۶)

جزاء اور سزا کا انکار انسان کی فطرت اور عقل کے خلاف ہے

یہاں متکبرین سے باندازِ تعجب سوال ہے کہ تمھیں کیا ہوگیا ہے، تمھاری عقل کہاں کھوئی گئی ہے کہ تم اس قسم کے فیصلے کرنے لگے ہو! مطلب یہ ہے کہ اگر تم آخرت اور جزا و سزا نہیں مانتے، تمھارے نزدیک زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے، یہ یونہی چلتی رہے گی یا یونہی ایک دن تمام ہو جائے گی تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اس کے خالق کو عدل اور رحم کی صفات سے عاری سمجھتے ہو جس کو اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ کس نے نیکی کی زندگی گزاری اور کس نے بدی کی۔ اگر تمھارا فیصلہ یہ ہے تو سوچو کہ یہ فیصلہ عقل اور فطرت سے کتنا بعید ہے! یہ کتنی بڑی تہمت ہے جو اس کائنات کے خالق پر، جس کی قدرت، حکمت، ربوبیت اور رحمت کی شہادت اس کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے، تم لگا رہے ہو!

قرآن کے اس اندازِ سوال سے یہ بات صاف نمایاں ہے کہ انسان کی عام عقل اور اس کی عام فطرت اس فیصلہ کو قبول کرنے سے ابا کرتی ہے۔ اگر کچھ لوگ یہ فیصلہ کرتے ہیں تو یہ چیز دو شکلوں سے خالی نہیں۔ یا تو وہ محض اپنی خواہشوں سے بے بس ہو کر اپنی عقل کی آنکھوں میں دھول جھونکتے اور اپنی فطرت کو جھٹلاتے ہیں یا یہ کہ انھوں نے اپنی یہ دونوں صلاحیتیں بالکل برباد کر لی ہیں۔

اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝ اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ (۳۷-۳۸)

متکبرین کے ایک مغالطہ پر ضرب

یہ قریش کے ان متکبرین کی ایک اور آرزوئے باطل پر ضرب لگائی ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ آخرت واخرت اول تو کوئی چیز ہے نہیں اور ہے تو ہمیں جو کچھ یہاں حاصل ہے اس سے بہتر وہاں حاصل ہوگا۔ ان کے اس مغالطہ کی بنیاد اس واہمہ پر تھی کہ اگر وہ خدا کے منظورِ نظر نہ ہوتے تو یہ عزت و سیادت انھیں اس دنیا میں کس طرح حاصل ہوتی! تو جب خدا کے منظورِ نظر ہوئے تو جو کچھ انھیں یہاں حاصل ہے اس سے بڑھ کر وہاں حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ تم کو اس مغالطہ میں کس چیز نے ڈالا؟ کیا تمھارے پاس خدا کا اتارا ہوا کوئی صحیفہ ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ تمھاری ساری آرزوئیں پوری ہوں گی؟ مطلب یہ ہے کہ جس کی آرزوئیں تم نے اپنے دلوں میں پال رکھی ہیں عقل و فطرت کے اندر تو ان کی کوئی بنیاد ہے نہیں، ہاں اگر کوئی آسمانی صحیفہ تمھارے پاس ہے جس میں یہ باتیں لکھی ہوئی ہیں تو اس کو پیش کرو۔

اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۙ اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ (۳۹)

فرمایا کہ کیا خدا نے تم سے قیامت تک کے لیے عہد کر رکھا ہے کہ جو تم چاہو گے تمھارے ساتھ وہی معاملہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس قسم کے کسی عہد کی نشان دہی تم نہیں کر سکتے تو آخر وہ کیا چیز ہے جس کے بل پر تمھیں ناز ہے کہ نہ دنیا میں تمھیں کوئی ہلا سکتا اور نہ آخرت میں تم پر کوئی مسئولیت ہے!

یہ امر یہاں واضح رہے کہ قوموں سے اللہ تعالیٰ نے آخرت کی فوز و فلاح کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ ایمان اور عمل صالح اور اس عہد کی پابندی کے ساتھ مشروط ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے واسطہ سے لوگوں سے لیے ہیں۔ کسی قوم سے بھی اس نے کوئی ایسا عہد نہیں کیا ہے جو بالکل غیر مشروط طور پر قیامت تک کے لیے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذریت کی دونوں شاخوں سے اللہ تعالیٰ نے امامت و پیشوائی کا جو عہد کیا وہ تورات میں بھی مذکور ہوا ہے اور قرآن میں بھی۔ اس میں بالکل واضح طور پر تشریح ہے کہ یہ عہد ان لوگوں سے متعلق نہیں ہے جو خدا کے عہد کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قوموں کی امامت پر سرفراز فرمانے کی بشارت دی کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (البقرۃ - ۲ : ۱۲۴) (میں تم کو لوگوں کا ایک عظیم امام بنانے والا ہوں) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سوال کیا کہ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (کیا یہ وعدہ میری ذریت سے متعلق بھی ہے؟) اللہ تعالیٰ نے اس کا فوراً جواب دیا کہ لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو تمہاری ذریت میں سے میرے عہد کو توڑ کر اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں گے) اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ ظاہر ہے کہ جس طرح بنی اسرائیل سے متعلق ہے اسی طرح بنی اسماعیل سے بھی متعلق ہے۔ لیکن قریش نے بھی اولادِ ابراہیم و اسماعیل (علیہما السلام) ہونے کے زعم میں عنداللہ ہر مسئولیت سے اپنے کو بری سمجھ لیا اور بنی اسرائیل نے بھی نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ (المآئدۃ - ۵ : ۱۸) کے غرور میں مبتلا ہو کر یہ گمان کر لیا کہ وہ آخرت کی ہر مسئولیت سے بالاتر ہیں۔

سَلْھُمْ اَیُّھُمْ بِذٰلِکَ زَعِیْمٌ ﴿۴۰﴾ اَمْ لَھُمْ شُرَکَآءُ ج فَلْیَاْتُوْا بِشُرَکَآئِھِمْ اِنْ کَانُوْا صٰدِقِیْنَ (۴۰-۴۱)

فرمایا کہ ان سے پوچھو کہ ان میں سے کون اس بات کا ضامن بنتا ہے کہ ان کے لیے خدا نے نجات و فلاح کا غیر مشروط ابدی پروانہ جاری کر رکھا ہے؟ اگر ان کے کچھ شرکاء ہیں جن کی نسبت ان کا گمان ہے کہ وہ ان کے اوپر خدا کو ہاتھ ڈالنے نہ دیں گے تو ان کو پیش کریں اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں۔ یعنی ان کو دکھائیں ورنہ کم از کم ان کے نام ہی لیں تاکہ دوسروں کو بھی ان کی حیثیت و حقیقت کا کچھ اندازہ ہو ــــــ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ مشرکین کو اپنے جن معبودوں پر ناز تھا کہ وہ خدا کے بڑے چہیتے ہیں وہ ان کو اس کی پکڑ سے بچا لیں گے ان کی بے حقیقتی قرآن نے ہر پہلو سے اس طرح واضح کر دی ہے کہ اس چیلنج کے جواب میں وہ ان میں سے کسی کا نام لینے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔

یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَّیُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ﴿۴۲﴾ خَاشِعَۃً اَبْصَارُھُمْ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ ط وَقَدْ کَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ وَھُمْ سٰلِمُوْنَ (۴۲-۴۳)

کشفِ ساق کا مفہوم

کشفِ ساق شدتِ امر کی تعبیر کے لیے عربی زبان کا معروف محاورہ ہے۔ شعرائے جاہلیت

نے مختلف طریقوں سے اس کو استعمال کیا ہے۔ حاتم کا مشہور شعر ہے۔

اخو الحرب ان عضت به الحرب عضها وان شمرت عن ساقها الحرب شمرا

(ممدوح جنگ کا مردِ میدان ہے۔ اگر جنگ اس پر حملہ آور ہوتی ہے تو وہ بھی اس سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اور اگر گھمسان کا رن پڑتا ہے تو وہ بھی اس میں بے خطر کود پڑتا ہے)

اس شعر میں گھمسان کے رن کے لیے 'شمرت عن ساقها الحرب' کا محاورہ استعمال کیا ہے۔

شدت امر کی تعبیر کے لیے اس محاورے کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب کوئی بڑی ہلچل برپا ہوتی ہے تو اس وقت کنواریاں اور شریف زادیاں بھی اپنے پائنچے اٹھا کر بھاگنے پر مجبور ہوتی ہیں جس سے ان کی پنڈلیاں اور ان کے پاؤں کے زیورات کھل جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے:

تذهل الشيخ عن بنيه وتبدي عن خدام العقيلة العذراء

(ایسی ہلچل جو بوڑھوں کو ان کی اولاد سے غافل کر دے گی اور کنواریوں کی پنڈلیوں اور ان کی پازیبوں کو بے نقاب کر دے گی)

مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ تو یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں کہ جس عیش میں یہ یہاں ہیں اسی عیش میں وہاں بھی رہیں گے لیکن وہ دن بڑی ہلچل کا ہوگا۔ آج تو ان کو خدا کے آگے سر بسجود ہونے کی دعوت دی جاتی ہے تو اکڑتے ہیں لیکن اس دن سجدے کو کہا جائے گا تو سجدہ کے لیے جھکنا چاہیں گے لیکن ان کی کمریں اس طرح تختہ بن جائیں گی کہ کوشش کے باوجود نہیں جھک سکیں گے۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان کے اوپر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ ان کا پورا سراپا ان کی ذلت اور بے بسی کی گواہی دے رہا ہوگا۔

سجدہ کا یہ حکم ظاہر ہے کہ محض اتمامِ حجت اور رسوا کرنے کے لیے دیا جائے گا کہ ان کی سرکشی اور ان کی محرومی پر خود ان کا وجود ایسی گواہی ثبت کر دے جس کا وہ انکار نہ کر سکیں۔

بعینہٖ یہی مضمون سورۂ معارج میں بدیں الفاظ بیان ہوا ہے۔

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلَىٰ نُصُبٍ يُوفِضُونَ ۝ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۚ ذَٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِي كَانُوا يُوعَدُونَ ۝

جس دن کہ وہ قبروں سے نکلیں گے تیزی سے، گویا کہ وہ نشانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔ یہ وہ دن ہوگا جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔

(المعارج - ۷۰: ۴۳-۴۴)

وہی مضمون جو سورۂ قلم میں 'يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے اس آیت میں 'يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا' کے الفاظ سے بیان ہوا ہے، اس طرح لغت اور نظیرِ قرآن دونوں سے اسی مطلب کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے لیا ہے۔

بعض لوگوں نے ایک روایت کی بنا پر اس کے معنی یہ بھی لیے ہیں کہ جس دن اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی کھولے گا، لیکن متعدد ائمۂ تفسیر سے وہی تاویل منقول ہوئی ہے جو ہم نے اختیار کی ہے۔ عکرمہؓ اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ھُوَ یَومُ القیٰمۃ یوم کرب و شدۃ (اس سے مراد قیامت کا دن ہے جو کرب و شدت کا دن ہوگا)۔ ابن جریرؒ نے ابن مسعودؓ یا ابن عباسؓ کے حوالہ سے کسی شاعر کا قول بھی مذکورہ معنی کی تائید میں نقل کیا ہے جس نے 'شالت الحرب عن ساق' کا محاورہ استعمال کیا ہے۔ مشہور امام تفسیر مجاہدؒ نے بھی اس کو شدتِ امر ہی کے مفہوم میں لیا ہے۔

فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّکَذِّبُ بِھٰذَا الْحَدِیْثِ ط سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۴۴)

مکذبین کو دھمکی

یہاں مکذبینِ قرآن کو دھمکی ہے جن کا ذکر آیت ۱۵ میں گزر چکا ہے کہ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْہِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ (جب ان کو ہماری آیتیں سنائی جاتی ہیں کہتے ہیں یہ اگلوں کے فسانے ہیں) ان کو دھمکی کے ساتھ ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اس میں بہت بڑی تسلی بھی ہے۔ آپ کو خطاب کر کے فرمایا کہ اب ان مکذبینِ قرآن کا معاملہ مجھ پر چھوڑو۔ تمہارے اوپر بلاغ کی جو ذمہ داری تھی وہ تم ادا کر چکے۔ اب تم بیچ سے ہٹو اور مجھے تنہا ان سے نمٹ لینے دو۔ میں درجہ بدرجہ ان کو وہاں سے ہلاکت کے کھڈ میں لے جاؤں گا جہاں سے ان کو علم بھی نہ ہوگا۔ اس وقت ان کو جو ڈھیل دے رہا ہوں اس کو وہ اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں حالانکہ وہ موت کے پھندے میں آئے ہوئے ہیں۔

وَاُمْلِیْ لَھُمْ ط اِنَّ کَیْدِیْ مَتِیْنٌ (۴۵)

یعنی میں اس استدراج کے دوران ان کو اس لیے ڈھیل دے رہا ہوں کہ یہ اپنی جولانیاں دکھا لیں اور اپنا زور صرف کر لیں۔ ان کی رسی دراز کرنے میں یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ میرے قابو سے باہر نکل جائیں گے۔ میری تدبیر نہایت ہی محکم ہوتی ہے۔

اَمْ تَسْئَلُھُمْ اَجْرًا فَھُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ (۴۶)

مکذبین کو ان کی محرومی پر ملامت

یہ قرآن سے ان لوگوں کے فرار پر تعجب کا اظہار بھی ہے اور ان کو ملامت بھی۔ مطلب یہ ہے کہ آخر یہ لوگ تمہاری بات سنتے کیوں نہیں؟ سننے میں ان کا کیا حرج ہوتا ہے؟ تم ان سے سنانے کا کوئی معاوضہ تو مانگ نہیں رہے ہو کہ یہ اس کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہوں؟ اس میں ضمناً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بھی ہے کہ اگر یہ نہیں سن رہے ہیں تو اس کا غم نہ کرو۔ اگر یہ اس نعمت سے بھاگ رہے ہیں تو اس میں انہی کی محرومی ہے۔ تم اپنے رب کے ہاں سرخرو ہو کہ یہ دولتِ آسمانی مفت لٹا رہے ہو۔

اَمْ عِنْدَھُمُ الْغَیْبُ فَھُمْ یَکْتُبُوْنَ (۴۷)

یہ بھی ان لوگوں کی اس بے پروائی اور بے نیازی پر اظہارِ تعجب ہے کہ آخر یہ کس بل بوتے پر اس انذار کو اس بے نیازی سے نظر انداز کر رہے ہیں! کیا ان کے پاس علمِ غیب ہے جو وہ لکھ

رہے ہیں کہ آخرت میں (اگر وہ ہوئی) ان کے لیے نہایت اعلیٰ مدارج ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ بغیر کسی دلیل اور سند کے محض خواہشوں کی مدد سے اپنے لیے خیالی جنت آراستہ کر لینا اور زندگی کے حقائق سے آنکھیں بند کر لینا دانشمندی نہیں بلکہ اپنے لیے ابدی ہلاکت کا سامان کرنا ہے۔

یہ آیت سورۂ طور میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے سیاق و سباق کی روشنی میں ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ سورۂ نجم میں یہ جس سیاق و سباق کے ساتھ آئی ہے اس سے اس کا پورا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہے:

أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ ۝	کیا اس کے پاس علم غیب ہے پس وہ دیکھ رہا ہے
أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ	(آخرت میں اپنے مدارج کو)؟ کیا موسیٰ کے صحیفوں میں
مُوسَىٰ ۝ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي	جو باتیں بتائی گئی ہے اس کی خبر اس کو نہیں ملی؟ اور
وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ	اس ابراہیم کی تعلیمات میں بھی جس نے اپنے رب کے
وِزْرَ أُخْرَىٰ ۝	ہر حکم کو پورا کیا؟ کہ کوئی جان بھی کسی بھی دوسری جان کا
(النجم-۵۳: ۳۵-۳۸)	بوجھ اٹھانے والی نہیں بنے گی۔

فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ (۴۸)

نبی صلعم کو اپنی دعوت پر جمے رہنے کی تلقین

'فَاصْبِرْ' یہاں 'انتظر' کے مفہوم پر متضمن ہے اس وجہ سے اس کے بعد 'ل' کا صلہ آیا ہے۔ یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و ثبات کی تلقین کے ساتھ تسلی دی جا رہی ہے کہ تم ثابت قدم رہو اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو اور اس طرح کی جلد بازی سے بچو جو مچھلی والے (حضرت یونسؑ) سے صادر ہو گئی۔

'مچھلی والے' سے اشارہ ظاہر ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی طرف ہے۔ اس لقب سے ان کو ملقب کرنے میں ایک قسم کا پیار بھی ہے اور اس آزمائش کی طرف اشارہ بھی جو آنجناب کو پیش آئی۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ کی پوری تفصیل اس کے محل میں ہم پیش کر چکے ہیں کہ ان کی قوم نے ان کی دعوت کی جو ناقدری کی تو حق کی اس توہین سے وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر قوم کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس پر ان کو عتاب ہوا جس کے نتیجہ میں ان کو مچھلی والا امتحان پیش آیا۔ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقین فرمائی گئی ہے کہ ہر چند تمھاری قوم بھی دعوت کی ناقدری اور تمھاری تکذیب پر مصر ہے لیکن تم میدان میں ڈٹے رہو اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کرو۔ جب تک تمھارے رب کا حکم نہ ہو اپنی جگہ چھوڑنے کی غلطی نہ کرنا۔ مبادا تمھیں بھی اسی طرح کا کوئی امتحان پیش آجائے جس طرح کا امتحان حضرت یونس علیہ السلام کو پیش آگیا۔

'إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ' یہ اجمالاً اس رویّہ کی طرف اشارہ ہے جو امتحان کے بعد حضرت یونسؑ

نے امتیار فرمایا۔ وہ فوراً ہی اپنی غلطی پر متنبہ ہوئے اور نہایت شدید قسم کے غم سے گھٹے ہوئے انھوں نے مچھلی کے پیٹ کے اندر اپنے رب سے فریاد کی۔ یہ فریاد جن زندۂ جاوید الفاظ میں انھوں نے کی وہ دوسرے مقام میں نقل ہوئے ہیں اور ان کی بلاغت ہم واضح کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بطور بدرقہ ارشاد ہوئی ہے۔ تاکہ 'لَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ' کے الفاظ سے حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق کوئی غلط فہمی نہ ہو بلکہ یہ واضح ہو جائے کہ اگرچہ شدتِ تاثر سے مغلوب ہو کر ان سے ایک غلطی صادر ہو گئی لیکن فوراً ہی توبہ سے انھوں نے اس کی اصلاح کر لی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو پھر برگزیدگی سے نوازا، جیسا کہ آگے تفصیل آ رہی ہے۔

لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ۝ فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۴۹-۵۰)

'نِعْمَةٌ' سے یہاں مراد اللہ تعالیٰ کا وہ فضل ہے جو توبہ کے بعد ان کو قبولیتِ توبہ اور ازسرِ نو فریضۂ رسالت پر ماموریت کی شکل میں حاصل ہوا۔ فرمایا کہ اگر ان پر اللہ کا یہ فضل نہ ہوا ہوتا تو جس ریت پر مچھلی نے ان کو ڈالا تھا اسی پر نہایت مذموم حالت میں وہ پڑے ہی رہ جاتے لیکن اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی، ان کو اپنی رحمت سے نوازا، ان کو ان کے مقدس مشن کی تکمیل کے لیے ازسرِ نو برگزیدہ کیا اور زمرۂ صالحین میں شامل فرمایا۔ یعنی اس دنیا سے وہ ناکام و نامراد نہیں گئے بلکہ بامرادوں کے زمرہ ـــ صالحین ـــ میں وہ شامل ہوئے۔

وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ (۵۱)

اس آیت کا تعلق بھی تلقینِ صبر و ثبات کے اس مضمون ہی سے ہے جو 'فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ' میں بیان ہوا ہے۔ یعنی اگرچہ حالات نہایت سخت ہیں۔ کفار جب قرآن سنتے ہیں تو تمھیں اس طرح گھورتے اور ایسی تیز نگاہوں سے دیکھتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمھیں دھکیل کر تمھارے مقام سے تمھیں پھسلا دیں گے اور جوشِ غضب میں تمھیں خبطی اور مجنون بتاتے ہیں لیکن ان کے اس رویہ کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ یہاں ابتدائے سورہ کی آیت 'مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ' ذہن میں تازہ کر لیجیے۔ سورہ جس مضمون سے شروع ہوئی تھی اسی پر ختم ہو رہی ہے۔

وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ (۵۲)

یعنی اگر اس بات کو سن کر یہ تمھیں دیوانہ کہتے ہیں تو کہیں، لیکن یہ یاد رکھیں کہ یہ کسی دیوانے

۱؎ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ڰ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانبیآء - ۲۱ : ۸۷)

کی بڑ نہیں بلکہ دنیا والوں کے لیے یاد دہانی ہے۔ اس یاد دہانی سے انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا تو پچھتائیں گے لیکن یہ پچھتانا بے سود ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا فضل و احسان ہے کہ ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علیٰ احسانہ۔

رحمان آباد
۳۰۔ جولائی ۱۹۷۸ء
۲۳۔ شعبان ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۶۹

الحآقّة

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور نظام

اس سورہ پر تدبر کی نظر ڈالیے تو اس میں اور سابق گروپ کی سورۂ واقعہ میں مختلف پہلوؤں سے بڑی گہری مشابہت نظر آئے گی، مثلاً

—— دونوں میں قیامت کا اثبات اور اس کے ہول کی تصویر ہے۔

—— دونوں میں اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کے انجام کی تفصیل ہے۔

—— دونوں میں قرآن مجید کی صداقت و حقانیت پر قسم کھائی گئی ہے۔

سابق سورہ —— القلم —— سے بھی اس کو بڑی گہری مناسبت ہے۔ اس کا عمود وہی ہے جو سابق سورہ کا ہے یعنی اثباتِ عذاب و قیامت۔ البتہ نہجِ استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ قرآن کی عظمت و صداقت جس طرح سابق سورہ میں واضح کی گئی ہے اور اس کی تکذیب کے نتائج سے ڈرایا گیا ہے اسی طرح اس سورہ میں بھی یہی مضمون زیرِ بحث آیا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ میں یہ مضمون تمہید کی حیثیت سے ہے اور اس سورہ میں خاتمہ کے طور پر اور تذکیر و تعلیم کے پہلو سے ان دونوں اسلوبوں کی اہمیت الگ الگ ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱ - ۱۲) تکذیبِ رسول کے نتیجہ میں عذاب اور قیامت کے شدنی اور اٹل ہونے پر رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ کی گواہی۔

(۱۳ - ۱۸) ہولِ قیامت کی تصویر۔

(۱۹ - ۳۷) اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کے انجام کی تفصیل۔

(۳۸ - ۵۲) قرآن کی عظمت و صداقت کا بیان کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہے بلکہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ جو لوگ اس کے انذار کی تکذیب کر رہے ہیں وہ اس کا انجام دور تک سوچ لیں۔

سُورَةُ الْحَاقَّةِ (۶۹)

مَكِّيَّةٌ ——— اٰیات: ۵۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَاقَّةُ ﴿۱﴾ مَا الْحَاقَّةُ ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاقَّةُ ﴿۳﴾ آیات ۱ - ۵۲
كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا
بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ
عَاتِيَةٍ ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ
حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ
خَاوِيَةٍ ﴿۷﴾ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾ وَجَآءَ
فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ﴿۹﴾
فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾ اِنَّا لَمَّا
طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِى الْجَارِيَةِ ﴿۱۱﴾ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً
وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾ فَاِذَا نُفِخَ فِى الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ﴿۱۳﴾
وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ﴿۱۴﴾
فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿۱۵﴾ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِىَ يَوْمَئِذٍ
وَّاهِيَةٌ ﴿۱۶﴾ وَّالْمَلَكُ عَلٰٓى اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ
فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمٰنِيَةٌ ﴿۱۷﴾ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى

مِنْكُمْ خَافِیَةٌ ﴿۱۸﴾ فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ
هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ﴿۱۹﴾ ج اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْ ﴿۲۰﴾ ج
فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ رَّاضِیَةٍ ﴿۲۱﴾ ۙ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ ﴿۲۲﴾ ۙ قُطُوْفُهَا
دَانِیَةٌ ﴿۲۳﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِی الْاَیَّامِ
الْخَالِیَةِ ﴿۲۴﴾ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَیَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ
لَمْ اُوْتَ كِتٰبِیَهْ ﴿۲۵﴾ ج وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِیَهْ ﴿۲۶﴾ ج یٰلَیْتَهَا كَانَتِ
الْقَاضِیَةَ ﴿۲۷﴾ ج مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ﴿۲۸﴾ ج هَلَكَ عَنِّیْ
سُلْطٰنِیَهْ ﴿۲۹﴾ ج خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾ ۙ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾ ۙ
ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾ ط
اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ﴿۳۳﴾ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ
الْمِسْكِیْنِ ﴿۳۴﴾ ط فَلَیْسَ لَهُ الْیَوْمَ هٰهُنَا حَمِیْمٌ ﴿۳۵﴾ ۙ وَّلَا طَعَامٌ
اِلَّا مِنْ غِسْلِیْنٍ ﴿۳۶﴾ ۙ لَّا یَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾ ع فَلَآ اُقْسِمُ ع ۱ ۳۷ ۵
بِمَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۸﴾ ۙ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۳۹﴾ ۙ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ
كَرِیْمٍ ﴿۴۰﴾ ج وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِیْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴿۴۱﴾ ۙ
وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۴۲﴾ ط تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِیْنَ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ﴿۴۴﴾ ۙ لَاَخَذْنَا
مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ﴿۴۵﴾ ۙ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ ﴿۴۶﴾ ۖ فَمَا
مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ ﴿۴۷﴾ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ

لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۸﴾ وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾ وَإِنَّهُ
لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۵۰﴾ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿۵۱﴾ فَسَبِّحْ
ع ۱۵/۶
بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿۵۲﴾

ترجمۂ آیات ۱-۵۲

شُدنی! کیا ہے شُدنی! کیا جانو کہ کیا ہے شُدنی! ۱-۳

ثمود اور عاد نے اس کھٹکھٹانے والی کو جھٹلایا۔ تو ثمود ایک حد سے بڑھ جانے والی آفت سے ہلاک کر دیے گئے۔ رہے عاد تو وہ ایک بے قابو بادِ تُند سے برباد ہوئے۔ اس کو اللہ نے سات رات اور آٹھ دن ان کی بیخ کنی کے لیے ان پر مسلّط رکھا۔ تم دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھاڑے پڑے ہیں گویا کہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں۔ تو کیا تم دیکھتے ہو ان میں سے کوئی بچ رہنے والا! ۴-۸

اور فرعون اور اس سے پہلے والوں اور الٹی ہوئی بستیوں والوں نے بھی اسی جرم کا ارتکاب کیا۔ انھوں نے اپنے رب کے رسولوں کی نافرمانی کی تو اس نے ان کو اپنی سخت گرفت میں دبوچ لیا۔ ۹-۱۰

اور جب پانی حد سے گزر گیا تو ہم ہی نے تم کو کشتی میں سوار کرایا تاکہ ہم اس واقعہ کو تمھارے لیے ایک درسِ موعظت بنائیں اور یاد رکھنے والے کان اس کو سنیں اور محفوظ رکھیں۔ ۱۱-۱۲

پس یاد رکھو جب کہ صُور میں ایک ہی بار پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی بار میں پاش پاش کر دیا جائے گا تو اس دن واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی اور آسمان پھٹ جائے گا اور اس دن وہ نہایت پھُس پھُسا

ہوگا۔ اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تیرے رب کے عرش کو اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوں گے۔ اس دن تمھاری پیشی ہوگی۔ تمھاری کوئی بات بھی ڈھکی چھپی نہیں رہے گی۔ ۱۳-۱۸

پس جس کو دیا جائے گا اس کا اعمال نامہ اس کے دہنے ہاتھ میں تو وہ کہے گا، پڑھو میرا اعمالنامہ! میں نے گمان رکھا کہ مجھے اپنے حساب سے دوچار ہونا ہے۔ پس وہ تو ایک دل پسند عیش میں ہوگا، ایک بلند و بالا باغ میں۔ اس کے پھل قریب لٹک رہے ہوں گے۔ کھاؤ اور پیو، بے غلّ و غش، اپنے ان اعمال کے صلے میں جو تم نے گزرے دنوں میں کیے۔ ۱۹-۲۴

رہا وہ جس کو اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا، کاش میرا اعمال نامہ مجھے دیا ہی نہ گیا ہوتا اور میں جانتا ہی نہ کہ میرا حساب کیا ہے! اے کاش کہ وہی موت فیصلہ کن ہوئی ہوتی! میرا مال میرے کیا کام آیا! میرا اقتدار مجھ سے چھن گیا! ــــ اس کو پکڑو، پھر اس کی گردن میں طوق ڈالو، پھر اس کو جہنم میں جھونک دو۔ پھر ایک زنجیر میں، جس کی پیمائش ستر ہاتھ ہے، اس کو جکڑ دو ــــ یہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور نہ مسکینوں کو کھلانے پر لوگوں کو ابھارتا تھا۔ پس آج اس کا یہاں کوئی ہمدرد نہیں اور غُسالہ کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا نہیں ہے۔ یہ کھانا صرف گنہگار ہی کھائیں گے۔ ۲۵-۳۷

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے اور یہ کسی شاعر

کا کلام نہیں، تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو! اور یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں، تم بہت ہی کم سمجھتے ہو۔ یہ خداوندِ عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ اور اگر یہ ہم پر کوئی بات گھڑ کر لگاتا تو ہم اس کو قوی بازو سے پکڑتے پھر ہم اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیتے پس تم میں سے کوئی بھی اس سے ہم کو روکنے والا نہ بن سکتا۔ اور یہ تو ایک یاددہانی ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لیے۔ اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں اس کے جھٹلانے والے بھی ہیں۔ اور یہ کافروں کے لیے موجبِ حسرت ہوگا اور بے شک یہ ایک حقِ یقینی ہے تو تم اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ ۳۸-۵۲

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ (۱-۳)

'الحاقۃ' کا مفہوم

'اَلْحَآقَّةُ' کے معنی ہیں وہ بات جو شُدنی ہو، جس کا وقوع عقلاً و اخلاقاً لازم ہو، جو بالکل اٹل اور قطعی ہو۔ یہ ایک ہی لفظ جملے کے قائم مقام ہے۔ جن لوگوں نے 'مَا الْحَآقَّةُ' کو اس کی خبر قرار دیا ہے ان کی رائے صحیح نہیں ہے۔ یہ اسلوبِ بیان اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب، خاص طور پر غافل مخاطب کو ہڑبڑا دینا مقصود ہو۔ ایسی صورت میں صرف مبتدا کا ذکر کافی ہوتا ہے، خبر کی ضرورت نہیں ہوتی تاکہ مخاطب کی پوری توجہ مبتدا ہی پر مرکوز ہو جائے۔ اس طرح جملہ میں جو ابہام پیدا ہوتا ہے وہ مخاطب کی توجہ جذب کرنے کا باعث بنتا ہے۔

'اَلْحَآقَّةُ' قیامت کے ناموں میں سے ہے۔ یہ نام اس کے شُدنی اور واقعی ہونے کو بھی ظاہر کرتا ہے اور عقلاً اور اخلاقاً اس کے واجب ہونے کو بھی۔ اس کے ان دونوں پہلوؤں کے دلائل کی تفصیل پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہے، بعض اشارات اس سورہ میں بھی ہیں اور آگے کی سورتوں میں بھی اس کے نہایت اہم پہلو واضح ہوں گے۔

اصلاً تو اس سے مراد قیامت ہی ہے لیکن ضمناً اس میں وہ عذاب بھی شامل ہے جو رسول کی تکذیب کی صورت میں لازماً اس کی قوم پر آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عذاب قیامت کی تمہید

بھی ہوتا ہے اور اس کی تصدیق بھی اور آتا بھی ہے در حقیقت قیامت کی تکذیب ہی کی پاداش میں۔ اللہ کے رسولوں نے بیک وقت دو عذابوں سے ڈرایا ہے۔ ایک عذاب قیامت سے اور دوسرے اس عذاب سے جو تکذیب قیامت کا لازمی نتیجہ ہے۔ قوموں نے جب قیامت کو جھٹلایا اور رسول کی صداقت کی کسوٹی اس عذاب کو ٹھہرایا جس کی دھمکی انھیں تکذیب کے نتیجہ کے طور پر دی گئی تو اتمام حجت کے بعد یہ عذاب ان پر آ گیا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہر بات اور رسول کی ہر وعید سچی ہے اس وجہ سے یہ عذاب بھی حَاقَّۃٌ یعنی شُدنی کی حیثیت رکھتا ہے۔

'مَا الْحَاقَّۃُ': یہ سوال اس کے ہول، اس کی دہشت اور اس کی بے پناہی کی تعبیر کے لیے ہے جس کی مزید وضاحت بعد کے الفاظ 'وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاقَّۃُ' سے ہوتی ہے کہ کون جان سکتا اور کون بتا سکتا ہے کہ یہ شدنی کیا ہے اور جب یہ ظہور میں آئے گی تو ان لوگوں پر کیا گزرے گی جو آج نہایت ڈھٹائی کے ساتھ اس کو جھٹلا رہے ہیں!

یہی اسلوب کلام سورۂ قارعہ میں بھی ہے۔ وہاں ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت ہوگی۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ (۴)

'القارعۃ' کا مفہوم

اور جس شُدنی سے ڈرایا گیا ہے رسولوں اور ان کی قوموں کی تاریخ سے یہ اس کی شہادت پیش کی جا رہی ہے کہ جس طرح قریش عذاب اور قیامت کو جھٹلا رہے ہیں اسی طرح ثمود اور عاد نے بھی جھٹلایا تھا جس کا انجام ان کے سامنے آیا۔ یہاں عذاب اور قیامت کی تعبیر کے لیے لفظ 'قَارِعَۃٌ' آیا ہے جس کے معنی ٹھونکنے اور کھٹکھٹانے والی کے ہیں۔ قرآن میں عذاب الٰہی اور قیامت دونوں کی یہ خصوصیت بیان ہوئی ہے کہ ان کے آنے کا وقت کسی کو معلوم نہیں۔ یہ اچانک آ دھمکیں گے اور جس طرح کوئی اچانک آ کر دروازے کو کھٹکھٹاتا اور بے خبر سونے والوں کو ہڑبڑا دیتا ہے اس طرح یہ بھی ایک ہلچل برپا کر دیں گے۔

فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ (۵)

'طاغیۃ' کا مفہوم

فرمایا کہ ان میں سے ثمود تو طَاغِیَۃٌ سے ہلاک کر دیے گئے۔ 'طَاغِیَۃٌ' کے معنی ہیں وہ شے جو اپنے حدود و قیود سے متجاوز ہو جائے۔ اس سورہ میں اس بارش کو جس نے قوم نوح کو غرق کیا 'طَغَا الْمَآءُ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قوموں کو سزا ان کے رویہ کی مناسبت سے دیتا ہے۔ جب کوئی قوم طغیان کی روش اختیار کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنی کائنات کی انہی چیزوں میں سے، جو انسان کی نفع رسانی کے لیے مسخر ہیں، کسی چیز کو اس کے خلاف طغیان پر ابھار دیتا ہے جو طَاغِیَۃٌ بن کر اس کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ثمود بھی، جیسا کہ 'كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ' (الشمس - ۹۱: ۱۱) سے واضح ہے اپنے رب کے خلاف طغیان میں مبتلا ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک آفت (طاغیۃ) مسلط کر دی۔

یہ آفت کیا تھی؟ اس کی کوئی وضاحت یہاں نہیں ہے لیکن قرآن کے مختلف مقامات میں اس سے متعلق جو اشارات ہیں سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم نے وہ بیان کر دیے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کی تباہی صاعقہ کے ذریعہ سے ہوئی جو سرما کے دھاریوں والے بادلوں کے اندر سے نمودار ہوئی۔ اگرچہ سرما کے بادل اور ان کے ساتھ کڑک دمک کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہے ان کو قوموں کے لیے قیامت بنا دے۔

اس زمانے میں سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے اور بظاہر انسان نیچر کی بہت سی قوتوں کو مسخر کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے لیکن آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے ساری سائنس اور تمام سائنس دانوں کی بے بسی ظاہر کر دیتا ہے۔

وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ (۶)

'عاتیۃ' کا مفہوم

یہ عاد کے انجام کی طرف اشارہ فرمایا کہ ان پر سرما کی تیز و تند بادِ صرصر چلی اور اس نے ان کو تہس نہس کر کے رکھ دیا۔ جس طرح اوپر ثمود کے بیان میں 'صاعقۃ' کو 'طاغیۃ' سے تعبیر کیا ہے اسی طرح یہاں بادِ صرصر کی صفت 'عاتیۃ' آئی ہے جس کے معنی ہیں وہ ہوا جو سرکش اور بے قابو ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہوا کو انسان کے لیے مسخر کیا ہے اور یہ اس کی زندگی اور بقا کے لیے ناگزیر ہے لیکن جب انسان سرکشی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی مسخر ہوا کو جب چاہتا ہے ذرا سی ڈھیل دے کر اس کے لیے عذاب بنا دیتا ہے۔

سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (۷)

ہوا کو عذاب بنا دینے کی تصویر

یہ ہوا کو عذاب بنا دینے کی تصویر ہے کہ جو ہوا اللہ نے انسان کی خدمت کے لیے مسخر کی ہے اسی کو اس نے عاد کے اوپر عذاب بنا کر مسلط کر دیا اور وہ سات راتیں اور آٹھ دن ان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ دینے کے لیے ان پر چلتی رہی۔ 'حسم' اور 'حسوم' کے معنی استیصال کر دینے کے ہیں۔

'فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ'۔ 'تری' کا خطاب اس طرح کے مواقع میں عام ہوتا ہے اور 'القوم' یہاں حریف اور مد مقابل کے مفہوم میں ہے۔ عاد اپنے 'عتو' (سرکشی) کے سبب سے گویا خدا کے حریف بن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اس وجہ سے اس لفظ کا استعمال یہاں نہایت موزوں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تم میں سے جو بھی ان کو دیکھتا تو وہ دیکھتا کہ اللہ کے عذاب نے ان کو اس طرح میدان میں پچھاڑ کے ڈال دیا ہے کہ گویا وہ کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہوں جو ہوا کے زور سے اِدھر اُدھر لڑھکتے پھر رہے ہوں۔

'رَبِّھَا' کی ضمیر مجرور کا مرجع ہوا بھی ہو سکتی ہے اور سرزمینِ عاد بھی۔ عربیت کے قاعدے سے یہ دونوں صحیح ہیں اور یہاں یہ دونوں معنی بنتے ہیں۔

فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ (۸)

عذابِ الٰہی کی بے پناہی — اس کا عطف اوپر والے 'فَتَرَى' پر ہے۔ گویا قومِ عاد کی بستیوں کو مخاطب کی چشمِ تصوّر کے سامنے کر کے یہ سوال فرمایا ہے کہ ذرا دُور دُور تک نگاہ دوڑا کے دیکھو کوئی متنفّس بھی پوری قوم میں سے زندہ بچا ہوا نظر آتا ہے؟ —— مطلب یہ ہے کہ جب کسی قوم پر اللہ کا عذاب آتا ہے تو اس طرح اس کا ستھراؤ کر کے رکھ دیتا ہے! احمق ہیں وہ جو اس کے دیکھنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ چیز دیکھنے کی نہیں بلکہ پناہ مانگنے کی ہے۔

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ (۹)

فرعون اور قومِ لوط کا حوالہ — 'مُؤْتَفِكَة' کے معنی ہیں 'الٹی ہوئی'۔ اس سے مراد یہاں قومِ لوط کی بستیاں ہیں۔ وہ زلزلے سے الٹ دی گئی تھیں اور 'حاصب' یعنی کنکر برسانے والی ہوا نے ان کو ریت اور کنکروں سے ڈھانک دیا تھا۔ اوپر اقوامِ بائدہ میں سے دو قوموں کا ذکر ہوا تھا اب یہ فرعون اور قومِ لوط وغیرہ کی بستیوں کی طرف اشارہ فرمایا جن کے آثار کے مشاہدہ کے مواقع قریش کو اکثر ملتے رہتے تھے۔ فرمایا کہ انھوں نے بھی اسی جرم کا ارتکاب کیا جس کا ارتکاب عاد و ثمود نے کیا اور ان کے سامنے بھی وہی انجام آیا جو ان کے سامنے آیا۔

فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً (۱۰)

یہاں ان کے جرم کی نوعیت کی طرف اشارہ ہے کہ انھوں نے اپنے رب کے رسول کی نافرمانی کی تو اللہ نے ان کو ایسی پکڑ پکڑا جس سے پھر وہ چھوٹ نہ سکے۔

رسول کی نافرمانی خدا سے بغاوت ہے — 'عَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّھِمْ' کے الفاظ سے ان کے جرم کی سنگینی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا رسول شاہِ کائنات کا سفیر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ گویا شاہِ کائنات کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتے ہیں جس کی پاداش میں وہ باغیوں کی سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔

فیصلہ کن عذاب — 'اَخْذَةً رَّابِيَةً' سے مراد وہ پکڑ ہے جس کی مدافعت نہ ہو سکے اور جو انسان کی برداشت سے زیادہ ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک پکڑ تو وہ ہوتی ہے جس کا مقصود صرف تنبیہ اور یاددہانی ہوتا ہے۔ اس طرح کی پکڑ سے آدمی چھوٹ جاتا ہے لیکن جب کوئی قوم خدا کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کی جسارت کرتی ہے تو وہ اس کو ایسی پکڑ پکڑتا ہے جس کی تاب لانا محال ہوتا ہے۔

اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (۱۱)

قومِ نوح کی طرف اشارہ — یہ آخر میں قومِ نوح کے واقعہ کی طرف بھی اشارہ فرما دیا جو مذکورہ واقعات سے بھی پہلے پیش آ چکا تھا۔ گویا اس طرح بالاجمال رسولوں کی پوری تاریخ مخاطب کے سامنے آ گئی۔

اس واقعہ کے ذکر کا انداز مخاطب (قریش) پر امتنان و اظہار احسان کا ہے۔ ان کو یاد دہانی فرمائی گئی ہے کہ تم جن اسلاف کے اخلاف ہو ان کو ہم ہی نے اپنے فضل سے نوح کی کشتی میں پناہ دی۔ اس پناہ کے مستحق وہ اس وجہ سے ٹھہرے کہ وہ اللہ کے رسول ـــــ حضرت نوح علیہ السلام ـــــ پر ایمان لائے۔ اگر وہ ایمان نہ لائے ہوتے تو وہ بھی اسی طرح غرق کر دیے گئے ہوتے جس طرح ان کی پوری قوم غرق کر دی گئی۔ جب تم انہی کے اخلاف ہو تو ہمارا یہ احسان بالواسطہ تمہارے اوپر بھی ہوا۔ آج تمھیں اپنی یہ تاریخ بھولنی نہیں چاہیے۔ اگر تم یہ بھول گئے اور رسول کی پیروی کی جگہ اس کی نافرمانی کی روش اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ خدا تمھارے ساتھ وہی معاملہ نہ کرے جو اس نے نوحؑ کی نافرمانی کرنے والوں کے ساتھ کیا۔

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ (۱۲)

سرگزشتیں سنانے کا مقصد

ضمیر مفعول کا مرجع صرف 'جَارِیَة' (کشتی) نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نقمت کی یہ پوری سرگزشت ہے۔ اس طرح ضمیر لانے کی متعدد مثالیں اس کتاب میں گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ طوفانِ نوح سے بچ رہنے والوں کو ہم نے اپنی رحمت و نقمت کی یہ شان بھول جانے کے لیے نہیں بلکہ یاد رکھنے، نصیحت حاصل کرنے اور اسلاف کی طرف سے اس کو اخلاف کو منتقل کرنے کے لیے دکھائی تھی۔
لیکن افسوس ہے کہ تم اس کو بھول گئے اور آج اسی طرح اپنے رسول سے لڑنے کو اٹھ کھڑے ہوئے جس طرح قومِ نوح اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۙ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ (۱۳-۱۵)

دنیا کے عذاب آخرت کے عذاب کی شہادت ہیں

عذاب کے تاریخی واقعات کی طرف اشارہ کرنے کے بعد یہ ظہورِ قیامت کی طرف اشارہ فرمایا کہ جس طرح قوموں پر عذاب لانے کے لیے ہمیں کوئی خاص اہتمام نہیں کرنا پڑا بلکہ جب چاہا چشم زدن میں عذاب آ گیا اسی طرح قیامت کے لانے کے لیے بھی ہمیں کوئی تیاری نہیں کرنی پڑے گی۔ بلکہ صور میں صرف ایک پھونک ماری جائے گی جس سے قیامت کی ہلچل برپا ہو جائے گی۔

'وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً' اور اس زمین اور اس کے پہاڑوں کو بھی کوئی ایسی چیز نہ سمجھو جن کو درہم برہم کرنے میں ہمیں کوئی زحمت پیش آئے گی بلکہ ہم دونوں کو ایک ہی ساتھ اٹھائیں گے۔ ایک ہاتھ میں زمین ہو گی دوسرے میں اس کے پہاڑ اور ان کو ایک ہی بار میں ٹکرا کر پاش پاش کر دیں گے۔ گویا دو شیشے کے گلاس تھے جو ایک ہی مرتبہ میں چور چور ہو گئے ـــــ

یہاں وہ بات یاد رکھیے جس کا حوالہ قرآن نے جگہ جگہ دیا ہے کہ منکرینِ قیامت جب قیامت کا مذاق اڑاتے تو یہ بھی کہتے کہ کیا جب قیامت آئے گی تو ان پہاڑوں کو بھی پاش پاش کر دے گی؟ مطلب

یہ کہ یہ بات انہونی ہے اس وجہ سے ان کے زعم میں قیامت بھی محض ایک خیالی ہوا ہے۔

فَیَوۡمَئِذٍ وَّقَعَتِ الۡوَاقِعَۃُ۔ فرمایا کہ اس دن وہ واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی جس کو تم بہت بعید از امکان خیال کیے بیٹھے ہو۔

اوپر کی آیات میں قیامت کو 'حَآقَّۃ' اور 'قَارِعَۃ' وغیرہ کے الفاظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے یہاں اس کو لفظ 'وَاقِعَۃ' سے تعبیر کیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کوئی اس کو بعید از امکان چیز سمجھتا ہے تو سمجھے اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ ایک امر واقعی ہے جو لازماً ایک دن پیش آ کے رہے گا۔

وَانۡشَقَّتِ السَّمَآءُ فَہِیَ یَوۡمَئِذٍ وَّاہِیَۃٌ (۱۶)

قیامت کے دن آسمان کا حال

زمین اور اس کے پہاڑوں کا حشر بیان کرنے کے بعد یہ آسمان کا حال بتایا کہ اس دن یہ بھی پھٹ جائے گا۔ 'فَہِیَ یَوۡمَئِذٍ وَّاہِیَۃٌ' یعنی آج تو یہ دیکھنے والوں کو نہایت ٹھوس اور محکم نظر آتا ہے، کہیں ڈھونڈے سے بھی اس میں کسی نقص یا شگاف کا کوئی نشان نہیں مل سکتا لیکن اس دن یہ بالکل بودا اور پھس پھسا ہو جائے گا اور روئی کے گالوں اور دھوئیں کی طرح اڑے گا۔

وَّالۡمَلَکُ عَلٰۤی اَرۡجَآئِہَا ؕ وَیَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّکَ فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ (۱۷)

قیامت کے دن فرشتوں کا حال

آسمان کے پھٹ جانے کے بعد آسمان کے فرشتوں کا جو حال ہو گا یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ اس وقت وہ اس کے اطراف اور کناروں میں سمٹے ہوئے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہلچل سے ان پر بھی ایک سراسیمگی کی حالت طاری ہو گی۔ یہ ان مشرکین کی آگاہی کے لیے واضح فرمایا ہے جو فرشتوں سے کو لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ ان کے مرجع بنیں گے اور ان کی سفارش کریں گے۔

'وَیَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّکَ فَوۡقَہُمۡ یَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِیَۃٌ' یعنی اس انقلاب حال سے سارا عملہ تو اپنی ذمہ داریوں سے فارغ ہو کر ایک طرف ہو جائے گا، بس عرش الٰہی کے اٹھانے والے رہ جائیں گے سو اس کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

قرآن مجید میں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق متشابہات سے ہے۔ ہمارے فہم سے قریب لانے کے لیے ان کو ایسے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے جن سے فی الجملہ ان کا تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو سکے۔ یہ احوال ایک نادیدہ عالم کے ہیں، ان کا تصور دینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اصل حقیقت کا جاننا اس عالم میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ وہ جس طرح بیان ہوئے ہیں اسی طرح ان پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ ان کی اصل حقیقت کے درپے نہ ہوا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ آدمی کسی فتنہ میں پڑ جائے۔

يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰى مِنْكُمْ خَافِيَةٌ (۱۸)

فرمایا کہ اس دن تم سب پیش کیے جاؤ گے اور تمھاری کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں رہ جائے گی۔ پیش کیے جانے سے مراد ظاہر ہے کہ خدا کے حضور پیش کیا جانا ہے۔ اس دن آسمانوں اور زمینوں کی ساری بساط لپیٹ کر رکھ دی جائے گی اس وجہ سے نہ تو کسی کے لیے کوئی جگہ چھپنے کی ہو گی اور نہ کوئی چیز چھپانے کی۔ جزا و سزا کی تفصیل

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَيَقُوْلُ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ (۱۹)

اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیشی کے بعد اب یہ اس جزا و سزا کی تفصیل آ رہی ہے جس سے ہر ایک کو سابقہ پیش آنا ہے۔ پہلے اہل ایمان کا حال بیان ہو رہا ہے۔ فرمایا کہ جس کو اس کا اعمال نامہ دہنے ہاتھ میں پکڑایا جائے گا وہ تو دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑے گا۔ دوسروں سے کہے گا، یہ لو، میرا اعمال نامہ پڑھو!

'ھا' کی حیثیت ہے تو مجرد ایک آواز کی جیسے ارے یا اُف وغیرہ لیکن یہ اس موقع پر بولتے ہیں جب کہنا ہو 'یہ لو'۔ یہاں 'ھا' اور 'اِقْرَءُوْا' کے بیچ میں 'ؤُمُ' محض اس خلا کو بھرنے کے لیے آ گیا ہے جو دونوں کے بیچ میں ہے۔ اس طرح کے زوائد کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔ 'كِتٰبِيَهْ' میں 'ہ' سکتہ کی ہے جو محض قافیہ کی رعایت سے آ گئی ہے۔ اس کی مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور آگے بھی آ رہی ہیں۔

اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ (۲۰)

ساتھ ہی وہ اپنی اس عظیم کامیابی کا سبب بھی بتائے گا کہ میں نے ہمیشہ اپنے دل میں یہ گمان رکھا کہ مجھے ایک دن اپنے زندگی کے حساب کتاب سے دوچار ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی گمان نے میری حفاظت کی اور میں ایک ایسا اعمال نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا جس کو دوسروں کے سامنے نہایت خوشی کے ساتھ پیش کر سکوں۔

'ظَنٌّ' یہاں ظنِ غالب کے مفہوم میں ہے۔ آفاق و انفس اور انبیاء و حکماء کی تعلیم میں جزا و سزا کے ایسے دلائل موجود ہیں کہ آدمی بالکل ہی بلید اور لاابالی نہ ہو تو اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ زندگی یوں ہی نہیں تمام ہو جائے گی بلکہ ایک دن جزا اور سزا سے سابقہ پیش آنا بھی لازمی ہے۔ اگرچہ اس بات پر اس کو اس طرح کا یقین تو نہیں ہوتا جو آنکھوں دیکھی چیز پر ہوا کرتا ہے لیکن ایسا ظنِ غالب ضرور ہوتا ہے جس کے بعد وہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ اس کو نظر انداز کر کے زندگی گزارے اور عاقبت کی کوئی پروا نہ کرے۔ اس ظنِ غالب سے آخرت پر جو ایمان پیدا ہوتا ہے جزا اور سزا کو ماننے کے لیے ظنِ غالب کافی ہے

وہ بالتدریج ایمانی تجربات سے مضبوط ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ درجہ بدرجہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ اگر آدمی اس ظنِّ غالب کو نظر انداز کر کے اس انتظار میں رہے کہ جب اس کو آخرت کا یقین ہو جائے گا تب اس کو مانے گا تو یہ انتظار اسی دن ختم ہوگا جس دن وہ سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لے گا اور اس دن کا ایمان اس کے لیے بالکل بے سود ہوگا۔

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ (۲۱-۲۳)

فرمایا کہ یہ لوگ اپنے پسندیدہ عیش میں ہوں گے۔ انھیں وہ سب کچھ حاصل ہوگا جو وہ چاہیں گے۔ وہ بلند باغوں میں ہوں گے جن کے خوشے بالکل ان کے سروں پر لٹک رہے ہوں گے۔

باغ بلند اور خوشے قریب

'عَالِيَةٍ' اور 'دَانِيَةٌ' کے تقابل پر نظر رہے کہ باغ تو بلند ہوں گے لیکن ان کے پھل اور خوشے جو اصل مطلوب ہیں، وہ نہایت قریب ہوں گے۔ اہل عرب کے باغوں میں کنارے کنارے کھجوروں کی قطاریں اور بیچ بیچ میں اناروں کے درخت اور انگوروں کی بیلیں ہوتی تھیں۔ ان کے لیے اس 'عَالِيَةٍ' اور 'دَانِيَةٌ' کے سمجھنے میں کوئی زحمت نہیں تھی۔ یوں بھی باغ کا نمایاں حسن یہی ہے کہ وہ بلندی پر ہو اور اس کے خوشے سروں پر لٹک رہے اور دسترس کے اندر ہوں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (۲۴)

یعنی اس طرح کے باغوں میں انھیں اتار کر یہ کہا جائے گا کہ لو اب آرام سے کھاؤ پیو۔ یہ کھانا پینا تمھارے لیے رچتا پچتا اور راس آنے والا ہوگا۔ دنیا کی نعمتیں تو وبال بن سکتی ہیں اگر ان میں اعتدال ملحوظ نہ رہ سکے یا ان کا صحیح شکریہ ادا ہو سکے لیکن ان نعمتوں میں اس طرح کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ لفظ 'هَنِيْٓـئًا' کی لغوی تحقیق اور نحوی حیثیت سورۂ طور کی تفسیر میں واضح کی جا چکی ہے۔

'بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ' - یعنی یہ تمھیں جو کچھ ملا ہے یہ تمھارے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کا صلہ ہے۔ یہاں تمھیں اب کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ تم اس کے پورے حقدار ہو اور یہ تمھارے لیے ہمیشہ باقی رہنے والی چیز ہے۔ اس میں اضافے تو دم بدم ہوتے رہیں گے لیکن کمی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ جو محنت اس کے لیے تمھیں کرنی تھی وہ تم اٹھا چکے۔ اب صرف اس سے بہرہ مند ہونا ہے۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (۲۵-۲۷)

اصحاب الشمال کا حال

یہ ان لوگوں کا حال بیان ہو رہا ہے جن کے اعمال نامے ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائے جائیں گے۔ وہ دیکھتے ہی اپنے سر پیٹیں گے، کہیں گے کاش! ہمارا اعمال نامہ ہمیں دیا ہی نہ گیا ہوتا اور ہمیں یہ معلوم ہی نہ ہوا ہوتا کہ ہمارا حساب کیا ہے۔ کاش! وہی موت، جو دنیا میں آئی تھی، فیصلہ کن ہو گئی ہوتی!

ضمیر کا مرجع موت ہے۔ قرینہ موجود ہو تو مرجع کے بغیر اس طرح ضمیر لانے میں کوئی عیب نہیں ہے اس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ ۚ هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ (۲۸-۲۹)

یعنی وہ نہایت حسرت سے کہیں گے کہ جو مال اس اہتمام سے جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا، بھلا کس کام آیا! 'مَا' یہاں نافیہ بھی ہو سکتا ہے لیکن اظہارِ حسرت کے پہلو سے اس کا استفہامیہ ہونا میرے نزدیک زیادہ موزوں ہے۔

'هَلَكَ عَنِّیْ سُلْطٰنِیَهْ' - 'هَلَكَ' کے بعد 'عَنِّیْ' اس بات کا قرینہ ہے کہ 'هَلَكَ' یہاں 'ذَهَبَ' یا 'بَعُدَ' کے مفہوم پر متضمن ہے۔ 'سُلْطَانٌ' کے معنی اقتدار کے ہیں یعنی وہ نہایت حسرت سے کہیں گے کہ وہ اقتدار بھی چھن گیا جس پر ہمیں ناز تھا اور جس کے گھمنڈ نے آج کے دن سے ہمیں اندھا بنائے رکھا۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۙ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْهُ ۙ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ (۳۰-۳۲)

یعنی یہ نالہ و شیون وہ کرتے ہی ہوں گے کہ حکم ہوگا کہ اس کو پکڑو، اس کی گردن میں طوق ڈالو، پھر اس کو جہنم میں جھونک دو، پھر ایک زنجیر میں جس کا طول ستر ہاتھ ہوگا، اس کو جکڑ دو ــــ قرآن مجید کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ دولت کو گن گن کر جمع رکھنے والے سرمایہ دار دوزخ میں ڈال کر بھاری زنجیروں میں ستونوں کے ساتھ باندھ دیے جائیں گے تاکہ جس دولت پر مارِ گنج بن کر بیٹھے رہے اس کی تپش کا مزا اچھی طرح چکھیں۔ سورۂ ھُمَزہ میں اس کی تفصیل، ان شاء اللہ، آئے گی۔

اِنَّهٗ كَانَ لَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِیْمِ ۙ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ (۳۳-۳۴)

فردِ جرم یہ اس کے اس جرم کا بیان ہے جس کے سبب سے وہ اس غضب اور اس سزا کا مستحق ٹھہرے گا۔ فرمایا کہ یہ خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتا تھا۔ یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اس کا یہ رویہ کہ یہ دولت کا پجاری بن کر بیٹھا رہا اور آج حسرت کر رہا ہے کہ 'مَآ اَغْنٰی عَنِّیْ مَالِیَهْ' (میری دولت میرے کیا کام آئی!) اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ خدا پر اس کا ایمان نہیں تھا۔ اگر خدائے عظیم پر اس کا ایمان ہوتا تو اس کی عظمت سے ڈرتا کہ ایک دن اس کے حضور میں پیش ہونا اور اس کے بخشے ہوئے مال کا حساب دینا ہے اور وہ ایسی عظیم ہستی ہے کہ اس کی پکڑ سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

'وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ' یعنی نہ خود مسکینوں پر خرچ کرتا تھا اور نہ دوسروں کو اس نیکی کی راہ پر ابھارتا تھا۔ جو لوگ بخیل ہوتے ہیں وہ صرف یہی نہیں کہ خود اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے بلکہ

ان کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ دوسرے بھی خرچ نہ کریں تاکہ ان کی بخالت کا راز افشا نہ ہو۔
سورۂ ماعون میں یہی بات یوں فرمائی گئی ہے: فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ ۙ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۲-۳) (پس وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے پر لوگوں کو نہیں ابھارتا) البتہ آیت زیر بحث میں یہ حقیقت بھی واضح فرما دی گئی ہے کہ جو لوگ دولت رکھتے ہوئے غریبوں اور مسکینوں کو دھکے دیتے ہیں وہ درحقیقت خدائے عظیم پر ایمان نہیں رکھتے اگرچہ ایمان کا دعویٰ وہ کتنی ہی بلند آہنگی سے کرتے ہوں۔ اسی طرح سورۂ ماعون میں ان لوگوں کی نماز کو بالکل بے حقیقت ٹھہرایا ہے جن کی خست کا یہ حال ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے معاملے میں بھی تنگ دلی برتتے ہیں اور ضرورت مندوں کو نہیں دیتے۔ فرمایا ہے: فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ (۴-۷) (پس ان نماز پڑھنے والوں کے لیے ہلاکی ہے جو اپنی نمازوں کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جو دکھاوے کی نمازیں پڑھتے ہیں اور ضرورت کی معمولی چیزیں بھی مانگے نہیں دیتے)۔

ان دونوں مقامات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ جو شخص مال رکھتے ہوئے یتیموں اور مسکینوں کی مدد نہیں کرتا نہ اس کا ایمان معتبر ہے اور نہ اس کی نماز کا کوئی وزن ہے اگرچہ وہ ایمان کا بھی مدعی ہو اور نماز کی بھی نمائش کرتا ہو۔

فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ (۳۵)

یعنی اس کی اس خست و بخالت کی سزا اس کو یہ ملی کہ یہاں کوئی اس کا ہمدرد و مددگار نہیں۔ جس نے نہ خدا کا حق پہچانا اور نہ اس کی مخلوق کا، قیامت کے دن بھلا کون اس کے ساتھ ہمدردی کرنے والا ہو گا؟ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جو لوگ مال رکھتے ہوئے بخیل ہوتے ہیں ان کے ساتھ اس دنیا میں بھی کسی کو ہمدردی نہیں ہوتی تو جزائے اعمال کی دنیا میں ان کے ساتھ بھلا کون ہمدردی کرنے والا اٹھے گا۔

وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ (۳۶)

'غِسْلِيْن' ناپاک اور گندی چیزوں کے غسالہ (دھوون) کو کہتے ہیں۔ چونکہ انھوں نے اپنی دولت کا مصرف صرف اپنی تن پروری اور اپنے کام و دہن کی لذت ہی کو سمجھا اور اس حرص میں غربا و مساکین کے حقوق ہڑپ کر کے اپنے سارے مال کو نجس بنایا اس وجہ سے قیامت کے دن ان کو ناپاک چیزوں کا دھوون ہی کھانے پینے کو ملے گا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آدمی کا مال اللہ کی راہ میں انفاق سے پاک ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص انفاق نہیں کرتا تو اس کا سارا مال نجاست کا ڈھیر بن جاتا ہے جس کی اصل حقیقت قیامت میں اس کے سامنے اس شکل میں ظاہر ہو گی جو بیان ہوئی۔

لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ (۳۷)

یعنی یہ غذا ان مجرموں ہی کے لیے خاص ہوگی، دوسرے اس کو نہیں کھا سکیں گے۔ اس کی وجہ غالباً وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ان کا جرم چونکہ خاص نوعیت کا ہے اس وجہ سے ان کی غذا بھی خاص ہوگی۔ جرم اور سزا میں مشابہت کے پہلو پر پیچھے بھی اس کتاب میں اشارات گزر چکے ہیں۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۙ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۙ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (۳۸-۴۰)

قسم سے پہلے 'لَا' کا موقع استعمال

قسم سے پہلے جو اس طرح 'لا' آیا کرتا ہے اس پر اس کے محل میں ہم بحث کر چکے ہیں کہ یہ نہ تو زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے بلکہ قسم سے پہلے مخاطب کے اس خیال کی تردید کے لیے آتا ہے جس کی تردید کے لیے قسم کھائی گئی ہے۔ جس طرح عام بول چال میں کہتے ہیں: 'نہیں، خدا کی قسم، یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ بات ہے'۔ اسی طرح یہاں بھی 'نہیں' سے کلام کا آغاز کیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ مخاطب کا خیال اتنا غلط ہے کہ متکلم اس کی تردید میں ایک لمحہ کا توقف بھی کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔

مکذبین کے ایک بیہودہ خیال کی تردید

قسم سے متعلق ہم یہ حقیقت بھی واضح کر چکے ہیں کہ قرآن میں جہاں کوئی قسم کھائی گئی ہے بالعموم دعوے کی شہادت اور اس کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یہاں اصل دعویٰ جس کو سورہ کے عمود کی حیثیت حاصل ہے، اثباتِ جزاء و سزا ہے۔ منکرین اس دعوے کی تکذیب کر رہے تھے اور اس کی تکذیب کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ آفاق و انفس اور عقل و نقل کے جو دلائل قرآن پیش کرتا ان کا جواب دینے کے بجائے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مطعون کرنے کی کوشش کرتے کہ (العیاذ باللہ) آپ ایک شاعر یا کاہن ہیں اور جس طرح کاہنوں اور شاعروں پر جنات و شیاطین کلام القاء کرتے ہیں اسی طرح ان پر بھی کوئی جن اور شیطان کلام القاء کرتا ہے اور یہ اس کو اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ یہ کلام ایک فرشتہ ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتا ہے۔ یہاں ان کے اسی بے ہودہ الزام کی تردید فرمائی ہے اور اس کے لیے اس عالمِ حاضر اور عالمِ غیب دونوں کی قسم کھائی ہے۔

قیامت کے حق میں عالم مشہود اور عالم غیر مشہود کی شہادت

قیامت اور جزاء و سزا پر قرآن نے جو دلائل دیے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکے ہیں اور اس سورہ میں بھی زیرِ بحث آئے ہیں، ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تعلق آفاق و انفس کے ان شواہد سے بھی ہے جو آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور آخرت کے ان احوال سے بھی جو آنکھوں سے تو نہیں دیکھے جا سکتے لیکن عقل سے سمجھے جا سکتے ہیں۔ اسی سورہ میں جزاء و سزا پر جو دلیل قائم کی گئی ہے وہ پہلے قوموں کی تاریخ اور ان کی تباہی کے آثار سے قائم کی گئی ہے پھر عالمِ غیب کے وہ احوال سنائے گئے ہیں جن سے اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو سابقہ پیش آنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک کا تعلق اس عالم سے ہے جس کی گواہی تاریخ کے صفحات اور زمین کے آثار میں موجود ہے اور دوسرے کا تعلق اس نادیدہ عالم سے ہے جس کو ہر چند یہاں آنکھوں سے

تو نہیں دیکھا جا سکتا لیکن عقل اس کو تسلیم کرتی ہے اس لیے کہ خالق کی صفات اور اس جہان میں پیش آنے والے مکافاتِ عمل کے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ انہی دونوں قسموں کی دلیلوں کو گواہی میں پیش کر کے یہاں جزاء و سزا کے منکروں کو آگاہ فرمایا ہے کہ قرآن جس جزاء و سزا سے تمھیں آگاہ کر رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس عالمِ مشہود اور عالمِ غیر مشہود کے دلائل اس کی تائید میں ہیں۔ اس کو کسی شاعر یا کاہن کا کلام قرار دے کر جھٹلانے کی کوشش نہ کرو۔ یہ کسی شیطان یا جن کا القاء نہیں ہے بلکہ یہ ایک باعزت رسول کی لائی ہوئی وحی ہے۔

قرآن کے لانے والے کی صفات

'اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ' میں 'رسول کریم' سے جبریل امینؑ مراد ہیں۔ صفت 'کریم' کے لانے سے یہاں مقصود مخالفوں کے اس وہم کی تردید ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ فرمایا کہ جو یہ کلام لاتا ہے وہ کوئی جن یا شیطان نہیں ہے، جیسا کہ تم کہتے ہو، بلکہ اللہ کا باعزت رسول ہے۔ بعینہٖ اسی طرح کے سیاق و سباق میں یہی بات سورۂ تکویر میں بھی فرمائی گئی جس سے اس رائے کی تائید ہوتی ہے:

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ — بے شک یہ ایک رسول گرامی کا لایا ہوا کلام ہے۔
ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ — وہ قوت والا اور عرش والے کے نزدیک معتمد ہے۔
مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ۙ — اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ مزید براں وہ نہایت امانتدار ہے۔
(التکویر - ۸۱ : ۱۹-۲۱)

سورۂ شعراء میں بھی منکرین کے اس الزام کی ہر پہلو سے تردید ہوئی ہے۔ مزید وضاحت مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (۴۱-۴۲)

یہ وہی اوپر والی بات منفی اسلوب سے فرمائی ہے کہ نہ یہ کسی شاعر کا کلام ہے اور نہ کسی کاہن کا۔ اگر تم لوگ ایمان لانے والے اور یاد دہانی کی قدر کرنے والے ہوتے تو تم پر از خود یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا کلام نہیں ہو سکتا لیکن خرابی یہ ہے کہ تمھارے اندر ایمان کی خواہش اور بات کو سننے سمجھنے کی طلب ہی بہت کم پیدا ہوتی ہے اور جن کے اندر یہ طلب ہی نہ ہو وہ اسی طرح فرار کے بہانے تلاش کر لیتے ہیں۔

قرآن کو کسی شاعر یا کاہن کا کلام کیوں نہیں قرار دیا جا سکتا؟ اس کا مفصل جواب سورۂ شعراء میں دیا گیا ہے اور ہم نے اس کے تمام پہلوؤں کی وہاں وضاحت کی ہے۔ اس پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

مکذبین کے باطن کی تعبیر

'قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ' اور 'قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ' میں دونوں فعل میرے نزدیک ارادۂ فعل کے معنی میں ہیں اور فعل کا ارادۂ فعل کے معنی میں آنا ایک معروف چیز ہے جس کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

یہ ان کے اصل سببِ اعراض پر روشنی ڈالی ہے کہ اگر تمہارے اندر ایمان لانے کا ارادہ پایا جاتا یا یاددہانی سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہوتی تب تو تم آسانی سے گمراہ اور پیغمبر میں امتیاز کر لیتے لیکن یہ ارادہ شاذ و نادر ہی تمہارے اندر پیدا ہوتا ہے۔

یہ بالکل ٹھیک ٹھیک ان مکذبین کے باطن کی تعبیر ہے۔ آخر قریش کے یہ لیڈر اتنے بدذوق اور غبی تو نہیں تھے کہ وہ اللہ کے کلام اور اپنے شاعروں اور کاہنوں کے کلام کے فرق کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ اس فرق کو سمجھتے تھے اور گاہ گاہ ان کے اندر سچائی کے اعتراف کا جذبہ بھی ابھرتا رہا ہو گا لیکن نفس کی خواہشوں کے بوجھ تلے یہ جذبہ اس طرح دبا ہوا تھا کہ اول تو یہ ابھرتا ہی بہت کم تھا اور اگر کبھی ابھرتا بھی تو اتنا ضعیف ہوتا کہ وہ زندگی میں کوئی مؤثر تبدیلی نہ لا سکتا۔ بس کوئی ایسا ہی خوش قسمت ہوتا تو وہ اپنے نفس کے حجابات سے نکلنے میں کامیاب ہوتا۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ یہ حال قریش کے لیڈروں کا بیان ہو رہا ہے ان کے عوام کا حال نہیں بیان ہو رہا ہے۔ ان کی قیادت کے کردار کی تصویر پچھلی سورہ میں بھی سامنے آ چکی ہے۔

تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۴۳)

قرآن کا اصل منبع — یہ وہی اوپر والی بات پھر مثبت پہلو سے فرمائی جا رہی ہے کہ یہ اللہ رب العلمین کی طرف سے اتارا ہوا کلام ہے۔ لفظ 'تنزیل' کے صحیح مفہوم کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں کہ ان کے اندر اہتمام اور تدریج کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ خاص طور پر شیاطینِ جن وانس کی دسترس سے اس کو محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو اہتمام فرمایا وہ جگہ جگہ قرآن میں بیان ہوا ہے اور ہم نے اس کی وضاحت کی ہے۔ ان شاء اللہ اس کی مزید وضاحت سورۂ جن میں آئے گی۔

'مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ' سے اس کی عظمت وشان بھی ظاہر ہو رہی ہے اور اس کی تکذیب کی بدانجامی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ بادشاہِ کائنات کا اتارا ہوا کلام ہے۔ اگر تم نے اس کی ناقدری کی تو تمہاری محرومی اور بدانجامی پر افسوس ہے۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ ۙ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ۙ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ ۙ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ (۴۴-۴۷)

کفار کے الزام کا جواب — یہ جواب ہے کفار کے اس الزام کا جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگاتے تھے کہ یہ سب کچھ گھڑتے تو ہیں اپنے جی سے لیکن ہم پر تھوپتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ کلام ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کیا جاتا ہے۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس کو اپنا رسول بناتا ہے وہ اس کا سفیر اور وحی کی عظیم امانت کا حامل ہوتا ہے اس وجہ سے اس کی نگرانی بھی نہایت کڑی ہوتی ہے۔ مجال نہیں ہے کہ وہ اپنے جی سے اس میں کوئی ردوبدل کر سکے۔ اگر وہ سرِمو بھی کوئی بات ہم سے غلط منسوب کرے تو ہم اس کو اپنے قوی

بازو سے پکڑیں اور اس کی شہ رگ ہی کاٹ دیں پھر کوئی بھی اس کو ہم سے بچانے والا نہیں بن سکتا۔

یہ بات ایسے اسلوب میں فرمائی گئی ہے جس سے اس کڑی نگرانی کی بھی وضاحت ہو رہی ہے جو رسول کی، اس کی منصبی ذمہ داریوں کے سبب سے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور کفار کے اس مطالبہ کا جواب بھی اس میں آگیا ہے جو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے تھے کہ اس قرآن کو اگر ہم سے منوانا ہے تو یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا کم از کم یہ کہ اس میں ایسی ترمیم کرو کہ یہ ہمارے لیے لائقِ قبول ہو سکے۔ سورۂ یونس میں ان کے اس مطالبہ اور اس کے جواب کا یوں حوالہ آیا ہے:

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ (یونس - ۱۰ : ۱۵)	اور جب ان کو ہماری نہایت واضح آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جو ہماری ملاقات کی توقع نہیں رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن لاؤ یا اس میں تبدیلی کرو۔ ان کو جواب دے دو کہ مجھے کیا حق ہے کہ میں اپنی چاہت سے اس میں کوئی تبدیلی کروں۔ میں تو بس اس چیز کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

'لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے 'ہم اس کا (پیغمبر کا) دہنا پکڑتے' کیا ہے لیکن مجھے یہ ترجمہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ عربیت کے قاعدہ سے اس کا ترجمہ 'ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑتے' ہونا چاہیے۔ میں نے یہی ترجمہ کیا ہے اور تفسیر ابن جریر دیکھی تو اس سے بھی اسی کی تائید ہوتی۔

'ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ'۔ 'وتین' کے معنی شہ رگ، رگِ جاں یا رگِ دل کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم اس سے کچھ دور نہیں ہیں۔ ہماری چٹکیوں میں تو اس کی شہ رگ ہے۔ ہم اسی کو مسل دیتے اور وہ چشم زدن میں ختم ہو جاتا۔

'فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِیْنَ' یہ قریش سے خطاب ہے کہ قرآن میں اپنے حسب منشا ترمیم کا مطالبہ تو کر رہے ہو لیکن خدا کی گرفت سے اس کو تم میں سے بچانے والا کون بنے گا! لفظ 'اَحَد' چونکہ جمع کے مفہوم میں آتا ہے جیسے لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ (الاحزاب - ۳۳ : ۳۲) میں ہے۔ اس وجہ سے 'حٰجِزِیْنَ' کا جمع آنا عربیت کے بالکل مطابق ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ اس طرح کی کڑی نگرانی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی کرتا ہے جن کو وہ منصبِ رسالت پر مامور فرماتا ہے اس لیے کہ ان کی تحویل میں وحی کا خزانہ ہوتا ہے جس کی حفاظت ضروری ہے۔ اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ جو شخص بھی خدا پر جھوٹ بولے اس کی گردن توڑ دی جائے۔ جھوٹ بولنا

رسولوں کی حفاظت ان کی ذمہ داری کے اعتبار سے ہوتی ہے

تو درکنار کتنے ہیں جو خدا کو گالی دیتے ہیں لیکن اس دنیا میں ان کو بھی مہلت ملی ہوئی ہے۔ وہ اپنا انجام آخرت میں بھگتیں گے۔ البتہ خدا کا کوئی سچا رسول نہ خدا پر کوئی افترا کر سکتا اور نہ کسی کے دباؤ سے اس کے پیغام میں کوئی کمی بیشی کر سکتا۔ رسولوں کو جو عصمت حاصل ہوتی ہے اس کی حکمت بھی یہی ہے کہ ان کی امانت میں خدا کی شریعت ہوتی ہے۔ ان کی معمولی بھول چوک اور غلطی پوری خلق کے لیے موجب فتنہ بن سکتی ہے اس وجہ سے ان سے کوئی معمولی فروگزاشت بھی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فوراً درست فرما دیتا ہے۔ دوسروں کو یہ حفاظت حاصل نہیں ہوتی کیونکہ وہ اس ذمہ داری پر مامور نہیں ہوتے جس پر حضراتِ انبیاء علیہم السلام ہوتے ہیں۔

وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۴۸)

رسول کو تسلی

یعنی لاخیرے اور محروم القسمت قسم کے لوگ اگر اس عظیم رحمت کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو یہ ان کی اپنی محرومی ہے۔ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں وہ اس سے یاد دہانی حاصل کرتے ہیں اور کریں گے اور وہی مقصود ہیں۔ یہ نعمت درحقیقت اللہ نے اتاری ہی انہی کے لیے ہے۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ اگر ناقدرے اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس سے دل برداشتہ نہ ہو۔ آخر اس کی قدر کرنے والے بھی تو ہیں!

وَاِنَّا لَنَعْلَمُ اَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ (۴۹)

مخالفین کو وعید

یہ مخالفین کو تہدید و وعید ہے کہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمھارے اندر اس کے جھٹلانے والے ہیں اور وہ کون ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ جو تکذیب کر رہے ہیں وہ یاد رکھیں کہ ہم سے وہ مخفی نہیں ہیں۔ اور جب وہ مخفی نہیں ہیں تو وہ اپنا انجام دیکھیں گے!

وَاِنَّهٗ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ (۵۰)

یعنی آج تو اس کی تکذیب کر رہے ہیں اور اپنے اس کارنامے پر بہت مگن ہیں لیکن عنقریب وہ دن بھی آنے والا ہے جب یہ کافروں کے لیے سبب حسرت بنے گا اور وہ اپنی بدبختی پر اپنے سر پیٹیں گے کہ انھوں نے اس کی تکذیب کر کے کیوں اپنی یہ شامت بلائی!

وَاِنَّهٗ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ (۵۱)

یعنی یہ کوئی ہوائی بات نہیں بلکہ ایک حق یقینی ہے۔ یہ قرآن جس روزِ جزا و سزا سے خبردار کر رہا ہے وہ لازماً پیش آئے گا۔

ابتدائی آیات: اَلْحَاۗقَّةُ ۙ مَا الْحَاۗقَّةُ ۚ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَاۗقَّةُ (۱-۳) میں جو بات فرمائی ہے اسی کی یاد دہانی سورہ کے خاتمہ پر ایک دوسرے اسلوب میں کر دی۔ گویا سورہ جس مضمون سے چلی تھی اسی کی یاد دہانی پر ختم ہوئی۔ یہ اسلوب قرآن کی بیشتر سورتوں میں اختیار فرمایا گیا ہے اور یہ قرآن میں

نظم کے وجود کی ایک واضح دلیل ہے۔

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (۵۲)

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی ہے کہ جو جھٹلا رہے ہیں ان کی روش سے بددل نہ ہو بلکہ صبر و انتظار اور اپنے ربِّ عظیم کے نام کی تسبیح کرو۔ یہ تسبیح تمھارے لیے حصولِ صبر اور قوت و اعتماد کا ذریعہ ہو گی۔ اللہ تعالیٰ بڑی قدرت و عظمت والا ہے۔ جب وقت آجائے گا تو وہ ان سرکشوں کو دکھا دے گا کہ اس کی ہر بات کس طرح پوری ہوتی ہے۔

ان سطور پر اللہ تعالیٰ کی مدد سے اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وبیدہ التوفیق۔

رحمان آباد

۱۴۔ اگست ۱۹۷۸ء

۸۔ رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۷۰

المعارج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ــــــ الحآقۃ ــــــ کی مثنیٰ ہے، دونوں کے عمود میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ انذارِ عذاب و قیامت جس طرح سابق سورہ کا موضوع ہے اسی طرح اس کا بھی موضوع ہے۔ دونوں کے ظاہری اسلوب میں بھی بڑی مشابہت ہے جس طرح سابق سورہ میں اثباتِ جزاء و سزا پر، وسطِ سورہ میں، قسم کھائی گئی ہے اسی طرح اس سورہ کے وسط میں بھی اسی نوعیت کی قسم ہے۔ خاص پہلو اس کا یہ ہے کہ اس میں ان متمردین کو تنبیہ فرمائی ہے جو عذاب و قیامت کا مذاق اڑاتے اور اس کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔ ان کے رویہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے کہ یہ بہت ہی تنگ ظرف اور تھڑدلے لوگ ہیں۔ اس وقت خدا نے ان کو جو ڈھیل دی ہے تو ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے ہیں۔ ذرا گرفت میں آجائیں تو ساری شیخی بھول جائیں گے۔ ان سے چندے درگزر کرو۔ ان کے فیصلہ کا وقت آیا ہی چاہتا ہے۔ جب وہ وقت آجائے گا تب انھیں اندازہ ہوگا کہ جس چیز کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے وہ کیسی ہولناک چیز نکلی۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۱-۷) ان لوگوں کو سرزنش جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے کو عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے تھے۔ ان کو آگاہی کہ کافروں کو جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے وہ ایک دن آکے رہے گا اور کوئی اس کو دفع کرنے والا نہیں بنے گا، لیکن خدا کے دنوں کو لوگ اپنے پیمانوں سے نہ ناپیں۔ اس کی بارگاہ بہت بلند ہے۔ وہاں تک رسائی کے لیے تو فرشتوں اور جبریل کو بھی پچاس ہزار سال کے برابر کا ایک دن لگتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبرِ جمیل کی تلقین اور یہ اطمینان دہانی کہ جس دن کو یہ تنگ نظر بہت دور خیال کر رہے ہیں ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔

(۸-۱۸) قیامت کے دن کی تصویر کہ اس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مانند سرخ اور پہاڑ دھنکی ہوئی اون کی مانند پراگندہ ہو جائیں گے۔ ہر ایک کی قوت و جمعیت بالکل منتشر ہو کر رہ جائے گی۔ کوئی کسی کا پرسان حال نہیں

رہے گا۔ اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے آدمی اپنے سارے عزیزوں، محبوبوں، خاندان، قبیلہ بلکہ زمین کی ہر چیز کو فدیہ میں دے دینا چاہے گا۔ دوزخ کے شعلوں کی لپیٹ اس کی چمڑی ادھیڑ دے گی۔ وہ ان سب کو کھینچ بلائے گی جنھوں نے دعوتِ حق سے اعراض کیا اور دولت جمع کرنے اور سینتنے میں لگے رہے۔

(۱۹-۳۵) اس حقیقت کا اظہار کہ لوگوں کا عام حال یہ ہے کہ ذرا خدا کی کسی گرفت میں آ جائیں تو واویلا شروع کر دیتے اور مایوس ہو جاتے ہیں اور اگر ڈھیل مل جائے تو اس کے شکر گزار ہونے کے بجائے اتراتے اور اکڑتے ہیں اور اس کے بخشے ہوئے مال پر خزانے کے سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس عام حالت سے مستثنیٰ صرف وہ لوگ ہیں جن کو خدا کی بندگی کی توفیق حاصل ہوئی۔ ان کے مال میں بے شک سائلوں اور محتاجوں کا حق ہوتا ہے۔ وہ روزِ جزا سے ڈرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ خدا کا عذاب نچنت رہنے کی چیز نہیں ہے۔ وہ اپنی شہوات کو لگام لگاتے ہیں۔ وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھتے اور اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں۔ وہ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو جنت میں عزت کا مقام پائیں گے۔

(۳۶-۴۴) ان لوگوں کے حال پر اظہارِ تعجب جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے عذاب و قیامت کا ذکر سنتے ہی آپ کا منہ بند کر دینے کے لیے آپ پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ ان کے اس زعم کی طرف اشارہ کہ ان کو اس دنیا میں جو عیش و آرام حاصل ہے آخرت ہوئی تو اس سے بڑھ کر وہاں ان کو عیش و آرام حاصل ہوگا۔ اس زعم کے سبب سے ان کے دلوں پر عذاب کی دھمکی بڑی شاق گزرتی تھی۔ ان کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی خلقت کو یاد رکھیں۔ نہ دوبارہ پیدا کیے جانے کو بعید از امکان سمجھیں اور نہ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ جو مشرق و مغرب کا رب ہے وہ ان کو دوبارہ پیدا کرنے پر پہلے بھی زیادہ قادر ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تلقینِ صبر کہ یہ لوگ جو سخن سازیاں کر رہے ہیں کر لینے دو۔ وہ یومِ موعود دور نہیں ہے جس دن یہ قبروں سے نہایت تیزی سے نکلیں گے، ان کی نگاہیں جھکی ہوئی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی۔

سُوْرَةُ الْمَعَارِجِ (۷۰)

مَكِّيَّةٌ ـــــــــ اٰيات : ۴۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ﴿۱﴾ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ ﴿۲﴾ آیات ۱-۴۴
مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ ﴿۳﴾ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ
يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ﴿۴﴾ فَاصْبِرْ صَبْرًا
جَمِيْلًا ﴿۵﴾ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا ﴿۶﴾ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ﴿۷﴾ يَوْمَ
تَكُوْنُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ﴿۸﴾ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ﴿۹﴾ وَلَا
يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ﴿۱۰﴾ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِيْ
مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۢ بِبَنِيْهِ ﴿۱۱﴾ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ﴿۱۲﴾ وَ
فَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ تُـْٔوِيْهِ ﴿۱۳﴾ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ
يُنْجِيْهِ ﴿۱۴﴾ كَلَّا اِنَّهَا لَظٰى ﴿۱۵﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ﴿۱۶﴾ تَدْعُوْا مَنْ
اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ﴿۱۷﴾ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾
اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾
اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَ
الَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾

وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ
رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾ وَالَّذِيْنَ
هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ
رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ
هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ
ع ۱ ۳۵ مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾ فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ﴿۳۶﴾
عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ ﴿۳۷﴾ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ
اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿۳۸﴾ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾
فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓى
اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿۴۱﴾ فَذَرْهُمْ
يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾
يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ
يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ
ع ۲ ۹ ۸ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾

ترجمۂ آیات ۱ — ۴۴ جلدی مچائی جلدی مچانے والے نے کافروں کے لیے واقع ہونے والے عذاب
کی ۔ اس کا کوئی دفع کرنے والا نہیں بنے گا ۔ وہ مدارج والے خداوند کی طرف سے ہوگا ۔

اس کی طرف فرشتے اور جبریل صعود کرتے ہیں ایک ایسے دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ تو تم خوبصورتی سے صبر کرو۔ وہ اس کو بہت دور خیال کر رہے ہیں اور ہم اس کو نہایت قریب دیکھ رہے ہیں۔ ۷

جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مانند ہو جائے گا اور پہاڑ دُھنی ہوئی اُون کے مانند اور کوئی دوست بھی کسی دوست کو نہ پوچھے گا۔ وہ ان کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم تمنّا کرے گا کہ کاش! اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں، اپنی بیوی، اپنے بھائی اور اپنے اس کنبہ کو جو اس کی پناہ رہا ہے اور تمام اہلِ زمین کو فدیہ میں دے کر اپنے کو بچا لے۔ ۸-۱۴

ہرگز نہیں! وہ ایسی آگ ہو گی جس کی لپٹ چمڑی ادھیڑ لے گی۔ وہ ان سب کو کھینچ بلائے گی جنھوں نے پیٹھ پھیری اور اعراض کیا، مال جمع کیا اور اس کو سینت سینت کر رکھا۔ ۱۵-۱۸

انسان بے صبرا پیدا کیا گیا ہے جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا جانے والا ہے اور جب اس کو کشادگی حاصل ہوتی ہے تو بخیل بن جاتا ہے۔ صرف نمازی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں اور وہ جن کے مالوں میں ایک معیّن حق ہوتا ہے سائلوں اور محروموں کا اور جو تصدیق کرتے ہیں جزا کے دن کی اور وہ جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہنے والے ہیں۔ بے شک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اور وہ جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے حد تک، سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ ہاں، جس نے اس

سے آگے بڑھ کر چاہا تو وہی لوگ حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنتوں میں، عزت کے ساتھ، رہنے والے ہوں گے۔ ۱۹ - ۳۵

تو ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ دہنے بائیں سے، تم پر پلے پڑ رہے ہیں گروہ در گروہ! کیا ان میں سے ہر ایک یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ جنت نعیم میں داخل کر لیا جائے گا! ہرگز نہیں! ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں! ۳۶-۳۹۔

پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے خداوند کی کہ ہم قادر ہیں اس بات پر کہ ہم ان کو بدل دیں ان سے بہتر سے اور ہم اس سے عاجز رہنے والے نہیں ہیں۔ پس ان کو چھوڑو یہ سخن گستری اور ہنسی مسخری کر لیں یہاں تک کہ اپنے اس دن سے دوچار ہوں جس کی ان کو دھمکی دی جا رہی ہے۔ جس دن نکلیں گے قبروں سے سرعت کے ساتھ گویا کہ وہ نشانوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان پر ذلت چھائی ہو گی۔ یہ ہے وہ دن جس سے وہ ڈرائے جاتے رہے ہیں۔ ۴۰-۴۴

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (۱)

سوال باندازِ استعجال

'سُوال' کے مختلف معانی پر اس کے محل میں بحث ہو چکی ہے یہاں اس کا صلہ 'ب' کے ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ استعجال یا استہزاء کے مفہوم پر متضمن ہے۔ یعنی ایک سوال کرنے والے نے واقع ہونے والے عذاب کی جلدی مچائی یا اس کا مذاق اڑایا۔ قریش کے متمردین کو جب عذاب سے ڈرایا جاتا تو وہ پوچھتے کہ وہ عذاب کہاں ہے؟ عذاب آتا ہے تو آ کیوں نہیں جاتا؟ ہم کب سے اس کے ڈراوے

سی رہے لیکن وہ میلا توراہ میں کہاں لنگرانداز ہو گیا کہ اب تک وہ نہیں پہنچا؟ اس طرح کے سوالات ظاہر ہے تحقیق کے لیے نہیں بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو زچ کرنے اور عذاب کا مذاق اڑانے کے لیے کیے جاتے تھے۔ ان سوالوں کے اندر جلد بازی اور استہزاء دونوں کے مفہوم پائے جاتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ اس جلد بازی کا مقصد ہی مذاق اڑانا ہوتا تھا۔ 'ب' کے صلہ نے 'سوال' کے اس مضمر مضمون کو واضح کر دیا اس لیے استعجال اور استہزاء دونوں کا صلہ 'ب' سے آتا ہے، مثلاً یَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ (العنکبوت ۲۹: ۵۴) اسی طرح اِسْتِهْزَاءٌ کا صلہ بھی 'ب' ہی آتا ہے۔

لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ (۲)

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کی حماقت

'لِلْكٰفِرِيْنَ'، کا تعلق 'وَاقِعٍ' سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی اس عذاب کا مذاق اڑاتے ہیں جو کافروں کے لیے واقع ہونے والا ہے اور اس کو مستقل جملہ بھی قرار دے سکتے ہیں، یعنی وہ جس عذاب کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ کافروں کے لیے ہوگا اور کوئی اس کو دفع کرنے والا نہیں بنے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی شامت ہی ہے جو ڈھٹائی سے اس کے لیے جلدی مچا رہے ہیں۔ وہ سیلاب فنا آیا تو آخر کس کے گھر جائے گا؟ انہی کے گھر تباہ کرے گا! اس کے مقابلہ کا کیا سامان انھوں نے کر رکھا ہے کہ اس طرح چیلنج کر رہے ہیں! اس کو دفع کرنے کا بوتا تو کسی میں بھی نہیں ہوگا، نہ ان کے اندر اور نہ ان کے مزعومہ معبودوں کے اندر، تو کس برتے پر اس کو دعوت دے رہے ہیں!

مِّنَ اللّٰهِ ذِي الْمَعَارِجِ (۳)

اللہ تعالیٰ کے دنوں کو اپنے دنوں پر قیاس نہ کرو

یعنی عذاب آئے گا تو ضرور۔ جس خدا نے اس کی دھمکی دی ہے اس کا ہر وعدہ اور اس کی ہر وعید شدنی ہے لیکن اس کی بارگاہ بہت بلند ہے۔ وہ بڑی بلندیوں، بڑے مدارج اور زینوں والا ہے۔ اس کے دربار سے جو احکام نازل ہوتے ہیں وہ اس کے اپنے پروگرام کے مطابق ہوتے ہیں اور ان سالوں اور دنوں کے اعتبار سے بنتے ہیں جو اس کے ہاں معتبر ہیں۔ اس کے ہاں کا ایک دن انسانی تقویم کے حساب سے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے دنوں اور سالوں کو لوگ اپنے محدود پیمانوں سے نہ ناپیں۔ انسان کی یہی تنگ نظری اس کو خدا کے فیصلوں کے بارے میں بے صبرا اور جلد باز بنا دیتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کرتا اور اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الگ الگ عالم بنائے ہیں اور ہر ایک کا مدار اور نظام الگ الگ ہے۔ ہم نہ تو اس کی کائنات کے سارے بھیدوں کو جان سکتے اور نہ اپنے دنوں اور اپنی گھڑیوں سے اس کے دنوں کا حساب کر سکتے۔ سورۂ حج میں اسی حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَ	وہ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں،
لَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ وَاِنَّ	حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا

يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ه (الحج - ۲۲ : ۴۷)

نہیں ہے۔ اور واضح رہے کہ تمھارے رب کے ہاں کا ایک دن تمھارے شمار کے ہزار سالوں کے برابر ہوتا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمھارے پیمانے بہت چھوٹے ہیں۔ تم ہر وعدے اور ہر وعید کو اپنے دنوں کے حساب سے جانچتے ہو اس وجہ سے تمھیں محسوس ہوتا ہے کہ فلاں وعدے پر بڑی طویل مدت گزر گئی اور وہ پورا نہیں ہوا حالانکہ خدائی دنوں کے حساب سے ابھی اس پر سیکنڈ یا منٹ سے زیادہ وقت نہیں گزرا ہوتا۔

تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (۴)

اللہ تعالیٰ کے 'ذی المعارج' ہونے کا مفہوم

یہ اللہ تعالیٰ کے ذِی الْمَعَارِجِ ہونے کی وضاحت ہے کہ اس کی بارگاہِ بلند تک پہنچنے کے لیے فرشتوں اور جبریلؑ کو بھی پچاس ہزار سال کے برابر کا دن لگتا ہے۔ 'معارج' کے معنی زینوں اور سیڑھیوں کے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ وراء الوراء اور وراء الوراء ہے۔ اس تک رسائی کے لیے دوسروں کا تو کیا ذکر ملائکہ اور جبریلؑ تک کا یہ حال ہے کہ اس راہ کے مراحل طے کرنے کے لیے انھیں پچاس ہزار سال کے برابر کا دن لگتا ہے۔

یہ باتیں متشابہات کی نوعیت کی ہیں۔ ان کی اصل حقیقت کا ادراک ہمارے لیے ناممکن ہے مقصود ان سے صرف یہ تصور دینا ہے کہ خدا کے معاملات کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔ اس کے ہاں کا ایک دن تمھارے ایک ہزار سال کے برابر کا ہوتا ہے اور بعض کاموں کے لیے اس نے پچاس ہزار سال کے برابر کے دن بھی رکھے ہیں۔ آیت زیر بحث میں اسی خاص دن کی طرف اشارہ ہے۔

'روح' سے مراد حضرت جبریل علیہ السلام ہیں۔ یہ عام کے بعد خاص کا ذکر ان کی عظمتِ شان کے پہلو سے ہے اس لیے کہ وہ تمام ملائکہ کے سرخیل ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں حضرت جبریل علیہ السلام کے لیے آیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض لوگوں نے اس دن سے مراد قیامت کے دن کو لیا ہے اور اس کا یہ طول ان کے نزدیک اس کے ہول اور شدت کی تعبیر ہے۔ ہمارے نزدیک یہ رائے موقع و محل کے بھی خلاف ہے اور عربیت کے بھی۔ یہاں مقصود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ کی بلندی کا اظہار ہے نہ کہ روزِ قیامت کی شدت کا۔ روزِ قیامت کی شدت اور اس کے ہول کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ ہر چند خدا کی بارگاہ بہت بلند ہے، وہ تمام خلق سے وراء الوراء ہے لیکن وہ ساتھ ہی ہر شخص کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ وہ سب کو دیکھتا، سب کی سنتا اور سب کی نگرانی کر رہا ہے۔ ہم اگرچہ اس کو دیکھنے سے قاصر ہیں لیکن وہ ہم کو ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ ہماری نگاہیں اس کو

نہیں پا سکتیں لیکن وہ ہماری نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (الانعام - ۶ : ۱۰۳) اس وجہ سے نہ تو اس ... کو لیے خوف ہونا جائز ہے نہ مایوس۔

یہی حال فرشتوں کا ہے۔ ان کو اگرچہ اس تک صعود کے لیے پچاس ہزار سال کے برابر کا دن لگتا ہے لیکن اس کے باوجود تمام ملائکہ ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہیں۔ وہ جب چاہے ان کو حکم دے سکتا ہے اور جب چاہے ان کو پکڑ لے سکتا ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيبًا (۵-۷)

پیغمبر صلعم کو صبر جمیل کی ہدایت

عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کے مقابلہ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو جو رویہ اختیار کرنا چاہیے یہ اس کا بیان ہے۔ فرمایا کہ ان کی جلد بازی اور ان کے استہزاء پر خوبصورتی اور وقار کے ساتھ صبر کرو۔ 'خوبصورتی کے ساتھ' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے رویہ سے نہ تو دل شکستہ اور مایوس ہو نہ ان کے جواب میں کوئی عاجلانہ قدم اٹھاؤ اور نہ اپنے موقف میں کوئی کمزوری پیدا ہونے دو۔ مختلف صورتوں میں صبر کی ہدایت کے ساتھ ان باتوں کی طرف اشارے بھی فرما دیے گئے ہیں جو صبر کو صبر جمیل بنانے کے لیے ضروری ہیں۔

اہل بصیرت قیامت کو دور نہیں سمجھتے

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيبًا یعنی ان لوگوں کی نظر بہت محدود ہے اس وجہ سے یہ اس عذاب کو جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے بہت دور خیال کر رہے ہیں حالانکہ ہم اس کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں اور اصل دیکھنا ہمارا دیکھنا ہے۔ اگر ان کے اندر بھی بصیرت ہوتی تو یہ بھی اس کو قریب ہی دیکھتے لیکن ان کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔ اس وجہ سے انھیں قریب کی چیز دور دکھائی دے رہی ہے۔ وہ دن آئے گا تو یہ پٹی کھل جائے گی اور ہر شخص دیکھ لے گا کہ جس چیز کو وہ بہت دور سمجھا تھا وہ نہایت قریب نکلی۔ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (قٓ - ۵۰ : ۲۲) (پس آج تو تیری نگاہ بہت تیز ہے) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے ——— یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ جن کی نگاہوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت ہوتی ہے وہ اس مغالطہ میں مبتلا نہیں ہوتے۔ صاحب بصیرت اللہ کی روشنی سے دیکھتا ہے اس وجہ سے جس طرح اللہ تعالیٰ اس دن کو قریب دیکھتا ہے اسی طرح مومن بھی اس کو قریب ہی دیکھتا ہے۔

يَوْمَ تَكُونُ السَّمَآءُ كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ (۸-۹)

قیامت کے ہول کی تصویر

یہ قیامت کی ہلچل اور اس کے ہول کی تصویر ہے تاکہ جو لوگ اس کو بصیرت کی آنکھوں سے نہیں دیکھ رہے ہیں وہ اس تصویر کو دیکھ کر اس سے کچھ عبرت پکڑیں۔ فرمایا کہ اس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کے مانند ہو جائے گا اور پہاڑ دھنی ہوئی اُون کے مانند۔

لفظ مُهْل مختلف معانی میں آتا ہے۔ سورۂ کہف میں یہ لفظ گزر چکا ہے وہاں مناسب قرینہ

معنی کی وضاحت ہم نے کر دی۔ یہ تیل اور تیل کی تلچھٹ کے معنی میں بھی آیا ہے۔ یہ معنی لیجیے تو مقصود آسمان کی رنگت کو تیل کی سرخ سیاہی مائل تلچھٹ سے تشبیہ دینا ہوگا۔ سورۂ رحمان میں بھی آسمان کی سرخی کا ذکر آیا ہے: فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ (الرحمٰن - ۵۵: ۳۷) (وہ کھال کی مانند سرخ ہوگا)

وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ۔ لفظ 'عِهْن' کے معنی اون کے ہیں اور اس سے مراد یہاں دُھنی ہوئی اُون ہے، جیسا کہ سورۂ قارعہ میں فرمایا ہے: وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوشِ (القارعة - ۱۰۱: ۵) (اور پہاڑ دُھنی ہوئی اُون کے مانند ہو جائیں گے)۔

یہ احوالِ قیامت سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں جو از قبیلِ متشابہات ہیں۔ ان کی اصل حقیقت یہاں سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ لیکن ذہن اس طرف جاتا ہے کہ آسمان کی سرخی نتیجہ ہوگی جہنم کے شعلوں کے بھڑکنے کا اور پہاڑ دھنی ہوئی اون کے مانند پراگندہ کر دیے جائیں گے تاکہ جو لوگ پہاڑوں کو لازوال سمجھتے رہے ہیں وہ ان کی بے ثباتی کا مشاہدہ کر لیں۔ ظاہر ہے کہ جب پہاڑوں کا یہ حال ہوگا تو دوسری چیزوں کا کیا ذکر! یہ باتیں ان نادانوں کی تنبیہ کے لیے سنائی گئی ہیں جن کو اپنی قوت و جمعیت اور اپنے قلعوں اور گڑھیوں پر بڑا ناز تھا ـــــ معلوم ہوا کہ اس دن سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا اور ایک نیا عالم بالکل نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ظہور میں آئے گا۔

وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا (۱۰)

اس دن کی نفسی نفسی کی تصویر

یعنی اس دن ہر شخص پر ایسی نفسی نفسی کی حالت طاری ہوگی کہ جو عمر بھر اس دنیا میں باہم دگر جگری دوست بنے رہے اور جنھوں نے ایک دوسرے کی خاطر اپنی جان اور اپنے مال سب کچھ قربان کیے اس دن اس طرح آنکھیں پھیر لیں گے کہ کوئی کسی کا حال پوچھنے کا بھی روادار نہ ہوگا۔

يُبَصَّرُونَهُمْ ۚ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۙ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۙ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۙ ثُمَّ يُنْجِيهِ (۱۱-۱۴)

یعنی اس دن وہ ایک دوسرے سے اوجھل نہیں ہوں گے کہ ان کے اندر حمیت و حمایت کا جذبہ نہ ابھرے۔ بلکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے اور یہ ساری مصیبت ان پر ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے گزرے گی لیکن وقت ایسی نفسی نفسی کا ہوگا کہ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ ہوگا۔ سورۂ عبس آیت ۳۴ میں بھی یہ مضمون بیان ہوا ہے۔ وہاں، ان شاء اللہ، اس کی پوری وضاحت ہو جائے گی۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۙ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۙ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۙ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنْجِيهِ۔ اس دن کا عذاب ایسا ہولناک ہوگا کہ گنہگار متمنی ہوں گے کہ کاش! اپنے محبوب سے محبوب عزیزوں کو فدیہ میں دے کر اس سے اپنے کو چھڑا سکیں تو چھڑا لیں۔ باپ اپنے بیٹوں کو فدیہ میں دے دینا چاہیں گے، شوہر اپنی بیوی

بھائی اپنے بھائی، صاحب کنبہ اپنے کنبہ و خاندان بلکہ زمین کی ساری مخلوق کو چاہے گا کہ فدیہ میں دے کر اس عذاب سے اپنی جان بچا لے جائے۔ لیکن یہ تمنا تمنا ہی رہے گی۔ اس دن نہ کسی کے پاس کوئی چیز فدیہ میں دینے کے لیے ہوگی اور نہ کسی کا کوئی فدیہ قبول ہوگا بلکہ ہر ایک کو وہ عذاب بھگتنا پڑے گا جس کا وہ مستحق ٹھہرے گا۔

غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت میں وہ تمام رشتے مذکور ہوئے ہیں جن کے لیے آدمی میں فطری محبت اور حمایت و مدافعت کی گہری حمیت ہوتی ہے۔ کنبہ و خاندان کے ذکر کے ساتھ خاص طور پر اس کی صفت 'تؤویہ' آئی ہے یعنی جو خاندان زندگی بھر اس کا ملجا و مامن رہا، جس نے دشمنوں سے اس کی حفاظت کی اور جس کی مدافعت میں وہ خود عمر بھر سربکف رہا، اس کو بھی وہ فدیہ میں دے کر اپنے کو بچانے کی تمنا کرے گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ بدویانہ دورِ زندگی میں خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و مدافعت کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جو شخص قبیلہ و خاندان کی مدافعت میں سربکف رہتا وہ ہیرو سمجھا جاتا اور جو قبیلہ کے مفاد کو اپنے مفاد پر قربان کرتا یا کسی خطرے کے وقت اس کی مدافعت سے جی چراتا نہ وہ خود کہیں منہ دکھانے کے قابل رہتا نہ اس کی آئندہ نسلیں۔

كَلَّا ۖ إِنَّهَا لَظَىٰ ﴿١٥﴾ نَزَّاعَةً لِّلشَّوَىٰ ﴿١٦﴾ (۱۵-۱۶)

لیعنی اس عذاب سے بچنے کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہوگی۔ اس کے شعلے دور ہی سے مجرم کی چمڑی ادھیڑ لیں گے۔ اس دن کسی کے لیے کوئی مفر نہ ہوگا

'کَلَّا' ان مجرموں کی تمنا کی تردید کے لیے ہے جو مذکور ہوئی۔ یعنی ان کی عذاب سے بچنے کی یہ تمنا ہرگز پوری نہ ہوگی۔

'اِنَّهَا لَظٰی' - 'اِنَّهَا' میں ضمیر کا مرجع وہی عذاب ہے جو مذکور ہوا۔ اس سے مراد چونکہ عذابِ نار ہے اس وجہ سے ضمیر مؤنث آئی۔ 'لظی' کے معنی شعلے کے ہیں۔ 'شوی' سر اور اطرافِ بدن کی کھال کے لیے آتا ہے۔ یعنی اس آگ کے شعلوں کی لپٹ ایسی ہوگی کہ دور ہی سے مجرموں کی کھڑی کھینچ لے گی۔

'نَزَّاعَةً' کو خبر کے بعد دوسری خبر بھی مان سکتے ہیں اور حال بھی۔ دونوں ہی صورتوں میں کوئی قابلِ لحاظ فرق معنی میں پیدا نہیں ہوگا۔

تَدْعُوا مَنْ أَدْبَرَ وَتَوَلَّىٰ (۱۷)

یعنی آج تو اللہ کی بندگی، اس کے عذاب سے بچنے اور اس کی راہ میں انفاق کی دعوت دی جاتی ہے تو لوگ پیٹھ پھیرتے اور اعراض کرتے ہیں لیکن اس دن جہنم کے عذاب سے پیٹھ پھیرنے اور اعراض

کرنے کا کوئی امکان نہ ہوگا۔ جہنم سارے اعراض و انکار کرنے والوں کو کھینچ بلائے گی۔ لفظ 'تَدْعُوْا' یہاں نہایت بلیغ ہے۔ یعنی پیغمبر کی پُر محبت دعوت جن کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے وہ یاد رکھیں کہ ان تنگ دلوں کو ایک دن جہنم بلائے گی اور اس طرح بلائے گی کہ کسی کے لیے بھی کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہے گی۔

وَجَمَعَ فَاَوْعٰی (۱۸)

بخیلوں کا انجام

یہ خاص طور پر بخیلوں کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ ایمان بالآخرت اور انفاق کی دعوت سب سے شاق انہی کے دلوں پر گزرتی ہے۔ آخرت کی فلاح کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنا مال اس دنیا کی تجوریوں میں بند رکھنے کے بجائے خدا کے بنک میں جمع کرے۔ بخیل اس کو خسارے کا سودا سمجھتا ہے۔ نہ وہ جزاء و سزا پر اعتقاد ہی رکھتا اور نہ آخرت کے نسیہ کی خاطر اپنا نقد مال قربان کرنے کا وہ حوصلہ ہی اپنے اندر پاتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کی مخالفت میں بخیل سب سے پیش پیش رہے ہیں۔ بخالت اور جزاء و سزا کی تکذیب دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ قرآن میں ارشاد ہے: 'اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ہ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ہ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ' (الماعون ۱۰۷: ۱-۳) (دیکھا اس کو جو جزاء کو جھٹلاتا ہے! وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھلانے پر لوگوں کو نہیں ابھارتا)۔

'جَمَعَ' کے ساتھ 'فَاَوْعٰی' کے لانے سے مقصود اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ انھوں نے آنکھیں بند کر کے حرام و حلال ہر راہ سے، مال جمع بھی کیا اور پھر اس کو نہایت اہتمام سے گن گن کر محفوظ بھی کیا۔ دوسرے مقام میں بخیلوں کی اسی خصلت کو 'جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ' (الھمزۃ ۱۰۴: ۲) (مال جمع کیا اور اس کو گن گن کر رکھا) سے تعبیر کیا ہے ـــــ فرمایا کہ اس طرح کے بخیلوں کو بھی جنھوں نے جزا پر ایمان نہ رکھنے کے سبب سے پیغمبر کی دعوتِ انفاق سے اعراض کیا اس دن جہنم کی آگ کھینچ بلائے گی۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا ہ لا اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ہ لا وَّاِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا (۱۹-۲۱)

'ھَلُوع' کے معنی جلد باز، بے صبرے اور تھڑدلے کے ہیں۔

عام لفظ سے خاص گروہ کی طرف اشارہ

لفظ 'انسان' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں اس سے اشارہ انہی انسانوں کی طرف ہے جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ اللہ نے ان کو مہلت دی تو اس کی قدر کرنے کے بجائے عذاب کی جلدی مچائے ہوئے ہیں اور ابھی پکڑ میں آ جائیں تو واویلا شروع کر دیں گے۔ خدا نے مال دیا ہے تو اس سے آخرت کی کمائی کرنے کے بجائے اس پر مارِ گنج بن کر بیٹھ گئے ہیں، اس کو اپنی قابلیت و ذہانت کا ثمرہ اور اپنے استحقاق کا کرشمہ سمجھ رہے ہیں اور اس گھمنڈ میں مبتلا ہیں کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کے منظورِ نظر ہیں اس وجہ سے انھیں یہ برابر حاصل رہے گا اور اگر آخرت ہوئی تو

وہاں اس سے بھی زیادہ ان کے لیے محفوظ ہے۔ لیکن ابھی کوئی افتاد پیش آجائے تو فوراً مایوس اور دل شکستہ ہو کر واویلا شروع کر دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی شیخی اور اکڑ کی پروا نہ کرو۔ یہ نہایت اوچھے اور تھڑدلے لوگ ہیں۔

کسی خاص جماعت کو جب اس طرح کسی عام لفظ سے ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مقصود، جیسا کہ اس کے محل میں ہم واضح کر چکے ہیں، بے اعتنائی بلکہ اس کی تحقیر کا اظہار ہوتا ہے۔ گویا متکلم نے اس کو اس قابل نہیں سمجھا کہ اس کو مخاطب کرے یا اس کی طرف اشارہ بھی کرے۔ یہ اسلوبِ بیان ہماری اپنی زبان میں بھی معروف ہے۔

داعیات میں عدم توازن — اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا' اسی طرح کا اسلوبِ بیان ہے جس طرح سورۂ انبیاء آیت ۳۷ میں 'خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ' یا سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۱ میں 'وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا' آیا ہے۔ انسانی فطرت کے اندر جس طرح شہوت، غضب، حرص اور اس قبیل کے دوسرے داعیات کا ایک مقام ہے اسی طرح عجلت کا بھی ایک موقع و محل ہے۔ یہ شے بجائے خود مذموم نہیں ہے۔ مذموم اگر ہے تو اس کا بے محل یا غیر معتدل ظہور ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو متضاد داعیات کی کشمکش میں پیدا کر کے اس سے یہ چاہا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق، جن کی تعلیم اس کو نبیوں کے ذریعہ سے دی گئی ہے، ان کے اندر توازن و ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات اور اس کے قوانین کا تابع بنائے۔ اس امتحان میں کامیابی ہی پر انسان کی تمام اخروی سعادت کا انحصار ہے۔ اختیار کا شرف بھی اس کو اس امتحان کے لیے عطا ہوا ہے۔ یہ امتحان مقصود نہ ہوتا تو انسان کو اختیار سے مشرف کرنے کے کوئی معنی بھی نہ ہوتے اور اس کو دوسری مخلوقات پر برتری حاصل کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ ہوتی۔

آیت میں جس چیز کو 'ھلع' سے تعبیر فرمایا گیا ہے یہ بھی جلد بازی اور بے صبری ہی کی ایک شکل ہے۔ اگر یہ چیز انسان پر اس طرح غالب ہو جائے کہ دوسرے متقابل داعیات اس کے آگے مغلوب ہو جائیں تو ایسی صورت میں یہ کہنا بالکل مطابقِ حال ہوتا ہے کہ اس کی تخلیق گویا اسی عنصر سے ہوتی ہے۔ ہانڈی میں نمک ناقابلِ برداشت حد تک زیادہ ہو جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہانڈی نمک ہی سے تیار ہوئی ہے۔

اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ (۲۲-۲۳)

عدم توازن سے پاک گروہ — یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس عدم توازن یا بے راہ روی سے پاک ہیں جس کا ذکر اوپر ہوا۔ فرمایا کہ نمازی اس سے مستثنیٰ ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفس کے متضاد داعیات میں صحیح توازن اور نقطۂ اعتدال پیدا کرنے میں اوّلین عامل کی حیثیت نماز کو حاصل ہے۔ جو شخص اپنی تربیت اس طرح کرنا چاہے کہ شیطان اس کو

کسی بے راہ روی میں مبتلا نہ کرنے پائے اس کے لیے سب سے اول شے نماز کا اہتمام ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص اس مقصد میں کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔

نماز صحیح توازن پیدا کرتی ہے

رہا یہ سوال کہ نماز میں وہ کیا چیز ہے جس کے سبب سے اس مقصدِ تربیت میں اس کو اولیت حاصل ہے تو یہاں اس کے تفصیلی جواب کا محل نہیں ہے۔ اس کے جواب میں ہم نے 'حقیقتِ نماز' کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے۔ تفصیل کے طالب اس کا مطالعہ کریں۔ یہاں ہم اس کے صرف انہی پہلوؤں کو زیرِ بحث لائیں گے جن کی طرف قرآن نے اس مقام میں اشارہ کیا ہے۔

عمل کے اندر روح مداومت سے پیدا ہوتی ہے

'اَلَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ'۔ فرمایا کہ اس مقصد کے لیے انہی نمازیوں کی نماز کارآمد ہے جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں۔ یہ ایک نہایت اہم تنبیہ ہے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کا بھی مختلف پیرایوں سے ذکر ہوا ہے، جن کا حال یہ ہے کہ یوں تو ان کو کبھی ذکرِ الٰہی یا سجدہ کی توفیق نہیں ہوتی لیکن ان پر کوئی مصیبت آجائے تو بڑے نمازی اور بڑی لمبی لمبی دعائیں کرنے والے بن جاتے ہیں۔ پھر جونہی وہ مرحلہ گزر جائے وہ کان جھاڑ کے اس طرح اس سے الگ ہو جاتے ہیں گویا خدا سے نہ کبھی ان کو کوئی سابقہ پڑا ہے اور نہ اب آئندہ کبھی پڑنے والا ہی ہے۔ اس طرح کی نماز چونکہ اسی عدم توازن کا ایک مظہر ہے جس کا یہاں علاج بتایا جا رہا ہے اس وجہ سے یہ نماز ان کی تربیت میں کچھ نافع نہیں ہوتی۔ نافع وہ نماز ہوتی ہے جس کی مداومت کی جائے اور گرم و سرد ہر طرح کے حالات میں اس کی پابندی قائم رہے۔ پابندی کے ساتھ تھوڑا عمل اس عمل سے کہیں زیادہ بابرکت ہے جو اگرچہ مقدار میں زیادہ ہو لیکن وہ محض وقتی اور ہنگامی ہو۔ ایک زور کا دونگڑا برس کر اگر ابر طویل عرصے کے لیے غائب ہو جائے تو فصلیں سوکھ کر تباہ ہو جاتی ہیں، برعکس اس کے تھوڑی بارش بھی جھڑی کی شکل میں قائم و دائم رہے تو وہ کھیتوں کو شاداب رکھتی اور فصلوں کو بارآور کرتی ہے۔ یہی حال نماز کا بھی ہے۔ دین کا جو عام مطالبہ ایک مسلمان سے ہے اگر وہ اسی کو پابندی اور تسلسل کے ساتھ پورا کرے تو اس کے عمل میں جو برکت ہوگی وہ ان لوگوں کے عمل میں نہیں ہوگی جو گاہ گاہ تو بڑے نمازی بن جاتے ہیں لیکن پھر اس طرح بھول جاتے ہیں کہ مسجد کی صورت بھی نہیں دیکھتے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو جھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی آپ جو عمل کرتے اس کی مداومت فرماتے اگرچہ اس کی مقدار تھوڑی ہو۔ عمل کی یہی مداومت اس کے اندر قوت، روح اور زندگی پیدا کرتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ فِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۲۴-۲۵)

نماز کے بعد انفاق دین کا دوسرا بازو ہے

یہ دین کے دوسرے بازو یعنی اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق کا بیان ہے۔ ہم جگہ جگہ یہ واضح کر چکے ہیں کہ دین کے اعمال میں نماز اور انفاق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ نماز بندے کو خدا سے

جوڑتی ہے اور انفاق سے اس کا تعلق بنی نوعِ آدم سے صحیح بنیاد پر استوار ہوتا ہے۔

'حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ' کے الفاظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس سے زکوٰۃ ہی مراد ہو۔ زکوٰۃ کا سسٹم ایک معیّن شرحِ نصاب کے ساتھ تو مدنی دور میں نافذ ہوا اور یہ سورہ مکّی ہے، بلکہ اس سے مراد اس حقیقت کا اظہار ہے کہ ان کا انفاق محض رسمی طور پر چھدا اتارنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ ایک حقِ واجب کی حیثیت سے، ایک معلوم مقدار میں، اپنے مال کا ایک حصہ خدا کی راہ میں دیتے ہیں۔

زمانۂ جاہلیت میں زکوٰۃ کا تصور

یہ امر یہاں واضح رہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی لوگ زکوٰۃ اور انفاق سے ناآشنا نہیں تھے۔ سورۂ انعام سے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین بھی خدا کا حق اپنے مال میں سے نکالتے تھے لیکن اپنے مشرکانہ زعومات کے تحت اس میں انھوں نے اپنے معبودوں کو بھی شریک کر رکھا تھا۔ حنیفیت کے پیرو تو خالص موحّد تھے اس وجہ سے وہ جو کچھ بھی نکالتے صرف اللہ تعالیٰ ہی کے حق کی حیثیت سے نکالتے۔ ان کے درمیان حضرت اسماعیل علیہ السلام سے متعلق یہ روایت موجود تھی کہ 'وَکَانَ یَاْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ' (مریم - ۱۹: ۵۵) (اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے)۔ اس وجہ سے یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اسلام سے پہلے اہلِ عرب انفاق فی سبیل اللہ کی کسی معیّن شکل سے بالکل ناآشنا تھے۔ مدنی دور میں زکوٰۃ کی جو شرح معیّن ہوئی وہ اس شرح سے مختلف تو ہو سکتی ہے جو لوگوں میں پہلے رائج رہی ہو لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زمانۂ جاہلیت کے نیکوں کے اندر بھی زکوٰۃ کی ایک معیّنہ شکل معروف تھی۔ چنانچہ اسی وجہ سے مکّی سورتوں میں بھی زکوٰۃ کا لفظ بار بار آیا ہے۔ ملّتِ ابراہیم کی دوسری تعلیمات کی طرح یہ زکوٰۃ بھی بدعات کے حجاب میں گم تھی لیکن اس کا نام باقی تھا۔ اسلام نے اس کو اجاگر اور از سرِ نو اس کی کامل صورت میں اسلامی معاشرے کے اندر نافذ کیا۔

'سائل' اور 'محروم'

'لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ'۔ 'سَآئِلٌ' سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کے آگے دستِ سوال پھیلاتا ہے۔ اس کا یہ عمل ہی گواہ ہے کہ وہ محتاج ہے اس وجہ سے مدد کا مستحق ہے۔ ایسے سائلوں کے متعلق زیادہ تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی جو کچھ دے سکے وہ دے دے، نہ دے سکے تو شائستہ طریق سے معذرت پیش کر دے۔ ان کو جھڑکنا یا ملامت کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ یہاں سچے نمازیوں کی یہ صفت بیان ہوئی ہے کہ ان کے مال میں سائلوں کا ایک معیّن حق ہوتا ہے۔

'مَحْرُوْمٌ' سے مراد تو ظاہر ہے کہ وہ شخص ہے جو وسائلِ معاش سے محروم ہو لیکن یہاں یہ لفظ چونکہ 'سَآئِل' کے ساتھ آیا ہے اس وجہ سے اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وہ محروم ہونے کے باوجود لوگوں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کا ننگ گوارا نہ کرتا ہو۔ بعض نادار ایسے خود دار ہوتے

ہیں جو فاقے کرتے ہیں لیکن سوال کی ذلت گوارا نہیں کرتے۔ خاص طور پر وہ مصیبت زدہ جو پہلے صاحب حیثیت رہے ہوں پھر گردشِ روزگار کے ہاتھوں نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے ہوں۔ اس طرح کے خوددار لفظ 'محروم' کے اصلی مصداق ہیں۔ ان کی مدد ان کو تلاش کر کے بلکہ ان کے آگے، جیسا کہ بعض آیات سے اشارہ نکلتا ہے، جھک کے کرنی پڑتی ہے۔ اس لیے کہ ان کی بلند ہمتی کسی کے آگے جھکنا گوارا نہیں کرتی۔ ع

ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را

وَالَّذِیْنَ یُصَدِّقُوْنَ بِیَوْمِ الدِّیْنِ ۝ وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ (۲۶-۲۷)

انفاق کا اصلی محرک

یہ ان کے اس انفاق کے محرک کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ چونکہ یہ لوگ روزِ جزا پر ایمان رکھتے ہیں اس وجہ سے انھوں نے اپنے مال میں غریبوں اور محتاجوں کا ایک حق معین کر رکھا ہے۔ اوپر ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے لیے غریبوں اور محتاجوں کا حق پہچاننا نہایت مشکل ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: 'اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۝ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ' (الماعون - ۱۰۷: ۱-۲) (بھلا دیکھا تم نے اس کو جو روزِ جزا کو جھٹلاتا ہے، وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے)۔

'وَالَّذِیْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ' یہ اسی تصدیق بیوم الدین کی وضاحت ہے کہ وہ جزاء و سزا پر ایمان رکھتے ہیں اس وجہ سے اپنے رب کے عذاب سے برابر لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ ان کے اس باطن پر سورۂ دہر میں یوں روشنی ڈالی گئی ہے: 'یُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَیَخَافُوْنَ یَوْمًا کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا ۝ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا' (الدھر - ۷۶: ۷-۱۰) (وہ اپنی نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہوگی اور مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی کمیابی اور اس کے ضرورت مند ہونے کے باوجود۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف رضائے الٰہی کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکرگزاری کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت منحوس قسم کے دن کا اندیشہ رکھتے ہیں)۔

انفاق کا یہی محرک فطری، بے ریا، بے غرض اور پاکیزہ محرک ہے اس وجہ سے قرآن نے اسی کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے سوا جو دوسرے محرکات ہیں یا جو مصنوعی طور پر پیدا کیے جاتے ہیں وہ تمام ترکاروباری محرکات ہیں جن سے نہ تو نفس کی کوئی اصلاح ہوتی ہے اور نہ ان کے تحت کیا ہوا انفاق خدا کے ہاں مقبول ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت پیچھے بھی ہو چکی ہے اور آگے بھی اس کے بعض اہم

پہلو ان شاء اللہ، روشنی میں آئیں گے۔

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ (۲۸)

یہ اوپر والے ٹکڑے پر نہایت بلیغ استدراک ہے کہ جو لوگ اپنے رب کے عذاب سے اس طرح لرزاں و ترساں ہیں وہ بڑے ہی دانش مند ہیں۔ ان کے رب کا عذاب چیز ہی ایسی ہے کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس سے بے خوف نہ رہا جائے۔ نہیں معلوم وہ کس وقت آدھمکے اور جب بھی آدھمکے کوئی نہیں ہے جو اس کو ٹال سکے یا تھوڑی دیر کے لیے اس کے رخ ہی کو موڑ سکے ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہنے کی سب سے مؤثر تدبیر کوئی ہے تو وہ غریبوں مسکینوں کو کھلانا پہنانا ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (۲۹-۳۱)

طہارتِ اخلاق

نماز، انفاق اور خشیتِ الٰہی کے بعد یہ ان کے اخلاق کی طہارت کی طرف اشارہ فرمایا کہ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ وہ سانڈ بن کر تمام حدودِ الٰہی کو توڑ تاڑ کر رکھ دیں۔ وہ اپنی جنسی خواہشوں کو اپنی بیویوں اور لونڈیوں[1] تک محدود رکھتے ہیں۔ اس حد سے تجاوز کرنے کی جسارت نہیں کرتے۔ اور جو لوگ اس سے تجاوز کرتے ہیں وہ یاد رکھیں کہ وہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ حدودِ الٰہی سے تجاوز کی سزا بھگتیں گے اس لیے کہ خدا اپنے حدود کی بے حرمتی کرنے والوں سے ضرور انتقام لے گا۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ (۳۲)

ایک ہی بات جو نیکیوں کا شیرازہ ہے

یہ ایک ہی جامع بات بہت سی نیکیوں کا شیرازہ ہے۔ فرمایا کہ اور وہ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس رکھنے والے ہیں؛

لفظ 'امانت' محدود معنی میں نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر لوگوں نے سمجھا ہے، بلکہ انسان کی جتنی قوتیں اور صلاحیتیں ہیں اور جن اسباب و وسائل سے بھی اللہ تعالیٰ نے اس کو بہرہ مند فرمایا ہے، وہ سب اس کی تحویل میں امانت ہیں اور ایک دن ان میں سے ایک ایک کی بابت اللہ تعالیٰ پوچھے گا کہ ان کے استعمال میں کوئی خیانت تو نہیں کی گئی ہے؛ قرآن میں تصریح ہے کہ سمع و بصر اور عقل و دل کی تمام صلاحیتوں سے متعلق ایک دن پرسش ہونی ہے اور جس نے بھی کوئی خیانت کی ہو گی وہ اس کی سزا بھگتے گا۔ اسی طرح یہ بھی تصریح ہے کہ قیامت کے دن ہر نعمت سے متعلق سوال ہو گا۔

---

[1] لونڈیوں اور غلاموں کے مسئلہ پر سورۂ نور کی تفسیر میں مفصل بحث گزر چکی ہے۔

اسی طرح لفظ 'عہد' بھی یہاں وسیع معنوں میں ہے۔ وہ عہد بھی اس میں شامل ہے جو باہمی قول و قرار سے ہمارے اندر وجود میں آتا ہے، وہ عہد بھی اس میں شامل ہے جو اگرچہ قول و قرار سے وجود میں نہیں آتا لیکن ہر اچھے معاشرے میں وہ مسلّم اور معروف ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت سے جو عہد لیا ہے وہ بھی اس میں شامل ہے اور سب سے زیادہ اہم حصہ اس کا وہ عہد و میثاق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہم سے لیا ہے اور جس کی دفعات نہایت وضاحت سے شریعت میں مرقوم ہیں۔

وَالَّذِينَ هُم بِشَهَادَاتِهِمْ قَائِمُونَ (۳۳)

شہادت وسیع معنوں میں

جس طرح اوپر والی آیت میں امانت اور عہد کے الفاظ وسیع معنوں میں استعمال ہوئے ہیں اسی طرح لفظ 'شہادت' اس آیت میں وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ہر شخص چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی اس شہادت کے ادا کرنے کا ذمہ دار ہے جس کا بار اس نے اپنے سر لیا ہے اور اس شہادتِ کبریٰ کے ادا کرنے کا بھی ذمہ دار ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا[1] (البقرۃ - ۲ : ۱۴۳) والی آیت میں مامور فرمایا ہے۔

وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ (۳۴)

نماز ہی دین کے لیے حصار ہے

اب یہ آخر میں نماز کا پھر ذکر فرمایا۔ آیات ۲۲-۲۳ میں نماز ہی سے ان صفات کے بیان کا آغاز فرمایا تھا اور اب اسی پر اس باب کو ختم کیا جس سے یہ بات بالبداہت نکلتی ہے کہ نماز ہی ان تمام نیکیوں کا منبع بھی اور وہی ان کی محافظ بھی ہے۔ گویا تمام دین و اخلاق کے لیے نماز کی حیثیت حصار کی ہے۔ جس نے اس حصار کو محفوظ رکھا وہ اپنے دین کو محفوظ رکھے گا اور جس نے اس حصار کو توڑ دیا وہ اپنے سارے دین کو ضائع کر بیٹھے گا۔ اس حقیقت کی وضاحت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یوں فرمائی ہے کہ 'جو اپنی نماز کو ضائع کر دے گا وہ باقی دین کو بدرجۂ اولیٰ ضائع کر بیٹھے گا'۔

یہاں اس پہلو پر بھی نگاہ رہے کہ اوپر والی آیت میں نماز کی مداومت کا ذکر ہے اور اس آخری آیت میں اس کی محافظت کی تاکید ہے۔ محافظت سے مراد نماز کو ان آفات و خطرات سے محفوظ رکھنا ہے جو اس کی افادیت کو برباد کر دینے والے ہیں۔ مثلاً یہ کہ نماز پڑھی تو جائے لیکن اوقات کی پابندی یا جماعت کی حاضری کا اہتمام نہ رکھا جائے، یا نماز کے ساتھ ایسے افعال کا ارتکاب کیا جائے جو اس کے مقصد کے منافی ہوں۔ ان خطرات و آفات کی پوری وضاحت ہم نے اپنے رسالہ 'حقیقتِ نماز' میں بھی کی ہے اور اپنی کتاب 'تزکیۂ نفس' میں بھی۔ جن کو تفصیل مطلوب ہو

---

[1] تاکہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے۔

ان کی مراجعت کریں۔[1]

أُولَٰئِكَ فِي جَنَّاتٍ مُّكْرَمُونَ (۳۵)

فرمایا کہ یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہوں گے جنت کے باغوں میں، عزت و اکرام کے ساتھ براجمان ہوں گے۔

قریش کے مغروروں کو تنبیہ

اس میں قریش کے ان مغروروں پر تعریض ہے جو اپنی موروثی سیادت کے پندار میں اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کا منظورِ نظر سمجھے بیٹھے تھے۔ ان کا زعم یہ تھا کہ آخرت ہوئی تو جس طرح اس دنیا میں وہ نعمتوں کے مستحق قرار پائے ہیں اسی طرح آخرت میں بھی مدارجِ عالیہ کے مستحق ٹھہریں گے اور جو لوگ یہاں مفلوک الحال ہیں وہ وہاں بھی اسی طرح مفلوک الحال رہیں گے۔ ان لوگوں کو آگاہ فرمایا گیا ہے کہ جنت وراثت میں منتقل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق آدمی کے کردار و اعمال سے ہے۔ جو لوگ وہ کردار اپنائیں گے جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہے وہ جنت میں جائیں گے، خواہ امیر ہوں یا غریب، اور جو اس کردار سے محروم ہوں گے وہ اس کی بو بھی نہ سونگھیں گے، خواہ وہ عرب کے صنادید میں سے ہوں یا عجم کے صنادید میں سے۔

فَمَالِ الَّذِينَ كَفَرُوا قِبَلَكَ مُهْطِعِينَ ۝ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِينَ[2] ۝ أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَن يُدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيمٍ (۳۶-۳۸)

قرآن کا یہ فیصلہ سن کر قریش کے مغروروں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ وہ یہ کس طرح سن سکتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے نادار و مفلوک الحال ساتھی تو جنت میں براجمان ہوں گے اور تمام عزتوں اور عظمتوں کے وارث و مورث، ساداتِ قریش دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ اس غصہ میں وہ ٹولیاں بنا بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تردید و توہین کے لیے دہنے بائیں سے آپ پر پل پڑتے تھے[3]۔ ان آیات میں اسی صورتِ حال کی تصویر اور ان مغروروں کی خرد باختگی پر اظہارِ تعجب ہے۔ فرمایا کہ ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ ہر طرف سے تمہارے اوپر ٹولیاں بنا بنا کر پلے پڑ رہے ہیں! کیا ان میں سے ہر شخص یہ توقع لیے بیٹھا ہے کہ وہ جنت میں جا براجے گا!! یعنی اگر اس طمعِ خام میں یہ مبتلا ہیں تو ان کی یہ توقع کبھی پوری ہونے والی نہیں ہے۔

---

[1] معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ یہ آیتیں سورۂ مومنون کے شروع میں بھی گزر چکی ہیں۔ وہاں ان کے ہر جزو پر ہم نے تفصیل سے بحث کی ہے۔

[2] قرآن میں لفظ 'عِزِین' آیا ہے جو 'عِزَۃ' کی جمع ہے۔ اس کے معنی گروہ اور ٹولی کے ہیں۔

[3] لفظ 'اِھطاع' کے معنی کسی طرف تیزی سے بڑھنے اور لپکنے کے ہیں۔

ان برخود غلط اغنیار کی اس طمعِ خام کا ذکر قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوا ہے۔

حٰمٓ السجدہ میں ہے: وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى (۵۰) (اور میں اول تو یہ گمان ہی نہیں رکھتا کہ قیامت ہونے والی ہے اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹنا ہی ہوا تو میرے لیے اس کے پاس اچھا ہی صلہ ہے)۔

سورۂ قلم میں انہی مغروروں کی تردید ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝	کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح بنا دیں گے؟
مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝ اَمْ	تمھیں کیا ہو گیا ہے! تم کیسے فیصلے کرتے ہو!
لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ۝	کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے
اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ ۝	ہو، اس میں تمھارے لیے وہی کچھ ہے جو پسند
(القلم - ۶۸: ۳۵ - ۳۸)	کرتے ہو!

كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ (۳۹)

یہ ان مغروروں کے اس زعمِ باطل پر ضرب لگائی ہے کہ یہ اپنے تقدس اور بزرگی کی حکایت زیادہ نہ بڑھائیں۔ ان کا یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر ہونے والا نہیں ہے۔ ہم نے ان کو جس چیز سے پیدا کیا ہے وہ ان سے مخفی نہیں ہے۔ اس کو بھول نہ جائیں۔ یعنی پانی، کیچڑ، مٹی اور مٹی سے پیدا ہونے والی مخلوق کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ شرافتِ حسب و نسب کے غرور میں اپنے آپ کو جنت کا موروثی حقدار سمجھ بیٹھے! مجردِ خلقت کے اعتبار سے کسی کو بھی کوئی شرف حاصل نہیں ہے۔ شرف اور استحقاق حاصل ہو سکتا ہے تو ان اعمال کی بنا پر حاصل ہو سکتا ہے جو اللہ کو پسند ہیں۔ اگر یہ متاع کسی کے پاس نہیں ہے تو اجزائے خلقت کے اعتبار سے تو نہ صرف تمام انسان بلکہ ناپاک سے ناپاک حیوانات بھی اس کے مساوی ہیں۔ یہی مضمون سورۂ نجم میں بدیں الفاظ گزر چکا ہے:

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ	وہ تم کو خوب جانتا ہے جب کہ اس نے زمین
الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ	سے تم کو پیدا کیا اور جب کہ تم اپنی ماؤں کے پیٹوں
بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا	میں شکلِ جنین رہے تو اپنے آپ کو پاکیزہ نہ ٹھہراؤ۔
اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝	وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جنھوں نے پرہیزگاری
(النجم - ۵۳: ۳۲)	اختیار کی۔

سورۂ نجم کی تفسیر میں ہم نے اشارہ کیا ہے کہ یہ آیت صوفیوں کے عقیدۂ وحدت الوجود پر بھی ایک ضربِ کاری ہے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا

مِّنۡهُمۡ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَ (۴۰-۴۱)

عربیت کا ایک خاص اسلوب

یہ اسی طرح کی قسم ہے جس طرح کی قسم پچھلی سورہ کی آیات ۳۸-۳۹ میں گزر چکی ہے۔ قسم سے پہلے جو 'لا' ہے اس کی وضاحت سابق سورہ میں ہو چکی ہے۔

'مشارق' اور 'مغارب' کے الفاظ اپنے مقام پر زیر بحث آ چکے ہیں۔ قرآن میں یہ الفاظ واحد، تثنیہ اور جمع تینوں شکلوں میں استعمال ہوئے ہیں اور تینوں ہی صورتوں میں معنی کے اعتبار سے کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ عربی زبان میں بعض مرتبہ مثنیٰ کسی شے کے دونوں اطراف کی طرف اشارہ کے لیے آتا ہے جس طرح سورۂ کہف میں 'بَيۡنَ الصَّدَفَيۡنِ' آیا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات جمع محض کسی شے کی وسعت اطراف کو ظاہر کرنے کے لیے آتی ہے جس کی وضاحت ہم نے سورۂ اعراف کی تفسیر میں کی ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم تمام مشرق و مغرب کے خداوند ہونے کی حیثیت سے کھا کر اپنی اس غیر محدود قدرت کا اثبات فرمایا ہے کہ وہ جب چاہے گا لوگوں کو ان کے مر کھپ جانے کے بعد از سر نو زندہ کر دے گا اور کوئی مشکل بھی اس کے اس ارادے میں آڑے نہیں آئے گی۔ اس قسم میں شہادت کا پہلو، جو قسم کا اصل مدعا ہوتا ہے، بالکل واضح ہے۔ اس کائنات میں ہم روز یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ سورج، چاند اور کروڑوں اربوں کواکب و نجوم کائنات کے خداوند کے حکم سے طلوع اور غروب ہوتے ہیں تو کیا جس خدائے قادر و قیوم کے اختیار میں ان کو روز غائب کر دینے کے بعد پھر نمودار کر دینا بھی ہے اس کے لیے لوگوں کو ان کے مر کھپ جانے کے بعد از سر نو زندہ کر دینا مشکل ہو جائے گا؟ پہلا کام زیادہ مشکل ہے یا دوسرا؟ جو پہلے پر قادر ہوا تو وہ دوسرے سے کیوں قاصر رہ جائے گا!

سورۂ نازعات میں یہی دلیل زیادہ جامع اسلوب سے بیان ہوئی ہے:

ءَاَنۡتُمۡ اَشَدُّ خَلۡقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ	کیا تمہارا دوبارہ پیدا کیا جانا زیادہ کٹھن ہے
بَنٰهَا ۟ رَفَعَ سَمۡكَهَا فَسَوّٰىهَا ۙ	یا آسمان کا؟ اس کو بنایا۔ اس کی چھت کو بلند
وَاَغۡطَشَ لَيۡلَهَا وَاَخۡرَجَ ضُحٰىهَا ۟	کیا اور اس کو ہموار کیا۔ اور اس کی رات کو
وَالۡاَرۡضَ بَعۡدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ؕ اَخۡرَجَ	ڈھانک دیا اور اس کے دن کو بے نقاب کیا
مِنۡهَا مَآءَهَا وَمَرۡعٰىهَا ۟	اور زمین کو اس کے بعد بچھایا اور اس سے اس
وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ۙ	کا پانی اور چارہ برآمد کیا اور پہاڑوں کو
(النّٰزعٰت - ۷۹: ۲۷-۳۲)	گاڑ دیا۔

عَلٰٓى اَنۡ نُّبَدِّلَ خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ ۙ وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِيۡنَ۔ یعنی ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان کی

جگہ ان سے بہتر مخلوق لائیں جو اللہ کے دین کو ماننے والی ہو۔ دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس بات پر قادر ہیں کہ ان کو دوبارہ اس سے بہتر صورت میں پیدا کر دیں۔ مطلب یہ کہ جب ہم اس سے بہتر صورت میں پیدا کر دینے پر بھی قادر ہیں تو بعینہٖ انہی کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا ہمارے لیے اور بھی آسان ہے۔ عام طور پر لوگوں نے پہلے مطلب ہی کو اختیار کیا ہے اور زبان کے پہلو سے اس میں کوئی خرابی بھی نہیں ہے لیکن میرا رجحان دوسرے مطلب کی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورہ میں اصل زیر بحث موضوع وقوع قیامت ہے جس کو مستبعد سمجھنے کی بڑی وجہ منکرین کے لیے یہی تھی کہ مرکھپ جانے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے کو وہ خارج از امکان قرار دیتے تھے۔ آگے کی آیات سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا حَتّٰى يُلٰقُوا يَوْمَهُمُ الَّذِي يُوعَدُونَ (۴۲)

یہ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی اور منکرین کے لیے وعید ہے کہ اگر یہ لوگ نہیں سمجھتے تو ان کو چھوڑو۔ یہ جن سخن سازیوں اور دلچسپیوں میں لگے ہوئے ہیں ان میں لگے رہیں یہاں تک کہ وہ دن ان کے آگے آجائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اور وہ اس سے نچنت ہیں۔

يَوْمَ يَخْرُجُونَ مِنَ الْأَجْدَاثِ سِرَاعًا كَأَنَّهُمْ إِلٰى نُصُبٍ يُّوفِضُونَ (۴۳)

لفظ نُصُب کی تحقیق

'نُصُبٌ' جمع ہے 'نَصِيْبٌ' کی جس کے ایک معنی گاڑے ہوئے پتھر کے ہیں۔ گاڑے ہوئے پتھر سے مراد وہ پتھر بھی ہو سکتے ہیں جو مشرکین اپنی نذریں اور قربانیاں پیش کرنے کے لیے گاڑتے تھے اور وہ پتھر بھی ہو سکتے ہیں جو دوڑ وغیرہ کے مقابلہ کے لیے نشان کے طور پر گاڑ دیے جاتے ہیں۔

ابن عباسؓ، مجاہدؒ اور ضحاکؒ اس سے عَلَم مراد لیتے ہیں جس کو دوڑ لگانے کے لیے ایک نشان کے طور پر گاڑا جائے۔

ابوالعالیہؒ اور یحییٰ بن کثیرؒ اس سے 'غایت' (یعنی گول کا نشان) مراد لیتے ہیں جس کو نشان ٹھہرا کر اس کی طرف مقابلہ کی دوڑ لگائی جائے۔

'ایفاض' کے معنی 'اسراع' یعنی تیزی سے چلنے یا بھاگنے کے ہیں۔

میرے نزدیک لفظ 'نُصُبٌ' یہاں نشان اور عَلَم ہی کے معنی میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ متمردین اللہ کے داعی سے اکڑتے اور اس کی بتائی ہوئی راہ سے منحرف ہو کر دوسری راہوں پر چل رہے ہیں لیکن وہ دن بھی آنے والا ہے جب قیامت کا داعی اپنا صُور پھونکے گا اور یہ قبروں سے نکل کر تیزی سے اس طرح اس کی طرف لپکیں گے گویا وہ دوڑ کے معین نشانیوں کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس دن ان کے سارے کس بل نکل جائیں گے اور یہ کج روی ان کی ختم ہو جائے گی۔ قیامت کے داعی کی پکار پر جس طرح لوگ اس طرف بھاگیں گے اس کی تصویر قرآن میں یوں کھینچی گئی ہے: يَوْمَئِذٍ

يَتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ (طٰهٰ - ۲۰ : ۱۰۸) (جس دن وہ داعی کی پکار کی پیروی بغیر کسی کجی کے کریں گے) یعنی جس طرح تیر سیدھا اپنے معین ہدف کی طرف جاتا ہے اسی طرح یہ داعی کی طرف لپکیں گے۔ عام طور پر لوگوں نے 'نُصُب' سے معبودوں کے تھان اور استھان مراد لیے ہیں لیکن اول تو یہ اس لفظ کا ضمنی مفہوم ہے دوسرے تھان یا استھان کی طرف دوڑنے کا کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ مشرکین کے متعلق اس قسم کی کوئی روایت بھی میرے علم میں نہیں ہے۔

خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۭ ذٰلِكَ الْيَوْمُ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ (۴۴)

یعنی آج تو اللہ کا رسول اس دن سے ان کو ڈراتا ہے تو اس کا منہ نوچنے کو دوڑتے ہیں لیکن جب قیامت کا داعی ان کو پکارے گا تو یہ اس کی طرف اس طرح لپکیں گے کہ خوف سے ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی اور ان کے چہروں پر ذلت چھائی ہوئی ہو گی ـــــ فرمایا کہ یہ وہ دن ہو گا جس کی ان کو وعید سنائی جاتی رہی ہے۔ یہاں اس سوال کو ذہن میں تازہ کر لیجیے جو پہلی آیت میں 'سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ' کے الفاظ سے نقل ہوا ہے۔ اس کے ضروری پہلوؤں پر بحث اور اس کی تصویر کے بعد یہ آخری آیت میں اس کا جواب دے دیا کہ یہ ہے وہ عذاب کا دن جس سے ان کو ڈرایا جاتا رہا لیکن وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے۔ اس طرح شروع سے آخر تک تمام کلام مربوط ہو گیا۔

اللہ تعالیٰ کی عنایت سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد
۲ - ستمبر ۱۹۷۸ء
۲۷ - رمضان المبارک ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۷۱

نوح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

سابق سورہ ـــــ المعارج ـــــ میں آپ نے دیکھا کہ عذاب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ اس سورہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل، ان کے طویل صبر و انتظار اور بالآخر ان کی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے کی سرگزشت اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اور مقصود اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جس میں آپ بھی دیکھ لیں کہ اللہ کے رسول کو اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے صبر و انتظار کے کن زہرہ گداز مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ساتھ ہی آپ کی قوم بھی دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ جلد بازوں کی جلد بازی اور ان کے طنز و طعن کے باوجود ان کو ڈھیل اگرچہ ایک طویل مدت تک دیتا ہے لیکن بالآخر پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو اس طرح پکڑتا ہے کہ کوئی ان کو چھڑانے والا نہیں بنتا۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

سورہ کے مطالب کی ترتیب اور ان کا نظم بالکل واضح ہے اس وجہ سے تجزیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک صرف حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، بیان ہوئے ہیں۔ صرف بعض آیات بیچ میں موقع کی مناسبت سے بطور تضمین آئی ہیں۔ ان کی نوعیت تفسیر میں، ان شاء اللہ، واضح ہو جائے گی۔

سُوْرَةُ نُوْحٍ (۷۱)

مَكِّيَّةٌ ——— آیات: ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ آیات ۱-۲۸
أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (١) قَالَ يَٰقَوْمِ إِنِّى لَكُمْ نَذِيرٌ
مُّبِينٌ (٢) أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ (٣) يَغْفِرْ لَكُم مِّن
ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ ٱللَّهِ إِذَا
جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (٤) قَالَ رَبِّ إِنِّى دَعَوْتُ وقف لازم
قَوْمِى لَيْلًا وَنَهَارًا (٥) فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِىٓ إِلَّا فِرَارًا (٦)
وَإِنِّى كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوٓا۟ أَصَٰبِعَهُمْ فِىٓ ءَاذَانِهِمْ
وَٱسْتَغْشَوْا۟ ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا۟ وَٱسْتَكْبَرُوا۟ ٱسْتِكْبَارًا (٧)
ثُمَّ إِنِّى دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا (٨) ثُمَّ إِنِّىٓ أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ
إِسْرَارًا (٩) فَقُلْتُ ٱسْتَغْفِرُوا۟ رَبَّكُمْ إِنَّهُۥ كَانَ غَفَّارًا (١٠)
يُرْسِلِ ٱلسَّمَآءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا (١١) وَيُمْدِدْكُم بِأَمْوَٰلٍ
وَبَنِينَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّٰتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَٰرًا (١٢)
مَّا لَكُمْ لَا تَرْجُونَ لِلَّهِ وَقَارًا (١٣) وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (١٤)

الم تروا كيف خلق الله سبع سموت طباقا ﴿۱۵﴾ و
جعل القمر فيهن نورا وجعل الشمس سراجا ﴿۱۶﴾
والله انبتكم من الارض نباتا ﴿۱۷﴾ ثم يعيدكم فيها
ويخرجكم اخراجا ﴿۱۸﴾ والله جعل لكم الارض بساطا ﴿۱۹﴾
ع ۲ ۹ لتسلكوا منها سبلا فجاجا ﴿۲۰﴾ قال نوح رب انهم عصوني
واتبعوا من لم يزده ماله وولده الا خسارا ﴿۲۱﴾ ومكروا
مكرا كبارا ﴿۲۲﴾ وقالوا لا تذرن الهتكم ولا تذرن ودا ولا
سواعا ولا يغوث ويعوق ونسرا ﴿۲۳﴾ وقد اضلوا كثيرا
ولا تزد الظلمين الا ضللا ﴿۲۴﴾ مما خطيئتهم اغرقوا
فادخلوا نارا فلم يجدوا لهم من دون الله انصارا ﴿۲۵﴾
وقال نوح رب لا تذر على الارض من الكفرين ديارا ﴿۲۶﴾
انك ان تذرهم يضلوا عبادك ولا يلدوا الا فاجرا
كفارا ﴿۲۷﴾ رب اغفر لي ولوالدي ولمن دخل
بيتي مؤمنا وللمؤمنين والمؤمنت ولا تزد الظلمين
ع ۲ ۸ ۱۰ النصف الا تبارا ﴿۲۸﴾

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۸

ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کو، قبل اس کے کہ
اس پر ایک دردناک عذاب آ جائے، ہوشیار کر دو۔ اس نے پکارا کہ اے میری
قوم کے لوگو! میں تمہارے لیے ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں کہ اللہ کی بندگی کرو،

اس کے حدود کی پابندی کرو اور میری بات مانو۔ اللہ تمھارے (پچھلے گناہ) معاف کردے گا اور تم کو مہلت دے گا ایک معیّن مدّت تک۔ بے شک اللہ کی مقررہ کی ہوئی مدّت جب آجائے گی تو وہ ٹالے نہیں ٹلے گی۔ کاش کہ تم اس کو سمجھتے! ۱-۴

نوح نے اپنے رب سے دعا کی، اے میرے رب! میں نے اپنی قوم کو شب و روز پکارا لیکن میری پکار نے ان کے گریز ہی میں اضافہ کیا۔ اور میں نے جب جب ان کو توبہ کی دعوت دی کہ تو ان کو بخشے تو انھوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیں، اپنی چادریں اپنے اوپر لپیٹ لیں، اپنی ضد پر اڑ گئے اور نہایت گھمنڈ کا اظہار کیا۔ پھر میں نے ان کو ڈنکے کی چوٹ پکارا۔ پھر میں نے ان کو کھلم کھلا بھی سمجھایا اور چپکے چپکے بھی۔ میں نے کہا، اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، بے شک وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر اپنے ابرِ رحمت کے ڈونگڑے برسائے گا اور مال و اولاد سے تمھیں فروغ بخشے گا اور تمھارے واسطے باغ پیدا کرے گا اور نہریں جاری کرے گا۔ ۵-۱۲

تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا کی عظمت کے ظہور کے متوقع نہیں ہو! حالانکہ اس نے تم کو خلقت کے مختلف مراحل سے گزارا! کیا تم نے دیکھا نہیں کہ کس طرح اس نے بنائے تہ بہ تہ سات آسمان اور چاند کو ان کے اندر روشنی بنایا اور سورج کو چراغ اور اللہ ہی نے تم کو زمین سے اُگایا خاص اہتمام سے۔ پھر وہ تم کو اسی میں لوٹاتا ہے اور اسی سے تم کو نکالے گا بے روک اور اللہ ہی نے تمھارے لیے زمین کو ہموار بنایا کہ تم اس کی کھلی راہوں میں چلو۔ ۱۳-۲۰

نوح نے دعا کی، اے میرے رب! انھوں نے میری نافرمانی کی اور ان لوگوں کی

پیروی کی جن کے مال اور جن کی اولاد نے ان کے خسارے ہی میں اضافہ کیا اور انھوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں اور کہا کہ ہرگز نہ چھوڑو اپنے معبودوں کو اور ہرگز نہ چھوڑو وَدّ کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث، یعوق اور نسر کو اور انھوں نے ایک خلقِ کثیر کو گمراہ کر ڈالا۔ اور اب تو ان گمراہوں کی گمراہی میں ہی اضافہ کر۔ ۲۱-۲۴

وہ اپنے گناہوں کی پاداش ہی میں غرق کیے گئے پانی میں، پھر داخل کیے گئے آگ میں۔ پس اللہ کے مقابل میں انھوں نے کسی کو اپنا مددگار نہیں پایا۔ ۲۵

اور نوح نے دعا کی، اے میرے رب! تو زمین پر ان کافروں میں سے ایک متنفّس کو بھی نہ چھوڑ۔ اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو وہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نابکاروں اور کافروں ہی کو جنم دیں گے۔ اے میرے رب! میری مغفرت فرما، میرے ماں باپ کی مغفرت فرما اور جو میرے گھر میں مومن ہو کر داخل ہوں ان کی مغفرت فرما اور تمام مومنین و مومنات کی مغفرت فرما اور کافروں کی ہلاکت ہی میں اضافہ کر! ۲۶-۲۸

الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی وضاحت

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱)

قوموں کے معاملہ میں سنتِ الٰہی

یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جس کی وضاحت قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوئی ہے کہ جب کسی قوم کا اخلاقی فساد اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کُن عذاب کی مستحق ہو گئی ہے تو عذاب بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر اپنا ایک رسول بھیج کر اس پر اپنی حجّت تمام کر دی ہے تاکہ کسی کے پاس گمراہی میں پڑے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہ جائے۔ اسی سنت کے مطابق اس نے قومِ نوح پر عذاب بھیجنے سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کو رسول بنا کر بھیجا کہ اپنی قوم کو اچھی طرح آگاہ کر دیں کہ اللہ کا عذاب آیا ہی چاہتا ہے۔ اس سے نجات مطلوب ہے تو لوگ اپنی گمراہی کی روش چھوڑ کر اس

طریقہ کی پیروی کریں جس کی وہ دعوت دے رہے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ اللہ کے قہر سے کسی کے لیے بھی کوئی راہِ فرار نہیں ہے۔

قَالَ یٰقَوۡمِ اِنِّیۡ لَکُمۡ نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ (۲)

حضرت نوح علیہ السلام کا انذار

'نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ' کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے[1]۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ جس طرح ایک نذیرِ عریاں اپنی قوم کو حملہ آور دشمن سے آگاہ کرتا ہے اسی طرح میں تمھارے لیے ایک نذیرِ مبین ہوں اور اللہ نے مجھے تمھاری طرف اس لیے بھیجا ہے کہ میں تمھیں اس عذاب سے ہوشیار کر دوں جو تمھارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔

اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ وَ اتَّقُوۡہُ وَ اَطِیۡعُوۡنِ (۳)

یہ اس انذار کی تفصیل ہے کہ اللہ کی بندگی کرو، اس کے مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی سے بچو اور میری اطاعت کرو۔

'اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ' یعنی اپنے خود تراشیدہ معبودوں کی (جن کی تفصیل اسی سورہ میں آگے آ رہی ہے) پوجا چھوڑو اور اپنے ربِّ حقیقی، اللہ واحد کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔

'وَاتَّقُوۡہُ' یعنی اللہ نے جو حدود و قیود تمھاری زندگی کی رہنمائی کے لیے مقرر کیے ہیں ان کی پابندی کرو کہ اس کے غضب سے محفوظ رہو۔ 'تقویٰ' کا اصل مفہوم، جیسا کہ ہم اس کتاب میں جگہ جگہ واضح کر چکے ہیں، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے، زندگی کے ہر شعبہ میں، اپنی شریعت کے ذریعہ سے جو حدود قائم فرما دیے ہیں، بندہ ان کا پورا احترام کرے اور ان کی خلاف ورزی سے برابر ڈرتا رہے۔ جو لوگ ان حدود کی خلاف ورزی میں بے باک ہو جاتے ہیں بالآخر وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی زد میں آ جاتے ہیں۔

'وَاَطِیۡعُوۡنِ' یعنی اپنے مفسد لیڈروں کی اطاعت چھوڑ کر میری اطاعت کرو۔

آگے اسی سورہ میں ان مفسد لیڈروں کا ذکر آ رہا ہے۔ حضرت نوحؑ نے قوم کو یہ آگاہی بھی دی کہ تمھارے لیڈر تمھیں خدا کے عذاب کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگر اس عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو ان کی پیروی چھوڑو اور میں جس راہ کی دعوت دے رہا ہوں اس کو اختیار کرو۔

حضرت نوح کی دعوت کے تین ارکان

حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے تین بنیادی ارکان اس آیت میں بیان ہوئے ہیں: توحید، شریعتِ الٰہی کی پابندی اور رسول کی اطاعت ـــــ انھی تین ارکان پر تمام رسولوں کی دعوت مبنی رہی ہے۔ انھی کے استحکام پر دین کے استحکام کا انحصار ہے۔ جب تک کوئی قوم ان پر استوار رہتی ہے

---

[1] ملاحظہ ہو تدبر قرآن جلد سوم، صفحہ ۳۸۶؛ تدبر قرآن جلد چہارم، صفحہ ۴۰۴۔

اس کے قدم جادۂ مستقیم پر استوار رہتے ہیں۔ جہاں اس سے قدم ہٹے اس کی راہ کج ہو جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اصل راہ سے اتنی دور ہو جاتی ہے کہ اس کے لیے بازگشت کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا۔ پھر وہ بہتر سے بہتر ناصحوں کی نصیحت بھی ٹھکرا دیتی ہے اور بالآخر خدا کے عذاب کی گرفت میں آ جاتی ہے۔

يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ أَجَلَ اللَّهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّرُ ۖ لَوْ كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۴)

زبان کی ایک بحث

یعنی اگر تم نے میری یہ تینوں باتیں مان لیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے ان جرائم کو معاف کر دے گا جن کے سبب سے تم مستحقِ عذاب قرار پائے ہو اور ایک معین مدت تک کے لیے تم کو اس دنیا میں کھانے بلنے کی مہلت مل جائے گی۔

'يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوبِكُمْ' میں حرف 'مِنْ' کو بعض لوگوں نے زائد قرار دیا ہے اور بعض لوگوں نے اس کو 'عَنْ' کے معنی میں لیا ہے لیکن یہ دونوں رائیں عربیت کے خلاف ہیں۔ قرآن میں کوئی حرف بھی زائد نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی حرف لفظاً زائد نظر آتا ہے تو وہ بھی زبان کے معروف ضابطہ کے تحت کسی خلا کو بھرنے کے لیے آیا ہے۔ اس طرح کے حروف مخصوص ہیں۔ ہر حرف کو بغیر کسی سند کے زائد نہیں قرار دیا جا سکتا۔ 'مِنْ' کے زائد آنے کی کوئی مثال قرآن یا مستند کلام میں موجود نہیں ہے۔

اسی طرح اس کو 'عَنْ' کے معنی میں لینا بھی ایک بالکل بے سند بات ہے۔ اوّل تو اس کے 'عَنْ' کے معنی میں آنے کی کوئی قابلِ اعتماد مثال موجود نہیں ہے اور دوسری 'غفر' کا صلہ 'عَنْ' کے ساتھ نہیں آتا۔ آپ دعا میں کہتے ہیں: 'رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا' یوں نہیں کہتے کہ 'اغْفِرْ لَنَا عَنْ ذُنُوبِنَا' اگر یوں کہیں گے تو اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے یہ تاویل کرنی پڑے گی کہ یہاں 'غفر' لفظ 'صفح' یا اس کے ہم معنی کسی ایسے لفظ پر متضمن ہے جس کا صلہ 'عَنْ' کے ساتھ آتا ہے۔ اس کے بغیر 'غفر' کے ساتھ 'عَنْ' کا استعمال عربیت کے خلاف ہو گا۔

میرے نزدیک یہاں 'مِنْ' اپنے معروف معنی یعنی تبعیض ہی کے لیے آیا ہے۔ پوری بات گویا یوں ہے کہ 'يَغْفِرْ لَكُمْ مَّا تَقَدَّمَ مِنْ ذُنُوبِكُمْ' (اگر تم میری باتیں مان لو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے وہ سارے گناہ معاف فرما دے گا جو اب تک تم سے صادر ہوئے ہیں)۔ یہاں وضاحتِ قرینہ کی بنا پر 'مَا تَقَدَّمَ' کے الفاظ حذف ہو گئے ہیں اس لیے کہ یہ بات معلوم بھی ہے اور عقلاً معقول بھی کہ کفر کے بعد ایمان کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے وہ گناہ، معاف ہو جاتے ہیں جو جاہلیت کی زندگی میں اس سے صادر ہوئے ہوتے ہیں۔ رہے وہ گناہ جن کا ارتکاب آدمی ایمان کی زندگی اختیار کرنے کے بعد کرتا ہے تو ان کے معاف ہونے کے لیے ایک مخصوص ضابطہ ہے جو آیت

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا (النساء - ۴ : ۱۷)

میں بیان ہوا ہے اور جس کی وضاحت اس کے محل میں ہو چکی ہے۔ اس آیت میں حرف 'مِنْ' اسی حقیقت کے اظہار کے لیے آیا ہے کہ اگر تم اس دعوت کو قبول کر کے ایمان میں داخل ہو جاؤ گے تو دورِ جاہلیت کے تمھارے سارے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ اگر یہ 'مِنْ' یہاں نہ ہوتا تو آیت کے یہ معنی بھی نکل سکتے تھے کہ تمھارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیے جائیں گے۔ درآنحالیکہ یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ کفر کے بعد ایمان صرف پچھلے گناہوں ہی کا ہادم بنتا ہے، آگے کے گناہوں کا ہادم نہیں بنتا۔

اس دنیا کی ہر فرصت فانی ہے

وَيُؤَخِّرْكُمْ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى: یعنی میری یہ تینوں باتیں مان لو گے تو اللہ تعالیٰ اس عذاب کو، جس سے میں ڈرا رہا ہوں، ٹال دے گا اور تمھیں اس دنیا میں جینے اور کھانے پلنے کی ایک معین مدت تک مہلت دے دے گا۔

'معین مدت' کی قید اس حقیقت کو ظاہر کر رہی ہے کہ اس دنیا میں کوئی مہلت بھی غیر محدود نہیں ہے۔ یہ دنیا اور اس کی ہر چیز وقتی اور فانی ہے۔ آدمی ایمان و عمل صالح کی زندگی گزارے جب بھی اس کو یہاں غیر محدود زندگی نہیں مل جاتی بلکہ لازماً وہ ایک دن اپنی جان جان آفریں کے حوالہ کرتا ہے۔ البتہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے کسی عذاب سے نہیں ہلاک ہوتا بلکہ وہ اپنی مہلتِ حیات سے بہرہ مند ہونے کی فرصت پاتا ہے۔ اسی طرح کوئی قوم اگر ایمان، تقویٰ اور اطاعتِ رسول کی زندگی اختیار کرتی ہے تو اس کو بھی اللہ تعالیٰ اسی وقت تک بہرہ مند رکھتا ہے جب تک وہ ایمان و تقویٰ پر استوار رہتی ہے۔ جوں ہی وہ اس سے منحرف ہوتی ہے اس پر زوال کے آثار طاری ہونے شروع ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ جب اس کا اخلاقی زوال اس نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جو آخری ہے تو اس کی 'اجل مسمّی' پوری ہو جاتی ہے اور قومی حیثیت سے اس کا وجود صفحۂ ارض سے مٹ جاتا ہے۔ یہی حال اس مجموعی دنیا کا بھی ہے۔ اس کی مدت بھی معین و مقرر ہے۔ ایک دن آئے گا جب اس دارالامتحان کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ایک نیا عالم نئے نوامیس و قوانین کے ساتھ ظہور میں آئے گا جس کو دارِ آخرت کہتے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے یہاں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اس دنیا کی ہر فرصت بہرحال محدود اور فانی ہے۔ نیک اور بد دونوں ہی اس کو ہمیشہ مستحضر رکھیں۔ جو اس کو مستحضر رکھیں گے وہ اس زندگی کی مہلت سے فائدہ اٹھائیں گے جو اس کو بھول جائیں گے ان کے لیے یہ دنیا سرتاسر وبال اور خسران ہے۔

لَوۡ كُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ'۔ اس زندگی کی فوز و فلاح کا اصل راز اسی نکتہ کے اندر مضمر ہے لیکن اس کو سمجھنے والے بہت تھوڑے ہیں اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اس تمنا کا اظہار فرمایا کہ کاش! تم لوگ اس کو جانتے اور سمجھتے!

اس آیت میں جو سنتِ الٰہی بیان ہوئی ہے اس کا حوالہ سورۂ نحل آیت ۶۱ میں بھی گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَہَارًا ۙ﴿۵﴾ فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا (۵-۶)

حضرت نوحؑ کی دعوت کا دوسرا مرحلہ

یہاں سے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے دوسرے مرحلہ کا بیان آرہا ہے جب آپ نے اپنے رب سے استغاثہ کیا ہے کہ ان کی شب و روز کی ساری تگ و دو جو دعوت کی راہ میں انھوں نے کی وہ قوم پر بالکل بے اثر رہی۔ یہ امر واضح رہے کہ جتنی طویل مدت تک حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی ہے اس کی کوئی اور مثال معلوم نہیں ہے۔ قرآن میں تصریح ہے کہ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا' (العنکبوت - ۲۹: ۱۴) (پس وہ اپنی قوم کے اندر پچاس سال کم ایک ہزار سال رہا)۔

'دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَہَارًا' کے الفاظ میں بھی ظاہر ہے کہ کسی مبالغے کا شائبہ نہیں ہو سکتا۔ رسول چونکہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے، اس کی تصدیق یا تکذیب ہی پر اس کی قوم کی زندگی یا موت کا انحصار ہوتا ہے اس وجہ سے یوں تو ہر رسول نے دعوت کی راہ میں اپنے رات دن ایک کر دیے ہیں اور اپنی طاقت کا ایک ایک قطرہ نچوڑ دیا ہے لیکن حضرت نوح علیہ السلام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ آپ نے جتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو جھنجھوڑا اور جگایا، اس کی کوئی مثال، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا جو حاصل رہا وہ خود آپ ہی کے الفاظ میں یہ ہے کہ 'فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا' (جتنا ہی زیادہ میں نے ان کو پکارا وہ اتنا ہی زیادہ مجھ سے بھاگے) یہ گریز و فرار ظاہر ہے کہ اس وجہ سے نہیں تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت میں کوئی بات عقل و فطرت کے خلاف تھی یا ان کی قوم کے لوگوں کو ان کے خلوص اور ان کی راستبازی میں کوئی شبہ تھا۔ ان کی دعوت کی معقولیت بھی ہر شخص پر واضح تھی اور ان کی صداقت کا بھی ہر شخص اپنے دل میں معترف تھا لیکن ان کی دعوت چونکہ نفس کی خواہشوں کے خلاف تھی اور اس کے قبول کرنے سے قوم کے لیڈروں کے استکبار پر چوٹ پڑتی تھی اس وجہ سے حضرت نوح علیہ السلام نے جتنا ہی ان کا تعاقب کیا اتنا ہی وہ بھاگے۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ حضرت نوحؑ کی باتوں کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہے اور اپنی زندگی کو بدلنا ان کے لیے ناممکن ہے تو سلامتی گریز و فرار ہی میں ہے تاکہ اپنے مجرم ضمیر کو احساسِ جرم کی اذیت سے بچا سکیں۔ اگرچہ یہ تدبیر ایک اوچھی تدبیر ہے لیکن حقیقت سے

فرار اختیار کرنے والوں کے پاس اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر اور کیا ہو سکتی ہے!

وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوٓا أَصَابِعَهُمْ فِيٓ ءَاذَانِهِمْ وَٱسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَٱسْتَكْبَرُوا ٱسْتِكْبَارًا (۷)

دعوت سے قوم کے فرار کی تصویر — یہ قوم کے گریز و استکبار کی تصویر ہے اور پیش نظر قوم کے مستکبرین ہیں۔ فرمایا کہ میں نے جب جب ان کو پکارا کہ وہ توبہ و استغفار کریں تاکہ تو ان کی مغفرت فرمائے تو انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں، اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹ لیں، اپنی بات پر اڑ گئے اور نہایت گھمنڈ کا اظہار کیا۔

'دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ' میں کلام کا کچھ حصہ بتقاضائے بلاغت حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہو گی کہ جب جب میں نے لوگوں کو توبہ و استغفار کی دعوت دی تاکہ وہ استغفار کر کے تیری مغفرت کے مستحق بنیں تو انھوں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس لیں۔ لیکن یہ بات یوں کہنے کے بجائے حضرت نوح علیہ السلام نے فعل کی جگہ ثمرۂ فعل کو رکھ دیا ہے تاکہ قوم کی بدبختی و محرومی پوری طرح واضح ہو جائے کہ میں نے تو ان کو تیری رحمت و مغفرت کا حقدار بنانے کے لیے بلایا لیکن یہ ایسے شامت کے مارے نکلے کہ انھوں نے میری بات سننی ہی گوارا نہ کی۔

'وَٱسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ' یہ لیڈروں کے غرور و استکبار کی تصویر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جوں ہی انھوں نے میری بات سنی نہایت بیزاری کے ساتھ اپنے اوپر اپنی چادر لپیٹی اور وہاں سے چل دیے۔

'وَأَصَرُّوا وَٱسْتَكْبَرُوا ٱسْتِكْبَارًا'۔ 'أَصَرُّوا' کے بعد بھی مصدر محذوف ہے یعنی 'أَصَرُّوا إِصْرَارًا' چونکہ 'ٱسْتَكْبَرُوا' کے بعد مصدر کی وضاحت ہو گئی ہے اس وجہ سے ایک جگہ اس کو حذف کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ میری دعوتِ استغفار قبول کرنے کے بجائے اپنے شرک و عصیان ہی پر جم گئے۔ اس کی وضاحت آیت ۲۲ میں آ رہی ہے۔

استکبار کا مفہوم — 'ٱسْتِكْبَارُ' کا مفہوم جانتے بوجھتے حق کی مخالفت اور اس کے مقابل میں سرکشی ہے۔ حق چھوٹا ہو یا بڑا خدا کو محبوب و مطلوب ہے اس وجہ سے بندے کا فرض یہی ہے کہ اس کے آگے سر جھکا دے اگرچہ یہ نفس پر کتنا ہی شاق کیوں نہ گزرے۔ اگر کوئی شخص حق کے مقابل میں اکڑ دکھائے تو وہ سنتِ ابلیس کا پیرو ہے اور وہ اسی کا ساتھی بنے گا۔

یہ استکبار کا ذکر ان کی ان حرکتوں کی اصل علت کی حیثیت سے ہوا ہو اس سے پہلے مذکور ہوئی ہیں یعنی کانوں میں انگلیاں دے لینا، اپنے اوپر اپنی چادریں لپیٹ لینا اور اپنے شرک پر اڑ جانا اس وجہ سے ہوا کہ ان کے اندر سخت استکبار تھا جس کا انھوں نے مظاہرہ کیا۔

ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّيٓ أَعْلَنتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا (۸-۹)

دعوت کا تیسرا مرحلہ

یہ نہایت بلیغ الفاظ میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کے تیسرے مرحلہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جب میں نے دیکھا کہ انھوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی ہیں اور اپنے اوپر اپنی چادریں بھی لپیٹ لی ہیں تو میں نے بھی اپنی دعوت کے لب و لہجہ کو تیز سے تیز تر اور بلند سے بلند تر کر دیا۔ ع

حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی!

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کا طریقِ دعوت یہی رہا ہے کہ ان کی قوم کی بیزاری دعوت سے جتنی ہی بڑھتی گئی ہے اتنا ہی ان کا جوشِ دعوت مضاعف، ان کا لب و لہجہ بلند، جھنجھوڑنے والا اور پرجوش ہوتا گیا ہے۔ حق اور اہلِ حق کی فطرت یہی ہے۔ مزاحمت کی شدت حق کی سطوت کو نمایاں کرتی اور اہلِ حق کے ولولہ کو دبانے کے بجائے ابھارتی ہے۔ ع

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

'ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا'۔ یعنی جہاں ڈنکے کی چوٹ بات کہنے کی ضرورت ہوئی وہاں میں نے بے دریغ ڈنکے کی چوٹ اپنی بات سنائی تاکہ بہروں تک بھی میری آواز پہنچ جائے اور جہاں دیکھا کہ ان کے اندر گھس کر کچھ سنانے سمجھانے کا موقع ہے تو میں نے یہ طریقہ بھی آزمایا تاکہ جن میں زندگی کی کچھ رمق باقی ہے وہ چاہیں تو فیصلہ کی گھڑی آنے سے پہلے پہلے اپنے انجام کی فکر کر لیں۔ غرض میں نے نرم و گرم اور پوشیدہ و علانیہ ہر پہلو سے لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کی ہے تاکہ فرضِ بلاغ میں کوئی کوتاہی نہ رہ جائے۔

'اَعْلَنْتُ لَهُمْ' کے بعد بھی میرے نزدیک مصدر محذوف ہے جس طرح اوپر 'اَصَرُّوْا' کے بعد محذوف ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (۱۰-۱۲)

دعوت میں دل سوزی

یہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی اس دعوت کی وضاحت فرمائی ہے جو نہایت دل سوزی اور محبت سے انھوں نے اپنی قوم کو دی۔ فرمایا کہ میں نے ان کو سمجھایا کہ لوگو، اپنے رب سے اپنے گناہوں کی مغفرت مانگو۔ ہر چند تمھارے گناہ بہت ہیں لیکن اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ وہ بڑا ہی مغفرت فرمانے والا ہے۔

'اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا' میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ اس کی مغفرت حاصل کرنے کے لیے اس کی طرف تمھارا رجوع ہی کافی ہے، تمھارے مزعومہ دیویوں دیوتاؤں کی سفارش کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بڑا ہی غفار ہے۔ صدقِ دل سے مغفرت مانگنے والوں کو کسی سفارش کے بغیر وہ خود ہی اپنے دامنِ رحمت میں چھپا لیتا ہے۔

خدا سے بڑا کوئی غفار نہیں کہ اس کی سفارش چاہی جائے

یہ امر یہاں واضح رہے کہ ہر دور کے مشرکین اس غلط فہمی میں بھی مبتلا رہے ہیں کہ خدا کی سرکار چونکہ بہت بلند ہے اس وجہ سے جب تک کچھ سفارشی نہ ہوں ہر شخص کے لیے اس سے اپنی التجا و درخواست منظور کرانا ممکن نہیں ہے۔ 'مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ' (الزمر - ۳۹ : ۳) (ہم تو ان معبودوں کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہم کو خدا سے قریب تر کر دیں) ان کے اسی خیال کی ترجمانی ہے۔ قرآن نے ان کے اس وہم کی مختلف پہلوؤں سے تردید کی ہے۔ یہاں 'إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا' میں بھی اس کی تردید ہے کہ جب وہ خود ہی سب سے بڑا مغفرت فرمانے والا ہے تو اس سے بڑا غفار کون ہے جس کو اس کے پاس کوئی سفارشی بنا کر لے جائے گا۔

استغفار کی برکت

'يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا' - لفظ 'سَمَاءٌ' جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، ابر باراں کے لیے بھی آتا ہے۔ 'مِدْرَارًا' کے معنی 'كثير الدر' (یعنی خوب برسنے والے کے ہیں۔ یہ مذکر و مؤنث دونوں کے لیے یکساں استعمال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا استغفار تمہارے رب کی رحمت کو جوش میں لائے گا اور وہ تمہیں رزق کی فراوانی اور مال و اولاد کی کثرت سے بہرہ مند کرے گا۔

مشرکین کے بعض اوہام کی تردید

مشرکین اس وہم میں بھی مبتلا تھے کہ بارش ان کے دیوتا برساتے ہیں اور اولاد ان کی برکت و عنایت سے ملتی ہے اس وجہ سے وہ ان کے خلاف ایک لفظ بھی کہنے یا سننے سے بہت ڈرتے تھے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ اشارہ ہے کہ انھوں نے رسولوں کی مخالفت اس اندیشہ کی بنا پر بھی کی ہے کہ وہ بتوں کی ہجو کرتے ہیں جس سے وہ ناراض ہو جائیں گے اور اپنی عنایات سے خلق کو محروم کر دیں گے۔ یہاں تک کہ رسولوں کے دور میں اگر انھیں کوئی آزمائش پیش آئی تو اس کو انھوں نے العیاذ باللہ رسول اور اس کے ساتھیوں ہی کی نحوست پر محمول کیا کہ انھوں نے دیوتاؤں کو ناراض کر دیا ہے اس وجہ سے فلاں افتاد پیش آئی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس ارشاد سے ان کے اس وہم پر بھی ضرب لگائی کہ بارش اور مال و اولاد کے خزانوں پر تمہارے دیوی دیوتا قابض نہیں ہیں کہ تم نے ان کو چھوڑ دیا تو وہ تم کو ان نعمتوں سے محروم کر دیں گے۔ ان سب چیزوں کا مالک اللہ ہی ہے اور اس کی رحمت توبہ و استغفار سے حاصل ہوتی ہے۔ تم یہ کام کرو اور پھر دیکھو کہ کس طرح اس کی رحمت کی گھٹائیں امنڈ امنڈ کر آتی ہیں اور تم پر برستی ہیں! سورۂ ہود آیت ۵۲ میں بھی یہ مضمون گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔

یہاں حکمتِ دین کا ایک نکتہ بھی حرزِ جاں بنانے کے لائق ہے جو سیدنا عمر فاروق رضؓ کے افادات سے ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آپ نے ایک مرتبہ نمازِ استسقاء میں صرف استغفار پر کفایت فرمائی، دعا میں بارش کا کوئی ذکر نہیں آیا تو لوگوں نے پوچھا کہ امیر المومنین! آپ نے دعا میں بارش کا تو کوئی ذکر کیا ہی نہیں! امیر المومنین رضؓ نے انہی آیات کی روشنی میں لوگوں کو بتایا کہ خدا کی رحمت کی کلید استغفار ہے اور یہ کام ہم نے کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ استغفار ہی جالبِ رحمت بنے گا۔ ہماری ضرورت اور

احتیاج کو ہمارا رب خود ہم سے بہتر جانتا ہے۔

وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (۱۲)

اسی اوپر والے مضمون کی یہ مزید توسیع ہے کہ مال، اولاد، باغ اور نہریں سب خدا ہی کے دیے ملتی ہیں۔ اگر تم توبہ و استغفار سے اپنے رب کو راضی رکھو گے تو یہ ساری چیزیں تمھیں ملیں گی۔ ان میں سے کوئی چیز بھی تمھارے یہ دیوی دیوتا نہیں دیتے کہ وہ راضی نہ رہے تو نہیں دیں گے یا دے کر چھین لیں گے۔

ہٹ دھرموں کی بلادت پر اظہارِ تعجب

'وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا' میں فعل کے اظہار اور اس کی تکرار سے ان نعمتوں کی گراں قدری اور محبوبیت کا جو مضمون پیدا ہوتا ہے وہ عربیت کا ذوق رکھنے والوں سے مخفی نہیں ہے۔

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (۱۳)

یہ قوم کے ہٹ دھرموں کی بلادت پر اظہارِ تعجب ہے کہ میں جو تمھیں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر استغفار کی دعوت دے رہا ہوں تو آخر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم کانوں میں تیل ڈالے پڑے ہو اور میری سنی ان سنی کیے دے رہے ہو! کیا تم سمجھتے ہو کہ تم اسی طرح اپنی دلچسپیوں میں مگن رہو گے اور جس رب نے تمھیں یہ سب کچھ دے رکھا ہے اس کا جلال، تمھاری بدمستیوں کے باوجود کبھی ظہور میں نہیں آئے گا! مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ایسا سمجھ رکھا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تمھاری نگاہوں میں اس کی عظمت و جلالت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ تم اس کو العیاذ باللہ بالکل بے حس، بے حمیت اور بے بس خیال کیے بیٹھے ہو کہ اس کی دنیا میں جو دھاندلی چاہو مچاتے پھرو لیکن اس کی غیرت و حمیت کبھی جوش میں نہیں آئے گی۔ بعینہٖ یہی مضمون 'مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ' (الانفطار - ۸۲: ۶) (اے انسان! تجھ کو تیرے ربِّ کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے) والی آیت میں بیان ہوا ہے۔ یعنی انسان جب اپنے دائیں بائیں نعمتوں کے انبار دیکھتا ہے اور یہ بھی دیکھتا ہے کہ وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے لیکن اس کی پکڑ نہیں ہو رہی ہے تو وہ آہستہ آہستہ ڈھیٹ ہو کر خدا کی پکڑ سے بالکل نچنت ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ سوچتا تو آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ خدا نے اس کے لیے اپنی کریمی کی یہ شانیں دکھائی ہیں تو اس لیے نہیں دکھائی ہیں کہ وہ اس کی دنیا میں دھاندلی مچائے بلکہ ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا شکر گزار اور اس امر کا منتظر رہے کہ ایک دن ان نعمتوں کے باب میں اس سے پرسش ہونی ہے اور اس دن ناشکروں اور نافرمانوں کو اس کی پکڑ سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔

'تَرْجُوْنَ' کے معنی یہاں منتظر اور متوقع رہنے کے اور 'وَقَار' کے معنی عظمت، شان اور جلال کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ میں جمال کی صفات کے ساتھ جلال کی صفات بھی ہیں جو ان لوگوں کے لیے ظاہر ہوتی ہیں جو اس کے رسولوں کی نافرمانی کرتے اور اس کے آگے اکڑتے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر استوار رہنے کے لیے

ضروری ہے کہ انسان ان دونوں ہی قسموں کی صفات کی یادداشت تازہ رکھے۔ اگر ان میں عدم توازن پیدا ہو جائے تو آدمی کا ذہن صفاتِ الٰہی کے باب میں غیر متوازن ہو جاتا ہے جس سے اس کی ساری زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ یہاں خطاب چونکہ سرکشوں سے ہے اس وجہ سے صرف صفتِ جلال ہی کا حوالہ دیا ہے۔

وَقَدْ خَلَقَكُمْ أَطْوَارًا (۱۴)

عظمتِ الٰہی کے ظہور کی دلیل

یہ دلیل ہے اس بات کی کہ خدا کی عظمت کے ظہور کا دن کوئی مستبعد اور ناممکن چیز نہیں ہے۔ فرمایا کہ اگر تم اپنی ہی خلقت کے تمام مراحل پر غور کرو تو نہایت آسانی سے سمجھ سکتے ہو کہ جس خدا نے تو تمھارے وجود کے اندر اپنی قدرت کی یہ شانیں دکھائی ہیں اس کے لیے کیا مشکل ہے کہ تمھارے مرکھپ جانے کے بعد از سرِ نو تمھیں اٹھا کھڑا کرے اور تم اپنی آنکھوں سے اس کا جلال دیکھو کہ سرکشوں اور باغیوں کو وہ کس طرح کیفرِ کردار کو پہنچاتا ہے۔ یہ دلیل بعینہٖ اسی سیاق و سباق میں، قیامت ہی کے اثبات کے پہلو سے، قرآن کے دوسرے مقامات میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِنُبَيِّنَ لَكُمْ ط وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ج وَمِنْكُمْ مَنْ يُتَوَفَّىٰ وَمِنْكُمْ مَنْ يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا ط وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّهُ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ وَأَنَّهُ

اے لوگو! اگر تم مرنے کے بعد اٹھائے جانے کے بارے میں شک میں ہو تو سوچو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کی پھٹکی سے، پھر مضغۂ گوشت سے، کوئی کامل، کوئی ادھورا، ہم نے اپنی یہ شانیں اس لیے دکھائیں کہ تم پر اپنی قدرت واضح کر دیں اور رحموں میں ہم ٹھہراتے ہیں جو چاہتے ہیں ایک معیّن مدت تک۔ پھر ہم تم کو ایک بچے کی صورت میں نکالتے ہیں پھر ہم تم کو مہلت دیتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ اور تم میں کچھ پہلے ہی مر جاتے ہیں اور تم میں سے بعض ارذلِ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ جاننے کے بعد کچھ نہیں جانتے اور تم زمین کو دیکھتے ہو کہ وہ بالکل خشک ہوتی ہے تو جب ہم اس پر برساتے ہیں بارش تو وہ لہریں لینے لگتی اور پھول جاتی ہے اور نوع بنوع کی خوش منظر چیزیں اگاتی ہے یہ اس وجہ سے کہ اللہ ہی کارسازِ حقیقی ہے

عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (الحج ۲۲: ۵-۶) اور وہی مُردوں کو زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

یہی مضمون سورۂ مومنون کی آیات ۱۲-۱۶ میں بھی بیان ہوا ہے۔ تفصیل کے طالب اس پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِیْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۙ ثُمَّ یُعِیْدُكُمْ فِیْهَا وَیُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا (۱۵-۲۰)

چند آیتیں بطور تضمین: یہ چھ آیتیں حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر کا حصہ بھی ہو سکتی ہیں لیکن میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہ بطور تضمین اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر کی تکمیل کے لیے ہیں۔ اس طرح کی تضمین کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔ اس کے تضمین ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ آیت ۲۱ سے حضرت نوح کی اس تقریر کا بقیہ حصہ آ رہا ہے جس کا آغاز 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' سے ہوا ہے۔ اگر آیات ۱۵-۲۰ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی تقریر ہی کا حصہ ہوتیں تو ان کے بعد 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' کے اعادہ کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اعادہ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کے لیے ہے کہ اوپر کی آیات بیچ میں بطور تضمین آ گئی تھیں۔ آگے کے حصہ کو حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کے ساتھ مربوط کرنے کے لیے یہ ظاہر فرمایا کہ یہ حضرت نوح علیہ السلام کا قول ہے۔

اللہ تعالیٰ کی قدرت کی سب سے زیادہ واضح نشانی: 'اَلَمْ تَرَوْا كَیْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا'۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کی سب سے زیادہ نمایاں نشانی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جو خدا یہ تہ بر تہ ساتوں آسمان پیدا کرنے پر قادر ہو گیا اس کے لیے تم کو دوبارہ پیدا کر دینا ناممکن ہو جائے گا؟ یہ وہی دلیل ہے جو 'ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا' (النازعات ۷۹: ۲۷) (کیا تمھارا پیدا کرنا زیادہ مشکل ہے یا آسمان کا جس کو بنایا) کے الفاظ میں بیان ہوئی ہے اور جو ذرا مختلف اسلوب میں پچھلی سورہ کی آیات ۴۰-۴۱ میں بھی گزر چکی ہے۔

'طِبَاقًا' یعنی تہ بہ تہ۔ اس لفظ سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ کپڑے کی تہوں کی طرح آسمان کی بھی سات تہیں ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ الگ الگ ایک سے ایک بلند سات عالم ہیں اور ان کے الگ الگ سات آسمان ہیں۔ اس طرح کی باتیں جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ کی غیر محدود قدرت کا ایک اجمالی تصور دینے کے لیے بیان ہوئی ہیں۔ ان پر اجمالی ایمان ہی کافی ہے۔ صحیح حقیقت اس دن ظاہر ہو گی جس دن پردہ اٹھے گا۔ اس پردے کو اٹھانا اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی کے بس میں نہیں ہے۔ ابھی ہماری سائنس کی رسائی بہت محدود ہے اور جتنی بھی اس کی رسائی ہوئی ہے اس سے حقیقت کے انکشاف

کے بجائے انسان کی حیرت ہی میں اضافہ ہوا ہے۔ اصل حقیقت آخرت ہی میں کھلے گی۔

آسمانوں کے اندر کی دو نشانیوں کی طرف اشارہ

وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ۔ آسمانوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد ان کے اندر کی دو عظیم نشانیوں کی طرف توجہ دلائی کہ یہ خدا ہی ہے جس نے ان آسمانوں کے اندر چاند کو روشن اور سورج کو چراغ بنا کر رکھا ہے جن سے ان کے اندر اجالا ہوتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت کے ساتھ ساتھ اس کی بے نہایت حکمت اور عالم گیر ربوبیت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر اس نے ان میں چاند کا دیا اور سورج کا چراغ نہ رکھا ہوتا تو یہ عالم ظلمات ہوتا۔ ان روشن نشانیوں کے بعد بھی جن کو آخرت ناممکن نظر آئے ان کی آنکھیں کوئی چیز بھی نہیں کھول سکتی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اس کائنات میں خدا کی رحمت اور ربوبیت کی جو نشانیاں ہیں وہ ایک روزِ عدل کے ظہور کو واجب کرتی ہیں۔ اس مسئلہ پر مفصل بحث اس کے محل میں گزر چکی ہے۔

زمین کی نشانیوں کی طرف اشارہ

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ۝ ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا ۔ آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد یہ زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی اور سب سے پہلے زمین کی سب سے اشرف مخلوق یعنی خود انسان کو لیا۔ فرمایا کہ اللہ نے تمھیں زمین سے اگایا اور اگانے کے بعد پھر اسی میں تمھیں مرنے کے بعد لوٹا دیتا ہے اور پھر اسی سے تمھیں ایک دن نکالے گا۔

دعویٰ ہی دلیل بھی ہے

یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اس آیت میں جو دعویٰ ہے وہی اس دعوے کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ اس کے مفہوم کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ جس طرح زمین سے سبزہ اگتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسی زمین سے اگایا ہے اور جس طرح زمین سے اگنے والی چیزیں فنا ہو کر زمین میں مل جاتی ہیں اسی طرح تم بھی مر کر زمین میں مٹی بن جاتے ہو۔ پھر جس طرح تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے فنا شدہ سبزوں کو ازسرِنو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح جب چاہے گا تمھیں بھی بغیر کسی زحمت کے اٹھا کھڑا کرے گا۔

'نَبَاتًا' اور 'اِخْرَاجًا' تاکیدِ فعل کے لیے آئے ہیں اور تاکیدِ فعل کے پہلو مختلف ہوتے ہیں اس وجہ سے اردو میں ان کا ترجمہ مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً 'اَنْۢبَتَكُمْ نَبَاتًا' کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں زمین سے اگایا نہایت قدرت و حکمت سے۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں زمین سے اگایا نہایت آسانی سے اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ تمھیں زمین سے اگایا نہایت اہتمام سے۔ میں نے ترجمہ میں اہتمام اور قدرت و حکمت کے پہلو کو اختیار کیا ہے اس لیے کہ قرآن کے نظائر سے اسی پہلو کی تائید ہوتی ہے۔ اوپر 'وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا' کے تحت اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ 'يُخْرِجُكُمْ اِخْرَاجًا' میں سہولت کے پہلو کو میں نے مدِنظر رکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ جب چاہے گا تمھیں بالکل بے روک نہایت آسانی سے اٹھا کھڑا کرے گا۔ یہ پہلو اختیار کرتے میں بھی میں نے قرآن کے نظائر ہی کو ملحوظ رکھا ہے اگرچہ

امکان دوسرے پہلوؤں کا بھی ہے لیکن اردو میں ان کا کوئی ایسا ترجمہ سمجھ میں نہیں آیا جو تمام پہلوؤں پر حاوی ہو جائے۔

زمین بجائے خود ایک عظیم نشانی ہے

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا ۙ لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔ اب یہ خود زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی جس سے اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت و حکمت کا بھی اظہار ہوتا ہے اور اس کی بے نہایت رحمت و عنایت کا بھی۔ فرمایا کہ ہم نے تمہارے لیے زمین کو ایک فرش کی طرح بچھایا۔ اس کو متوازن اور باربردار رکھنے کے لیے اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑ دی ہیں اور پہاڑوں کے اندر درّے اور راستے نکال دیے ہیں تاکہ تم پہاڑوں کی دیواروں کے پیچھے محصور ہو کے نہ رہ جاؤ بلکہ درّوں سے گزر کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا سکو۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ زمین کے گہوارہ یا فرش بننے کے لیے اس کے اندر توازن کا پایا جانا لازمی ہے چنانچہ قرآن میں یہ تصریح ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے پہاڑ اسی لیے گاڑے ہیں کہ اس کا توازن قائم رہے 'اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ' (النحل - ۱۶ : ۱۵) اور 'اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا ۙ وَّالْجِبَالَ اَوْتَادًا' (النبا - ۷۸ : ۶-۷) اور اس مضمون کی دوسری آیات میں اسی اہتمام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ پھر مزید عنایت اللہ تعالیٰ نے یہ فرمائی کہ پہاڑ گاڑے تو اس طرح کہ ان کے اندر درّے اور راستے بھی رکھے تاکہ انسان کے لیے آمد و شد کی راہیں کھلی رہیں۔ آیت میں لفظ 'فِجَاج' استعمال ہوا ہے جو 'فَجّ' کی جمع ہے۔ یہ لفظ عام راستوں کے لیے نہیں بلکہ پہاڑی درّوں اور راستوں کے لیے آتا ہے۔ سورۂ حج میں 'فَجٍّ عَمِيْقٍ' کے تحت اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ يَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ اِلَّا خَسَارًا (۲۱)

تضمین کے بعد حضرت نوحؑ کی دعا کی تکمیل

تضمین کی آیات ختم ہوئیں۔ یہاں سے کلام پھر حضرت نوحؑ کی دعا سے مربوط ہو گیا۔ چنانچہ 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' فرما کر یہ واضح کر دیا گیا کہ اب حضرت نوحؑ کی دعا پھر آ رہی ہے۔

حضرت نوحؑ یہ اس ردِ عمل کا ذکر فرما رہے ہیں جس کا آپ کی قوم کی طرف سے، دعوت کے تیسرے مرحلہ میں، جو اتمامِ حجت کا آخری مرحلہ تھا، اظہار ہوا۔ فرمایا کہ اے رب! میں نے سارے جتن کر ڈالے لیکن ان سنگ دلوں نے میری کوئی بات بھی نہیں سنی بلکہ اپنے انہی لیڈروں کی پیروی کی جن کے مال و اولاد کی کثرت نے ان کے خسارے ہی میں اضافہ کیا ہے۔ یعنی مال و اولاد نے شکر گزاری کے بجائے ان کے استکبار کو بڑھایا ہے جس کے سبب سے وہ اپنی روش پر اڑ گئے اور میری کوئی بات سننی ان کو گوارا نہیں۔ سورۂ قلم میں فرمایا ہے: 'اَنْ كَانَ ذَا مَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ' (القلم - ۶۸ : ۱۴-۱۵) (یعنی چونکہ یہ مال و اولاد والے ہیں اس وجہ سے جب ان کو رسول کی تکذیب کے انجام سے ڈرایا جاتا اور تکذیب کرنے والی قوموں کی سرگزشتیں ان کو سنائی

جاتی ہیں تو نہایت غرور سے کہتے ہیں کہ یہ اگلے وقتوں کے فسانے ہیں، ہم ان قصوں سے مرعوب ہونے والے نہیں ہیں۔

وَمَكَرُوْا مَكْرًا كُبَّارًا (۲۲)

'کُبَّارٌ' مبالغہ ہے 'کَبِیْرٌ' کا۔ یعنی اپنے استکبار کے سبب سے میری دعوت کو شکست دینے، اپنے عوام کو مجھ سے برگشتہ کرنے اور میرے خلاف بھڑکانے کے لیے انھوں نے بڑی بڑی چالیں چلیں۔ ان چالوں کی یہاں کوئی تفصیل نہیں ہے لیکن ان کو سمجھنا دشوار نہیں ہے۔ ہر زمانے کے مستکبرین لوگوں کو حق سے برگشتہ کرنے کے لیے جس طرح کی چالیں چلتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر قومِ نوح کی چالوں کا بھی نہایت آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا (۲۳)

اوپر آیت ۲۱ میں قوم کے لیڈروں کی جس ضد اور ہٹ دھرمی کی طرف اشارہ ہے یہ اس کی تفصیل ہے کہ میری دعوتِ توحید کے خلاف انھوں نے اپنی قوم کے عوام کو بھڑکایا کہ اس شخص کے کہنے سے اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑو۔

قومِ نوح کے بتوں کی سخت جانی

'وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا'۔ یہ ان کے خاص خاص بڑے بتوں کے نام ہیں۔ ان کی خدائی کا سکہ ان کے عوام کے دلوں پر جما ہوا تھا اس وجہ سے ان کے نام لے کر انھوں نے عوام کو للکارا کہ اپنے ان بزرگ دیوتاؤں پر مضبوطی سے جمے رہو۔ اگر تم ذرا کمزور پڑے تو تمہارا دینِ آبائی خطرے میں پڑ جائے گا۔

ان بتوں کے ناموں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عربی نام ہیں۔ قومِ نوح کا مسکن شمالی حجاز تھا اس وجہ سے اس کی زبان کا عربی ہونا بعید نہیں۔ ان بتوں کی سخت جانی قابلِ داد ہے کہ طوفان نے قومِ نوح کے ایک ایک نقش کو مٹا دیا لیکن ان بتوں کی خدائی پھر بھی باقی رہی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں مختلف قبائلِ عرب میں ان بتوں کی پرستش پھر رائج ہو گئی۔ چنانچہ 'وَدّ' قبیلہ قضاعہ کی شاخ بنی کلب کا بت تھا۔ سُواع کی پرستش قبیلہ ہُذَیل کرتا تھا۔ یَغُوث قبیلہ طے کی بعض شاخوں کا بت تھا۔ یَعُوق قبیلہ ہمدان کی ایک شاخ کا دیوتا تھا۔ نَسر قبیلہ حِمْیَر کی ایک شاخ میں پجتا تھا۔ یہاں ان بتوں کا ذکر جس ترتیب سے آیا ہے اس سے گمان ہوتا ہے کہ قومِ نوح میں ان کے مراتب کی ترتیب یہی تھی۔ یعنی وَدّ اور سُواع کا مرتبہ سب سے اونچا تھا اور یَغُوث، یَعُوق اور نَسر مرتبہ میں ان سے نیچے تھے۔

وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا ۚ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا (۲۴)

حضرت نوحؑ کی بد دعا

یہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم کے لیڈروں کی روش پر غم و اندوہ کا اظہار فرمایا ہے اور

ساتھ ہی ان کی زبان سے بے ساختہ یہ بددعا بھی نکل کہ اے رب، اب ان کی ضلالت ہی میں اضافہ کرتا کہ عذاب کی سمت میں ان کی تیز روی مزید بڑھ جائے اور جلد سے جلد ان کی عفونت سے زمین پاک ہو۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس زمین پر بار رہنے کے لیے نہیں پیدا کیا ہے بلکہ حصولِ سعادت کی جدوجہد کے لیے پیدا کیا ہے۔ زمین پر اس کو اسی وقت تک باقی رہنے کا حق ہے جب تک اس کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی رہے۔ یہ رمق بالکل ختم ہو جائے تو پھر اس کا وجود زمین کے لیے لعنت ہے۔ رسول، خلق پر اتمامِ حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس کے چھاج میں پھٹکے جانے کے بعد بھس اور دانے میں پورا امتیاز ہو جاتا ہے چنانچہ وہ دانوں کو الگ کر کے بھس کو جلا دیتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کے تیسرے مرحلے میں پہنچ کر دیکھ لیا کہ اس قوم میں جتنا جوہر تھا وہ نکل آیا ہے۔ اب جو باقی ہے اس کی کوئی افادیت نہیں۔ اس کے مٹ جانے ہی میں خیر ہے۔

اسی مرحلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی قومِ فرعون کے لیے بددعا کی جو سورۂ یونس میں بدیں الفاظ مذکور ہے۔

رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ	اے ہمارے رب! ان کے مالوں کو مٹا دے
وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا	اور ان کے دلوں پر پٹیاں باندھ دے کہ اب
حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ	وہ دردناک عذاب دیکھ ہی کر ایمان
(یونس - ۱۰: ۸۸)	لائیں۔

مِمَّا خَطِيْٓـئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا (۲۵)

دعا کی فوری قبولیت: یہ آیت حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا حصہ نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد اس طرح کی ایک تضمین ہے جس طرح کی تضمین اوپر گزر چکی ہے۔ اس کے لانے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بالکل صحیح وقت پر، ایک صحیح مقصد کے لیے تھی اس وجہ سے پہلا فقرہ زبان سے نکلتے ہی پوری دعا قبول ہو گئی۔ اگر یہ بشارت حضرت نوحؑ کی دعا کے آخر میں رکھی جاتی تو اس کی فوری قبولیت کا پہلو نمایاں نہ ہوتا اس وجہ سے اس کو دعا کے پہلے ہی فقرے کے بعد رکھ دیا۔ اس قسم کی تضمین کی متعدد مثالیں پچھلی سورتوں میں گزر چکی ہیں۔

مِمَّا خَطِيْٓـئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنے جرائم کے سبب سے پانی میں غرق اور آگ میں داخل کیے گئے۔ یعنی یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ ان کو پانی اور آگ دونوں کے عذاب

سے سابقہ پیش آیا۔ اس دنیا میں وہ پانی میں ڈوبے اور آخرت میں دوزخ کی آگ میں پڑیں گے۔

'فَلَمْ یَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا' یعنی جب ان کو عذاب سے ڈرایا جاتا تو وہ اپنی عزت و جمعیت اور اپنے مزعومہ دیوتاؤں کے بل پر اکڑتے لیکن جب اللہ کا عذاب آ دھمکا تو اس کے مقابل میں کوئی بھی ان کی مدد کرنے والا نہ اٹھا۔

وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (۲۶-۲۷)

دعا کی تکمیل

تضمین کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی دعا پھر شروع ہو گئی چنانچہ 'قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ' کے الفاظ نے اس کو تضمین سے ممتاز کر دیا۔ اگر تضمین بیچ میں نہ آ گئی ہوتی تو ان الفاظ کے اعادے کی ضرورت نہ ہوتی۔ التباس سے بچنے کے لیے ان کا اعادہ ضروری ہوا۔

فرمایا کہ اے رب! اب تو زمین پر کافروں میں سے ایک متنفس کو بھی نہ چھوڑ۔ عربی میں اگر کہیں کہ 'مَا فِی الدَّارِ دَیَّارٌ' تو اس کے معنی ہوں گے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ اس عمومیت کے ساتھ بد دعا کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ رسول پوری قوم کو اپنے چھاج میں پھٹک لیتا ہے اور وہ اتمامِ حجت کا آخری ذریعہ ہوتا ہے جس کے بعد سنت الٰہی کے مطابق عذاب ہی کا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے۔ فرمایا کہ اب اگر تو ان کو چھوڑے رکھے گا تو یہ کافروں اور نابکاروں ہی کو جنم دیں گے۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ اگرچہ ہر بچہ فطرۃ اللہ پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے بناؤ یا بگاڑ میں سب سے زیادہ دخل والدین کی تربیت اور معاشرہ و ماحول کے اثرات کا ہوتا ہے۔ ماحول اچھا ہو گا تو امید ہے کہ بچہ ایمان و اسلام پر پروان چڑھے گا اور اگر ماحول کافرانہ ہوا تو جیسا کہ 'ابواہ یھودانہ وینصرانہ' والی حدیث سے واضح ہے، بچہ بھی ماحول کے رنگ ہی میں رنگ جائے گا۔ حضرت نوحؑ نے اپنے معاشرہ کو اچھی طرح پھٹک کے دیکھ لیا تھا کہ اس میں ایمان اور نیکی کا ایک ذرہ بھی نہیں ہے اس وجہ سے انھوں نے فرمایا کہ یہ لوگ اب صرف نابکاروں اور کافروں ہی کو جنم دیں گے۔ ان کی کوکھ سے اب کوئی مومن و مسلم جنم لینے والا نہیں ہے۔

رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ۭ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا (۲۸)

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے لیے، اپنے والدین کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو ایمان کے ساتھ ان کے گھر میں پناہ گیر ہو جائیں اور تمام مومنین و مومنات کے لیے مغفرت کی دعا مانگی اور ان لوگوں کی تباہی پر یہ دعا ختم کی جنھوں نے شرک و کفر پر اصرار کر کے اپنے لیے اس تباہی کو دعوت دی۔

والدین کا عظیم حق

'وَلِوَالِدَیَّ'۔ والدین کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعائے مغفرت سے والدین کے اس عظیم

حق کا اظہار ہوتا ہے جس کی تاکید قرآن میں بار بار آئی ہے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ مومن تھے لیکن اس کی تائید میں کوئی اشارہ قرآن میں نہیں ہے۔ ممکن ہے ان کی وفات حضرت نوحؑ کی دعوت یا اتمام حجت سے پہلے ہی ہو چکی ہو۔ ان دونوں ہی صورتوں میں حضرت نوح علیہ السلام کا ان کی مغفرت کے لیے دعا کرنا جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی ممانعت بھی نہیں تھی، ان کے حق کا تقاضا تھا۔

'وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا' سے معلوم ہوتا ہے کہ آخری مرحلہ میں حضرت نوحؑ نے یہ اعلان بھی فرما دیا تھا کہ جو عذاب سے پناہ کے طالب ہوں وہ اس کے ظہور سے پہلے پہلے ان کے گھر میں پناہ گیر ہو جائیں۔

بتوفیقِ الٰہی ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین۔

رحمان آباد

۱۹- ستمبر ۱۹۷۸ء

۱۵- شوال ۱۳۹۸ھ

تدبرِ قرآن

۷۲

الجِن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سورہ کا عمود، سابق سورہ سے تعلق اور مطالب کا تجزیہ

یہ سورہ سابق سورہ ——— نوح ——— کی توام سورہ ہے۔ دونوں کے عمود میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ قومِ نوح کے لیڈروں نے جس ضد و مکابرت کا مظاہرہ کیا، پیغمبر کی دعوت سے جس طرح انھوں نے اپنے کان بند کر لیے اور پھر اس کا جو انجام ان کے سامنے آیا اس کی نہایت ہی مؤثر اور عبرت انگیز تصویر قریش کے لیڈروں کے سامنے سورۂ نوح میں رکھ دی گئی ہے۔ اب اس سورہ میں ان کو یہ دکھایا جا رہا ہے کہ جس قرآن سے وہ اس درجہ بیزار ہیں کہ اس کو سن کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے، منہ نوچ لینے کو جھپٹتے اور دامن جھاڑ کے بھاگ کھڑے ہوتے ہیں اسی کو سن کر جنوں کی ایک جماعت اس قدر اثر پذیر ہوتی ہے کہ وہ فوراً اپنی قوم کے اندر اس کی دعوت پھیلانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ جنوں کے جس واقعہ کا حوالہ یہاں ہے اس کا ذکر سورۂ احقاف کی آیات ۲۹-۳۲ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے ذکر کیا ہے کہ اس کو سنانے سے مقصود ایک تو قریش کو غیرت دلانا ہے کہ جنات، جو قرآن کے براہِ راست مخاطب بھی نہیں ان کا حال تو یہ ہے کہ کبھی سرِ راہے بھی ان کے کانوں میں اس کی بھنک پڑ گئی ہے تو وہ اس کو سن کر تڑپ اٹھے اور ایک تم ہو کہ خاص تمھارے ہی لیے یہ اترا اور تمھی کو اس کی دعوت دینے کے لیے اللہ کا رسول اپنے رات دن ایک کیے ہوئے ہے لیکن تم ایسے بدقسمت ہو کہ اس کی کسی بات کا تمھارے دلوں میں اترنا تو درکنار تم اس کے سنانے والوں کے جانی دشمن بن گئے ہو۔ دوسرا مقصد اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ اگر آپ کی قوم کے اشرار اس قرآن کی ناقدری کر رہے ہیں تو آپ اس سے آزردہ خاطر نہ ہوں۔ جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اس سے فیضیاب نہیں ہوں گے، خواہ آپ کتنے ہی جتن کریں۔ البتہ جن کے اندر کچھ صلاحیت ہو گی ان کے کانوں میں اگر اتفاق سے بھی اس کے کچھ کلمات پڑ جائیں گے تو وہ ان کے اندر گھر کر لیں گے، خواہ وہ اس کے مخاطب ہوں یا نہ ہوں اور خواہ ان کو سنانے کے لیے کوئی اہتمام کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔

جنوں کے جس تاثر کا اس سورہ میں حوالہ دیا گیا ہے اس سے اگرچہ وہ لوگ متاثر نہیں ہوں گے جو صرف محسوسات کے غلام ہیں اور جو ان چیزوں کے سرے سے وجود ہی کے منکر ہیں جو ان کے محسوسات کے

دائرہ سے باہر ہیں لیکن اس طرح کے لوگ یہاں مخاطب بھی نہیں ہیں۔ یہاں مخاطب مشرکین قریش ہیں جو اتنے بلید نہیں تھے کہ صرف انہی چیزوں کو مانیں جنھیں چھوتے اور دیکھتے ہوں۔ وہ جنوں کو نہ صرف مانتے تھے بلکہ ان سے رابطہ رکھنے کے لیے انھوں نے کہانت کا پورا نظام قائم کر رکھا تھا اس وجہ سے قرآن نے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے ان کو جنوں کے یہ تاثرات سنائے کہ وہ چاہیں تو اس سے فائدہ اٹھائیں۔ کاہنوں کے واسطے سے وہ جنوں کے اشرار کی القا کی ہوئی جھوٹی خبریں سنتے تھے۔ قرآن نے ان کے سامنے ان کے اخیار کی ایک سچی رپورٹ رکھی تاکہ جن کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی کچھ صلاحیت ہے وہ اس سے ایمان کی طرف رہبری حاصل کریں۔ قرآن نے غیب کے جو حقائق بیان کیے ہیں وہ اسی مقصد سے بیان کیے ہیں کہ حق کے طالب ان سے فائدہ اٹھائیں۔ اگرچہ محسوسات پرست اس کو واہمہ کی خلاقی قرار دیں گے لیکن نا اہلوں کی ناقدری کے سبب سے قدرت خلق کو اپنی فیض بخشی سے محروم نہیں کرتی۔

سُوْرَۃُ الْجِنِّ (۷۲)

مَکِّیَّۃٌ ____ آیات : ۲۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا آیات ۱ – ۲۸
سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۝۱ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ
وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۝۲ وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ
صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ۝۳ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ
شَطَطًا ۝۴ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا ۝۵ وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ
مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝۶ وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ
لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا ۝۷ وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَاۗءَ فَوَجَدْنٰهَا
مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝۸ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا
مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ۭ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا
رَّصَدًا ۝۹ وَّاَنَّا لَا نَدْرِيْٓ اَشَرٌّ اُرِيْدَ بِمَنْ فِي الْاَرْضِ اَمْ
اَرَادَ بِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا ۝۱۰ وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ

ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَاۗىِٕقَ قِدَدًا ۙ ﴿١١﴾ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ
فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا ۙ ﴿١٢﴾ وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى
اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا ۙ ﴿١٣﴾
وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰۗىِٕكَ
تَحَرَّوْا رَشَدًا ﴿١٤﴾ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ۙ ﴿١٥﴾ وَّ
اَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَي الطَّرِيْقَةِ لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّاۗءً غَدَقًا ۙ ﴿١٦﴾
لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا
صَعَدًا ۙ ﴿١٧﴾ وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ۙ ﴿١٨﴾
وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ
لِبَدًا ۭۧ ﴿١٩﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٠﴾ قُلْ ع ۱۹ / ۱۱
اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿٢١﴾ قُلْ اِنِّىْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ
اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿٢٢﴾ اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ
وَرِسٰلٰتِهٖ ۭ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ﴿٢٣﴾ حَتّٰٓي اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ
اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿٢٤﴾ قُلْ اِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ مَّا
تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْٓ اَمَدًا ﴿٢٥﴾ عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا
يُظْهِرُ عَلٰي غَيْبِهٖٓ اَحَدًا ﴿٢٦﴾ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ
يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ ﴿٢٧﴾ لِّيَعْلَمَ

لِّيَعْلَمَ أَن قَدْ أَبْلَغُوا رِسَالَاتِ رَبِّهِمْ وَأَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ وَأَحْصَىٰ كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا ﴿٢٨﴾

ع ۲ ۹ ۱۲

ترجمۂ آیات ۱ - ۲۸

کہہ دو، مجھے وحی کی گئی ہے کہ جنوں کی ایک جماعت نے قرآن کو سنا تو انھوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ ہم نے ایک نہایت دل پذیر قرآن سنا جو ہدایت کی راہ بتاتا ہے تو ہم اس پر ایمان لائے اور اب ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور یہ کہ ہمارے رب کی شان بہت بلند ہے، اس نے اپنے لیے نہ کوئی بیوی بنائی ہے نہ کوئی اولاد اور یہ کہ ہمارا بے وقوف (سردار) اللہ کے بارے میں حق سے بالکل ہٹی ہوئی باتیں کہتا رہا ہے۔ اور یہ کہ ہم نے گمان کیا کہ انسان اور جن خدا پر ہرگز کوئی جھوٹ نہیں باندھ سکتے۔ اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو جنوں میں سے بعض کی دہائی دیتے رہے ہیں تو انھوں نے ان کی شامت ہی میں اضافہ کیا اور یہ کہ انھوں نے بھی تمھاری ہی طرح یہ گمان کیا کہ اللہ کسی کو مرنے کے بعد زندہ کرنے والا نہیں ہے اور ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو دیکھا کہ وہ سخت پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں کچھ سن گن لینے کو بیٹھا کرتے تھے پر اب جو بیٹھے گا تو وہ ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔ اور یہ کہ ہم نہیں جانتے کہ یہ زمین والوں کے لیے کوئی برائی چاہی گئی ہے یا ان کے رب نے ان کے لیے بھلائی چاہی ہے اور یہ کہ ہم میں بھی نیک اور اس سے مختلف قسم کے لوگ ہیں، ہماری راہیں الگ الگ ہیں۔ اور یہ کہ ہم نے مان لیا کہ ہم اللہ کے قابو سے نہ زمین میں کہیں جا کر نکل سکتے اور نہ آسمان میں کہیں بھاگ کر۔ اور یہ کہ جب ہم نے ہدایت کی بات سنی ہم اس پر ایمان

لائے۔ پس جو اپنے رب پر ایمان لائے گا تو اس کو نہ کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی زیادتی کا اور یہ کہ ہم میں فرمانبردار بھی ہیں اور بے راہ بھی تو جنھوں نے فرمانبرداری کی روش اختیار کی انھوں نے ہدایت کی راہ ڈھونڈی۔ اور جو بے راہ ہوئے تو وہ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ۱-۱۵

اور مجھے وحی آئی ہے کہ اگر یہ (قریش) سیدھی راہ پر گامزن رہتے تو ہم ان کو خوب خوب سیراب کرتے کہ ہم اس میں ان کو آزمائیں اور جو اپنے رب کی یاددہانی سے منہ موڑیں گے تو وہ ان کو چڑھتے عذاب میں داخل کرے گا۔ اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے ہیں تو اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ اور یہ کہ جب اللہ کا بندہ صرف اللہ ہی کو پکارتا کھڑا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس پر پل پڑیں گے۔ کہہ دو کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکارتا ہوں اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراؤں گا۔ کہہ دو، میں نہ تمھارے لیے کسی ضرر پر کوئی اختیار رکھتا نہ کسی نفع پر۔ کہہ دو، مجھے اللہ سے کوئی پناہ دینے والا نہیں بنے گا اور نہ میں اس کے سوا کوئی ملجا پا سکوں گا۔ بس اللہ کی طرف سے پہنچا دینا اور اس کے پیغاموں کی ادائیگی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں گے تو ان کے لیے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے اس چیز کو جس سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے تب وہ جانیں گے کہ مددگاروں کے اعتبار سے سب سے زیادہ کمزور اور تعداد کے لحاظ سے سب سے حقیر کون ہے! کہہ دو، مجھے کچھ نہیں پتا کہ جس چیز سے تمھیں آگاہ کیا جا رہا ہے وہ قریب ہی ہے یا میرا رب ابھی اس کو کچھ مدت اور ٹالنے والا ہے۔ غیب کا

جاننے والا وہی ہے اور وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا۔ رہے وہ جن کو وہ رسول کی حیثیت سے انتخاب فرماتا ہے تو وہ ان کے آگے اور پیچھے پہرہ رکھتا ہے کہ دیکھے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام پہنچا دیے اور وہ ان کے گرد و پیش کا احاطہ کیے اور ہر چیز کو شمار میں رکھے ہوتا ہے۔ ۱۶-۲۸

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا (۱)

جنوں کے تاثرات کی اطلاع پیغمبر کو وحی کے ذریعہ ہوئی

'قُلْ اُوْحِيَ' کے الفاظ سے یہ بات صاف عیاں ہے کہ جنوں کے جو تاثرات اس سورہ میں بیان ہوئے ہیں وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو براہ راست جنوں کی زبانی نہیں بلکہ وحی الٰہی کے ذریعہ معلوم ہوئے۔ ان کی ایک جماعت نے سر راہے کہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے سنا جس کی کشش نے ان کے دلوں کو اس طرح موہ لیا کہ وہ اس کے سننے میں ہمہ تن محو ہو گئے اور پھر اس دل پذیر کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ پلٹے تو اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے اٹھ کھڑے ہوئے۔

واقعہ کو سنانے کا مقصد

یہ کس موقع کا ذکر ہے؟ اس کا کوئی قطعی جواب دینا مشکل ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ اسی واقعہ کی تفصیل ہے جس کا اجمالی ذکر سورۂ احقاف میں ہوا ہے۔ وہاں روایات کی روشنی میں اس کے موقع و محل کی وضاحت ہم کر چکے ہیں۔ جنوں کے ان تاثرات کی آپ کو اس لیے اطلاع دی گئی کہ اپنی قوم کو آپ سنا دیں کہ جس کلام بلاغت نظام کے ساتھ تمھارا سلوک یہ ہے کہ اس کو سن کر تم کانوں میں انگلیاں دے لیتے اور اس کے سنانے والے کے دشمن بن کر اٹھ کھڑے ہوتے ہو درآنحالیکہ یہ کلام تمھارے ہی لیے اترا ہے، اس کلام کو سن کر ذی صلاحیت جنات اس طرح اس کے عاشق ہو جاتے ہیں کہ اپنی قوم کو اس کی دعوت دینے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں حالانکہ وہ براہِ راست اس کے مخاطب بھی نہیں۔

لفظ 'قُلْ' اس بات پر دلیل ہے کہ جنوں کے ان تاثرات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقصد سے آگاہ فرمایا گیا کہ آپ قریش کے لیڈروں کو یہ سنا دیں کہ ان کو کچھ غیرت آئے۔ ضمناً اس میں آپ کے لیے تسلی بھی ہے کہ نااہلوں کی ناقدری سے آپ آزردہ نہ ہوں۔ اگر یہ لوگ اس کی قدر نہیں کر رہے ہیں تو اس میں قصور نہ اس کلام کا ہے نہ آپ کا بلکہ یہ خود ان لوگوں کے اپنے دلوں کے فساد کا نتیجہ ہے۔

جنوں کی دعوت اپنی قوم کو

'فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا' یہ وہ دعوت ہے جو انھوں نے اس کلام کو سننے کے بعد اپنی

قوم کو دی۔ یعنی اس کو سن کر وہ صرف واہ واہ کر کے نہیں رہ گئے بلکہ انھوں نے حق کی قدر دانی اور اپنی قوم کی خیر خواہی کا یہ لازمی تقاضا سمجھا کہ جس نعمتِ آسمانی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بہرہ مند فرمایا اس سے وہ اپنی قوم کو بھی بہرہ مند کریں۔

'عَجَبٌ' مصدر ہے اس وجہ سے 'عجیب' کے مقابل میں اس کے اندر مبالغہ کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ یہ لفظ انھوں نے اس کلام کی دل پذیری، اثر انگیزی اور حکمت آفرینی کے پہلو سے استعمال کیا۔ عربی میں یہ لفظ صرف کسی شے کے انوکھے پن کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ اس کی دل پذیری اور اثر انگیزی کے پہلو کو ظاہر کرنے کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ اسی پہلو سے آیا ہے۔ سورۂ احقاف میں یہی بات ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

قَالُوْا يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا	اے ہماری قوم کے لوگو! ہم نے ایک کتاب سنی
اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا	ہے جو موسیٰ کے بعد اپنے پہلے کی پیشین گوئیوں کی
بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى	مصداق بنا کر نازل کی گئی ہے جو حق اور ایک
طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ (الاحقاف - ۴۶: ۳۰)	بالکل سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

اس سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ جنات صرف اپنی ہی زبان نہیں بلکہ جس علاقہ سے وہ تعلق رکھتے ہیں اس علاقہ کے انسانوں کی زبان بھی سمجھتے ہیں اور ان کے اندر ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس زبان کے حسن و قبح کے اچھی طرح پرکھنے والے بھی ہوتے ہیں۔

يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا (۲)

قرآن کی دعوتِ رُشد: یہ قرآن کی اسی دل پذیری کی وضاحت ہے جس کی طرف لفظ 'عجیب' اشارہ کر رہا ہے۔ یعنی یہ کتاب اس حق و ہدایت کی طرف رہنمائی کر رہی ہے جس کو ہر سلیم الفطرت کا دل قبول کرتا ہے۔ سورۂ احقاف کی مذکورہ بالا آیت میں 'يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ' کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں اسی مضمون کے لیے جامع لفظ 'رُشْد' استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ ان تمام بنیادی عقائد اور نیکیوں پر حاوی ہے جو انسانی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔ انسان اپنے اختیار کے سوءِ استعمال سے اپنی فطرت بگاڑ نہ لے تو یہ اس کی رہنمائی صحیح سمت میں کرتی ہے اور اگر غفلت کے سبب سے ان پر کبھی حجاب بھی آ جاتا ہے تو وہ معمولی تذکیر و تنبیہ سے دور ہو جاتا ہے بشرطیکہ انسان نفس کی خواہشوں کی پیروی میں اس کی ناقدری نہ کرے۔ اس 'رُشد' میں سب سے اونچا مقام توحید کا ہے۔ تمام بنیادی عقائد و اعمال کا منبع بھی وہی ہے اور اسی پر ان کی صحت کا مدار بھی ہے۔

رشد کا حق: 'فَاٰمَنَّا بِهٖ'۔ یہ انھوں نے اس 'رُشد' کا حق بیان کیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس ہدایت سے ہمیں آگاہ فرمایا تو ہم نے اس کا یہ فطری حق سمجھا کہ ہم اس پر ایمان لائیں۔ چنانچہ ہم نے اس کو صدقِ دل سے

قبول کر لیا۔

'وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا'۔ تمام رشد کا سرنامہ، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، توحید ہی ہے رشد کا سرچشمہ
چنانچہ انھوں نے اس رشد پر ایمان کا تقاضا یہ بیان کیا کہ اب ہمارے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ ہم کو اپنے رب کا شریک ٹھہرائیں۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ تمام بنیادی عقائد اور نیکیاں نہ صرف انسانوں اور جنوں کے درمیان مشترک ہیں بلکہ قرآن میں یہ وضاحت ہے کہ یہ تمام کائنات میں مشترک ہیں۔ ہمارے اور جنوں کے درمیان فرق ہے تو معاشرتی احکام میں ہے۔ توحید، معاد، جزاء و سزا اور فضائل و رذائل میں فرق کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ چنانچہ انہی چیزوں کا یہاں ذکر آیا ہے اور قرآن نے مکی زندگی کے ابتدائی دور میں انسانی فطرت کے انہی ابتدائی مطالبات کی لوگوں کو دعوت بھی دی۔

وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا (۳)

یہ انھوں نے اپنے قول 'وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا' کی مزید وضاحت کر دی کہ اب ہم پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ ہمارے رب کی شان بیوی بچوں کی نسبتوں سے بالکل پاک اور نہایت ارفع ہے۔ نادان ہیں وہ لوگ جو اس طرح کی چیزیں اس سے منسوب کرتے ہیں۔ اس نے نہ اپنے لیے کوئی بیوی بنائی اور نہ کوئی اولاد۔

'جد' کے معنی عظمت، شان اور رتبہ کے ہیں۔ یعنی اس کی ذات اتنی بلند ہے کہ کوئی چیز اس کی شریک و سہیم اور ہم رتبہ نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنی ذات میں بالکل یکتا، بے نیاز اور ہر چیز سے مستغنی ہے۔ کسی کا یہ درجہ نہیں کہ اس کا کفو اور ہمسر ہو سکے۔

یہ قول اگرچہ جنات ہی کا ہے اس وجہ سے اس کو 'فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا' کے تحت ہی ہونا چاہیے تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ باتیں براہ راست نہیں بلکہ وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوئیں اس وجہ سے اس کو 'قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّهُ' کے تحت کر دیا گیا اور آگے جنات کے سارے اقوال اسی کے تحت آئیں گے۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا (۴)

'سَفِيْهُ' کے معنی بے وقوف کے ہیں۔ یہاں یہ لفظ جنوں نے اپنے سردار کے لیے استعمال کیا ہے سفیہ لیڈروں
اس لیے کہ قرآن سن لینے کے بعد اپنے سردار کی سفاہت ان پر واضح ہو گئی۔ کی پیروی سے
'شَطَطًا' حق و عدل سے نہایت دور ہٹی ہوئی بات کو کہتے ہیں۔ اجتناب کی دعوت

جنوں پر جب توحید کی حقیقت واضح ہو گئی تو انھوں نے اپنی قوم کو آگاہ کیا کہ ہمارا بدھو سردار اللہ تعالیٰ جل شانہ پر حق سے نہایت دور ہٹی ہوئی یہ تہمتیں جڑتا رہا ہے کہ اس کے بیوی بھی ہے اور اولاد بھی ہے، فلاں اور فلاں اس کے بیٹے اور فلاں اور فلاں اس کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ لیکن

ہم نے جو قرآن سنا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ ہمارے احمق سردار کی یہ باتیں بالکل بے بنیاد تھیں۔ چنانچہ ہم نے ان خرافات سے توبہ کرلی اور ہم قوم کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ لوگ اس طرح کی باتوں سے توبہ کریں اور اس سفیہ کے جھکے میں نہ آئیں۔

اس آیت سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ جنّات عوام کے طبقہ سے تھے۔ ان کے سردار جس ڈگر پر ان کو چلاتے رہے اس پر وہ چلتے رہے لیکن جب ان پر یہ حقیقت واضح ہوگئی تو انھوں نے پوری ایمانی جرأت سے ان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں سے نکال پھینکا اور اللہ کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر چل پڑے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطہ سے قریش کے عوام کو یہ باتیں اس لیے سنائی گئیں کہ ان کے اندر بھی اپنے احمق لیڈروں کے پھندے سے نکلنے اور اپنی عقل و بصیرت پر اعتماد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا (۵)

مغالطہ پر تنبیہ

یہ اس مغالطہ کی طرف اشارہ ہے جس کے سبب سے وہ اپنے ان سرداروں کے چکر میں پھنسے رہے۔ کہا کہ ہم نے گمان کیا کہ بھلا انسان اور جنّات اللہ تعالیٰ پر یہ تہمت باندھنے کی جسارت کس طرح کرسکتے ہیں کہ اس نے فلاں اور فلاں کو اپنا شریک بنایا اور ان کو مستحق عبادت ٹھہرایا ہے۔ لیکن انھوں نے یہ جسارت کی اور ہم اپنی سادگی کے سبب سے ان کے چکموں میں آگئے۔

یہ ان کی طرف سے اپنی قوم کے عوام کو آگاہی ہے کہ اپنے ان پروہتوں کے تقدّس کے فریب میں مبتلا ہو کر اپنی عقل کو معطل نہ رکھ چھوڑو بلکہ اپنی سمجھ سے کام لو۔ ایسا نہ ہو کہ مچھلی کے نام سے یہ تمھیں سانپ پکڑا دیں۔

وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا (۶)

انسانوں کی بعض حماقتوں کی طرف اشارہ

اسی سلسلہ میں انھوں نے اپنی قوم کے سامنے اپنا یہ انکشاف بھی بیان کیا کہ اس قرآن سے ہمیں یہ علم بھی ہوا کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ افراد کی دہائی دیتے رہے ہیں لیکن اس سے ان کو کچھ نفع پہنچنے کے بجائے ان کی شامت اور بدبختی ہی میں اضافہ ہوا۔

'رَهَقٌ' کے اصل معنی کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ ڈالنے کے ہیں۔ یہیں سے اس کا استعمال زیادتی، گناہ، حق تلفی اور تعدّی کے معنی میں وسیع ہوگیا۔ چنانچہ آگے آیت ۱۳ میں یہ لفظ تعدّی کے معنی میں آیا ہے۔

عام طور پر لوگوں نے آیت کے معنی یہ لیے ہیں کہ کچھ بے وقوف انسانوں نے جنوں کی دہائی دے کر ان کے دماغ کو عرش پر پہنچا دیا ہے لیکن یہ تاویل صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ اوّل تو اس کلام کا کچھ فائدہ سمجھ میں نہیں آتا ثانیاً لفظ 'رَهَق' کے اصل مفہوم سے اس میں تجاوز بھی ہے۔ میرے نزدیک 'زَادُوْا' کا فاعل 'رِجَالٌ مِّنَ الْجِنِّ' اور 'هُمْ' کا مرجع 'رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ' ہے یعنی بے وقوف انسانوں نے تو

جنوں کی پناہ اس لیے ڈھونڈی کہ وہ ان کی آفتوں سے اپنے کو بچائیں لیکن جنوں نے جب دیکھا کہ کچھ انسان ان کے جال میں پھنسے ہیں تو انھوں نے اپنے شر سے محفوظ رکھنے کے بجائے ان کو اور تگنی کا ناچ نچایا۔

عرب کے مشرکین میں جنّات سے متعلق یہ وہم تھا کہ وہ غیب کی خبریں معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں چنانچہ اسی چیز نے ان کے ہاں کہانت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا جس کی بنیاد تمام تر، جیسا کہ اس کے محل میں وضاحت ہو چکی ہے، جھوٹ اور فریب پر تھی۔ کاہن اپنے جال میں پھنسے ہوئے بے وقوفوں میں سے جس کو ڈرا دیتے کہ فلاں خطرناک جن تم پر بہت برہم ہے، اگر تم نے اس کے لیے فلاں چیز کی قربانی یا اتنی نذر نہ گزرانی تو وہ آفت میں مبتلا کر دے گا تو وہ لازماً ان کے حکم کی تعمیل کرتا۔ یہاں تک کہ انہی کاہنوں کے حکم سے بعض بے وقوف لوگ جنوں کو راضی کرنے کے لیے اپنی اولاد تک کو، جیسا کہ سورۂ انعام میں ذکر ہے، قربانی کر دیتے۔

اسی نوع کا ایک دوسرا وہم یہ پایا جاتا تھا کہ ہر وادی اور ہر پہاڑی جنوں کے کسی خاص گروہ کا مسکن ہوتی ہے۔ اگر اس وادی میں رات گزارنے کی نوبت آئے تو ضروری ہے کہ اس کے سردار جن کی پناہ حاصل کر لی جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ وہ کسی آفت میں مبتلا کر دے۔ چنانچہ دورِ جاہلیت میں اہل عرب جب کسی وادی میں شب گزارتے تو اس وادی کے سردار جن کی دہائی دے کر اپنے گمان کے مطابق اس کی پناہ حاصل کر لیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک خواہ مخواہ کی مصیبت تھی جس میں جنوں کے وہم نے ان کو مبتلا کر رکھا تھا۔

اسی طرح کی باتوں کی طرف ان مومن جنوں نے اشارہ کیا ہے اور ان کا مقصود یہ دکھانا ہے کہ توحید کے شعور سے محرومی کے باعث بے وقوف انسانوں اور شریر جنوں میں کس طرح گٹھ جوڑ رہا ہے اور اس سے کیا کیا روحانی و مادی مفاسد ظہور میں آ رہے تھے جن کے سدّباب کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ کتاب نازل فرمائی ہے۔

لفظ 'رِجَالٌ' کی تنکیر تحقیر اور تفخیم دونوں پر دلیل ہو سکتی ہے۔ آپ یہ معنی بھی لے سکتے ہیں کہ انسانوں کے اندر کے کچھ بے وقوف ہمارے اندر کے کچھ بے وقوفوں کی دہائی دیتے تھے اور یہ معنی بھی لے سکتے ہیں کہ انسانوں کے اندر کے کچھ شریر ہمارے اندر کے کچھ شریروں کی دہائی دیتے تھے بلکہ یہ معنی بھی اگر لیں کہ انسانوں کے اندر کے کچھ احمق ہمارے اندر کے کچھ شریروں کی دہائی دیتے ہیں تو یہ بھی عربیت کے خلاف نہیں ہوگا۔

وَاَنَّهُمْ ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا (۷)

توحید کے بعد قیامت کا حوالہ

توحید کے بعد یہ قیامت کے باب میں انھوں نے دونوں گروہوں کی غلط فہمی کی طرف اشارہ

کیا کہ جس طرح تم اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہو کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کسی کو زندہ نہیں کرے گا اسی طرح انسان بھی اس غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن لوگوں کی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کے لیے نازل ہوا ہے۔

بعض لوگوں نے اس کا یہ مطلب بھی لیا ہے کہ جس طرح تمھارے ہاں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کسی کو رسول بنا کر بھیجنے والا نہیں ہے اسی طرح انسانوں کے اندر یہ بھی غلط فہمی موجود تھی مطلب یہ ہے کہ اس قرآن کے نزول نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کیا۔

اگرچہ آیت کے الفاظ کے اندر یہ معنی لینے کی گنجائش موجود ہے لیکن یہ بات کھٹکتی ہے کہ قرآن کے اوّلین مخاطبوں میں، خواہ بنی اسماعیل ہوں یا بنی اسرائیل، پچھلی پیشین گوئیوں کی بنا پر ایک رسول کی بعثت کا انتظار تھا۔ اگرچہ اہل کتاب نے ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کا انکار نہ کر سکے۔ بنی اسماعیل کے اندر، ان کی امیّت کے سبب سے، اس رسول کا تصوّر کچھ واضح نہیں تھا لیکن قطعیت کے ساتھ انکار انھوں نے بھی نہیں کیا۔ چنانچہ قرآن کے بعض مقامات میں ان کو ملامت فرمائی گئی ہے کہ رسول کی بعثت سے پہلے پہلے تو تم بڑھ چڑھ کر دعوے کرتے تھے کہ تمھارے اندر اللہ نے کوئی رسول بھیجا تو تم اس کی دعوت کو سب سے پہلے قبول کرنے والے اور اس کی ہدایت پر سب سے زیادہ عمل کرنے والے بنو گے لیکن جب اللہ نے اس نعمت سے تمھیں نوازا تو تم اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا شَدِيْدًا وَّشُهُبًا ۝ وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ ؕ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا (۸-۹)

ایک نئے تجربے کا حوالہ

یہ انھوں نے اپنے ایک خاص تجربہ کا حوالہ دیا جو اس کتاب کے نزول کے دور میں بالکل پہلی بار اس کائنات کے نظام میں ان کو ہوا۔ انھوں نے اپنی قوم کو بتایا کہ اس دوران میں ہم نے آسمان کا جائزہ لیا تو یہ دیکھا کہ آسمان زبردست پہرہ داروں اور شہابوں سے بھر دیا گیا ہے اور ہم اس کے بعض ٹھکانوں میں عالم بالا کے اسرار کی کچھ سن گن لینے کے لیے جو بیٹھا کرتے تھے تو اب اس کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اگر کوئی اب اس کی کوشش کرے گا تو ایک شہاب کو اپنی گھات میں پائے گا۔

قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بیان فرمائی گئی ہے کہ شیاطین جن علم غیب کی باتیں اچکنے کے لیے جب گھات لگاتے ہیں تو ان پر شہاب ثاقب کی مار پڑتی ہے۔ جنوں کے اس ذاتی تجربہ سے اس بات کی تصدیق بھی ہوتی ہے اور مزید برآں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ پہلے تو گھات لگانے کی کچھ گنجائش تھی لیکن جس دور کا وہ یہ تجربہ بیان کر رہے ہیں اس دور میں آسمان کا ہر گوشہ پہرہ داروں اور شہابوں سے اس طرح بھر دیا گیا تھا کہ جنوں کے لیے دراندازی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

جنوں نے کائنات میں اس اہم تغیر کا ذکر تو کیا لیکن قوم کے سامنے اس کا کوئی سبب وہ نہیں بتا سکے۔ اس کی وجہ آگے کی آیت سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس اہم تبدیلی کی حکمت ان پر اچھی طرح واضح نہیں تھی۔ تاہم نزولِ قرآن کے واقعہ کے ساتھ اس واقعہ کو ملا کر انھوں نے لوگوں کو یہ تاثر دے دیا کہ آسمان کے نظام میں یہ تبدیلی بھی قرآن کے نزول ہی سے تعلق رکھنے والی بات ہے۔

ہمارے نزدیک ان کا یہ قیاس صحیح تھا۔ قرآن کے متعدد مقامات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ آسمان میں جو پہرا اس کو شیاطین کی مداخلت سے محفوظ رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قائم کر رکھا ہے وہ نزولِ وحی کے زمانے میں نہایت سخت کر دیا گیا تھا تاکہ ان کو وحی میں کسی دراندازی کی راہ نہ ملے۔ یوں تو یہ پہرا ہمیشہ ہی رہا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے بھی شیاطین پر شہابوں کی مار پڑتی رہی ہے لیکن جس طرح حکومتیں اس شاہراہ کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر دیتی ہیں جس پر سے شاہی خزانہ لے جایا جانے والا ہو یا بادشاہ کی سواری گزرنے والی ہو اسی طرح وحی کے نزول اور جبریل امینؑ کی آمد و شد کے دور میں معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی ہر طرف سے ناکہ بندی کر دی گئی تھی تاکہ اچکوں کی ہر راہ مسدود ہو جائے۔

جنوں کی اس اطلاع کا ذکر قرآن نے یہاں مشرکینِ عرب کے سامنے اس لیے کیا ہے کہ وہ قرآن پر یہ الزام جو لگاتے ہیں کہ یہ کاہنوں کے طرز کا کلام ہے جو نعوذ باللہ کوئی جن پیغمبرؐ پر القا کرتا ہے۔ یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کی تردید کے لیے خود جنوں کا یہ بیان کافی ہے کہ اس دور میں آسمان سے کوئی خبر لانا تو درکنار اس کے اندر ان کے جو ٹھکانے تھے اب ان تک پہنچنا بھی ان کے لیے ممکن نہیں رہا۔

وَّاَنَّا لَا نَدۡرِیۡۤ اَشَرٌّ اُرِیۡدَ بِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ اَمۡ اَرَادَ بِہِمۡ رَبُّہُمۡ رَشَدًا ﴿۱۰﴾

اہلِ زمین کے لیے ایک مبارک قرآن کی طرف اشارہ

ان جنوں پر نظامِ کائنات میں اس اہم تبدیلی کی اصل علت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، اچھی طرح واضح نہیں تھی اس وجہ سے انھوں نے اس کی کوئی قطعی وجہ بیان کرنے کے بجائے اس پر صرف اپنے تردد کا اظہار کیا کہ اگرچہ اس کا سبب ہم پر واضح نہیں ہے تاہم یہ زمین میں کسی اہم انقلاب کا پیش خیمہ ضرور ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ انقلاب اہلِ زمین کے لیے سببِ شر ہو گا یا اس میں ان کے رب کی طرف سے کوئی بڑا خیر مضمر ہے تو اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔

اگرچہ انھوں نے بربنائے احتیاط اپنی رائے واضح نہیں کی لیکن اسلوبِ کلام شاہد ہے کہ اہلِ زمین کے لیے انھوں نے اس کو ایک فالِ نیک سمجھا۔ چنانچہ شر کا ذکر تو انھوں نے مجہول کے اسلوب میں کیا لیکن رشد و ہدایت کی توقع کا ذکر بصیغۂ معروف اَمۡ اَرَادَ بِہِمۡ رَبُّہُمۡ رَشَدًا کے الفاظ سے کیا۔ ان دونوں اسلوبوں میں اللہ تعالیٰ کے لیے ادب و احترام کے پہلو سے جو فرق ہے اس کی وضاحت سورۂ کہف کی تفسیر میں ہو چکی ہے۔ یہاں خاص طور پر جو بات نگاہ میں رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اگر

ان کا ظنِ غالب یہ نہ ہوتا کہ اس میں اہلِ زمین کے لیے خیر ہے تو اس دوسرے فقرے کو بھی پہلے فقرے کی طرح مجہول کے مبہم اسلوب ہی میں کہتے ۔ لیکن قرآن اور اس تبدیلی کو پہلو بہ پہلو دیکھ کر ان کا ذہن اسی طرف گیا کہ یہ دونوں واقعے اہلِ زمین کے لیے ایک ہی نوع کے ہیں اور یہ قرانِ السعدین کی حیثیت رکھتے ہیں۔

وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ۭ كُنَّا طَرَاۗىِٕقَ قِدَدًا (۱۱)

وصل و فصل کی بنیاد ایمان و عمل پر ہونی چاہیے

یعنی اب تک تو نیکی اور بدی کے درمیان ہماری نگاہوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ برے اور بھلے دونوں ہماری نظروں میں یکساں تھے لیکن اس قرآن نے ہمارا یہ مغالطہ دور کر دیا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہم میں سب ایک ہی راہ پر چلنے والے نہیں ہیں بلکہ ہمارے طریقے اور راہیں الگ الگ ہیں اور ضروری ہے کہ ہم اس فرق کو ملحوظ رکھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کریں۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان وصل و فصل کی بنیاد ایمان اور کفر کو ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو ہماری قوم اور قبیلہ کا ہے وہ ہمارا ہے، خواہ وہ کافر ہو یا مومن، نیک ہے یا بد۔

یہ گویا انھوں نے اپنی قوم کے ان لوگوں سے اعلانِ براءت کیا ہے جو ان کی اس دعوتِ ایمان کے بعد بھی اپنے کفر و شرک پر اڑے رہنے کے لیے ضد کریں۔ اس طرح کا اعلان تمام انبیاء نے اپنی اپنی قوموں کے سامنے کیا اور ہر دور کے مصلحین نے بھی انبیاء علیہم السلام کی اس سنت کی پیروی کی جس کی ایک واضح مثال اصحابِ کہف کا رویہ ہے جو سورۂ کہف میں بیان ہوا ہے۔

'طَرَاۗىِٕقَ' کے معنی راستے اور مسلک و مذہب کے ہیں اور 'قِدَدًا' کے معنی متفرق کے۔

وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِي الْاَرْضِ وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا (۱۲)

انسان ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہے

دعوت کے بعد یہ انھوں نے اپنی قوم کو انذار کیا کہ ہم پر یہ حقیقت بھی واضح ہو گئی ہے کہ ہر وقت ہم خدا کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ جب چاہے ہمیں پکڑ سکتا ہے۔ نہ ہم زمین میں کہیں چھپ کر اس کی گرفت سے بچ سکتے اور نہ آسمانوں میں کہیں بھاگ کر اس کے قابو سے نکل سکتے۔

اس آیت میں عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق، بعض متقابل الفاظ محذوف ہیں جو قرینہ سے سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً پہلے ٹکڑے میں 'فِي الْاَرْضِ' ظاہر کیا گیا تو دوسرے ٹکڑے میں 'فِي السَّمَآءِ' حذف کر دیا گیا۔ اسی طرح دوسرے میں 'هَرَبًا' کا لفظ آیا تو پہلے ٹکڑے میں اس کا مدمقابل حذف ہو گیا۔ ترجمے میں یہ محذوفات ہم نے کھول دیے ہیں۔ اردو میں یہ اسلوب غیر معروف ہے اس وجہ سے محذوفات کھولے بغیر مطلب ادا نہیں ہوتا۔

وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى اٰمَنَّا بِهٖ ۭ فَمَنْ يُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا (۱۳)

ایمان لانے والوں کو کوئی اندیشہ نہیں

یہ قوم کے سامنے انھوں نے اپنی مثال پیش کی ہے کہ جب یہ ہدایت بخش دعوت ہمارے کانوں

میں پڑی تو ہم نے اپنے اوپر یہ واجب سمجھا کہ اس کی قدر کریں چنانچہ ہم اس پر ایمان لائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی روش ان تمام لوگوں کو اختیار کرنی چاہیے جن کے اندر حق و ہدایت کے لیے احترام موجود ہے جو لوگ اس سے بھاگیں گے ان کا اعراض گواہی دے گا کہ وہ اپنی عقل کے بجائے اپنی خواہشوں کی پیروی کرنا چاہتے ہیں۔

'فَلَا یَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا'۔ 'بَخْسٌ' کے معنی کمی کرنے اور 'رَهَقٌ' کے معنی جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، زیادتی کرنے کے ہیں۔ یہی مضمون معمولی تغیر کے ساتھ 'فَلَا یَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا' (طٰهٰ - ۲۰ : ۱۱۲) کے الفاظ میں بھی ادا ہوا ہے۔

یہ انھوں نے دعوتِ ایمان قبول کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے کہ جو لوگ ایمان لائیں گے وہ اطمینان رکھیں کہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کا بھرپور صلہ دے گا، نہ ان کو کسی حق تلفی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی تعدی کا۔ جو کچھ جس نے کیا ہوگا وہی اس کے سامنے آئے گا۔ 'فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ' (الزلزال - ۹۹ : ۷-۸)

وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ۭ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا ۝ وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا (۱۴-۱۵)

خیر اور شر میں امتیاز کا بدیہی نتیجہ

یعنی جب اللہ تعالیٰ نے خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت بھی ہمارے اندر ودیعت فرمائی ہے، اپنے نبیوں اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے خیر اور شر دونوں کو اچھی طرح اجاگر بھی کر دیا ہے اور ایک امرِ واقعی کی حیثیت سے ہم اس صورتِ حال کا بھی مشاہدہ کر رہے ہیں کہ ہمارے اندر خدا کے فرماں بردار اور نافرمان دونوں قسم کے لوگ ہیں تو اس کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ دونوں سے ایک ہی طرح کا معاملہ نہ کرے بلکہ جو اس کی اطاعت کی راہ اختیار کرنے والے ہوں وہ تو اس کے صلے میں جنت کے حق دار ٹھہریں اور جو حق سے منحرف ہوں وہ جہنم کے ایندھن بنیں۔ حق و باطل میں یہ امتیاز اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی حکمت کا لازمی تقاضا ہے۔ ورنہ یہ دنیا ایک اندھیر نگری ہے جس کے خالق کے نزدیک معاذ اللہ نیکی اور بدی دونوں یکساں ہیں۔

وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا عَلَی الطَّرِیْقَةِ لَاَسْقَیْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا (۱۶)

کلام کا رخ براہِ راست قریش کی طرف

جنوں کے تاثرات و اقوال کا حوالہ دینے کے بعد یہاں سے کلام کا رخ براہِ راست قریش کی طرف مڑ گیا۔ پہلی آیت میں لفظ 'قُلْ' کی وضاحت کرتے ہوئے ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ قرآن اور اس کی دعوت کے متعلق جنوں کی یہ باتیں آپ قریش کے ناقدروں اور مغروروں کو پہنچا دیں۔ اس کے بعد اب براہِ راست قریش کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر وہ صراطِ مستقیم پر استوار رہتے تو یہ خسارے کا سودا نہیں تھا بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی راہ یہی ہے۔ ہم اس کے صلے میں

ان پر اپنی رحمت کی گھٹائیں برسا تے۔

'مَآءً غَدَقًا' کے لغوی معنی نو وافر پانی کے ہیں لیکن عربی میں یہ تعبیر ہے رزق و فضل کے بہتات کی۔اس کی مثالیں پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکی ہیں۔ سابق سورہ میں فرمایا ہے:

اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۙ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۭ (نوح - ۷۱: ۱۰-۱۲)	اپنے رب سے مغفرت مانگو۔ وہ نہایت بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر اپنے ابرِ کرم کے دونگڑے برسائے گا اور مال و اولاد سے تمھاری مدد فرمائے گا۔ اور تمھارے لیے باغ بھی پیدا کرے گا اور نہریں بھی جاری کرے گا۔

یہ قریش کے اس وہم کا ازالہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی خوشحالی کو اپنے بتوں کا فیض سمجھتے اور ڈرتے ہیں کہ اگر قرآن کی دعوت انھوں نے قبول کر لی تو مال و اولاد کی جس فراوانی سے وہ بہرہ مند ہیں اس سے محروم ہو جائیں گے۔ فرمایا کہ یہ ان کی نادانی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو انھوں نے اپنے فرضی دیوتاؤں سے منسوب کر رکھا ہے۔ یہ نعمتیں سب اللہ کی عنایت کردہ ہیں اور اس نے ان کی ناشکریوں کے باوجود جب ان سے ان کو بہرہ مند کیا تو شکر گزاری کی روش اختیار کرنے کے بعد بدرجۂ اولیٰ نہ صرف ان کو باقی رکھے گا بلکہ اس میں افزونی فرمائے گا۔

توحید کی راہ ایک جانی پہچانی راہ ہے

'عَلَى الطَّرِيْقَةِ' سے مراد توحید کی صراطِ مستقیم ہے۔ اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ گویا یہ ایک جانی پہچانی راہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے اس لیے کہ انسان کی فطرت اس کی گواہ ہے، عقل اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے، آفاق و انفس اس کی گواہی دے رہے ہیں اور اللہ کے رسولوں اور اس کی کتابوں نے اسی راہ کی دعوت دی ہے۔

لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا (۱۷)

ایک بر سرِ موقع تنبیہ

یہ بر سرِ موقع ایک تنبیہ ہے کہ اس دنیا میں ہم رزق و فضل سے کسی کو جو بہرہ مند کرتے ہیں تو اس سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ وہ خدا کا منظورِ نظر ہے بلکہ اس سے مقصود اس کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی نعمتیں پا کر اس کا شکر گزار اور فرمانبردار رہتا ہے یا ناشکرا اور مغرور و متکبر بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کے یہ مغرور لیڈر اس واضح حقیقت کو فراموش کر بیٹھے۔ انھوں نے ان نعمتوں کو اپنا موروثی حق جانا اور اس غرور کے نشہ میں انھوں نے اس یاد دہانی سے منہ موڑا جو اللہ نے ان کو راہِ راست دکھانے کے لیے نازل فرمائی۔

'وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا'۔ یہ اسی کے ساتھ کی دوسری تنبیہ ہے کہ اس دنیا کے غرور میں مبتلا ہو کر جو لوگ اپنے رب کی یاد دہانی سے منہ موڑیں گے وہ یاد رکھیں کہ

اللہ ان کو ایک ایسے عذاب میں داخل کرے گا جو برابر ترقی ہی کرتا رہے گا۔

'ذکر' سے مراد یہاں قرآن ہے جس کی ناقدری پر قریش کو اوپر کی آیات میں ملامت کی گئی ہے۔ یہ لفظ قرآن کے لیے جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔

'عذاباً صعداً' کے معنی لوگوں نے عام طور پر 'عذاب شدید' کے لیے ہیں لیکن لفظ 'صعد' کا اصل مفہوم ترقی کرنا ہے۔ اس وجہ سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس میں اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور اپنی کتاب کی تکذیب کی پاداش میں جن کو پکڑتا ہے ان کی سزا وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتی بلکہ اس میں برابر ترقی ہی ہوتی رہتی ہے۔ اس دنیا میں جس عذاب سے وہ دوچار ہوتے ہیں اس سے بڑے عذاب سے ان کو آخرت میں سابقہ پیش آئے گا اور پھر آگے ان کے عذاب کی شدت میں ترقی ہی ہوتی رہے گی۔ اس کے ختم یا اس میں بالتدریج کمی ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (۱۸)

سجدہ گاہ صرف اللہ ہی کے لیے ہو سکتی ہے

اوپر والی آیت میں کلام غائب کے اسلوب میں تھا۔ اس آیت میں براہ راست خطاب کر کے متنبہ فرمایا کہ مسجدیں صرف اللہ کی عبادت کے لیے خاص ہوتی ہیں ان میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو اس کا شریک عبادت نہ بناؤ۔ یہ توحید کا مضمون اس انذار ہی کا حصہ ہے جو اوپر والے ٹکڑے میں مضمر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جب اعراض کرنے والوں کو پکڑے گا تو اس کی پکڑ سے یہ فرضی دیوی دیوتا بچانے والے نہیں بنیں گے تو اللہ کی مساجد کو ان کی پوجا سے آلودہ نہ کرو۔

عبادت کا سزاوار چونکہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، کوئی دوسرا سزاوار عبادت نہیں ہے اس وجہ سے ہر مسجد اپنے مقصد تعمیر ہی سے اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہوتی ہے۔ نہ اس کے سوا کسی اور کے لیے مسجد تعمیر ہو سکتی، نہ کسی مسجد میں غیر اللہ کی عبادت ہو سکتی۔

لفظ 'مساجد' اگرچہ عام ہے لیکن یہاں خطاب قریش سے ہے اس وجہ سے قرینہ دلیل ہے کہ اس کا مصداق اول بیت اللہ ہے۔ اس کو جمع کے لفظ سے تعبیر کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہی تمام مساجد کا قبلہ اور ان کا شیرازہ ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ جمع سے تعبیر کرنے کے سبب سے یہ حکم بالکل عام ہو گیا ہے۔ سورۂ توبہ کی آیت ۱۷ 'مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ' میں بھی یہی اسلوب بیان ہے۔ وہاں بھی 'مَسٰجِدَ اللّٰهِ' کا مصداق اول بیت اللہ ہی ہے لیکن حکم کو عام کرنے کے لیے اس کو تعبیر جمع کے لفظ سے فرمایا ہے۔

وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ يَدْعُوْهُ كَادُوْا يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا (۱۹)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مشرکین کی برہمی

یعنی ہونا تو یہ تھا کہ بیت اللہ میں غیر اللہ کا نام بھی سنا نہ جا سکتا لیکن اس کے بالکل برعکس صورت حال

یہ ہے کہ جب اللہ کا بندہ صرف اپنے رب ہی کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو مخالفین اس کو ہر طرف سے گھیر لیتے ہیں۔

'لِبَدًا' جمع ہے 'لِبْدَۃٌ' کی، جس کے معنی کسی تہ بہ تہ اور گتھم گتھا شئے کے ہیں۔ یہ تصویر ہے اس بات کی کہ جو گھر خالص اللہ واحد کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اب اس میں بھی توحید ایک ایسی نامانوس چیز بن کے رہ گئی ہے کہ جب اللہ کا رسول اپنے رب کی عبادت کے لیے کھڑا ہوتا ہے اور توحیدِ خالص کی تعلیم پر مشتمل سورتوں کی تلاوت کرتا ہے تو لوگ اس کو ایک اعجوبہ یا دیوانہ سمجھ کر ہر سمت سے گھیر لیتے ہیں۔ بعینہٖ یہی صورت اس وقت بھی پیش آتی جب آپ دعوت کے لیے نکلتے اور لوگوں کو توحید کی سورتیں سناتے۔ اس وقت بھی شریر افراد آپ کو گھیر لیتے اور آپ کی توہین کرنے اور ایذا پہنچانے کی کوشش کرتے۔

'عَبْدُ اللّٰہِ' سے مراد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس لفظ میں آپ کے لیے پیار بھی ہے اور اس حقیقت کا اظہار بھی کہ اللہ کے بندے کے لیے سب سے زیادہ معقول اور فطری کام کوئی ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے اللہ ہی کو پکارے لیکن دنیا کا ضمیر اس طرح بگڑ چکا ہے کہ یہی سب سے زیادہ صحیح اور اعلیٰ کام لوگوں کے لیے ایک نہایت انوکھا اور ناگوار کام بن کے رہ گیا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾

پیغمبر صلعم کی طرف سے فیصلہ کن اعلان

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ خواہ یہ لوگ کتنے ہی کان کھڑے کریں اور کتنا ہی برا مانیں لیکن تم ان کی مطلق پروا نہ کرو بلکہ ان کو صاف صاف سنا دو کہ میں تو صرف اپنے رب ہی کو پکاروں گا، کسی کو بھی اس کا ساجھی نہیں ٹھہراؤں گا، خواہ تم نے ان کو کتنا ہی بڑا خدا کا شریک کیوں نہ سمجھ رکھا ہو۔

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾

فرمایا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم میری دعوت سے نفور ہو، میری بات سننے کے لیے تیار نہیں تو اس کا علاج میرے پاس نہیں ہے۔ میں داعی بنا کر بھیجا گیا ہوں، تم پر داروغہ مقرر نہیں ہوا ہوں۔ نہ تمہارا نفع و ضرر میرے اختیار میں ہے نہ تمہاری ہدایت و ضلالت۔ میں صرف اللہ کی بات پہنچانے پر مامور ہوں سو یہ کام کر رہا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہاں اسلوب کی یہ ندرت ملحوظ رہے کہ 'ضَرًّا' کے بعد 'نَفْعًا' اور 'رَشَدًا' کے مقابل 'غَیًّا' کو حذف کر دیا ہے اس لیے کہ تقابل خود اس پر دلیل ہے۔

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾

یہ اوپر والی بات ہی کی مزید وضاحت ہے کہ اگر میں تمہاری نازبرداری میں یا تم سے مرعوب ہو کر کسی کو خدا کا شریک مان لوں تو یہ اپنے رب پر ایسے افترا کا ارتکاب کروں گا جو سب سے بڑا جرم ہے، اور جس کی سزا سے نہ مجھے کوئی دوسرا پناہ دینے والا بنے گا اور نہ میں ہی اپنے لیے کوئی ملجا و ماویٰ اس کے مقابل میں پا سکوں گا۔

اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا (۲۳)

اس آیت کا تعلق اوپر والی آیت ' لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ' سے ہے۔ یعنی میں نہ تمھارے مطالبہ پر تمھیں عذاب دکھا سکتا اور نہ تمھارے دلوں میں ہدایت اتار سکتا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو پیغام دے کر مجھے بھیجا ہے وہ بے کم و کاست میں تمھیں پہنچا دوں اور اس کے حکموں سے تمھیں آگاہ کر دوں۔

' رِسٰلٰتِهٖ ' کا عطف ' بَلٰغًا ' پر ہے۔ ' بَلَاغ ' کے بعد اس لفظ کے اضافہ سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ میرا فریضۂ منصبی صرف بے کم و کاست پہنچا دینا ہے۔ نہ بلاغ کے سوا تمھاری ہدایت و ضلالت سے متعلق مجھ پر کوئی ذمہ داری ہے اور نہ مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ تمھاری خاطر خدا کے احکام میں سرِ مو کوئی ردّ و بدل کر سکوں۔

' وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ' یعنی یہ فرضِ بلاغ ادا کر دینے کے بعد میں بری الذمہ ہو جاؤں گا۔ جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی پر اڑے رہیں گے وہ یاد رکھیں کہ ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

حَتّٰۤى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا (۲۴)

یعنی آج تو ان لوگوں کو اپنی قوت و جمعیت پر بڑا ناز ہے لیکن جب اس عذاب کو دیکھیں گے جس کی وعید ان کو سنائی جا رہی ہے تو وہ اچھی طرح جان لیں گے کہ قوت اور جمعیت کے اعتبار سے کمزور و ناتواں کون ہے؟ وہ، یا اللہ کا رسول جس کے انذار کو انھوں نے حقیر جانا؟

' مَا يُوْعَدُوْنَ ' کے مفہوم میں وہ عذاب بھی داخل ہے جو رسول کی تکذیب کی پاداش میں لازماً اس کی قوم پر اس دنیا میں آیا ہے اور وہ عذاب بھی جس سے قیامت میں سابقہ پیش آئے گا۔ سورۂ نوح کی آیت ۲۵ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

قُلْ اِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّيْۤ اَمَدًا (۲۵)

یعنی جو لوگ عذاب یا قیامت کے لیے جلدی مچائے ہوئے ہیں اور تمھیں زچ کرنے کو پوچھتے ہیں کہ اس کا ظہور کب ہو گا ان کو جواب دے دو کہ خدا نے مجھے اس سے صرف آگاہ کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ سو میں نے اس سے آگاہ کر دیا۔ رہی یہ بات کہ اس کا ظہور کب ہو گا تو اس کی کوئی خبر مجھے نہیں ہے۔ ممکن ہے وہ بالکل قریب آ لگا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میرا رب کچھ مدّت کے لیے اس کو ابھی اور ٹال دے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا (۲۶)

یعنی حقیقی عالمِ غیب وہی ہے۔ اس نے جس غیب کے علم کو اپنے لیے خاص کر رکھا ہے اس کو

کسی پر بھی ظاہر نہیں کرتا۔ 'عَلٰی غَیْبِہٖ' میں ہر غیب مراد نہیں بلکہ وہ غیب مراد ہے جس کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ہی لیے خاص کر رکھا ہے، مثلاً عذاب و قیامت کے وقتِ مقررہ کا علم۔ اس طرح کی باتوں کا علم اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ اور رسولوں پر بھی ظاہر نہیں کرتا۔

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۙ لِّیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا (۲۷-۲۸)

رہے اللہ کے رسول جن کو وہ منصبِ رسالت کے لیے انتخاب فرماتا ہے تو ان کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں تمام اسرارِ غیب سے آگاہ کر دے۔ فریضۂ رسالت کے ادا کرنے کے لیے ان کا غیب داں ہونا ضروری نہیں ہے البتہ ان کے آگے اور پیچھے وہ اپنا پہرہ رکھتا ہے تاکہ وہ دیکھتا رہے کہ انھوں نے اپنے رب کے پیغام و احکام بے کم و کاست پہنچا دیے یا نہیں؟

یہ استثناء عام معنی میں استثناء نہیں ہے بلکہ یہ اس طرح کا استثناء ہے جس طرح کا سورۂ غاشیہ میں ہے۔ فرمایا ہے:

فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ ۙ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۙ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَ كَفَرَ ۙ فَیُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ (الغاشیۃ - ۸۸: ۲۱-۲۴)	پس تم ان کو یاد دہانی کر دو۔ تم تو بس ایک یاد دہانی کرنے والے ہو۔ تم ان کے اوپر داروغہ نہیں مقرر ہوئے ہو۔ رہا وہ جو پیٹھ پھیرے اور کفر کرے گا تو اللہ اس کو عذابِ اکبر کا مزا چکھائے گا۔

اسی طرح 'اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی' ہے۔ اہلِ نحو اس کو استثنائے منقطع کہتے ہیں یعنی یہ سابق سے الگ بات ہوتی ہے جس کی وضاحت اس خبر سے ہوتی ہے جو اس کے بعد آتی ہے۔

'لِیَعْلَمَ' یہاں اسی مفہوم میں آیا ہے جس مفہوم میں 'حَتّٰی نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِیْنَ مِنْكُمْ' (محمد ۴۷: ۳۱) اور اس مفہوم کی دوسری آیتوں میں آیا ہے۔ اسی مفہوم میں 'لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ' (یونس ۱۰: ۱۴) میں لفظ 'نَنْظُرَ' بھی آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ یوں تو جانتا سب کچھ ہے لیکن وہ چاہتا ہے کہ جس کے باطن میں جو کچھ ہے وہ باہر آئے اور وہ اچھی طرح اس کا امتحان کرے۔

'وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی كُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا'۔ یعنی وہ رسول کی تحویل میں جو امانت اپنے دین اور اپنی وحی کی دیتا ہے اس کو پوری طرح اپنی نگرانی میں رکھتا ہے۔ ایک ایک چیز کو گنے ہوئے ہوتا ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی اس کے شمار سے رہ جائے۔

ربِّ کریم کی معونت اور توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فالحمد للہ علی احسانہ۔

رحمان آباد
۲۰ - اکتوبر ۱۹۷۸ء
۱۷ - ذی قعدۃ ۱۳۹۸ھ

فہرست مضامین

تفسیر سورۃ القمر - ۵۴

تفسیر سُورَۃ الجُمُعَة - ۶۲

تفسیر سُورَۃ المُنٰفِقُون - ۶۳

تفسیر سُورَۃ التغابن - ۶۴

تَفْسِیْرُ سُوْرَۃِ الطَّلَاق - ۶۵

تَفْسِیْرُ سُوْرَۃِ التَّحْرِیْم - ۶۶

خطاطی ـــــــ عبد الغفور کیلانی